بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

(والصّٰفّٰت ۱۰۷، ۱۰۸ قرآن حکیم)

خداوند رب الافواج کیلئے اُتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ذبیحہ مقرر ہے

(یرمیاہ ۱۰۰۰، ۱۰۸) بائیبل

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر

(علامہ اقبالؒ)

ذبیحِ موعودؑ

تمہید

واقعاتِ کربلا پر مؤرخانہ تنقید و تبصرہ

(شیعہ زاویۂ نگاہ سے)

تالیف

صوبیدار ایس۔ کے۔ نیاز

ایس اے وی۔ فاضل السنہ شرقیہ۔ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر
صدر انجمن حسینیہ، سنٹر چک بیلی خان و جنرل سیکرٹری انجمن اتحاد و ترقی علاقہ سواں، راولپنڈی

۷۸۶

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

(والصّٰفّٰت ۱۰۷-۱۰۸)

قرآن حکیم

خداوند رب الافواج کے لئے اُتر کی سرزمین میں دریائے **فرات** کے کنارے **ذبیحہ** مقرر ہے (یرمیاہ ۱۰۷-۱۰۸) **بائیبل**

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنئ **ذبحِ عظیم** آمد پسر (علامہ اقبالؒ)

ذبیحِ موعودؑ

واقعاتِ کربلا پر مؤرخانہ تنقید و تبصرہ

(شیعہ زاویۂ نگاہ سے)

تالیف

صوبیدار ایس۔ کے۔ نیاز

ایس اے وی۔ فاضل السنہ شرقیہ۔ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر

مدر انجمنِ حسینیہ، سنٹر چک بیلی خان و جنرل سیکرٹری انجمن اتحاد و ترقی علاقہ سواں ضلع راولپنڈی

اطلاع عام

تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ سازمت   مے آرم اعتراف گناہِ نبودہ را

اس کتاب کی تالیف میں ہمیشہ یہ خیال پیشِ نظر رہا کہ کوئی ایسا فقرہ ضبطِ تحریر میں نہ لایا جائے جو کسی کی دل آزاری کا موجب بنے۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع ایک پرانے تاریخی مغالطہ کا ازالہ ہے جو اپنی قدامت کی بناء پر جزوِ مذہب بن چکا ہے۔ اصولاً ہر غلطی کے ازالہ کے لئے تنقید و تحیص لازمی ہے لہٰذا وہ حضرات جو اپنے آبائی و موروثی عقیدہ کے خلاف تاریخی نکتہ چینی کی سماعت گوارا نہ کر سکیں، اس کتاب کو نہ خریدیں اور نہ پڑھیں۔

یہ کتاب شیعہ عقیدہ کی حمایت میں لکھی گئی ہے اور اس کی اشاعت محض فرقۂ اثنا عشریہ میں مقصود ہے۔

مؤلف

ہدیہ

بحضور جناب صاحب العصر والزمان، سید الانس والجان، ابو القاسم محمد بن الحسن، القائم المنتظر المہدی علیہ السلام، عجل اللہ ظہورہٗ

بیادگار و برائے ایصال ثواب

بروح والدین مرحومین و بروح شہیدِ حسینیت، مبلغِ اسلام، داعیٔ حسینی مشن، مرحوم و مغفور عزیزم ڈاکٹر پروفیسر چوہدری منصور احمد، ڈبل ایم اے۔ بی ایڈ۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

پہلا ایڈیشن ...... نومبر ۱۹۷۸ء

تعداد ۵۰۰

قیمت ...... ۲۵ روپے

طباعت: ٹی، ایس پرنٹرز، راولپنڈی

کتابت: خان زمان علوی، کھبہ بڑالہ

پروف ریڈنگ و نظر ثانی: چوہدری مختار احمد۔ ڈبل ایم اے۔



Subedar S. K. Niaz,

S. A. V., H. P., H. U.,

R.I.A.S.C.

نذرِ عقیدت

بحضور سید الشہداء، خامسِ آلِ عبا، سبط رسول الثقلین، نور العینین، مولینا و مولی الکونین، الامام بالحق، ابی عبداللہ الحسین صلوٰۃ اللہ و سلامہٗ علیہ۔

حضورِ پرنور کی بارگاہ رفیع میں مجھ جیسا حقیر گدا باریابی کی استدعا کرتے ہوئے محض اس امید پر چند اوراقِ پریشاں نذر کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ آپ کے لطفِ عمیم کی وجہ سے یہ ناچیز تحفہ شرفِ قبولیت حاصل کرے گا ؎ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

آپ پر ظلم و ستم کی جو سلسلہ جنبانی بعد وفاتِ رسولؐ شروع ہوئی تا ہنوز جاری ہے۔ حضورِ اقدسؑ کی شہادت کے بعد ظلم کی نوعیت اور طریقِ ستم رانی میں تغیر و تبدل ضرور ہوتا رہا لیکن آپ کی مظلومانہ موت اس سلسلہ کو ختم نہ کر سکی۔ آج بھی پیشہ ور مؤرخین شہادت کے غلط اسباب بیان کر کے شہادتِ عظمیٰ کے بلند مقاصد کو نقصانِ عظیم پہنچا رہے ہیں اور ایک حیرت انگیز و بے مثال قربانی کو بغاوت و مجبوری کی موت سے تعبیر کر رہے ہیں۔ بعض منہ پھٹ تو تیغِ زباں سے اور بعض کور باطن سنانِ قلم سے آپ پر اب تک برابر وار کئے جا رہے ہیں۔

اس مختصر سی تالیف میں تاریخی واقعات پر روشنی ڈال کر حقائق کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ جن لوگوں کو خداوند تعالیٰ ہدایت کی توفیق ارزانی فرمائے ان کے لئے یہ کتاب موجبِ ہدایت اور میرے لئے ذریعۂ نجات بنے لہٰذا اپنی ذہنی کاوش اور انیس ۱۹ سالہ مسلسل محنت کے یہ پھول، عقیدت کی کشتی میں "**ذبیح موعود**" کے رنگ میں لا کر اس تمنا اور آرزو کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ حضور اس ناچیز نذر کو قبول فرمائیں تاکہ آپ کا یہ حقیر غلام میدانِ حشر میں آپ کی نصرت کرنے والوں میں ایک ادنیٰ سا مقام حاصل کر سکے ؎

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خادم اہلبیتؑ
ایس۔ کے۔ نیاز

پیش لفظ

خان صاحب آغا محمد سلطان مرزا۔ ایم اے ایل ایل بی۔ ریٹائرڈ سیشن جج۔ مولف"

کتاب" ذبیح موعود" مولفہ صوبیدار ایس کے نیازی۔ ایس اے وی، منشی فاضل وادیب فاضل، جنرل سکرٹری انجمن حسینیہ، چک بیلی خان میری نظر سے گزری۔ اس کتاب میں واقعاتِ کربلا پر مؤرخانہ و بے لوث تبصرہ کیا گیا ہے۔ فی الحقیقت واقعۂ کربلا نے ہر پہلو پر گہرے نقش چھوڑے ہیں اور معتقدین کے علاوہ غیر متعصب مؤرخین نے اس سے کافی سبق حاصل کیا ہے۔ دشمنانِ اہلبیتؑ نے اس واقعہ کی اہمیت کو کم کرنے کیلئے اپنا سارا زور لگا دیا لیکن وہ اس کی اہمیت کو کم نہ کر سکے۔ امام حسینؑ کی دور بین نگاہیں پہلے ہی سے جانتی تھیں کہ دشمنانِ علیؑ اس واقعہ کو قبائلی عصبیت و خاندانی رقابت کا رنگ دے کر اس کی اہمیت کو کم کریں گے۔ اس لئے عالی منزلت امامؑ نے اپنی صداقت و حقانیت کی خاطر واقعات کی شہادت اس ترتیب سے پیش کی کہ مستقبلِ بعید میں بھی دشمنوں کے سارے منصوبے ناکام رہ جائیں اور وہ حق پر باطل کا پردہ نہ ڈال سکیں۔ یہ قدرتی امر ہے کہ اگر کسی تاریخی واقعہ کو محض عقیدت کی نظر سے دیکھا جائے تو اسکی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور وہ شاعر کی مرثیہ خوانی اور ادیب کی فسانہ نگاری میں محدود ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت کربلا کا المیہ تاریخی مطالعہ کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں صدہا بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کتاب میں اس واقعہ کو اسی زاویۂ نگاہ سے تاریخی روشنی میں دیکھا گیا ہے اور یہی اس کتاب کا مایہ الامتیاز ہے۔

اس کتاب میں ابوبکر مالکی کے قول "اِنَّ الحُسَینُ قُتِلَ بِسَیفِ جَدِّہٖ" کی مکمل تردید کی گئی ہے اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے شائع کردہ لٹریچر (خلافتِ اسلامیہ) اور محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔

محمد سلطان مرزا

۵ جون ۶۳ ۱۹ء — سٹی سائیڈ بلڈنگ۔ AM/3۔ کراچی-۱

ذبیحِ موعود

مبلّغِ اسلام مولانا غلام محمد محمودی تونسوی کی نظر میں

ہے مرے زیرِ نظر آج وہ بیمثل کتاب
چودہ[14] معصوم ہیں جوں، اس کے ہیں چودہ[14] ابواب

نقشِ تحریر جدا جس کا جدا طرزِ ثبوت
آبِ تقدیس میں ڈھلتی گئی ہر حرف کی آب

دیکھیں عرفاں کے سمندر کی وہ اٹھتی موجیں
دے سکی جن کی نہ پُرتابیٔ کوثر بھی جواب

کیا تبحر ہے مصنّف کی کتب بینی کا
ان کے سر پر ہو سدا سایۂ ربّ الارباب

ان کی تحریر میں تائید وہ پائی حق کی
گلشنِ قلب ہوا جس کے کرم سے شاداب

ڈھونڈ کر دُر یہ خدا جانے کہاں سے لائے
دیدۂ دہر میں اب تک نہ ملا جن کا جواب

کون یوں دیگا زمانے کو ثبوتِ ماتم
کون مغرب زدہ لوگوں سے کرے گا یہ خطاب

زورِ بازو سے نہ پائی یہ سعادت واللّٰہ
فضلِ خالق ہے کہ بنتے گئے یوں فضل مآب

کیا ٹھکانے لگی انیس[19] برس کی محنت
جس طرح خلد کے انیس[19] مزیّن ہوئے باب

مثلِ حُر سبطِ پیمبرؐ نے جنہیں کھینچ لیا
بابِ رحمت کھلا اور بند ہوا بابِ عذاب

ایک توبیتِ عزا[12] ، ایک ذبیحِ موعود
ان کی بخشش کیلئے کافی ہیں بس یومِ حساب

کس طرح رُکتے وہ محمودیؔ جہاں والوں سے
بن گئے عفو و کرم کے جو ازل سے اسباب

(محمودیؔ تونسوی)

آقا کے حضور گلہائے عقیدت

جان دے کر بول بالا کر دیا اسلام کا
ناصرِ دینِ خدا تھے صبر کے پیکر حسینؑ

بے اندازہ فوجِ دشمن کی ذرا پرواہ نہ تھی
نعرہ زن تھے کربلا میں سر بکف ہو کر حسینؑ

فاطمہؑ کے لال میں سب خوبیاں تھیں باپ کی
بن گئے میدانِ جنگ میں حیدرِ صفدرؑ حسینؑ

سبطِ اصغرؑ سے نبیؐ کی شان و شوکت تھی عیاں
بالیقیں تھے عزم و استقلال کے پیکر حسینؑ

مغفرت کی فکر تجھ کو کیوں رلائے اے نیازؔ
جب اعانت پر تری ہوں شافعِ محشر حسینؑ

آقائے نامدار کا ادنیٰ غلام
صوبیدار ایس، کے، نیازؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

حضرت امام حسین (عَلَیْہِ وَعَلٰی آبَائِہٖ وَاَجْدَادِہٖ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلام) کو تاریخ عالم میں بالعموم اور تاریخ اسلام میں بالخصوص وہ اہمیّت حاصل ہے جو محتاجِ بیان نہیں۔ جس واقعہ نے اسلام کی دینی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی تاریخ پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے وہ فی الحقیقت سانحۂ کربلا ہے لیکن دشمنوں نے اس واقعہ کی اہمیّت کو کم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کربلا کی معرکہ آرائی کو (خاکم بدہن) دو شہزادوں کے ذاتی اغراض و مقاصد کا تصادم تصور کیا۔ شومئ قسمت سے کمزور فریق کو نواسۂ رسولؐ سمجھ کر واقعۂ شہادت کے حیرت انگیز و عبرت خیز کارناموں کو محبانِ اہلبیتؑ کی محض عقیدت پر محمول کیا شکوۂ اغیار تو برطرف، افسوس تو اس امر کا ہے کہ اپنوں نے بھی ایسا طریقِ کار اختیار کیا کہ امامِ مظلومؑ کی حقیقی عظمت محض افسانہ بن کر رہ گئی۔ سانحۂ کربلا کے ٹھوس تاریخی حقائق کو شاعر کی مرثیہ خوانی اور ادیب کی فسانہ نگاری سمجھا جا رہا ہے ؎

من از جورِ بیگانگاں ہرگز نہ نالم   بامن آنچہ کرد آشنا کرد

لہٰذا اقتضائے وقت کے تحت تاریخی روشنی میں اس مسئلہ کی تمام تر جزئیات پر تنقیدی قلم فرسائی کی اشد ضرورت تھی تاکہ ابنِ رسولؐ کا اسوۂ حسینہ مومنین

کے لئے سرمایہ اتباع و تقلید ہو سکے۔

یہ مختصر سی تالیف جو چودہ ابواب پر مشتمل ہے محض اسی مقصد کے پیشِ نظر ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں سابقہ کتبِ مقدسہ، قرآنِ حکیم اور اقوالِ رسولؐ کی روشنی میں استدلال کیا گیا ہے کہ حضرت امام حسینؑ ایک ایسے ذبحِ موعود ہیں جنہوں نے ملوکیت واستبداد، آمریت و قاہریت کے مقابل صدق و صفا، صداقت و حق پرستی کا ایک غیر متزلزل نمونۂ عمل پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام زمانہ سازی کا سبق نہیں سکھاتا بلکہ اس کے برعکس "بازمانہ ستیز" کا درس دیتا ہے ؎

نازہے تمہیں کہ بدلا ہے زمانے نے تمہیں۔ مرد تو وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اسلام نہ تو وقت کی پیداوار ہے اور نہ وقت کا غلام ہے دام وہ ہنگامی رجحانات و وقتی بدعات سے کوئی مصالحت نہیں کر سکتا بلکہ مخلوقِ خدا کی قیادت، اعلیٰ اخلاق کی تدریس اور وقت کے غلط میلانات کا مقابلہ کرنا اسلام کا بلند ترین نصب العین ہے۔

متعدد کتابیں اردو زبان میں شائع ہو چکی ہیں جن میں واقعاتِ کربلا کا سلسلہ وار تذکرہ موجود ہے۔ بالعموم بعض کتابوں میں تاریخی واقعات کے تسلسل کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بغیر جرح و قدح بعض غلط روایات کو بھی شامل کیا گیا اور تنقیدی پہلو کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا جو مورخ کی شان کے شایاں نہیں۔ اس سیاسی بے بصیرتی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غلط روایات کی شمولیت نے ٹھوس تاریخی حقائق کو سطحی نگاہوں میں افسانوی رنگ میں رنگین کر دیا۔ اسی پر اکتفا نہ ہوا بلکہ رزم گاہِ کربلا کی تین مفروضہ شرائط نے جو امامؑ کی ذاتِ قدسی صفات کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ شہادتِ عظمیٰ کے بلند کارنامہ کو مجبوری کی موت بنا دیا ہے اور تحفظِ دینِ خدا کی خاطر جو عظیم الشان قربانی دی گئی تھی اسے ایک ناکام سیاسی بغاوت سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ محمود احمد عباسی، علی احمد عباسی، محمد تقی مدیر البلاغ اور اس نوع کے دیگر علماء نے خود اہلسنّت کے مسلک و عقیدہ کو بھی مسخ

کر کے رکھ دیا ہے۔ حضرت علیؑ و حضرت حسینؑ کے مقابل معاویہ و یزید کی شخصیت و موقف کو بڑھا چڑھا کر اس انداز سے پیش کرنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت علیؑ و حضرت حسینؑ کا مقام و موقف برحق و برصواب ہونے کی بجائے عوام میں شبہات و اشکالات کا مورد بنتا جا رہا ہے۔

پس اس امر کی ضرورت تھی کہ اس غلط روی، کوتاہ بینی و بداندیشی کا علاج کیا جاتا چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ہمارا مقصد واقعات کا مسلسل تذکرہ نہیں بلکہ واقعاتِ کربلا پر مؤرخانہ و دیانتدارانہ تنقید ہے اور ایک ایسے تاریخی مغالطہ (اِنَّ الْحُسَيْنَ قُتِلَ بِسَيْفِ جَدِّهٖ) کا ازالہ ہے جو اپنی قدامت کی وجہ سے مذہبی عقائد کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ حقائق کی تائید اور اوہام کی تردید میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کی بنیاد فی نفسہٖ واقعات پر ہے۔ اس طرح سے واقعات کے بیان میں اگرچہ تسلسل کا اہتمام نہیں تاہم کوئی ایسا تاریخی واقعہ نہیں جو کسی نہ کسی رنگ میں اوراقِ کتاب کے لئے باعثِ زینت نہ بن چکا ہو بلکہ بعض مقامات پر دلائل کے طور پر بعض واقعات کو متعدد بار مجبوراً پیش کرنا پڑا ہے۔

چونکہ سوادِ اعظم کے بعض علماء کے زاویۂ نگاہ میں امیر معاویہ ایک بلند مرتبت شخصیت کے مالک تھے اس لئے ان کے کردار و شخصی خصوصیات پر بحث کرتے وقت شیعہ نقطۂ نگاہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، صرف علمائے اہلِ سنت کے اقوال نقل کئے گئے ہیں بالخصوص علامہ مولٰینا مودودی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات و تالیفات پیشِ نظر رہی ہیں۔

اس کتاب کی تیاری میں آنریبل جسٹس سید امیر علی، سید اولاد حیدر فوق بلگرامی، نواب احمد حسین رئیس پریانواں، سید العلماء سید علی نقی صاحب مجتہد لکھنوی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی، آغا محمد سلطان مرزا ریٹائرڈ سیشن جج کی تالیفات

و تصنیفات سے کافی مدد لی گئی ہے بالخصوص "البلاغ المبین" نے مشعلِ راہ کا کام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو ثوابِ دارین عطا فرمائے جن کی ذہنی کاوشوں سے ہزاروں آدمی استفادہ کر رہے ہیں۔ خداوند تعالیٰ آغا محمد سلطان مرزا کو بالخصوص اجرِ عظیم عطا کرے جنہوں نے حق گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ آغا صاحب ممدوح نے نہ صرف اس کتاب کے بعض ابواب پر نظرِ ثانی فرمائی بلکہ اپنے مفید و کارآمد مشوروں سے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور اس کتاب پر پیش لفظ لکھ کر مجھے نوازا۔

میں جناب مولینا سید علی حسن صاحب اختر امروہوی، مبلغِ اسلام جناب سرفراز حسین صاحب تحسین جعفری، جناب سید عاشق حسین ایم اے، ایم او ایل۔ اور جناب ملک محمد نواز صاحب بی اے، منشی فاضل کا بیحد ممنون ہوں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اس کتاب کی تیاری میں میری پوری امداد و نصرت فرمائی۔

اس کتاب کی تیاری اور اشاعت میں برادرم کمانڈر غلام محمد، عزیزم منصور احمد ڈبل ایم اے۔ بی ایڈ۔ عزیزم مختار احمد ڈبل ایم اے اور عزیزم ناصر علی بی اے کا بھی مخصوص حصہ ہے۔ خدا ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اہلِ بیتِ رسولؐ کا ادنیٰ خادم
(صوبیدار) ایس کے نیاز

ابواب

فہرست مضامین

باب اوّل

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهِ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ...... هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ○

تجھ سے ماہ محرم میں قتال و جدال
کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دیجئے ماہ محرم میں قتال گناہ کبیرہ
ہے۔ اور (یہ بھی یاد رہے) کہ خدا کی راہ سے روکنا اور خدا سے انکار
اور مسجد حرام (کعبہ) سے (روکنا) اور جو اس کے اہل ہیں ان کا مسجد سے نکال باہر
کرنا (یہ سب) خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر گناہ ہے اور فتنہ پردازی کشت
و خون سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ کفار ہمیشہ تم سے لڑتے ہی چلے جائیں گے یہاں تک
کہ اگر ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اور تم میں جو شخص اپنے دین
سے پھرا اور کفر ہی کی حالت میں مر گیا تو ایسوں کا کیا کرایا سب کچھ
دنیا اور آخرت (دونوں) میں اکارت ہے اور یہی لوگ
جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے

(البقرہ ۲۱۷)

حرمتِ محرم اور قربانی کا تعیّن

اجمال

کربلا داستانِ حرم کا وہ نورانی باب ہے جس کی روشنی ابد تک ماند نہیں ہو سکتی حق و باطل کی ازلی آویزش کا یہ ایسا نقطۂ عروج ہے جس کی تجلّیات ایمان کی راہوں کو ہمیشہ ہمیشہ منوّر کرتی رہیں گی۔ جس مبارک قافلے اور اس کے عظیم قافلہ سالار نے اپنے خونِ مطہر سے کربلا کے صحرا پر اِلّا اللّٰہ کا نقشِ حق ثبت کیا۔ اس میں بوڑھوں چند جوانوں کے علاوہ بچے اور خواتین بھی شاملِ سعادت تھیں۔ ذبحِ عظیم کی صورت میں یہ مقدّس قربانی کربلا کی متبرک سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے پیش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم میں اس عظیم الشّان قربانی کے لئے شخصیت منتخب تھی جنابِ حسینؑ کی، دن معیّن تھا عاشورۂ محرّم کا، وقت مقرر تھا عصر کا اور مقام مخصوص تھا دریائے فرات کا کنارہ۔ آگے چل کر ان ہی امور پر آسمانی کتابوں کی روشنی میں تفصیلاً بحث کی جائے گی۔

یہ منفرد سعادت جناب سیدالشہداء حضرت امام حسینؑ کے مقدّر میں تھی جو ختمی مرتبت حضرت محمدؐ کے سبطِ اصغر، امیرالمومنین حضرت علیؑ کے فرزندِ ارجمند اور جناب سیّدۃ النساءؑ کے جگر گوشہ تھے۔ حادثۂ کربلا کا اجمال یہ ہے کہ امیر معاویہ نے اپنے عہدِ حکومت کے آخری ایام میں خلافتِ راشدہ کے اصول کے برعکس اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین و ولی عہد نامزد کر دیا اور اپنی شاہانہ جاہ و جبروت اور عسکری شان و شوکت کو جو انہیں بحیثیت امیر حاصل تھی کام میں لاکر عوام کو بیعتِ یزید پر مجبور کر دیا یزید نے تخت نشین ہوتے ہی ولید حاکم مدینہ کو حکم بھیجا کہ حضرتِ امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا جائے۔ انکار کی صورت میں انہیں قتل کر دیا جائے۔ کربلا کے بطلِ جلیل حضرت امام حسینؑ نے خاتونِ جنتؑ کی پاکیزہ آغوش میں پرورش پائی تھی۔ آپ روحِ اسلام سے

اپنے علم و بصیرت کی بنا پر واقف تھے۔ امیر معاویہ جس قیصرائی طرز حکومت کا آغاز کر چکے تھے اور یزید نے جس استعماری نظام حکومت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا چاہا تھا وہ خلافتِ راشدہ اور عہدِ نبوی کے علاوہ روحِ اسلام کے بالکل منافی تھی اس لئے آپ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا اور امن کی تلاش میں مکّۂ مکرمہ کی جانب چل پڑے۔ اہلِ کوفہ کی دعوت پر اپنے چچازاد مسلم بن عقیلؓ کو سفیر بنا کر کوفہ بھیجا جس کے ہاتھ پر ہزاروں کوفیوں نے بیعت کرلی۔ یزید نے تیس آدمیوں کو حاجیوں کے لباس میں مکّہ بھیجا تاکہ دورانِ حج موقع پاکر امام حسینؑ کو قتل کر دیں۔ امام مظلومؑ نے حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے کوفیوں کے مسلسل اصرار کی بنا پر کوفہ کا رخ کیا۔ یزید نے حاکمِ کوفہ کو تبدیل کر کے اس کی جگہ ایک جابر حاکم عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ بعض اہلِ کوفہ تو اقتدارِ وقت کے دام تزویر و تحریص میں الجھ کر رہ گئے اور بعض نے دھمکیوں سے مرعوب ہو کر حضرت مسلم بن عقیلؓ کا ساتھ چھوڑ دیا اور باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ اپنے چند ساتھیوں سمیت نہایت بیدردی سے شہید کر دیئے گئے۔

مکّہ سے روانگی کے بعد منزلِ صفاح پر عرب کے مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ فرزدق نے کوفہ کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "لوگوں کے دل تو آپ ہی کے ساتھ ہیں مگر تلواریں بنی امیّہ کا ساتھ دیں گی"۔ لیکن آپ کے عزم میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔ آپ بدستور اسی راہ پر گامزن رہے جس کا ارادہ کر کے مکّہ سے نکلے تھے۔ سرکار سید الشہداءؑ دو محرم ۶۱ھ کو واردِ کربلا ہوئے۔ حُر بن یزید کی مزاحمت پر دریائے فرات کا کنارہ چھوڑ کر خیمے نصب کرنے کے لئے سات محرم الحرام کو حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا گیا۔ یوم عاشور امام مظلومؑ اور آپ کے احباب و انصار نے یکے بعد دیگرے تحفظِ اسلام کی خاطر جانیں قربان کر دیں۔ آپ کی شہادت پر سورج کو گہن لگا، سیاہ آندھیاں چلیں۔ آسمان پر چند نورانی صورتیں نظر آئیں اور فضائے تیرہ و تار میں صدا گونجی :-

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (الفجر ۲۷-۳۰)

(ترجمہ) "اے اطمینان والے نفس! تو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کر اس حال میں کہ تو اس پر راضی بھی ہے اور اس کا پسندیدہ بھی۔ پس تو میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں چلا آ۔" (ترجمہ مقبول احمد)

جمعہ کا مبارک دن تھا کہ کربلا کے جہاد کی خوں ریز منزل اپنی انتہا کو پہنچی۔ انسانی تاریخ کا ورق اس خونِ ناحق کے چھینٹوں سے ہمیشہ کے لئے داغدار ہو گیا۔ قرآن کی عملی تفسیر خونِ شہادت سے لکھی گئی اور اسلام کو زندگیٔ جاوید مل گئی۔ امام پاکؑ نے اپنی اور اپنے اعزہ و رفقاء کی قربانی دیکر ہمیشہ کے لئے یہ طے کر دیا کہ اسلام میں فسق و فجور، ظلم و استبداد، ملوکیت و آمریت، قیصر و کسریٰ کے نظامِ حکومت کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔

تا قیامت قطع استبداد کرد — موج خونِ او چمن ایجاد کرد (علامہ اقبالؒ)

تحریمِ محرم

واقعہ ہائلہ کربلا جس کا اجمال بیان کیا جا چکا ہے محرم الحرام کے مقدس دن (یوم عاشور) کو وقتِ مقررہ پر پیش آیا۔ چنانچہ اس بابرکت مہینے کے بارے میں چند حقائق منظرِ عام پر لائے جاتے ہیں۔ تاریخ عالم کی ورق گردانی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتدائے تخلیقِ انسانیت سے دنیا کے ہر مذہب و ملت میں ماہِ محرم کی حرمت برقرار رہی ہے۔ دنیا کی اکثر قومیں ماہ محرم میں بالعموم اور یوم عاشور کو بالخصوص کفارۂ گناہ کی خاطر قربانیاں پیش کرتی رہی ہے۔ آسمانی کتابوں میں توریت کو اپنی قدامت کی وجہ سے مخصوص اہمیت حاصل ہے اور بہت سے تاریخی واقعات محض توریت کے ذریعہ ہی منظرِ عام پر آئے لہٰذا حرمتِ محرم کے سلسلہ میں پہلے توریت ہی سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

حرمت محرم پر توریت کی مقدس شہادت

بنی اسرائیل کا پہلا مہینہ ابیب ہے جو ملتِ اسلامیہ کے ماہ رجب کے مترادف ہے اور ان کا ساتواں مہینہ نیسان مسلمانوں کے ماہ محرم کا قائم مقام ہے۔ حضرت موسےؑ کے زمانہ میں عام سال کا ساتواں مہینہ مقدس سال کے پہلے مہینے سے تبدیل کیا گیا چنانچہ توریت میں مذکور ہے :-

" پھر خداوند نے ملک مصر میں موسیٰؑ اور ہارون سے کہا کہ یہ مہینہ تمہارے لئے مہینوں کا شروع اور سال کا پہلا مہینہ ہو ۔ پس اسرائیلیوں کی ساری جماعت سے کہدو کہ اسی مہینے کے دسویں دن ہر شخص اپنے آبائی خاندان کے مطابق گھر پیچھے ایک برہ لے"۔ (خروج ۱۲ : ۱-۳)

پس اس آیۂ کریمہ کی رو سے مقدس مہینے کا دسواں دن (یوم عاشور) قربانی کے لئے معین ہوا، اور یہود کا یہی ساتواں بابرکت مہینہ تبدیل ہو کر مسلمانوں کا پہلا مبارک مہینہ محرم الحرام قرار پایا۔ توریت کا ایک دوسرا مقام ملاحظہ فرمائیے :-

" اور خداوند نے موسےؑ سے کہا کہ اسی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو کفارہ کا دن ہے ، اس روز تمہارا مقدس مجمع ہو اور تم اپنی جانوں کو دکھ دینا اور خداوند کے حضور آتشیں قربانی گزراننا تم اس دن کسی طرح کا کام نہ کرنا کیونکہ وہ کفارہ کا دن ہے جس میں خداوند تمہارے خدا کے حضور تمہارے لئے کفارہ دیا جائیگا اور جو شخص اس دن کسی طرح کا کام کرے اسے میں اس کے لوگوں میں سے فنا کر دوں گا۔ تم کسی طرح کا کام مت کرنا۔ تمہاری سب سکونت گاہوں میں پشت در پشت یہی آئین رہے گا۔ یہ تمہارے لئے خاص آرام کا سبت ہے ۔ اس میں تم اپنی جانوں کو دکھ دینا۔ تم اس مہینے کی **نویں تاریخ کی شام سے دوسری شام تک** اپنا سبت ماننا۔ (احبار ۲۳ : ۲۶-۳۲)

اقتباس مذکور سے عیاں ہے کہ ماہ محرم یہود کے لئے سال کا مقدس ترین مہینہ ہے اور یوم عاشور کفارہ ، قربانی ، سبت اور عبادت کے لئے مخصوص ہے۔ اس مقررہ دن کے دوران دنیوی کاروبار

میں مصروفیت ممنوع ہے۔ خلاف ورزی اور حکم عدولی پر شدید سزا و دردناک عذاب معین ہے آیۂ کریمہ کے یہ الفاظ کہ " تمہاری سب سکونت گاہوں میں پشت در پشت یہی آئین رہے گا۔" خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ خداوند تعالیٰ کی طرف سے یوم عاشور کی قربانی، اپنے آپ کو غمگین رکھنے اور ماتم کرنے کا حکم تمام اقوام عالم کے لئے نسل در نسل لازم قرار دے دیا گیا ہے۔ عیسائی پادری اور یہودی علماء آج تک کوئی معقول وجہ نہ بتا سکے کہ یوم عاشور کفارے اور قربانی کے لئے کیوں مخصوص ہوا اور نویں محرم کی شام سے دسویں محرم کی شام تک غمزدہ و غمگین رہنے کا حکم کیوں نافذ ہوا؟ بائبل کے تمام مفسرین اس سلسلہ میں خاموش ہیں اور کوئی منطقی و معقول دلیل پیش کرنے سے قاصر، لیکن قرآنِ حکیم کی روشنی میں اس قسم کے دائمی قانون ابد تک نافذالعمل رہتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:-

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ○ (الفتح ۲۳)

(ترجمہ) "اللہ کی سنت وہی ہے جو قدیم سے چلی آرہی ہے تم اللہ کے قاعدے و دستور العمل میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"

پس اسلام کی دائمی شریعت اس ابدی قانونِ قدرت کے دائرہ عمل سے کس طرح باہر ہو سکتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یوم عاشور کو ماتم کرنے اور اپنے آپ کو غمگین و غمزدہ رکھنے کا حکم کسی انتہائی دردناک صدمہ و المیہ کی بناء پر نافذ ہوا اسکی تائید و تصدیق کے لئے تاریخ عالم کے پاس صرف واقعہ ہائلہ کربلا کا دلسوز و المناک منظر ہے جس کا محض تصور ہی انسانی جسم پر کپکپی طاری کر دیتا ہے جسین مظلومؑ کو لشکرِ کفار ماہِ محرم کی نویں تاریخ کو نرغہ میں لے لیتا ہے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی گلوئے خشک تک نہیں پہنچتا۔ چاروں طرف سے اَلعَطَش اَلعَطَش کی دردناک صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور وہ المناک منظر رونما ہوتا ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ نویں محرم کی شام سے دسویں محرم کی شام تک اہلبیتِ رسولؐ اور ان کے انصار پر وہ مظالم توڑے جاتے ہیں کہ الامان والحفیظ! شامِ عاشور نواسۂ رسول کے گلوئے پاک پر شمر ملعون کا خنجر چلتا ہے۔ پس جتنی دیر فرزندِ بتولؑ اور آپکے یار و انصار انتہائی دنیوی کرب و بلا میں مبتلا رہے اتنے ہی عرصہ کے لئے ماتم کناں اور گریاں رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ توریتِ مقدس کے ایک دوسرے

مقام پر یہی حکم زیادہ زور دار الفاظ میں یوں مرقوم ہے :-

"یہ تمہارے لئے دائمی قانون ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے ، اپنی جان کو دکھ دے اور کسی طرح کا کام نہ کرے۔ (احبار ۱۶ : ۲۹)

غور و فکر کا مقام ہے کہ کسی مسافر کو بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا بلکہ اس ابدی قانون کی رُو سے ہر فرد کے لئے ماتم کرنا لازم قرار دے دیا گیا۔ ہندو بھی اسی مہینے کے یوم عاشور کو پوِتر اور مبارک سمجھتے ہیں چنانچہ پانڈوؤں کی آزادی کا بھی یہی دن تھا انہوں نے کوروؤں سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت اور عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسی دن جمی کے پودے سے اپنے ہتھیار کھولے تھے۔ اسی مخصوص دن ہنومان کو یہ سراغ مل سکا کہ سیتا راون کی گرفت میں ہے یہی یوم عاشور تھا کہ رامچندر جی مہاراج نے اطلاع پاکر سیتا کی آزادی و رہائی کے لئے اہتمام شروع کیا اور راون ایسے دُشٹ کو نشٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اسی دن کو ہندو دسہرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہر سال دسہرہ کی تقریب مناتے ہیں۔ یہی یوم عاشور تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی نصرت و اعانت فرما کر ان کو فرعون کی غلامی سے آزادی دلائی تھی۔ اسی دن امام عالی مقامؑ باطل کی تمام طاغوتی طاقتوں کے مقابل سینہ سپر ہو کر اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے پار کرتے ہیں۔ مذہبی طور پر یہود، ہندو اور مسلمان تمام تر قمری مہینے سے سال کا شمار کرتے ہیں لیکن یہودیوں اور ہندوؤں کا مسلمانوں کے یوم عاشور سے اختلاف اس لئے پیدا ہو جاتا ہے کہ قمری سال کی شمسی سال سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہودی ماہ نیساں کے چالیس دن گنتے ہیں اور اور ہندو ہر تیسرے سال کو ایک زائد مہینہ شمار کرتے ہیں ورنہ یہود کا یوم کفارہ (DAY OF ATONEMENT) ہندوؤں کا دسہرہ اور مسلمانوں کا عاشور محرم ایک ہی دن وقوع پذیر ہوتے۔ صرف یہود و ہندو قوم کے ساتھ ہی ماہ محرم کی حرمت وابستہ نہیں بلکہ ظہورِ اسلام سے قبل قریش بھی عاشور محرم کا روزہ رکھتے تھے اور خود سرور کائناتؐ بھی اس پر عمل پیرا رہے۔ مدینہ میں پہنچ کر بھی آنحضرتؐ یوم عاشور روزہ رکھتے

تھے اور دوسروں کو روزہ رکھنے کا حکم دیتے رہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں مروی ہے:۔

"اخرج البخاری عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان یوم عاشوراء تصومہ قریش فی الجاھلیۃ وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصومہ فلما قدم المدینۃ صامہ وامر بصیامہ فلما نزل رمضان کان رمضان الفریضۃ وترک عاشوراء وعن عبداللہ قال دخل علیہ الاشعث وھو یطعم فقال الیوم عاشوراء فقال کان یصام قبل ان ینزل رمضان فلمّا نزل رمضان ترک فاذن فکل۔"

(ترجمہ) صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش عاشور محرم روزہ رکھتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ مدینہ میں تشریف لانے کے بعد بھی اس پر عمل فرماتے رہے اور دوسروں کو بھی حکم دیتے رہے کہ عاشور محرم کو روزہ رکھیں مگر جب ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آنحضرتؐ نے عاشور محرم کا روزہ ترک کر دیا۔

عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ وہ کھانا کھا رہے تھے اسی اثنا میں اشعث ان کے یہاں آئے اور ابن مسعود کو کھانا کھاتے دیکھ کر کہا کہ آج یوم عاشور ہے (اور تم کھانا کھا رہے ہو) ابن مسعود نے کہا کہ جب تک ماہ رمضان کے روزے فرض نہ ہوئے تھے اس وقت تک عاشورے کا روزہ رکھا جاتا تھا لیکن جب ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے عاشورے کا روزہ ترک ہوگیا۔ آؤ کھانا کھاؤ۔

(تاریخ احمدی۔ص ۳۳-۳۴)

حرمتِ محرم پر قرآنی شہادت

قرآن حکیم بھی بذاتِ خود ماہ محرم کی حرمت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ

(التوبہ: ۳۶)

(ترجمہ) "بیشک خدا کے نزدیک مہینوں کی گنتی جس دن سے خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے کتابِ خدا میں بارہ ہی ہے، ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں۔ آپس میں ان کے اندر ظلم مت کرو یہی دینِ قیم ہے۔"

تمام مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ مذکورہ حرمت والے چار مہینے : محرم، رجب، ذلقعد اور ذوالحجہ ہیں۔ حرمتِ محرم کے متعلق زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے :۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

(البقرة : ۲۱۷)

(ترجمہ) " (اے محمدؐ!) تجھ سے ماہِ محرم میں قتال و جدال کی نسبت پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ماہِ محرم میں قتال گناہ کبیرہ ہے اور راہِ خدا سے باز رکھنا (خود) خدا کا انکار کرنا اور مسجد الحرام سے روکنا اور اہالیانِ مسجد الحرام کو اس سے نکال باہر کرنا اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے اور فتنہ بپا کرنا قتل سے بھی بدتر ہے۔ ہمیشہ یہ لوگ تم سے مقابلہ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائیگا اور کفر کی حالت میں مرجائے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال آخرت میں اکارت ہوجائیں گے اور یہی لوگ اہلِ جہنم ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

اس آیۂ وافی ہدایہ میں ہم نے شہرالحرام کا ترجمہ ماہ محرم کیا ہے۔ شہر عربی زبان میں مہینے کو کہتے ہیں۔ پس شہرالحرام کے معنی حرمت والا مہینہ ہوئے اور یہی مفہوم ماہ محرم میں مضمر ہے محرم کے علاوہ تین مہینے اور بھی ایسے ہیں جو قرآنِ حکیم کی رُو سے حُرمت والے ہیں اور جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے لیکن اس مقام پر شہرالحرام کے معنی صرف ماہ محرم ہی کے ہو سکتے ہیں کیونکہ سوال

کرنے والوں نے بلفظ جمع نہیں پوچھا بلکہ ایک مہینہ کو منفرد کیا ہے نیز اصول فقہ وغیرہ علوم میں مسائل اصول لغت پر ہی بیان ہوتے ہیں چونکہ لغتِ عرب میں اسم با مسمیٰ یہی پہلا مہینہ ہے اس لئے اس موقع پر شہر الحرام سے ماہِ محرم ہی مراد ہو سکتا ہے علاوہ ازیں بقاعدۂ بلاغت بھی چاہیئے کہ اس سے فردِ کامل ہی مراد لی جائے اور فردِ کامل ان چاروں میں یہی پہلا مہینہ ہے، علامہ فخرالدین رازی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ **وفی الخبر ان اعظم الشھور عند اللّٰہ المحرم** حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محرم کو تمام مہینوں پر عظمت حاصل ہے لہٰذا قرآنِ حکیم سے محرم کی حرمت بالصراحت ثابت ہے اور قواعد علمیہ کی رُو سے تخصیص متحقق۔ پس جب ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ آیۂ کریمہ بالصراحت ماہ محرم کی حرمت پر نص قطعی ہے تو اب یہ دیکھنا ہے کہ ماہ محرم کو یہ حرمت کیوں ملی؟ وہ کون سے ایسے اعمال قبیحہ ہیں جن سے مجتنب و محترز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ اس کی حرمت برقرار رہے۔

اب چند ٹھوس حقائق پر جن کا تذکرہ آیۂ وافی ہدایہ میں کیا گیا ہے۔ غور و فکر کرکے یہ دیکھنا ہے کہ کربلا کے المیہ سے ان کا کیا تعلق ہے اور ایک عظیم القدر قربانی کا محرم کی حرمت سے کیا واسطہ ہے؟

اوّلاً: سوال کرنے والا گروہ ضرور مسلمان تھا کیونکہ کفار و مشرکین عرب کو کیا ضرورت تھی کہ وہ نبی کریمؐ سے مسئلہ حلال و حرام دریافت کریں علاوہ **وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا** (وہ تم سے برابر لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں) میں ضمائر جمع مذکر مخاطب کا مرجع کفار مطلقاً نہیں ہو سکتے۔ ماسبق و مابعد کی آیات میں بھی اسی قسم کے استفسارات کئے گئے ہیں جو صرف مسلمان ہی کر سکتے ہیں مثلاً **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ** (تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟) **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ** (تجھ سے شراب و قمار بازی کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ** (تجھ سے تیموں کے بابت سوال کرتے ہیں)

ثانیاً: سوال کرنے والے سب کے سب یا کم از کم ان میں سے کچھ ایسے لوگ ضرور تھے جنہوں

نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام کی روز افزوں قوت سے خائف ہو کر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور وقتی طور پر مولفۃ القلوب کے تحت طلقاء کے زمرے میں شامل ہو کر معافی حاصل کر لی تھی لیکن غیظ و غضب کے مارے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے اور جن کی دلی خواہش تھی کہ وقت آنے پر ماہ محرم میں قتال کر کے اس کی حرمت توڑیں۔ اسلام کی ترقی کو روکیں اور آبائی دورِ جاہلیت کی کافرانہ تہذیب کو واپس لائیں ورنہ یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی ۔۔؟ اقتضائے وقت کے تحت اگرچہ ان میں بعض موت سے ہم آغوش ہو گئے اور ان کو یہ ہوس پوری کرنے کا موقع نہ ملا تاہم وہ اپنی اولاد میں یہ تمنا وصیتاً بطور ورثہ چھوڑ گئے اور جن کو چار دن کی مہلت مل سکی انہوں نے باہم مل کر ۶۱ھ میں نواسۂ رسولؐ کے خلاف یوم عاشور قتال و جدال کی وہ سلسلہ جنبانی کی کہ خدا کی پناہ! الامان والحفیظ! فرزندِ رسولؐ، جگر گوشۂ بتولؑ کے خون سے تلواریں رنگین کیں، اٹھارہ برس کے نوجوان ہمشکل پیمبرؐ، شہزادہ علی اکبرؑ کو نیزوں سے گھائل کیا۔ عباس علمبردار کے بازو قلم کئے، قاسم کے زخم خوردہ بدن کو سمِ اسپاں سے پامال کیا۔ اصغرؑ معصوم کے گلے میں ظلم و ستم کا تیر پیوست کیا۔ الغرض مولفۃ القلوب کے تحت ہاشمی رحمتِ بے پایاں سے استفادہ کرنے والے اموی خاندان نے اولادِ رسولؐ سے جنگ بدر کے گن گن کر بدلے لئے۔ کیا یہ روزِ روشن کی طرح عیاں نہیں؟ کہ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ کے تحت مسلمانوں کی جو تمنا و آرزو پوشیدہ تھی کربلا میں یوم عاشور منصۂ شہود پر آگئی اور ملتِ اسلامیہ نے اس درندگی و بہیمیت کا مظاہرہ کیا کہ انسانیت کا سر ندامت سے جھک گیا۔

ثالثاً:۔ سوال کنندگان کی غرض و غایت تو صرف یہ دریافت کرنا تھا کہ محرم میں قتال موجبِ ثواب ہے یا باعثِ عذاب؟ جس کے جواب میں صرف "قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ" ہی کہہ دینا کافی تھا یعنی ماہ محرم میں قتال و جدال گناہ کبیرہ ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ علیم و حکیم خدا نے اس جواب کو کافی نہ سمجھا اور مزید چار اہم امور کا ذکر فرما دیا:۔

۱۔ اللہ کی راہ سے باز رکھنا۔

۲۔ کفر باللہ۔

۳۔ مسجد حرام سے روکنا۔

۴۔ اہالیان مسجد الحرام کو اس سے نکال باہر کرنا۔

چونکہ حکیم مطلق کا کوئی فعل خالی از حکمت نہیں ہوتا اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہونگے جو ماہ محرم میں صرف قتال ہی پر اکتفار نہ کرینگے بلکہ بندگان خدا کو دین اسلام سے باز رکھنے کی سعی بھی کریں گے، کفر باللہ کے مرتکب ہوں گے۔ بیت اللہ کی حرمت توڑ کر مومنین کو حج سے روکدیں گے اور اہالیان مسجد الحرام کے لئے ایسا پرخطر ماحول پیدا کردیں گے کہ وہ عین حج کے موقع پر حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے بادل ناخواستہ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ اب اگر ان چاروں امور پر انفرادی رنگ میں غور کیا جائے تو اس پیشینگوئی کا ایک ایک حرف یزیدیوں پر صادق آتا ہے۔

امر اوّل: صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ:۔ یزیدیوں نے انتہائی رعب و تشدد اور سطوت و قوت کو بروئے کار لاکر کوشش کی کہ حضرت امام حسینؑ ایک فاسق و فاجر کو دین کا قائد سمجھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں تاکہ اس طرح کفر و باطل کا غلبہ اور اسلام کے نوزائیدہ پودے کی بیخ کنی ہو جائے۔ یہ تھا آیہ مبارکہ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا مفہوم۔ لیکن دل و جانم باد فدائے تو اے حسین ابن علی علیہما السلام! تو مع اقربا و انصار کفر و الحاد کی تلاطم خیز موجوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ گیا اور باطل کی تمام منصوبہ بندیوں کا شیرازہ تتر بتر کر کے رکھ دیا۔

سر داد و نداد دست در دست یزید   حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

(خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ)

امر دوم: کُفْرٌ بِاللّٰهِ:۔ بندروں کو علمائے اسلام و بزرگان دین کا لباس پہنا کر کوچہ و بازار میں گردش کرانا اور اس طرح دین خدا کا مضحکہ اڑانا، علانیہ برسر بازار شراب نوشی و قمار بازی

کو دل لگی کا سامان سمجھنا۔ محرمات کے ساتھ نکاح جائز قرار دینا۔ حدود الٰہی کو معطل کرنا۔ خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینا۔ بر سرِ دربار یہ کہنے کی جرأت کرنا کہ "محمدؐ نے تو ہاشمیوں کی سلطنت کے قیام کا منصوبہ باندھا ہوا تھا ورنہ کہاں کی وحی اور کہاں کا فرشتہ"۔ یہ چیز تھی جس کو آیۂ مبارکہ نے کفر باللہ سے تعبیر کیا۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یزید اپنی نہاد میں بدکردار اور فطرتاً بداطوار تھا۔ علانیہ فسق و فجور کا مرتکب ہوتا تھا۔ شراب و کباب کا رسیا بھی تھا۔ رقص و سرود، شعر و شراب اور حسن و جوانی اس کی رنگیں راتوں کی کہانی تھی۔ یزید کے کردار کی واضح تصویر ملاحظہ کیجئے۔ البدایہ والنہایہ فی التاریخ الجزء الثانی ص ۲۳۵ مصنفہ ابن کثیر شامی۔

امر سوم: صَدٌّ عَنْ...... الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ :- مسجد الحرام سے باز رکھنا یعنی ماہ محرم میں حرمتِ بیت اللہ توڑنا اور مومنین کو فریضہ حج کی ادائیگی سے روک دینا۔

اس آیۂ کریمہ میں کتنی شاندار صداقت پوشیدہ ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یزیدیوں نے امام مظلومؑ کو عین موسم حج میں حج بیت اللہ سے روک دیا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب مسلمانوں نے عالی منزلت امامؑ کا مدینہ میں قیام ناممکن بنا دیا تو آپ اہلِ بیتِ اطہارؑ، مخلص احباب اور دیگر ملازمین کی معیت میں مدینہ منورہ سے عازم مکہ مکرمہ ہوئے تاکہ جائے امن میں پہنچ کر بقیہ ایامِ زندگی عبادت خداوندی میں صرف کریں۔ چند ماہ قیام تو کیا مگر امن و چین کا ایک سانس بھی لینا نصیب نہ ہوا۔ ہر وقت یہ خوف دامنگیر رہا کہ اعدائے دینِ مبین کہیں خانۂ خدا میں ہی شہید نہ کر دیں۔ جب یزید کو معلوم ہوا کہ آپ مکہ معظمہ میں قیام پذیر ہو چکے ہیں تو اس ملعون نے اپنے تیس حواریوں کو حاجیوں کے لباس میں بھیجا تاکہ نواسۂ رسولؐ کا کام تمام کر دیں۔ چنانچہ امامؑ کو خیال پیدا ہوا کہ مبادا میرے قتل سے بیت اللہ کی حرمت ٹوٹے لہٰذا حالات سے مجبور ہو کر آپ نے حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے کوفہ کی جانب روانگی اختیار کی حالانکہ کئی خیر خواہ مانع ہوئے اور ترکِ سفر پر برابر اصرار کرتے رہے۔

ان ٹھوس حقائق کی تائید میں بکثرت تاریخی شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ شیخ سلیمان القندوزی البلخی مفتیٔ اعظم قسطنطنیہ نے اپنی کتاب ینابیع المودۃ کے باب حادی الستون میں مقتل ابو مخنف سے واقعات نقل کئے ہیں چنانچہ موصوف رقمطراز ہے :۔

"وَکَانَ فِیْہِ خُرُوْجِ الحسین رضی اللّٰہ عنہ من مکۃ اِلی العِرَاق بعد ان طَافَ وَسَعیٰ و احل من احرام و جَعَلَ حجۃ عمرۃ مفردۃ لانہ لم یمکن من اتمام الحج مخافۃ ان یبطش بہ ویقع الفتنا فی الموسم فی مکۃ لان یزید ارسل مع الحجاج ثلاثین رجلا من شیاطین بنی امیۃ امرھم بقتل الحسینؑ علی کل حال"۔

(ترجمہ) " (جس دن مسلم کوفہ میں قتل ہوئے) اس ہی دن امام حسینؑ مکہ سے عراق کی طرف طوافِ خانہ کعبہ وسعی اور تحصیل تحلیل احرام وغیرہ فرما کر اپنے حج کو عمرہ سے تبدیل کرنے کے بعد روانہ ہو گئے کیونکہ اتمام حج تک آپ کا وہاں رہنا ممکن نہ تھا۔ اس سبب سے کہ آپ کو فکر دامنگیر تھی کہ آپ پر اس سے بھی زیادہ سختی کی جائے گی جس کے باعث مکہ معظمہ میں خصوصاً موسمِ حج میں فساد واقع ہوگا کیونکہ یہ امر واقعہ ہے کہ یزید نے شیاطینِ بنی امیہ میں سے تیس آدمیوں کو قافلۂ حجاج کے ساتھ صرف اس امر کے واسطے روانہ کیا تھا کہ وہ امام حسینؑ کو جس حال میں پائیں قتل کر دیں۔" (البلاغ المبین: ص ۱۷۲۰-۱۷۲۱)

اس تاریخی شہادت سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے اندر اس معصیتِ کبریٰ کے مرتکب ہونے والے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے امام عالیمقامؑ اور ان کے اہلبیتِ عظام و انصار کو حج بیت اللہ سے محروم کیا اس طرح سے جن واقعاتِ شدنی کی خبر اس آیۂ مبارکہ میں دی گئی ہے سو فی صدی درست ثابت ہوئی۔

امر چہارم : اخراج اھلہ منہ :۔ (اہالیانِ بیت اللہ کا نکال باہر کرنا)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فرزند رسولؐ مجبوراً مدینہ کی سکونت ترک کرکے جائے پناہ کی تلاش میں مکہ تشریف لے گئے پھر عین خوف و اضطراب کے عالم میں مکہ کا قیام بھی ترک

کرنا پڑا چنانچہ جب لوگوں نے امام عالیمقامؑ کو کوفیوں کی بدعہدی و غدّاری کی یاد دلا کر اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی سعی کی (گو ان میں جناب عبداللہ ابن زبیرؓ ایسے بعض حضرات صرف ظاہرداری سے کام لے رہے تھے حالانکہ وہ قلبی طور پر یقین رکھتے تھے کہ مکّہ میں امامؑ کی موجودگی ان کے مفاد کے منافی ہے) تو دوربین و دوراندیش امامؑ نے حقیقتِ حال کے چہرہ سے پردہ اٹھاکر یوں ارشاد فرمایا۔

" ثم قال الحسینؑ واللہ لان اقتل خارجاً منہا بشبر احبّ الی من ان اقتل داخلاً منہا بشبر وایم اللہ لوکنتُ فی جحر ھامۃ من ھٰذہ الھوام لاستخرجونی حتّیٰ یقضوا فی حاجتھم واللہ لیعتدن علیّ کما اعتدت الیھود فی السبت۔"

(تاریخ طبری: الجزء السادس ص: ۲۱۷-۲۲۳)

(ترجمہ) پھر امام حسینؑ نے کہا کہ قسم بخدا اگر میں ایک بالشت بھر مکہ کے باہر قتل کیا جاؤں تو وہ میرے نزدیک محبوب تر ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک بالشت اس کے اندر قتل ہوں قسم بخدا اگر میں سوراخِ مُور میں چلا جاؤنگا تب بھی مجھ کو یہ لوگ وہاں سے نکال کر اپنی خواہشِ قتل پوری کریں گے۔ قسم بخدا میرے معاملہ میں یہ لوگ اس طرح حدودِ خداوند تعالیٰ سے باہر ہوجائیں گے جس طرح یہودی سبت کے معاملہ میں ہوئے تھے۔ (البلاغ المبین ص: ۱۷۲۱)

عبداللہ ابن عباسؓ نے امام عالیمقامؑ کو سفرِ عراق ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا جس کو جناب نے قبول نہ فرمایا۔ جب ابن عباسؓ کا گزر ابن زبیرؓ کے پاس سے ہوا تو کہنے لگے "اے ابن زبیرؓ! اب تو تیری آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں"۔ اس کے بعد چند اشعار پڑھے جو تاریخ طبری۔ الجزء السادس ص ۲۱۷ پر درج ہیں اور جن کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"چنڈال چڑیا اب تو خوب عیش کر کہ تیرے لئے ساری فضا خالی ہوگئی ہے۔ خوب انڈے دے، بچے نکال اور راگ گائے جا۔ یہ حسینؑ عراق کو جاتے ہیں اور تم حجاز کو سنبھالو۔"

فرزندِ رسول اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ عبداللہ ابن زبیرؓ کے شوقِ حصولِ

خلافت کا کیا حشر ہونے والا ہے چنانچہ جب ابن زبیرؓ نے ظاہر داری کے طور پر ہچکچاتے ہوئے آپ کو ترکِ سفر کا مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا:۔

" فقال لہ الحسینؑ ان ابی حدثنی ان بھا کبشا یستحل حرمتھا فما احب ان اکون انا ذلک الکبش "۔ (تاریخ طبری۔ الجزء السادس ص ۲۱۷۔ تاریخ ابن کثیر شامی الجزء الثامن ص ۱۶۲)

(ترجمہ) "ابن زبیرؓ سے حسینؑ نے کہا کہ میرے والد بزرگوار نے فرمایا تھا کہ مکّہ میں ایک مینڈھا ذبح ہوگا جس سے مکّہ کی حرمت جائیگی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مینڈھا میں ہوں" (البلاغ المبین ص ۲۲)

عالی منزلت امامؑ کی اس گفتگو سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ نے مکّہ کے قیام کو محض اس لئے ترک کردیا کہ شہادت تو اٹل اور ناگزیر امر ہے لیکن حدودِ حرم میں شہید ہو کر بیت اللہ کی حرمت نہ توڑی جائے۔ مزید براں آپ کی دور بین نگاہوں سے اپنے جدِ بزرگوارؐ کی وہ مخصوص پیشین گوئی بھی اوجھل نہ تھی جس میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "مکّہ میں ایک مردِ قریشی دفن ہوگا جس کا نام عبداللہ ہوگا۔ اس پر عالم کے عذاب کا ایک حصہ ہوگا۔ اگر اس شخص کا گناہ تولا جائے تو دونوں جہاں کے گناہوں سے بھی زیادہ ہوگا"۔ دوسری روایت میں ہے "مکّہ میں ایک سردارِ قریش کی قبر بنے گی جس کا نام عبداللہ ہوگا۔ اس پر نصف عالم کا عذاب ہوگا"

(کنزالعمال ص ۲۴۴۔ ازالۃ الخفاء شاہ ولی اللہ ۔ ذبح عظیم سید اولاد حیدر فوق بلگرامی ص ۱۴۲)

امامؑ کو زمانہ کے رنگ، دشمن کی مخالفت و عالم فریبی سے یہ بخوبی اندازہ تھا کہ اگر آپ کا خونِ ناحق اسمٰعیلی قربان گاہ یعنی مقام منٰی پر گرایا گیا تو آپ کے فضائل و مناقب چھپانے والا اور آپ کے مراتب و مدارج گھٹانے والا فرقہ اس پیشین گوئی کا مفہوم آپ کی طرف پھیر دے گا۔ آپ کے قتل کے بعد ایک عبداللہ نہیں اگر ہزار عبداللہ مکّہ میں مدفون بھی ہوں پھر بھی خاندان امیّہ کے ہوا خواہ عبداللہ کو آپکی کنیت **ابو عبداللہ** سے تعبیر کرکے آپ کی بلند پایہ قربانی کو شہادتِ عظمٰی کے درجے سے گرا کر ایک باغی کی مجرمانہ سزا کے رنگ میں پیش کرینگے اس لئے آپ نے انتہائی عاقبت اندیشی سے کام لے کر

مکہ سے دور تر مقامِ معین (دریائے فرات کے کنارے) پر جامِ شہادت نوش کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔

رہا حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی سعی استحکامِ حکومت کا سوال۔ ہر ایک تاریخ دان پر یہ امر روشن ہے کہ امامؑ برحق حضرت علی مرتضیٰؑ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہو کر رہی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے گورنر حجاج بن یوسف کے حکم سے عین خانۂ خدا کے اندر نہایت بیدردی و سفاکی سے قتل ہوئے۔ آپ کا سر تن سے جدا کر کے مختلف شہروں میں پھرایا گیا اور آپ کی لاش کئی روز تک سُولی پر لٹکتی رہی یہاں تک کہ وہ سڑ گئی۔ (الاستیعاب ج ا۔ ص ۳۵۴، ۳۵۵۔ الطبری ج ۵۔ ص ۳۳۔۳۴ البدایہ ج ۸۔ ص ۳۳۲۔ ابن خلدون ج ۳۔ ص ۳۹۔ خلافت و ملوکیت علامہ مودودی۔ ص ۱۷۹)

فتنۂ عظیم

ماہ محرم میں معاملہ صرف قتال ہی تک محدود نہ رہا بلکہ الفتنة اکبر من القتل کے تحت ایک عظیم فتنہ کی پیشین گوئی کی گئی تھی جو ایسے درد بھرے اندوہناک مناظر کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کا محض تصوّر ہی انسان کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ وہ فتنۂ عظیم جس سے احکامِ خدا کو تہ و بالا کر دیا گیا، نہیں، وہ عبرت انگیز فتنہ، جس نے اسلام کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، نہیں، وہ درد انگیز فتنہ، جس نے دینِ الٰہی کو پامال کر دیا اور محرماتِ الٰہیہ کو توڑ کر رکھ دیا، نہیں، وہ شرانگیز فتنہ، جس سے خاندانِ نبوّت تباہ اور فاطمہ زہراؑ کا ہرا بھرا باغ تاخت و تاراج ہو کر رہ گیا۔ نہیں، بلکہ وہ المناک فتنہ، جس سے اہلبیتؑ رسالت کو اسیر، بیمار کربلا کو پا بہ زنجیر اور دخترانِ رسولؐ کو تشہیر کیا گیا۔

تنہائی کشتگان ہمہ در خاک و خوں نگر سر ہائے سروراں ہمہ بر نیزہ ہا ببیں

آں سر کہ بود بر دوش نبیؐ ملام یک نیزہ اش ز دوش مخالف جدا ببیں
یا بضعۃ الرسولؑ ز ابنِ زیاد داد کو خاکِ اہل بیتِ رسالت بباد داد
(محتشم کاشی)

اسی آیۂ زیر بحث میں بعد ازاں ارشاد ہوتا ہے کہ طاغوتی طاقتیں پوری قوت کے ساتھ کوشش کریں گی کہ تمہیں تمہارے اپنے دین سے پھیر دیں۔ ذرا تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالئے۔ ایک وسیع دعسر یعنی اسلامی سلطنت میں صرف چند حضرات ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے امیر معاویہ کے تشدد آمیز دباؤ کے باوصف محض اعلائے کلمۃ الحق کے لئے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ اپنی انتہائی بے سروسامانی اور انتہائی بے کسی و مظلومیت کے باوجود اپنے غیر متزلزل تقویٰ و کردار سے ثابت کر دیا کہ اسلام استبداد و آمریت سے کوئی مصالحت نہیں کر سکتا اور غیر شرعی نظام حکومت سے اشتراکِ عمل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کتنے حضرات ایسے تھے جو اس فتنۂ ارتداد کے مقابل چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ ارتداد کے اس تلاطم خیز طوفان میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بہ گئے اور بفحوائے آیۂ کریمہ "فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" جہنم کا ایندھن بن گئے۔

عقوبتِ گناہ

قدرت نے عقوبت و عذاب کا سلسلہ بھی گناہ کے مطابق ہی رکھا ہے۔ جس قسم کی برائی کی جائے گی اس کے مثل سزا بھی ملے گی چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ الانعام ۱۶۰

(ترجمہ) جو شخص فعلِ بد کرے گا اس کے مانند ہی اس کو بدلہ دیا جائیگا ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا

فتنۂ عظیم بپا کرنے والے مجرمین کی سزا کے لئے قرآنِ حکیم نے جو طریقِ عقاب تجویز کیا ہے

وہ بھی کچھ کم عبرت خیز نہیں۔ زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے :-

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝ إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ۝ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝ (المزمل ۱۱-۱۳)

(ترجمہ) اور مجھے ان جھٹلانے والے صاحبانِ نعمت سے بدلہ لینے کے لئے چھوڑ دو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دو۔ بیشک ہمارے پاس بھاری بھاری بیڑیاں بھی ہیں اور جلانے والی آگ بھی، گلے میں پھنسنے والا کھانا بھی اور دردناک عذاب بھی"

بیگناہ اہلبیتِ رسولؐ کو ظالموں نے رسن بستہ و پابہ زنجیر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک مقیّد و اسیر پھرایا۔ قدرت نے بھی ان کے گناہ کے مطابق وزنی بیڑیوں کی سزا تجویز کر رکھی ہے۔ خیامِ اہلبیتِ اطہارؑ کو نذرِ آتش کیا گیا جس کی پاداش میں جہنم کی شعلہ زن آگ ان کو بھسم کرنے کے لئے تیار ہے۔ تین روز کے بھوکے اور پیاسے گلوئے پاک پر خنجرِ آبدار چلایا گیا اور العطش کی پکار پر زبانِ معصوم میں نوکدار تیر پیوست کیا گیا۔ قدرت نے ظالم مجرمین کے لئے گلے میں اٹکنے والا طعام اور پینے کے لئے گرم پانی (حمیم) کا اہتمام کیا ہے۔ بے گناہوں کے جسموں کو تیروں اور نیزوں سے چھلنی کرنے اور شہداء کے مبارک اجسام کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کرنے والوں کو عذابِ دردناک کی بشارت دی گئی ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ؕ

باب دوم

ذلک من انباء الغیب نوحیہ الیک وما کنت لدیہم اذ اجمعوا امرہم وہم یمکرون ۝

غیب کی خبروں میں سے یہ وہ ہیں جو ہم
تمہیں وحی کے ذریعے بھیجتے ہیں....

(یوسف ۱۰۲)

شہادتِ عظمیٰ کی پیشین گوئیاں

اہمیّت:۔ کفارۂ گناہ کے لئے قربانی کو خاص اہمیّت حاصل ہے۔ اخلاقی و روحانی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان مالی اور جانی قربانی پیش کرے۔ پھر ایسی عظیم الشان قربانی کا تذکرہ جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر رہے اور جو انسانیت کو انتہائی معراجِ ترقی پر پہنچانے کے لئے اسوۂ حسنہ کا کام دے لازماً بطور پیشین گوئی الہامی کتابوں میں موجود ہونا چاہئے تھا تاکہ آنے والی نسلیں اس عظیم الشان "ذبیح موعود" کی معرفت حاصل کرسکیں اس کے لائحۂ عمل کو اپنے لئے مشعلِ ہدایت بنائیں۔ اس کے بہترین نمونہ کی تقلید کرکے دنیا میں نیکی کی نشر و اشاعت کریں اور فسق و فجور سے مجتنب رہ کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مقدس فریضہ سرانجام دیتی رہیں۔ دنیا کے ہر بلند مرتبت مصلح اور ریفارمر کے متعلق خواہ وہ نبی ہو یا امام پیشین گوئی نہایت ہی کارآمد ثابت ہوتی ہے تاکہ عوام ان کے سوانح حیات پر غور کرکے پیشین گوئی کے حقیقی مصداق کا اندازہ کرسکیں تاکہ مدعیانِ کاذب کفر و ضلالت نہ پھیلا سکیں۔ قرآنِ حکیم نے خود اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ نبی امیؐ کا ذکرِ خیر صحائف انبیاء میں موجود ہے:۔

۱۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ " (الاعراف: ۱۵۷)

"وہ لوگ جو رسولؐ کی پیروی کرتے یعنی اس نبی امیؐ کی جس کا ذکر وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں"۔

۲۔ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ (الاحقاف: ۱۰)

"بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ (حضرت موسیٰؑ) نے اپنے مثیل پر گواہی دی ہے"۔

جن حضرات کو قرآنِ حکیم کے اس دعویٰ کی صداقت کا امتحان مطلوب ہو وہ بائیبل کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں:۔

۱۔" میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں (بنی اسمٰعیل) میں سے تیری مانند (مثیلِ موسیٰؑ)

ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ (استثناء ۱۸: ۱۸-۱۹)

مزید ملاحظہ فرمائیے :-

۲ ـ چنانچہ موسیٰؑ نے کہا خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ سا ایک نبی پیدا کرے گا۔ جو کچھ وہ تم سے کہے اس کی سننا اور یوں ہوگا کہ جو شخص اس نبی کی نہ سنے گا وہ امّت میں سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔" (اعمال ۳: ۲۲-۲۳)

اسی سلسلہ میں اطمینانِ قلب کے لئے ملاحظہ فرمائیے :-

زبور ۱۱۸: ۲۲ ـ انجیل متی ۲۱: ۴۳ ـ انجیل یوحنا ۱: ۲۱ ـ توریت استثنا ۱۸: ۱۵

پطرس ۲: ۷ ـ مکاشفہ ۱۹: ۱۱-۱۶ ـ

چونکہ امام عالیمقامؑ کی عظیم الشان قربانی نے آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دینا تھا، اس لئے لازماً اس کا ذکر الہامی کتابوں میں موجود ہونا چاہئے تھا چنانچہ اس ہولناک واقعہ کی خبر تقریباً تمام انبیائے کرامؑ کو پہنچائی گئی انہوں نے اس قیامت خیز سانحہ پر مکمل خلوص و ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ اکثر و بیشتر الہامی کتابیں اس ذکر خیر سے بھرپور ہیں۔

سرکارِ دوعالمؐ کی پیشین گوئیاں

جناب امام ہمامؑ کی قربانی کا تذکرہ صرف الہامی کتابوں تک ہی محدود نہیں بلکہ احادیث و تواریخ کی کتابیں بھی اس قسم کی پیشین گوئیوں سے پُر ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ "سرالشہادتین" میں لکھتے ہیں کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے :-

۱۔ اَوْحَی اللّٰہ تعالیٰ اِلیٰ محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اِنِّی قَتَلتُ بِیَحْیٰیؑ ابن زکریّا سَبْعِیْنَ اَلْفًا وَ اِنِّی قَاتِلٌ بِابنِ بِنْتِک سَبْعِیْنَ اَلْفًا وَ سَبْعِیْنَ اَلْفًا۔

(ترجمہ) خداوند عالم نے جناب رسالتمآبؐ کے پاس وحی بھیجی کہ میں نے یحییٰ بن زکریاؑ کے انتقام میں ستر ہزار آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور تیرے نواسہ کے انتقام میں ستر ہزار و ستر ہزار (ایک لاکھ چالیس ہزار) آدمیوں کو قتل کروں گا۔

اسی واقعہ کے لئے دیکھئے :- (۱) صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص ۱۹۔ (۲) مستدرک علی الصحیحین الحاکم الجزء الثالث ص ۱۷۸۔ (۳) ینابیع المودۃ شیخ سلیمان مفتیٔ اعظم قسطنطنیہ مطبوعہ استنبول ۱۳۰۱ھ ص ۳۵۷۔

۲۔ شیخ ابوالحسن بن محمد ابی وردی الشافعی اپنی کتاب اعلام النبوۃ میں حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول خداؐ کو وحی آرہی تھی، اسی دوران امام حسینؑ آئے اور جناب رسولِ خداؐ کے کندھوں سے لپٹ کر کھیلنے لگے۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا: "اے محمدؐ! آپ کے بعد آپ کی امت آپ کے اس بیٹے کو قتل کرے گی" اور مٹی دکھا کر کہا کہ "یہ وہاں کی زمین کی مٹی ہے۔ اس زمین کا نام **طف** ہے۔ وہاں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت عمارؓ تھے۔ آپ اس وقت رو رہے تھے۔ لوگوں نے سببِ گریہ پوچھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا بیٹا حسینؑ ارضِ طف میں قتل کیا جائیگا اور یہ وہاں کی مٹی ہے یہی روایت ابن سعد اور طبرانی نے حضرت عائشہؓ سے بیان کی ہے۔ (صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی ص ۱۱۵۔ ینابیع المودۃ شیخ سلیمان مفتیٔ اعظم ص ۳۱۸-۳۱۹۔

۳۔ جناب عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول یقتل الحسینؑ بارض بابل۔ (تاریخ ابن کثیر شامی الجزء الثامن ص ۱۹۳۰)

(ترجمہ) سنا ہے میں نے جناب رسولخداؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے کہ حسینؑ ارض بابل میں قتل کیا جائے گا۔

۴۔ امام طبرانی اور ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔ "عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ

علیہ وسلم قال اخبرنی جبرئیل الحسینؑ یقتل بارض الطف وجآء فی ھذہٖ التربۃ واخبرنی ان فیھا مضجعہ"۔

(ترجمہ) ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھے خبردی ہے کہ میرا بیٹا حسینؑ طف کی زمین پر مارا جائے گا اور یہ مٹی مجھ کو لاکر دکھلائی گئی ہے کہ اس میں ان کی قبر ہوگی۔

۵۔ امام ترمذی اپنی صحیح میں، امام احمد حنبل اپنی مسند میں اور امام بیہقی اپنی سنن میں تحریر کرتے ہیں: "عن ابن عباسؓ قالَ خَرَجَ رَسُولُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نِصفَ النَّہارِ وَ اَخَذَ بیدہٖ قارورۃ فِیھَا دم ملتقط فَسَأَلہُ فَقَالَ دَمُ الحُسَیْنِ عَلَیْہِ السلام وَاَصْحَابِہٖ لَم ازل اتبعہ منذ الیوم فَنَظَرُوا فَوَجَدُوا قَدْ قُتِل ذَالِکَ الیَوم"۔

(ترجمہ) ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ ایک روز جناب رسولخداؐ گھر سے باہر تشریف لائے۔ ہاتھ میں ایک شیشی تھی۔ اس میں مٹی ملا ہوا خون تھا حضورؐ سے استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ حسینؑ اور اس کے دوستوں کا خون ہے۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ میں اس کو دیکھا کرتا تھا۔ ایک دن اس کو دیکھا کہ مٹی بالکل خون ہوگئی۔ پس معلوم ہوا کہ حسینؑ شہید ہو گئے۔

۶۔ حافظ ابونعیم، امام بیہقی و اسحق ابن راہویہ لکھتے ہیں کہ ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ ایک روز جناب رسولخداؐ خواب استراحت سے اٹھے۔ ان کے دست مبارک میں سرخ مٹی تھی جس کے وہ بوسے لے رہے تھے۔ میں نے عرض کیا یا حضرت! یہ مٹی کیسی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ حسینؑ عراق کی سرزمین میں شہید کئے جائیں گے یہ وہیں کی مٹی ہے۔ (ذبح عظیم۔ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی۔ ص ۱۲۳)

۷۔ منتخب کنزالعمال میں علی متقی روایت کرتے ہیں کہ طبرانی نے الکبیر میں ام سلمہؓ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ ایک دن جناب رسولخداؐ میرے مکان میں تشریف رکھتے تھے اور فرمایا کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ میں دروازے پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں حسینؑ آئے اور اندر داخل

ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے جناب رسولخداؐ کے گریہ وزاری کی آواز سنی۔ میں جب اندر گئی تو دیکھا کہ حسینؑ آنحضرتؐ کی گود میں ہیں اور آپ ان کو پیار کر رہے ہیں اور رو رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کے اندر آنے کی خبر نہ ہوئی ورنہ اندر نہ آنے دیتی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی جبرئیلؑ میرے پاس تھے انہوں نے مجھے خبر دی کہ میری امت زمین کربلا پر میرے فرزند حسینؑ کو قتل کرے گی اور یہ مٹی بھی وہاں کی دکھائی۔ عقد الفرید میں بھی یہ روایت ہے۔ (صواعق محرقہ۔ ص ۱۱۵ - ینابیع المودۃ۔ ص ۳۱۸-۳۱۹)

حضرت ام سلمہؓ کی اس روایت کو حضرت انسؓ نے بھی نقل کیا ہے جس کو بغوی نے اپنے معجم میں بیان کیا ہے وہاں جبرئیلؑ کی بجائے دوسرا فرشتہ ہے۔

۸۔ ام الفضل بنت الحارث زوجہ عباس کہتی ہیں کہ ایک دن میں جناب رسولخداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حسینؑ کو ان کی خدمت میں دے دیا۔ اتنے میں آنحضرتؐ پر آثار وحی ظاہر ہوئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا ابھی جبرئیلؑ میرے پاس تھے انہوں نے مجھے خبر دی کہ میرے اس فرزند حسینؑ کو میری امت قتل کرے گی اور مجھے اس زمین کی مٹی بھی دی ہے۔

۹۔ صواعق محرقہ، تذکرہ امام قرطبی اور سر الشہادتین میں امام بغوی و ابن السکن بسندہ اور ابن عساکر و ابن نعیم و ماوردی کے اسناد سے لکھا ہے:-

"عن انس ابن الحارث ابن منبیه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان ابنی هذا یعنی الحسین یقتل بارض من العراق یقال لها کربلا فمن ادرکه منکم اولیشهده فلینصره۔"

(ترجمہ) انس ابن الحارث ابن منبیہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے سنا کہ میرا فرزند حسینؑ سرزمین عراق میں مقام کربلا پر قتل کیا جائیگا۔ تم میں سے جو شخص وہ وقت پائے اسے چاہئے کہ حسینؑ کی نصرت کرے۔"

بخاری نے اپنی تاریخ میں بغوی و ابن سکن نے انسؓ ابن الحارث سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسولخداؐ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ میرا فرزند حسینؑ ارضِ کربلا مین شہید کیا جائیگا۔ پس تم میں سے جو کوئی اس زمانہ میں ہو اسے چاہیے کہ حسینؑ کی مدد کرے چنانچہ انس بن الحارث کربلا میں امام حسینؑ کی نصرت میں شہید ہوئے۔ (ینابیع المودۃ مطبوعہ اسلامبول ص ۳۱۸ - ۳۳۲ ۔ صواعق محرقہ ص ۱۱۵ ۔ ذبح عظیم ص ۱۲۵)

اس مقام پر موزوں نظر آتا ہے کہ مذکورہ بالا راوئ حدیث انس بن الحارث کا تعارف کرادیا جائے تاکہ مخبرِ صادقؐ کی پیشین گوئی کی جامعیت کے علاوہ مردِ مومن کی جاں نثاری و فداکاری کے ذکرِ خیر سے ہماری قوتِ ایمان میں بالیدگی پیدا ہو جائے۔

انس بن حارث اسدی :- اصحابِ رسولؐ میں سے حدیث کے مشہور راوی تھے۔ پیغمبرؐ کی زبانی شہادتِ حسینؑ کا تذکرہ سن کر منتظر رہنے لگے کہ فداکاری کا موقع کب نصیب ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا کے وقت بہت کبیر السن و ضعیف العمر ہو چکے تھے مگر جذبۂ قربانی و جوشِ شہادت ابھی تک جواں تھا۔ خدمتِ امامؑ میں حاضر ہو کر اذنِ جہاد طلب کیا۔ جہاد کی اجازت مرحمت ہونے پر عمامہ سے اپنی کمر کس لی اور اپنی بھوؤں کو جو آنکھوں پر لٹک آئی تھیں اونچا کرکے رومال سے باندھا۔ امامؑ ان کی خمیدہ کمر، ضعفِ پیری اور جوشِ شہادت کو دیکھ کر رو رہے تھے اور دعائے خیر دے رہے تھے "شکر اللہ یا شیخ"۔ اے بوڑھے مجاہد! خدا تیرے حسنِ عمل کی قدر کرے۔ بوڑھا مجاہد دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ تعدادِ کثیر کو جہنم داخل کیا اور انجام کار درجۂ شہادت پر فائز ہوا۔

جنابِ رسالتمآبؐ کی صحابیت و ہم نشینی کا یہ اثر تھا۔ اللہ! اللہ! آنحضرتؐ کی بیان کردہ پیشین گوئی پر کس قدر یقینِ محکم تھا۔

اپنے سابقہ سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید ایک اقتباس ہدیہ ناظرین ہے۔ امام احمد ابویعلی، ابن سعد اور امام طبرانی نے حضرت علیؑ اور طبرانی نے دوسرے طریق باسناد امام ہانی اور

اور انس بن مالک اور ابن عساکر نے حضرت ام سلمہؓ اور ابن سعد نے حضرت عائشہؓ اور ابو یعلی نے بار دگر ام المومنین زینبؓ بنتِ جحش اور ابن عساکر نے بار ثانی ام الفضل زوجہ عباس کی اسناد سے تحریر فرمایا ہے۔

۱۰۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان عندی جبرائیل فاخبرنی ان الحسین یقتل بشاطئ الفرات وقال ھل لک ان اشمک من تربۃ قلت نعم فمد یدہ فاخذ قبضۃ من تراب فاعطانیہا فلم املک عینی ان فاضتا۔

(ترجمہ) آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ ابھی ابھی میرے پاس سے گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے بیان کیا حسینؑ دریائے **فرات** پر قتل ہوں گے اور یہ بھی کہا "اگر کہیے تو وہاں کی خاک آپ کو سونگھا دوں"۔ میں نے کہا "ہاں"۔ پس جبرئیل نے ہاتھ بڑھا کر ایک مٹھی خاک مجھے دی۔ اس پر مجھ سے ضبط گریہ نہ ہو سکا۔ (ذبح عظیم ص ۱۲۴)

کیا مذکورہ بالا احادیث "ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ" (سورہ یوسف ۱۰۲) کی عملی تفسیر تو نہیں؟ بخوفِ طوالت مذکورہ بالا چند احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر تمام مستند و متواتر احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو ہماری موجودہ تالیف اس بار گراں کی متحمل نہیں ہو سکے گی لہٰذا مزید معلومات کے لئے قارئین کرام بذاتِ خود کتب محولہ بالا کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔

حضرت علی مرتضیٰؑ کی پیشین گوئیاں

جناب علی مرتضیٰؑ نے بھی بارہا لوگوں کو شہادتِ حسینؑ کی خبر دی۔ چنانچہ سر الشہادتین میں شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رقم طراز ہیں:

قال اخرج ابونعیم عن یحیی الحضرمی انہ سار مع علیؑ الی صفین فلما حاذی نینوی نادی صبرا اباعبداللہ بشط الفرات۔ قلت ماذا؟ قال ان النبی صلی اللہ علیہ

وسلم قالَ حدثنی جبرئیل ان الحسین یقتل بشط الفرات واخرج ایضاً عن اصبغ بن نباتة قال اتینا مع علی علیہ السلام علی موضع قبر الحسین فقال ھٰھنا مناخ رکابھم وموضع رحالھم ومھراق دماءھم فئةٌ من آلِ محمدؐ تقتلون بھٰذہِ العرصة تبکی علیھم السمآء والارض ۔

(ترجمہ) بروایت ابونعیم یحییٰ الحضرمی سے مروی ہے کہ میں سفر صفین میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھا۔ جب ہم لوگ نینویٰ کے برابر پہنچے تو انہوں نے ندا کی کہ اے اباعبداللہ! شط الفرات پر صبر کرنا۔ میں نے پوچھا "آپ نے کیا فرمایا؟" حضرت علیؑ نے کہا کہ جناب رسولخداؐ نے بواسطہ جبرئیلؑ خبر دی ہے کہ میرا فرزند حسینؑ فرات کے کنارے قتل کیا جائیگا نیز کتاب موصوفہ میں بروایت حافظ ابونعیم، اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے کہ جب ہم لوگ حضرت علیؑ کے ساتھ مشہدِ حسینؑ پر پہنچے تو حضرتؑ نے فرمایا کہ یہ شہیدوں کے اونٹ بندھنے اور کجاوے رکھنے کی جگہ ہے، یہ شہیدوں کے خون گرنے کا مقام ہے۔ ایک گروہ آلِ محمدؐ کا یہیں شہید ہوگا جس پر زمین و آسمان روئیں گے۔ (تاریخ احمدی ص ۱۹۰-۱۹۱)

اس طرح کی ایک اور روایت صواعق محرقہ میں بھی ہے :۔

"قال اخرج ابن سعد عن الشعبی قالَ مر علی رضی اللہ عنہ بکربلا عند مسیرہ الی صفین و حاذیٰ نینویٰ (قریة علی الفرات) فوقف وسأل عن اسم ھذہ الارض فقیل کربلاء فبکیٰ حتیٰ بل الارض من دموعہ ثم قال دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو یبکی۔ فقلتُ ما یبکیك؟ قال کان عندی جبرئیل انفا و اخبرنی ان ولدی الحسینؑ یقتل بشاطئ الفرات بموضع یقال لہٗ کربلاء۔"

(ترجمہ) بروایت ابن سعد، شعبی سے مروی ہے کہ جب حضرت علیؑ صفین کو جاتے ہوئے کربلا میں پہنچے اور نینوا کے مقابل ہوئے تو ٹھہر کر پوچھا کہ اس مقام کا کیا نام ہے۔ لوگوں نے کہا "کربلا" یہ سن کر آپ رونے لگے اور اتنا روئے کہ زمین آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ بعد ازاں

آپ نے کہا کہ ایک دن میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو روتا ہوا پا کر سببِ گریہ دریافت کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی جبریلؑ نے آکر مجھے خبر دی ہے کہ میرا لختِ جگر حسینؑ کربلا میں فرات کے کنارے شہید ہوگا۔" (تاریخ احمدی ص: ۱۹۱)

امرِ شدنی کا علمِ کامل

ذیل میں جناب قائم الملت مولانا سید قائم مہدی صاحب قبلہ امام جماعت ریاست عالیہ محمود آباد کی تقریر کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو آپ نے سات محرم الحرام کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر فرمائی جس کو معاصر محترم سرفراز لکھنو نے شائع کیا تھا۔ نیز اخبار رضا کار لاہور نے ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء کے پرچہ میں بحوالہ سرفراز لکھنو اس کی اشاعت کی۔ یہی واقعہ من وعن روضۃ الاحباب میں بھی درج ہے جس کو تاریخ احمدی ص ۲۹۷-۲۹۸ پر نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے صاف عیاں ہے کہ اہل بیتؑ اطہار کے اکثر افراد کو واقعہ ہائلہ کربلا کے وقوع پذیر ہونے سے بہت عرصہ پہلے مخبر صادقؐ کی معرفت یہ علم ہو چکا تھا کہ آلِ محمدؐ کو ریگ زار کربلا میں، حق و باطل کی آویزش کے سلسلہ میں عظیم الشان قربانی پیش کرنا ہوگی۔ چنانچہ آلِ عباؑ کے رکن چہارم حضرت امام حسنؑ نے اپنے فرزندِ ارجمند حضرت قاسمؑ کو بطور وصیت ایک تعویذ عطا کیا تھا جس کی مندرجہ ذیل تفصیل ہمارے مدعا پر مکمل روشنی ڈالتی ہے:۔

"جب قاسم بن حسنؑ کے مرنے اور چچا پر نثار ہونے کی باری آئی تو عجب دل ہلا دینے والا سماں تھا۔ حسینؑ اپنے بھتیجے کو لڑنے مرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ قاسمؑ خیمے کے ایک گوشے میں بیٹھے گویا اپنی بدقسمتی پر اشک فشانی کر رہے تھے کہ طائرِ فکر نے پرواز کی اور ناخنِ تقدیر عقدہ کشائی کا باعث بنا۔ ذہنِ رسا نے مدد کی۔ قوی حافظہ نے مشکل حل کی یاد آیا۔ مسموم باپ نے، مجسمۂ اخلاق پدر نے بارگاہِ خداوندی میں جاتے وقت فرمایا تھا۔ "اے قاسم! میں تو دنیا سے جاتا ہوں تم اس تعویذ کو اپنے بازو پر سے کھول کر اس وقت

دیکھنا جب تمہارے چچا حسینؑ مصائب کی فوجوں میں، دشواریوں کے لشکروں میں چاروں طرف سے گھر گئے ہوں۔ قاسمؑ نے جلدی جلدی تعویذ کھولا، گوہرِ مقصود ملنے کی تمنا میں شمعِ نگاہ سے جستجو کی۔ دیکھا کہ مظلوم و مسموم باپ نے لکھا تھا کہ اے قاسم! جب حسینؑ کربلا کے میدان میں مجبور و بیکس بنا دیئے جائیں، دشمن قتل پر آمادہ ہوں تو میری بجائے تم اپنی جان میرے بھائی پر فدا کرنا۔ اب تو قاسمؑ کو امید بر آنے کا وسیلہ مل گیا۔ خوشی کی سرخی گورے گورے رخساروں پر جھلکنے لگی۔ آنسوؤں کا مینہ تھم گیا۔ رگوں میں خونِ شجاعت دوڑنے لگا۔ دوڑتے ہوئے چچا کی خدمت میں آئے۔ چچا اب تو مرنے کی اجازت دیجئے۔ دیکھئے تو میرے باپ اور آپ کے بڑے بھائی کی وصیّت بھی یہی ہے۔ اب حسینؑ مجبور ہوئے اور شاہزادہ قاسمؑ اپنے باپ کی وصیّت پوری کرنے چلے۔"

اہلِ بیتؑ رسالت کا تو کیا کہنا۔ وہ تو بقولِ رسولؐ، حجّتِ خدا، معدنِ رسالت اور بابِ امن ہیں جن کے فضائل و مناقب لاتعداد ہیں۔ انہیں تو واقعۂ کربلا کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ان واقعاتِ شدنی کا علمِ کامل عطا ہو چکا تھا۔ عام مسلمانوں میں بھی اکثر ایسے لوگ تھے جو جنابِ رسالتمآبؐ و کتبِ سماویہ کی پیشین گوئیوں کی وجہ سے مقامِ کربلا کو **ذبحِ موعود** کی قتل گاہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ مورخ ابنِ اثیر نے تاریخ کامل میں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے:۔

"قالَ راس الجالوت ما مررت بکربلا و انا ارکض دابتی حتیّٰ اخلف امکان لا نا کنا نتحدث ان ولا نبی یقتل بذالک المکان فلما قتل الحسین امنت فکنت سیر ولا ارکض۔"

(ترجمہ) راس الجالوت سے روایت ہے کہ میں جب کبھی کربلا سے ہوکر گزرتا تھا تو گھوڑے کو جلد اس سرزمین سے نکال کرلے جاتا تھا کیونکہ ہم میں مشہور تھا کہ زمینِ کربلا ایک نبی زادہ قتل ہوگا لیکن واقعۂ شہادتِ امام حسینؑ کے بعد وہ خیال جاتا رہا اور میں نے زمینِ کربلا سے گزرتے وقت

گھوڑے کو بھگا نا چھوڑ دیا۔ (تاریخ احمدی۔ ص ۳۱۹)

امام ؑ کی انجامِ سفر سے آگاہی

فی الحقیقت جنابِ حسینؑ پیش آنے والے واقعات حضرت مخبرِ صادقؐ کی معرفت سُن چکے تھے کہ کرب و بلا کے مقام پر "تشنہ دہن" مع اہلبیتِ رسالت انتہائی بیکسی و مظلومیت کی حالت میں درجۂ شہادت پر فائز ہونا آپ کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ آپ اپنے جدِ امجدؐ کو واقعی نبیٔ برحق مانتے تھے۔ ارشاداتِ نبوی پر آپ کو ایمانِ کامل و یقینِ محکم تھا۔ امامؑ اپنی شہادت کا مفہوم و مقصد بخوبی سمجھتے تھے اس لئے آپ نے دیدہ و دانستہ تحفظِ ناموسِ ملت و بقائے اسلام کی خاطر یہ مہتم بالشان قربانی پیش کی۔ ہم اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں چند مستند حوالے ذیل نقل کرتے ہیں:۔

ملّا حسین واعظ کاشفی روضۃ الشہداء میں لکھتے ہیں کہ یزید کا حکم ملنے پر ولید حاکمِ مدینہ نے حضرتِ حسینؑ سے بیعتِ یزید کا مطالبہ کیا۔ امامؑ کے انکار پر ولید نے مروان کے ایماء سے یزید کو حالات سے باخبر کیا۔ یزید نے مطلع ہو کر بحالتِ غضب ولید کو فرمان بھیجا کہ ابنِ زبیر کی فکر نہ کرو، کیونکہ وہ بھاگ کر میرے غضب سے نہیں بچ سکتا۔ البتہ حسینؑ ابن علیؑ کا سر جواب نامہ کے ساتھ میرے پاس بھیجدو اور میری عنایات کے امیدوار رہو۔ تمہیں منصبِ عالی عطا ہوگا۔ جب امامِ مظلومؑ کو ان حالات سے آگاہی ہوئی تو شام تک آپ نے صبر فرمایا۔ رات کے وقت روضۂ رسولؐ پر جاکر بعدِ سلام عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں آپ کا نواسہ ہوں اور وہ شخص ہوں جس کی رعایت کے باب میں آپؐ نے امت کو وصیت فرمائی تھی لیکن لوگوں نے اس وصیت کو کالعدم سمجھا اور مجھے ضائع و محروم کردیا۔ اس قسم کی باتیں کہہ کر امامِ حسینؑ بہت روئے اور وہیں رات بھر عبادت میں مشغول رہے۔ جب صبح نمودار ہوئی تو بیت الشرف میں واپس تشریف لائے۔ زاں بعد ملّا حسین واعظ کاشفی تحریر فرماتے ہیں:۔

"شبِ دیگر بر سرِ تربتِ مقدس و مشہدِ معطر و منور آنحضرتؐ حاضر شد۔ بعد از ادائے مناجات در رفعِ حاجات گریاں گریاں سر خود را بر قبرِ اقدس آں سرورؐ نہاد و بخواب رفت۔ چناں دید کہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم با فوج عظیم از ملائکہ ظاہر گشت و سرِ حسینؑ را باسینۂ خود منضم ساختہ بر میان دوچشمش بوسہ داد و گفت۔ اے حسینؑ! گویا مے بینم کہ عنقریب امتِ من در کربلا ترا بکشند و تو در آں حالت تشنہ باشی و ترا آب نہ دہند۔"

(ترجمہ) دوسری رات کو پھر روضۂ مقدسہ پر حاضر ہوکر بعد مناجات بچشم گریاں قبرِ مبارک پر سر رکھ کر سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ رسولِ مقبولؐ نے مع جماعت ملائکہ تشریف لاکر امام حسینؑ کا سر اپنے سینے پر رکھا اور پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا۔ اے فرزند! میں دیکھتا ہوں کہ عنقریب میری امت تجھ کو بلاکر قتل کرے گی۔ تو اس وقت پیاسا ہوگا مگر وہ لوگ تجھے پانی نہ دیں گے۔" (تاریخ احمدی ص: ۲۴۱)

روضۃ الاحباب میں ہے کہ امام حسینؑ خواب سے بیدار ہوکر بحزن و ملال دولت سرا میں تشریف لے گئے اور جب آپ کے اقربا و موالی نے خواب کا واقعہ سنا تو اس قدر مغموم ہوئے کہ اس وقت مشرق سے مغرب تک ان سے زیادہ غمگین کوئی نہ تھا۔ (تاریخ احمدی ص ۲۴۱)۔

امامؑ سے خواب کا واقعہ سن کر اہلبیتِ اطہارؑ کے تمام افراد کا انتہائی متاسف و محزون ہونا ایک فطری امر تھا۔ انہیں قطعی یقین ہو چکا تھا کہ نوشتۂ تقدیر اٹل و ناگزیر ہے۔ اسی طرح مقتل ابو مخنف میں خواب کا ایک واقعہ درج ہے کہ جب امام حسینؑ مدینہ سے نکلے تو اولاً قبرِ رسولؐ پر حاضر ہوئے اور بعد گریۂ بسیار فرمانے لگے۔" بابی انت وامی یا رسول اللہ! آپ کے جوار سے مجبوراً نکل رہا ہوں۔ میرا آخری سلام قبول ہو۔" ناگہاں آپ پر نیند کا اثر طاری ہوا۔ آپ نے خواب میں جنابِ رسالتمآبؐ کو یہ ارشاد فرماتے سنا:۔

یا بنی قد لحق بی ابواک فعجل بالقدوم الینا واعلم یا بنی ان لک فی الجنۃ درجۃ مخشاۃ بنور اللہ فلست تنالہا الا بالشہادۃ۔"

(ترجمہ) "اے فرزند! تمہارے والدین میرے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اب تم بھی آنے میں جلدی کرو تمہارے لئے جنت میں ایک نورانی درجہ تیار ہے لیکن جب تک رتبۂ شہادت نہ حاصل کر لوگے اس کو نہیں پا سکتے۔" (تاریخ احمدی ص: ۲۴۲)

تاریخ ابن جریر طبری میں ہے کہ مدینہ سے روانگی کے وقت بعض غمخواروں نے عرض کیا کہ اگر شارع عام چھوڑ کر اس راہ پر جائیں جس پر عبداللہ ابن زبیرؓ گئے ہیں تو مخالفین بصورت تعاقب آپ کو نہ پاسکیں گے۔ آپ فرمانے لگے :- لا واللّٰہ لا افارقہ حتّٰی یقضی اللّٰہ ماھو احب الیہ نہیں قسم بخدا۔ میں شارعِ عام کو نہ چھوڑوں گا تا اینکہ خدا اس امر کو پورا کرے جو اس کے نزدیک محبوب تر ہے (تاریخ احمدی ص: ۲۴۲)

اسی سلسلہ میں مولانا ابوالکلام کی شہادت ملاحظہ فرمائیے :-

قصر بنی مقاتل نامی مقام سے کوچ کرتے وقت آپ اونگھ گئے پھر چونک کر بآوازِ بلند کہنے لگے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" تین مرتبہ یہی فرمایا۔ آپؑ کے صاحبزادے علی اکبرؑ نے عرض کیا یہ "اِنّا للّٰہ اور الحمدُ للّٰہ کیوں ؟" فرمایا "جانِ پدر! ابھی اونگھ گیا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوار کہتا چلا جا رہا ہے۔ لوگ چلتے ہیں اور موت ان کے ساتھ چلتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہماری موت کی خبر ہے جو ہمیں سنائی جا رہی ہے۔" علی اکبرؑ نے کہا۔ "کیا ہم حق پر نہیں ؟" فرمایا "بیشک ہم حق پر ہیں۔" اس پر وہ بے اختیار پکار اٹھے۔ "اگر ہم حق پر ہیں تو پھر موت کی کوئی پرواہ نہیں۔" (داستان کربلا نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن ص ۵۲)

اسی واقعہ کو تاریخ کامل ابن اثیر نے اس طرح بیان کیا ہے۔

یا بنی انی خفقت خفقۃ فعن لی فارس علی فرس فقال القوم یسیرون والمنایا تسیر فعلمتُ اَنَّ انفسنا نعیت الینا۔"

(ترجمہ) امام حسینؑ نے ارشاد فرمایا کہ اے فرزند مجھے ابھی نیند آگئی۔ میں نے خواب میں ایک اسپ سوار دیکھا جو یہ کہہ رہا تھا کہ لوگ چلے جا رہے ہیں اور موت ان کی طرف چلی آرہی ہے

اس سے مجھے معلوم ہوا کہ ہم کو ہماری خبرِ مرگ پہنچائی جارہی ہے۔" (تاریخ احمدی۔ ص ۲۶۵)

مزید شہادت کے لئے حبیب السیر سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے :۔

"کہ چوں آں شہسوارِ فضائے امامت بہ کربلا رسید، اسپ آنحضرتؑ از رفتار باز ایستاد۔ امام حسینؑ پرسید کہ ایں زمین چہ نام دارد؟ شخصے گفت: "ماریہ" فرمود کہ شاید نام دیگر داشتہ باشد۔ گفتند: "آرے۔ ایں موضع را **کربلا** نیز مے گویند۔" امام حسینؑ گفت: "ایں زمینِ کرب وبلا است و مکانِ ریختن خونہائے ما است۔" و ہم آنجا فرود آمدہ فرمود تا خیام را برافراشتند۔ (تاریخ احمدی ص ۲۶۶)

(ترجمہ) جب امام حسینؑ صحرائے کربلا میں پہنچے تو ان کا گھوڑا چلنے سے رکا۔ آپ نے پوچھا کہ اس مقام کا کیا نام ہے؟ کہا کہ 'ماریہ'۔ آپ نے فرمایا کہ اس مقام کا نام کچھ اور بھی ہے؟ لوگوں نے کہا۔ ہاں، کربلا بھی کہتے ہیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا۔ "یہ جگہ کرب وبلا کی ہے اور یہ مقام ہمارے خون بہنے کا ہے۔" پھر آپ نے وہاں اتر کر خیمے نصب کرائے۔" (تاریخ احمدی ص ۲۶۶)

اگرچہ ہم امامؑ کی انجامِ سفر سے آگاہی کے متعلق معتبر و مستند روایات بکثرت درج کر چکے ہیں تاہم انگریزی کتب سے بھی ایک دو اقتباسات سپردِ قلم کئے جاتے ہیں کیونکہ ان میں مسئلہ زیرِ بحث کو ایسے بہترین رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ قارئین حضرات کو ان سے محروم رکھنا کوتاہی متصور ہوگی۔ امام عالیمقامؑ مدینہ منورہ سے مکّہ مکرمہ کو روانہ ہوتے وقت جناب ام المومنین حضرت امّ سلمہؓ کو الوداعی سلام کہتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع کو بیان کرتے وقت فاضل مصنف لکھتا ہے :۔

Ummi-Salma addressed to Hussain and said, "O son! How can I be happy to bid you farewell, when I remember the prediction of your grand Father **that** you would be killed in Iraq." Hussain retorted, "I know the day and the person who

would accomplish it. I am fully aware of the ULTIMATE RESULT of my journey. There is nothing that can alter the decree of God. Ummi-Salma sighed with intense grief and began weeping.

(Hussain, the Saviour, page 135)

(ترجمہ) "حضرت ام سلمہؓ نے جناب حسینؑ کو یوں خطاب کیا:" اے فرزند! میں کس طرح آپ کو الوداع کرتے ہوئے شادمانی و مسرت محسوس کر سکتی ہوں جب کہ مجھے آپ کے جدِ امجد آنحضرتؐ کی پیشین گوئی یاد ہے کہ آپ سرزمینِ عراق میں ذبح کئے جائیں گے۔" حضرت حسینؑ نے ارشاد فرمایا:" بلاشبہ میں اپنے یوم شہادت اور مقتل سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں اپنے قاتل کو بھی جانتا ہوں، میں اپنے سفر کے "نتائج و انجام" سے پوری طرح باخبر ہوں۔ نوشتۂ تقدیر میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ ام سلمہؓ نے شدتِ حزن و ملال سے ایک آہِ سرد بھری اور زار و قطار رونا شروع کر دیا۔"

ایک دوسرے مقام پر فاضل مصنف اس موقعہ کو جبکہ قافلۂ اہلبیتؑ روانگی کے لئے پا بہ رکاب تھا اور جناب حسینؑ کی سواری کا گھوڑا بیت الشرف کے دروازے پر زین بستہ تیار کھڑا تھا، یوں بیان کرتا ہے:۔

"He in the costume of his grand father put a foot in a stirrup and stood for some time thinking. Suddenly he made a jump on to the croup, and with a frown said, "Such is the world that heads of Zacharias and John, the Baptist were sent as presents before drunkards." This analogy of Hussain had an ocean of philosophy. To all observers these words explained the ULTIMATE RESULT of his journey, and to the religious folk

the unstability of the world, the hard-trials that Godly souls are put to and the transitory luxuries that vicious people enjoy in this world at the cost of eternal blessing."

(Hussain, the Saviour page 136)

(ترجمہ) امامؑ نے اپنے جدِ عالیمقام کے لباس میں ملبوس ہو کر ایک پاؤں رکاب میں رکھا، پھر تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہوئے، پیشانی پر بل ڈال کر فرمانے لگے: "آہ! یہ دنیا ایسی ہے کہ ذکریاؑ اور یحییٰؑ (یوحنا بپتسمہ دینے والا) کے سر شرابیوں کے حضور تحفۃً پیش ہوئے"۔ حسینؑ کی اس تمثیل میں فلسفہ کا ایک بحرِ بیکراں مضمر ہے۔ گو بادی النظر میں یہ الفاظ امامؑ کے انجامِ سفر پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن ان سے صاحبانِ معرفت پر دنیا کی بے ثباتی، اور وہ زہرہ گداز آزمائشیں جن میں متقی لوگوں کو ڈالا جاتا ہے نیز وہ عارضی عیاشیاں جن سے لطف اندوز ہونے کی خاطر بدکار لوگ دائمی نعمات و ابدی برکات کو کھو دیتے ہیں، واضح ہوتی ہیں۔"

یوحنا بپتسمہ دینے والے (حضرت یحییٰؑ) کا واقعہ انجیلِ مقدس سے نقل کیا جاتا ہے تاکہ امامؑ کی فلسفیانہ تمثیل کا مفہوم واضح ہو سکے کہ پا در رکاب ہوتے وقت دور بین امامؑ نے یہ فقرہ کیوں ارشاد فرمایا تھا؟ چنانچہ متی (۱۴ : ۳-۱۲) میں مرقوم ہے:-

"ہیرودیس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرودیاس کے سبب سے یوحنا کو پکڑ کر باندھا اور قید خانہ میں ڈال دیا تھا کیونکہ یوحنا نے اسے کہا تھا کہ اس کا رکھنا تجھے روا نہیں اور وہ اسے ہر چند قتل کرنا چاہتا تھا مگر عام لوگوں سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ اسے نبی جانتے تھے لیکن جب ہیرودیس کی سالگرہ ہوئی تو ہیرودیاس کی بیٹی نے محفل میں ناچ کر ہیرودیس کو خوش کیا۔ اس پر اس نے قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا کہ جو کچھ تو مانگے گی تجھے دوں گا۔ اس نے اپنی ماں کے سکھانے سے کہا: "مجھے یوحنا بپتسمہ دینے والے کا

سر تھال میں یہیں منگوا دے۔ بادشاہ غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب اس نے حکم دیا کہ دے دیا جائے۔ اور آدمی بھیج کر قیدخانہ میں یوحنا کا سر کٹوا دیا اور اس کا سر تھال میں لایا گیا اور لڑکی کو دے دیا گیا۔ وہ اسے اپنی ماں کے پاس لے گئی۔"

یوحنا کے قتل کا یہی واقعہ متی کے علاوہ مرقس (۶: ۱۴-۲۹) اور لوقا (۹: ۷-۹) میں بھی مذکور ہے۔

یوحنا (حضرت یحییٰؑ) نے حاکم ملک ہیرودلیس (ہرودس) کو متنبہ کیا تھا کہ اس کے لئے اپنے بھائی کی بیوی کا رکھنا روا نہیں کیونکہ موسوی شریعت کی رُو سے یہ ممنوع ہے۔ کیونکہ توریت میں مرقوم ہے:۔

"تو اپنی بھاوج کے بدن کو بے پردہ نہ کرنا کیونکہ وہ تیرے بھائی کا بدن ہے۔ (احبار ۱۸: ۱۶)"

بہرکیف موسوی شریعت کی پاسداری اور حق گوئی کے جرم میں یوحنا کا کٹا ہوا مقدس سر تھال میں رکھ کر شرابی و زانی بادشاہ ہرودس کے حضور پیش ہوا جس کو اس نے تحفۃً اپنی معشوقہ کے پاس بھجوا دیا۔ تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ نواسۂ رسولؐ حضرت حسینؑ کو حضرت یحییٰؑ (یوحنا) سے بہت کچھ مماثلت ہے:۔

حضرت یحییٰؑ سے حسینی مماثلت

۱۔ دونوں کی پیدائش قدرتِ کاملہ کا ایک بے مثال کرشمہ تھا۔

۲۔ دونوں شکمِ مادر میں چھ چھ ماہ تشریف فرما رہے۔

۳۔ دونوں کی تخلیق آیۂ کریمہ "سیدًا وَّحصورًا" کی عملی تفسیر تھی۔

۴۔ دونوں نے پاکیزگی و طہارت کے لحاظ سے نمونہ کی زندگی بسر کی۔

۵۔ دونوں نے حق گوئی و بیباکی اور سرفروشی و جاں سپاری کی بے مثال نظیر پیش کی۔

۶۔ دونوں نے خدائی آئین کے تحفظ اور اعلائے کلمۃ الحق کیلئے عظیم الشان قربانی دی۔

۷۔ دونوں کو شاہانہ جاہ و جبروت مرعوب نہ کر سکی اور عسکری ہیبت راہِ حق سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا سکی۔

۸۔ دونوں نے خلافتِ حق و نیابت رسولؐ کا حق کماحقہٗ ادا کر دیا۔ حضرت یحییٰؑ نے موسوی شریعت کے احکام کی خلاف ورزی پر جابر یہودی بادشاہ ہیرودس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے حضرت موسیٰؑ کی حقیقی جانشینی کا ثبوت دیا۔ حضرت حسینؑ نے اسلامی قوانین کی پامالی پر خودسر، مطلق العنان نام نہاد مسلمان بادشاہ یزید کے خلاف نعرۂ حق بلند کر کے مثیلِ موسیٰؑ حضرت محمد مصطفےٰؐ کی حقیقی نیابت کا حق ادا کر دیا۔

۹۔ دونوں حضرات کے کٹے ہوئے مقدس سر تھال میں رکھ کر شرابی و زانی بادشاہوں کے حضور پیش ہوئے۔

۱۰۔ دونوں کی اندوہناک موت پر زمین و آسمان نے گریہ کیا۔

اس مماثلت کے باوصف پھر بھی دونوں میں اتنا فرق اور اتنا امتیاز ضرور تھا کہ حضرت یحییٰؑ نے صرف اپنا ہی مقدس سر قربان گاہ کی بھینٹ چڑھایا لیکن فرزندِ رسولؐ جناب حسینؑ نے بہتر۷۲ سر نذرانہ دیئے۔ غالباً اسی وجہ سے خدائے قدوس کو کہنا پڑا:۔

"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے یحییٰؑ بن زکریاؑ کے خونِ ناحق کے بدلے ستر ہزار آدمیوں کو قتل کر دیا اور تمہارے فرزند حسینؑ کے خونِ ناحق کے عوض میں ستر ہزار و ستر ہزار (ایک لاکھ چالیس ہزار) آدمیوں کو قتل کروں گا۔" (صواعق محرقہ: علامہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص ۱۱۹)

جناب حسینؑ کا پا در رکاب ہوتے وقت بعد از تامل یہ فرمانا "کہ آہ! یہ دنیا ایسی ہے کہ زکریاؑ و یحییٰؑ کے سر شرابیوں کے حضور تحفۃً پیش ہوئے۔" بصیرت کی ایک دنیا اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اس ایک ہی فقرہ میں حضرت شبیرؑ نے اپنے انجام کا صحیح نقشہ کھینچکر رکھ دیا۔ کہ اے بعید ترین زمانے میں حسینی لائحہ عمل پر اعتراض کرنے والو! گوشِ ہوش سے سن لو کہ جس طرح ہیرودس ایسے ظالم، جابر، زانی اور شرابی یہودی بادشاہ

کے حضور یوحنا کا سر تھال میں پیش ہوا تھا اسی طرح نواسۂ رسولؐ کا سر ہیرودس کے مثیل زانی و شرابی مسلمان بادشاہ یزید کے حضور طشت میں رکھ کر پیش کیا جائیگا۔

اللہ اکبر! امامؑ کی دور رس نگاہوں نے اپنا انجام سفر جو ابھی تک مستقبل کے پردوں میں مستور تھا اوجھل نہ تھا۔ اللہ رے شانِ حسینؑ! آپ کے مقدس منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ایک زندہ تاریخی حقیقت بن کر منظرِ عام پر آئے اور آپ کی عظیم الشان پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوکر رہی۔ کہاں ہیں وہ متعصب و حق پوش مؤرخین جو یہ کہتے ہیں کہ امامؑ نے یزید سے حکومت چھیننے کے لئے خروج کیا تھا اور سیاسی قابلیت کے فقدان کی بناء پر لاعلمی میں عراق کی جانب روانہ ہوگئے اور کربلا میں پہنچ کر حالات کو ایسا پلٹا ہوا پایا کہ وہ الجھ کر رہ گئے۔ بچ نکلنے کے لئے تین (مفروضہ) شرائط پیش کیں جو منظور نہ ہوسکیں اور بغاوت کی پاداش میں قتل ہو گئے۔

نبی کریمؐ کی متعدد پیشین گوئیوں کے علاوہ ہم نے چند تاریخی شواہد پیش کرکے یہ واضح کردیا ہے کہ آنے والے حالات نے جس رخ پر پلٹا کھانا تھا آپ اپنی علم و بصیرت کی بناء پر اس سے کلی واقفیت رکھتے تھے۔ آپ اپنے **انجام سفر** سے کما حقہ' آگاہ تھے۔ امام عالیمقامؑ (معاذاللہ) سیاسی شعور کے فقدان کی وجہ سے نادانستہ طور پر مشکلات میں نہیں الجھے بلکہ دیدہ و دانستہ نبی کریمؐ کے احکاماتؐ کی تعمیل اور فرائضِ امامت کی بجا آوری کیلئے عین منشائے خداوندی کے مطابق دین کے تحفظ و بقا کیلئے شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے۔ حقیقتِ حال کو تو امامؑ کے ایک ہی فقرہ نے بے نقاب کرکے رکھ دیا تھا:۔

"Such is the world that heads of Zacharias and John, the Bfaptist were sent as presents before drunkards."

صاف عیاں ہے کہ عالی مرتبت امامؑ سوچی سمجھی تجویز کے تحت، محض بقائے دین و تحفظ اسلام کی خاطر، یہ جانتے ہوئے کہ ان کا سر اقدس تھال میں رکھ کر شرابی حاکم کے حضور پیش کیا جائیگا، موت کے منہ میں جارہے تھے لہٰذا حق کو باطل کا رنگ دینے، صداقت کے چہرے پر کذب و افتراء کا پردہ ڈالنے

والے مؤرخین چشمِ بصیرت وا کریں اور گوشِ ہوش سے آسمانی پکار سن لیں مبادا حق پوشی کے جرم میں واصلِ جہنم ہوں :۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرۃ ۴۲)

(ترجمہ) حق کو باطل کا لباس مت پہناؤ اور اس صداقت کو مت چھپاؤ جس کو تم جانتے ہو۔

ان ناقابلِ تردید تاریخی حقائق پر جن کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے غور و فکر کرنے کے بعد ہر انصاف پسند و صداقت شعار شخصیت جس کو تاریخِ اسلام سے کچھ دلچسپی ہے حق و انصاف کی کچھ پاسداری بھی ملحوظ ہے، اسلام کا کچھ درد سینہ میں ہے اور دنیا میں سچائی کی اشاعت مطلوب ہے، یہ استفسار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ "ایں حسینؑ کیست کہ عالم ہمہ دیوانۂ اوست"۔ استفسار پر خواجہ غریب نواز حضرت اجمیریؒ جواب ارشاد فرماتے ہیں :۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سرداد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

شبیر حسن جوش ملیح آبادی جواب دیتے ہیں :۔

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسینؑ
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسینؑ
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسینؑ
جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسینؑ
مرتبہ اسلام کا جس نے دو بالا کر دیا
جس کی قربانی نے عالم میں اجالا کر دیا
نطق جس کا نغمہ پرداز پیمبرؐ وہ حسینؑ
تھا جو شرحِ مصطفےٰؐ، تفسیرِ حیدرؑ وہ حسینؑ
تشنگی جس کی جوابِ موجِ کوثر وہ حسینؑ
لاکھ پر بھاری رہے جس کے بہترؑ، وہ حسینؑ
جو محافظ تھا خدا کے آخری پیغام کا
جس کی نبضوں میں مچلتا تھا لہو اسلام کا
ہنس کے جس نے پی لیا جامِ شہادت وہ حسینؑ
مر گیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت۔ وہ حسینؑ
ہے رسالت کی سپر جس کی امامت وہ حسینؑ
جس نے رکھ لی نوعِ انسانی کی عزت وہ حسینؑ
وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

باب سوم

اِنَّ السید رب الجنود ذَبِیحَة فِی ارض الشّمال عند نهر الفرات

ارضِ شمال میں نہر فرات کے کنارے ایک ایسے
سید کا ذبح کیا جانا مقرر ہوا ہے جو لشکروں کا آقا
و سردار ہے

بائیبل (یرمیاہ) ۴۶ : ۱۰

کربلائے معلےٰ کی تاریخی و جغرافیائی اہمیّت

کربلائے معلّٰی:- دورِ حاضرہ میں کربلائے معلّٰی (مشہدِ حسینؑ) مملکتِ عراق کا ایک پرانا شہر ہے جو دارالحکومتِ بغداد سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر دریائے فرات کے غربی کنارے پر واقع ہے اور بلحاظ آبادی اور صنعت و حرفت روز افزوں ترقی کر رہا ہے لیکن جس زمانے میں امام عالی مقامؑ کربلا کی ارضِ مقدّس میں نزول فرما ہوئے تھے اس وقت یہ بیابان ایک غیر آباد و خشک ریگستان تھا۔ اس میں آباد ہونا تو درکنار لوگ اس میں سے گزرتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ اس سے تھوڑے فاصلہ پر چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں جو نینویٰ، غاضریہ، سقیہ اور ماریہ کے ناموں سے مشہور تھیں۔ ان میں اہلِ عرب کے مختلف قبائل بستے تھے جن میں قبیلہ بنی اسد کو نمایاں شہرت حاصل تھی۔ اس غیر آباد بیابان کے ملحقہ قطعاتِ ارض کربلا، نینویٰ، غاضریہ، شط الفرات اور ارضِ طف کے نام سے مشہور تھے جو انفرادی خصوصیت کے لحاظ سے تو مختلف لیکن باہمی قرب کے اعتبار سے ایک ہی سمجھے جاتے تھے اسی لئے جب قافلۂ اہلبیتِ رسالتؐ اس مقدس سرزمین میں وارد ہوا اور نواسۂ رسولؐ کی سواری کا گھوڑا چلتے چلتے یک لخت رک گیا، ہرچند راہوار کو آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر بے سود، متعدد سواریاں بدلی گئیں مگر کسی نے بھی اپنے مقام سے جنبش نہ کی تو امامؑ نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو بھیجکر قریب کی بستی سے چند آدمیوں کو بلوایا اور ان سے استفسار فرمایا کہ اس سرزمین کا نام کیا ہے؟ ایک شخص نے کہا "غاضریہ"۔ دوسرا بولا۔ "نہیں۔ یہ نینویٰ ہے"۔ تیسرے نے کہا "نہیں اس کو سقیہ کہتے ہیں"۔ امامؑ نے فرمایا "کیا اس کا کوئی اور نام بھی ہے؟" ایک شخص بولا "ہاں، اسے شط الفرات بھی کہتے ہیں"۔ دوسرا بولا "یہ ارضِ طف ہے"۔ پھر امامؑ نے فرمایا "کیا اس کا کوئی اور نام نہیں؟" بالآخر ایک سن رسیدہ شخص جس کی ریش کے بال سفید ہو چکے تھے کہنے لگا "اے فرزندِ رسولؐ! میں نے اپنے آبا و اجداد سے سنا ہے کہ اس بیابان کو **کربلا** کہتے ہیں اور یہ وہ ہولناک مقام ہے جس سے گزرتے وقت ہر ایک نبیؑ کو دکھ اور مصیبت کا سامنا ہوا ہے"۔ یہ سنتے ہی امامِ مظلومؑ پکار

اٹھے۔ ھذہٖ واللّٰہ ارض کرب وبلآء ھٰھُنا تقتل الرجال و نزمل النسآء ، وھٰھنا محل قبورنا ومحشرنا وبھٰذہ اخبرنی جدّی صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم ثمّ نزل من جوادہٖ "۔

(ترجمہ) قسم بخدا یہ زمین مصیبت و بلا کی ہے اور یہی وہ زمین ہے جہاں ہمارے مردوں کے خون بہائے جائیں گے اور ہماری عورتیں بیوہ بنادی جائیں گی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ہماری قبریں بنیں گی اور جہاں سے ہم قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے۔ ان تمام باتوں کی خبر میرے جدّ بزرگوار احمد مختارؐ نے مفصل بیان فرمادی تھی۔ یہ فرماکر آپ گھوڑے سے اتر پڑے"۔

گھوڑے سے اترتے ہی آپ نے ایک مشتِ خاک اٹھاکر اس کا اس مٹی سے مقابلہ کیا جس کو آپ نے اپنی جیب سے نکالا۔ دونوں کی بُو سونگھ کر ارشاد فرمایا" یہ مٹی وہی ہے جو جبرئیلِ امینؑ میرے جدّ بزرگوارؐ کے پاس لائے تھے۔ قسم بخدا۔ یہی وہ زمین ہے جہاں میرے گلے کی شہ رگیں کاٹی جائیں گی اور میری ڈاڑھی خون سے مخضب کی جائیگی"۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: مقتل ابو مخنف، صواعق محرقہ ابن حجر مکی۔ ضیاء عینین فی مقتل الحسینؑ امام ابو اسحٰق اسفرائنی عربی نسخہ میں ص ۲۹ ترجمہ مطبوعہ بنارس ص ۶۰)۔

روضۃ الشہداء میں ہے کہ جب امام حسینؑ نے زمینِ کربلا میں قدم رکھا تو وہاں کی خاک کا رنگ زرد ہوگیا اور اس میں سے ایک ایسا غبار اٹھا کہ امام حسینؑ کے گیسو گرد آلود ہوگئے یہ حال مشاہدہ کرکے حضرت امِ کلثومؑ نے عرض کیا کہ " اے بھائی! میں یہاں کی عجیب حالت دیکھ رہی ہوں اور اس دشت کو دیکھ کر میرے دل پر ہولِ عظیم طاری ہوگیا۔ (تاریخ احمدی ص ۲۹۶)

فی الحقیقت صحرائے کربلا اس زمانہ میں وہ ہولناک بیابان تھا جہاں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لانے کے بعد قریباً چالیس برس تک بھٹکتے پھرے جس کو پار کرنے کے بعد قادس برنیع (قادسیہ) پہنچے۔ (استثنار ۱:۹)

چنانچہ رب الافواج کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے توریتِ مقدس میں ارشاد ہوتا ہے:

" تو خداوند اپنے خدا کو بھول جائے جو تجھ کو ملکِ مصر یعنی غلامی کے گھر سے نکال لایا اور

ایسے وسیع ہولناک بیابان (صحرائے کربلا) میں تیرا رہبر ہوا جہاں جلانے والے سانپ اور بچھو تھے اور جہاں کی زمین بغیر پانی سوکھی پڑی تھی۔ وہاں اس نے چقمق کی چٹان سے تیرے لئے پانی نکالا"۔ (استثنا ۸: ۱۴-۱۵)

ارضِ کربلا مملکتِ بابل میں واقع ہونے کی وجہ سے قدیم الایام سے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہی ہے۔ طوفانِ نوحؑ کے بعد اولادِ نوحؑ نے ملکِ بابل کی بنیاد ڈالی اور وہیں سے اولادِ نوحؑ اقطاعِ عالم میں منتشر ہوئی۔ اسی شہر بابل سے ان کی زبان میں اختلاف کی ابتداء ہوئی تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: پیدائش ۱۱: ۱-۹۔

مملکتِ بابل ہمیشہ سے جباروں کا ملک رہا۔ نمرود بن کوش پہلا شخص تھا جس نے بادشاہت کی بنیاد ڈالی اور حضرت ابراہیمؑ پر جور و تشدد شروع کیا۔ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو تاخت و تاراج کیا تو مملکتِ بابل کو عالمِ انسانیت میں اور بھی شہرت حاصل ہوئی۔ اس زمانہ میں کسدی قوم بابل میں آباد تھی۔ بیت المقدس کی تاراجی و تباہی کے ستّر سال بعد حضرت یسعیاہؑ نبی کی پیشین گوئی کے مطابق مملکتِ بابل ہمیشہ ہمیش کے واسطے برباد ہو کر صحرا اور کھنڈرات کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ (یسعیاہ باب ۱۳-۱۴)

مملکتِ بابل کے دورِ عروج میں نینوا کا شہر انتہائی ترقی پر تھا اور یہ بلحاظ وسعت یونسؑ نبی کی تصریح کے مطابق تین روز کی مسافت یعنی قریباً ساٹھ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد تھی۔ (یوناہ نبی کی کتاب)

کربلا، نینویٰ، غاضریہ، حیرہ، شط الفرات، ارضِ طف یہ سب وہ قطعاتِ زمین تھے جن ناموں سے اسی قدیم شہر نینویٰ کے برباد ہونے پر اس کے مختلف حصے موسوم ہوئے۔ کوفہ اور حلّہ اسی قدیم بابل کے مقام پر آباد ہیں اور حلّہ کے قریب قدیم بابل کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ کی بعض پیشین گوئیوں میں مذکور ہے کہ میرا فرزند حسین ارضِ بابل میں شہید ہوگا۔ کہیں ارض طف، کہیں کربلا اور کہیں شط الفرات کا نام ہے

فراعنہ مصر کے زمانے میں اس سرزمین پر کچھ دشمنانِ خدا آباد ہو گئے تھے جن کو خدائے قدیر، رب الافواج کی تلوار نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد کر دیا تھا تاکہ اس مقدس سرزمین کو ایک مقدس قربانی کے لئے جو دریائے کے کنارے پایۂ تکمیل تک پہنچنی مقدر تھی مخصوص کر دیا جائے۔ چنانچہ بائیبل میں مرقوم ہے:-

"خداوند رب الافواج کے لئے اُتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ایک ذبیحہ مقرر ہے۔" (یرمیاہ: ۱۰: ۴۶)

اس آیۂ مبارکہ میں دریائے فرات کا لفظ مقامِ قربانی کا تعین کر دیتا ہے کہ قربانی اس دریا کے کنارے پر ہوگی **اُتر کی سرزمین** سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ذبیح موعود کا مسکن اس قتل گاہ سے لازماً جنوب کو ہونا چاہئے جب ہی تو اتر کی سرزمین ایک بامعنی کلام ہو سکتا ہے۔ ملک عرب دریائے فرات سے یقیناً جنوب کی طرف واقع ہے۔ مدینۂ منورہ اور بالخصوص مکہ معظمہ جو امامؑ کی روانگی کا آخری مقام ہے کربلائے معلیٰ سے عین جنوب میں واقع ہے لہٰذا اپنی آخری قیام گاہ سے روانہ ہونے والے ذبیح (حضرت امام حسینؑ) کے لئے قتل گاہ کربلا **اتر کی سرزمین** میں بھی ہے اور **دریائے فرات کے کنارے** پر بھی۔ چونکہ عالی منزلت امامؑ نے قربانی دینِ خدا کے تحفظ اور اسلام کی بقا کے لئے پیش کی اس لئے یہ قربانی خداوند رب الافواج کے لئے ہوئی یعنی **فی سبیل اللہ** قرار پائی۔

مزید براں حضرت حسینؑ حضرت مسیحؑ ناصری کی طرح صلیب پر نہیں چڑھائے گئے بلکہ عین سجدہ کی حالت میں مذبوح من القفا ہوئے لہٰذا ذبیحہ ٹھہرے کیونکہ ذبیحہ کے حلقوم پر چھری پھیری جاتی ہے نہ کہ اسے دار پر کھینچا جاتا ہے پس مسیحؑ ناصری تو کسی بھی زاویۂ نگاہ سے اس پیشین گوئی کے مصداق نہیں ٹھیرتے تو پھر امامؑ ذیشان کے سوا کون سا ذبیحہ دریائے فرات کے کنارے گزرا جو اس قابل تھا کہ اس کا تذکرہ الہامی کتابوں میں موجود ہوتا۔

علاوہ ازیں مسیحؑ پر یہ پیشین گوئی اس بناء پر بھی چسپاں نہیں ہو سکتی کیونکہ دریائے

فرات یروشلم (بیت المقدس) سے شمال کی جانب نہیں بلکہ مشرق کی طرف عراق میں بہتا ہے اس لئے یروشلم کے مکیں مسیح ناصری کے بارے میں اتر کی سرزمیں میں دریائے فرات کی موجودگی کا ذکر کرنا مہمل ہوگا کیونکہ یروشلم سے اتر کی طرف ترکی و روس کا علاقہ ہے۔ جہاں دریائے فرات نہیں بہتا بلکہ وہ تو سرزمینِ عراق کو سیراب کرتا ہے۔ اگر اتر کی سرزمین کا تعین کرنے کے لئے ذبیح موعود کی قیام گاہ کی بجائے پیشین گوئی کرنے والے نبی حضرت یرمیاہؑ کا مسکن لیں تو بھی وہی الجھن بدستور قائم رہے گی کیونکہ یہودی نقطۂ خیال سے یرمیاہ نبی کی قیام گاہ یوروشلم ہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ارضِ کنعان یعنی فلسطین کا علاقہ لے سکتے ہیں جس سے شمال کی طرف ترکی اور روس کا علاقہ ہے۔ نہ خداوند رب الافواج کے لئے وہاں کوئی قابلِ ذکر قربانی پیش ہوئی اور نہ وہاں دریائے فرات بہتا ہے۔ پس یہ کھلی دلیل اس امر کی ہے کہ جناب حسینؑ کا دریائے فرات کے کنارے ذبح ہونا مشیّتِ ازلی میں مقدر ہو چکا تھا اس لئے امام ذیشانؑ بلاشبہ ذبیح موعود ہیں جن کی قربانی کا مقام بقولِ یرمیاہ دریائے فرات کا کنارہ معین تھا اور جن کی شہادت کا وقت **عصر** اور یوم، عاشورِ محرم مقرر تھا اور جس عظیم القدر و مہتم بالشان سرفروشی پر "وفدینٰه بذبح عظیم" کی قرآنی شہادت مہر تصدیق ثبت کرتی ہے بلکہ جس کی نسبت داؤد نبیؑ نے زبور مقدس میں ارشاد فرمایا ہے :-

"دیکھو ہم نے اس کی خبر **افراتا** کے متعلق سنی اور ہم نے اس کو جنگلوں میں دیکھا۔"

افراتا وہی وادیٔ فرات ہے جس کا یرمیاہ نبی نے واضح الفاظ میں ذکر فرما دیا تھا۔ **بائیبل** کے قدیم عربی نسخوں میں یرمیاہ نبی کی مذکورہ بالا پیشین گوئی اس طرح لکھی ہوئی ملتی ہے:

"إنّ السید رب الجنود ذبیحة فی ارض الشمال عند نهر الفرات۔"

(ترجمہ) ارضِ شمال میں نہر فرات کے کنارے ایک ایسے سیّد کا ذبح کیا جانا مقرر ہوا ہے جو لشکروں کا آقا و سردار ہے۔"

"The Lord God of host hath a sacrifice in the north country by the river EUPHRATES."

مذکورہ بالا عربی ارشاد کا انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت لارڈ کے ساتھ گاڈ کے لفظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو ایک قسم کی لفظی و معنوی تحریفؑ ہے ورنہ اس عربی عبارت کے مفہوم سے یہ صاف عیاں ہے کہ نہرِ فرات کے کنارے کسی ایسے سیّد کا مذبوح ہونا مقرر ہو چکا ہے جو لشکروں کا سردار و آقا ہے۔ قرآن حکیم میں رب کا لفظ آقا کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ (یوسف:۴۲)

(ترجمہ) ان دونوں میں سے جس کی نسبت یقین تھا کہ رہائی پائے گا اس سے (حضرت یوسفؑ) نے کہا کہ اپنے آقا (شاہِ مصر) سے میرا ذکر کر دیجیو۔"

اگر آیۂ مذکور کی تفسیر اس نہج سے کی جائے تو اس کے اندر ایک اور عظیم الشان پیشین گوئی مضمر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ اس سیّدِ مذبوح من القفاء کے لشکر تا قیامِ قیامت مرتب ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عزادارانِ حسینؑ کے گروہ دنیا کے بیشتر ممالک میں مسلم و غیر مسلم اقوام سے مرتب ہوئے، ہو رہے ہیں، ہوتے رہیں گے۔

باب چہارم

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا

اور ان میں ہم نے بارہ سردار بھیجے

(المائدہ - ۱۲)

قربانی کی تدریجی ترقی و امامتِ کبریٰ

اہمیّت :۔ قربانی کی اہمیت ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس سے کسی ذی شعور کو مجالِ انکار نہیں۔ مسلمانوں کے لئے شرعاً حدود مقرر ہیں جن سے تجاوز کرنا ممنوع ہے۔ عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ہر مجرم اپنے جرم کی سزا پائے جو جرم کی نوعیت کے مطابق مالی یا بدنی صورت میں دی جاتی ہے۔ عادلِ حقیقی نے پاداشِ جرم میں کفّارہ گناہ کے طور پر قربانی پیش کرنے کا حکم دے رکھا ہے تاکہ عاصی و مجرم خدائے رحمان و رحیم کے بے پایاں رحم و کرم کے باعث منزلِ فلاح و نجات کو پاسکیں۔ جھوٹی قسم پر کفارۂ گناہ کے طور پر کچھ نقدی یا طعام قربانی میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح روزہ کے ترک کرنے اور توڑنے پر چند قیود عائد ہیں کہ مساکین کی ایک معیّنہ تعداد کو کھانا کھلایا جائے یعنی گناہ کے اثرات زائل کرنے کے لئے مالی قربانی پیش کی جائے۔ ہر سال حج کے موقعہ پر ہزاروں گوسفند اتباعِ سنّتِ ابراہیمی میں قربان کئے جاتے ہیں تاکہ ذبحِ عظیم کی قربانی کی یاد تازہ ہوتی رہے اور لوگ قربانیاں پیش کر کے کفارۂ عصیاں ادا کرسکیں۔ خالقِ کونین نے زہر کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے تریاق پیدا کیا اور انسان نے تیر و سنان اور تیغ و تبر کی ضربات سے بچنے کے لئے زرہ بکتر اور ڈھال ایجاد کی۔ اسی طرح گناہ کے برے اثرات سے بچنے کے لئے قربانی کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ تاکہ گناہ و عصیاں کے مجرمین قربانی کی پناہ میں آکر اپنے افعالِ قبیحہ کے برے نتائج سے محفوظ و مامون رہ سکیں۔

مسیحی کفّارہ اور اسلامی شفاعت میں امتیاز

امام عالیمقامؑ کی بے مثال قربانی نہ صرف آپ کے مقلدین کی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی ارتقاء کے لئے مشعلِ ہدایت ہے بلکہ آپ کے نام لیوا نبی کریمؐ کے ارشادات کی روشنی میں کامل امید رکھتے ہیں کہ مظلوم کربلاؑ کی مقدس قربانی مومنین کے لئے نجاتِ اخروی کا ذریعہ ثابت ہوگی دنیا میں صرف دو ہی ایسے مذہب ہیں جن کے عقائد میں یہ امر داخل ہے کہ باخدا و مقدس حضرات کی قربانی ان کے مقلدین کے لئے کفارۂ گناہ یا ذریعۂ عفو معاصی کا کام دیتی ہے۔

اول الذکر عقیدہ عیسائیت سے متعلق ہے اور موخر الذکر اسلام سے۔ عیسائی عقیدہ کے بموجب یسوع مسیحؑ نے مصائب و نوائب کو برداشت کیا تاکہ ان کی قربانی ان کے متبعین کے لئے کفارۂ گناہ بن کر نجاتِ اخروی کی ضامن ہو اور اسلامیہ زاویۂ نگاہ سے حضرت امام حسینؑ کی شہادتِ عظمیٰ آپ کے نام لیواؤں کے لئے عفوِ معاصی کا ذریعہ ہے۔ لیکن ان دونوں نظریات میں ایک نمایاں امتیاز یہ بھی ہے کہ عیسائی محض کفارہ کے نظریہ کا زبانی اقرار کر لینے سے بروزِ حشر مواخذہ سے بچ سکتا ہے اور نجات کا حق دار ہو سکتا ہے لیکن مسلمان حضرت امام حسینؑ کے نقشِ قدم پر چل کر عملاً حسینی لائحہ عمل کو اپنا کر ہی جنّت کا وارث ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کے مخصوص و مقرب بندوں کو شفاعت کرنے کا مرتبہ حاصل ہے جیسا کہ اس آیہ وافی ہدایہ سے نمایاں ہے :-

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (طٰہٰ:۱۰۹)

(ترجمہ) اس دن کوئی سفارش فائدہ نہ دیگی سوائے اس شخص کی سفارش کے جس کو خدائے رحمان نے اذن دے دیا ہو اور جس کی بات پسند فرمائی ہو۔

یقیناً امام عالیمقامؑ کا شمار خدا کے ان برگزیدہ مخصوص بندوں میں ہے جن کو بروزِ حشر شفاعت کی اجازت مرحمت ہوگی۔ اگر ایسا نہیں تو حدیثِ نبوی " اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ " بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر حسنین علیہما السلام کو مجرم کی سفارش کا حق حاصل نہیں تو جنّت کی سرداری کا مطلب ہی کیا ہے۔ جب سردارانِ جنّت کے اختیارات کی کیفیت یہ ہو تو پھر کون سی بزرگ ہستیاں ہو سکتی ہیں جنہیں شفاعت کا اذن عطا ہوگا۔

انسان اقتضائے بشریت کے تحت اپنی فطری کمزوریوں کی بنا پر مَعْصُوْمٌ عَنِ الْخَطَا نہیں ہو سکتا جب ہی تو کہا جاتا ہے کہ اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْيَانِ (to err is human) یعنی انسان سہو و خطا کا پتلا ہے۔ عدل و انصاف اس امر کا مقتضی ہے کہ ہر خطا و گناہ کے

لئے خواہ وہ کتنا ہی حقیر اور معمولی کیوں نہ ہو سزا کا ہونا ضروری ہے وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال:۸) اور "جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لیگا" اگرچہ خدا جبار وقہار بھی ہے تاہم وہ رحمٰن و رحیم بھی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ کمزور مخلوق کی خاطر بخشش و غفران کا کوئی ذریعہ پیدا کیا جاتا۔ چنانچہ خدائے تبارک و تعالیٰ نے اپنے لطفِ عمیم و فضلِ عظیم کی بنا پر قربانی کے ذریعہ نجات کی شاہراہ کھول دی۔ عیسائی عقائد کی رُو سے مسیحؑ (LAMB OF THE GOD AND SON OF MAN) خدا کا برّہ اور ابنِ آدم ہیں جو مصلوب ہوکر اپنے متبعین کے گناہوں کا کفارہ بنے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو امام عالیمقامؑ ہی خداوند رب الافواج کے وہ برّہ ہیں جو مصلوب نہیں بلکہ مذبوح ہوئے۔ قربانی کے گوسفند ذبح کئے جاتے ہیں صلیب پر نہیں کھینچے جاتے۔ حضرت حسینؑ ابن علیؑ (SON OF MAN) ابنِ آدم ہیں لیکن مسیح ابن مریم (SON OF MAN) ابنِ آدم کی بجائے بدرجۂ اولیٰ (SON OF WOMAN) ہیں۔ اس لئے یرمیاہ (۴۶ : ۱۰) کی اس پیشین گوئی کہ "خداوند رب الافواج کے لئے اتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ذبیحہ مقرر ہے" کے مصداق حقیقی امام حسینؑ ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت مسیح ناصریؑ، کیونکہ دریائے فرات کے کنارے ذبح ہونے والی حضرت شبیرؑ کی ذاتِ گرامی ہے نہ کہ جناب عیسیٰؑ ابن مریم کی۔ مزید براں ساتویں مہینے (ماہ محرم) کی دسویں تاریخ (یوم عاشور) کو ذبح ہونے کا فخر بھی صرف امام عالیمقامؑ کو حاصل ہے۔ جناب مسیح ناصریؑ اس شرف سے بھی محروم ہیں۔ کفارہ کی تخصیص یوم عاشور سے وابستہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"پھر خداوند تعالیٰ نے موسیٰؑ کو خطاب کرکے فرمایا۔ اسی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو کفارہ کا دن ہے۔ اس روز تمہارا مقدس مجمع ہو اور تم اپنی جانوں کو دکھ دینا اور خداوند کے حضور آتشیں قربانی گذراننا" (احبار ۲۳ : ۲۶-۲۷)

پس یہ امر دو اور دو چار کی طرح ثابت ہوگیا کہ وہ خدا کا برّہ و ابن آدم (LAMB

(OF GOD AND SON OF MAN) جو اپنی عظیم الشان قربانی کی وجہ سے اپنے مقلدین کے لئے کفارہ گناہ نہیں بلکہ ہادیِ راہ شریعت و شفیع المذنبین ہوگا۔ حضرت امام حسینؑ کی ذاتِ گرامی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم امامؑ کو اس اعتبار سے **نجات** دہندہ تصور کرنے لگیں کہ انہوں نے اپنے ماننے والوں کو فرائض کی پابندی سے آزاد کردیا اور خود گویا سب کا کفارہ ہوگئے۔ یہ سمجھنا کہ حضرت امامؑ نے گنہگارانِ امت کے لئے شہادت اختیار کی ہے، اس معنی سے ہرگز درست نہیں کہ انہوں نے ہمیں گناہوں کا جواز عطا کردیا اگر کوئی کم فہم ایسا سمجھتا ہے تو وہ اپنی غلط ذہنیت سے شہادت کے بلند مقاصد کو پامال کر رہا ہے اور امام مظلومؑ کی ذاتِ قدسی صفات کو اپنے معاصی کے حق بجانب ہونے کا بہانہ قرار دے رہا ہے۔ یہ کج فہمی صحیح عقیدت مندی سے کوسوں دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امامؑ ہمیں اطاعت کے راستے پرلے جانا چاہتے ہیں وہ گناہوں کا دروازہ کھولنے والے نہیں اور نہ ہی ہمارے قوائے عمل کو معطل کرنا چاہتے ہیں۔ امامؑ کا اسوۂ حسنہ فی الحقیقت ہمارے لئے بہترین محرکِ عمل ہے۔ حسینؑ بیشک اس اعتبار سے **نجات دہندۂ امت** ہیں کہ انہوں نے اپنے عمل و کردار سے نجات کا راستہ نمایاں کردیا اور اپنی بیمثال قربانی سے ایک ایسی **ہیئتِ اجتماعیہ** کی تشکیل کا سامان مہیا کردیا جو اپنے عمل سے نجات کی حقدار بن جائے۔ اگر جہادِ کربلا معرضِ وجود میں نہ آتا تو دین و شریعت کی اصلی صورت مسخ ہوجاتی اور بادشاہوں کی سیرت سنّتِ الٰہیّہ قرار پاتی، ان کی تقلید معیارِ نجات سمجھی جاتی اور یہ ملتِ اسلامیہ کی حقیقت میں ابدی ہلاکت ہوتی۔ حسینؑ نے اپنے حیرت انگیز اسوۂ حسنہ سے کمزور انسان کو نجات کے قابل بنا دیا، جب ہی تو جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں:۔

آفریں چشم و چراغ دودمانِ مصطفےٰؐ — آفریں صد آفریں مرحبا صد مرحبا
مرتبہ اسلام کا تو نے دوبالا کردیا — جان دے کر اہلِ دل کو تو سبق یہ دے گیا
کشتیِ ایماں کو خونِ دل سے کھینا چاہئے — حق پہ جب آنچ آئے تو یوں جان دینا چاہئے

فی الحقیقت آپ کا وجود ذی جود بقول قائد ملت نواب بہادر یار جنگ " وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ " کی عملی تفسیر ہے جس نے اپنے خونِ سرخ و گرم سے حق و باطل کے دوراہے پر ایک واضح، نمایاں اور نہ مٹنے والی لکیر کھینچ دی تاکہ پیچھے آنے والے وہ نوردانِ حق اس کو دیکھ کر اپنی منزل کا پتہ چلا سکیں۔ آپ کا روشن و چمکتا ہوا خون، باطل کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا خون، نظر نہ آنے مگر محسوس ہونے والا خون، قیامت تک باطل سے انکار اور حق کی اتباع میں شہادت دیتا رہے گا۔

(داستانِ کربلا : ص ۲۱۷)

امامؑ اور ان کے حق پرست انصار کی مظلومیت فی الواقعہ اسلام کی مظلومیت تھی اور یہی مظلومیت آج ہماری تاریخ کا بہترین سرمایہ ہے جس سے ہم زندگی کی حرارت حاصل کر سکتے ہیں۔

قربانی کی ابتدا و تدریجی ترقی

" مذاہبِ عالم میں قربانی پیش کرنے کا رواج کم و بیش زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے لیکن توریت کی ورق گردانی سے واضح ہوتا ہے کہ قربانی کا سلسلہ ابتدا ہی سے رسماً نہیں بلکہ فریضہ مذہب و رکنِ دین کے طور پر چلا آیا ہے۔ توریت میں مذکور ہے :-

" ہابل (ہابیل) بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائن (قابیل) کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا۔ پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا اس لیے قائن نہایت غضبناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا .... جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن نے اپنے بھائی ہابیل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ تب خداوند نے قائن سے کہا کہ تیرا بھائی

ہابل کہاں ہے ؟" اس نے کہا" مجھے معلوم نہیں۔ کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں" پھر اس نے کہا" تو نے یہ کیا کیا۔ تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے۔ اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا جس نے اپنا منہ پسار کر تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے جب تو زمین کو جوتے گا تو وہ تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہوگا" (پیدائش ۴: ۲-۱۲)

ہابیل کی قربانی مقبول ہوئی۔ قابیل نے حسداً اسے قتل کردیا۔ ایک بیگناہ کے خون سے ہاتھ رنگین کرکے لعنتی ہوا اور زمین پر پریشان و آوارہ پھرنے لگا۔ دراصل حسد ہی ایک ایسی بری چیز ہے جو ارتکابِ گناہ پر آمادہ کرتی ہے۔ ابلیس نے آدمؑ سے حسد کیا اور ملعونِ ابدی ٹھہرا۔ قابیل نے حسد کی بنا پر اپنے حقیقی بھائی ہابیل کو قتل کرکے کرۂ ارض پر پہلی خونریزی کی بنیاد رکھی۔ امویوں نے حسداً ہاشمیوں سے حکومت چھین کر اسلام کے اندر ایک رخنۂ عظیم ڈالا جو اسلام کی ذلت و نکبت کی وجہ بنا اور اہلِ بیتِ رسالت پر لاتناہی مظالم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پس پہلی عظیم الشان قربانی ہابیل نے پیش کرکے حق و صداقت پر شہادت کی مہر ثبت کی۔ طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوحؑ کشتی سے اترے تو انہوں نے ایک **قربان گاہ** تیار کی جس پر پاکیزہ جانوروں اور پرندوں کو آتشیں قربانی کی نذر کیا۔ چنانچہ توریت میں تحریر ہے :-

"تب نوحؑ نے خداوند کے لئے ایک مذبح بنایا اور سارے پاک چرندوں و پاک پرندوں میں سے لے کر اس مذبح پر سوختنی قربانیاں چڑھائیں" (پیدائش ۸: ۲۰)

اسی طرح قربانیاں پیش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہندو تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم آرین میں بھی قربانیاں دینے کا رواج تھا۔ چنانچہ وید کے منتر اس امر کی تائید کرتے ہیں۔ بدھ مت کے عروج نے ہندوؤں کو قربانی ترک کرنے پر مجبور کردیا۔ سوامی شنکر اچاریہ اور رامانج کی کوششوں سے جب ہندو دھرم نے دوبارہ فروغ حاصل کیا اور **پُران**

کی متعدد تصنیفات معرضِ تحریر میں آئیں تو اس جدید و ترقی پسند ہندو دھرم سے قربانی کا سلسلہ جاتا رہا مگر اقوامِ عالم میں قربانی کو بتدریج ترقی حاصل ہوتی رہی حضرت ابراہیمؑ کے دورِ نبوت میں قربانی کا سلسلہ انتہائی عروج پر پہنچ چکا تھا۔

ابراہیمی قربانی

توریت میں مرقوم ہے :۔ " ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا:" اے ابرہام !" اس نے کہا" میں حاضر ہوں " تب اس نے کہا کہ" تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا **اکلوتا** ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر **موریاہ** کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک **پہاڑی** پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار جامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اضحاق کو لیا اور سوختنی قربانی کے لئے لکڑیاں چیریں اور اٹھ کر اس جگہ کو جو خدا نے اسے بتائی تھی روانہ ہوا۔ تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اس جگہ کو دور سے دیکھا۔ تب ابرہام نے اپنے جوانوں سے کہا:" تم یہیں گدھے کے پاس ٹھہرو۔ میں اور یہ لڑکا دونوں ذرا وہاں تک جاتے ہیں اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس لوٹ آئیں گے اور ابرہام نے سوختنی قربانی کی لکڑیاں لے کر اپنے بیٹے اضحاق پر رکھیں اور آگ اور چھری اپنے ہاتھ میں لی اور دونوں اکٹھے روانہ ہوئے۔ تب اضحاق نے اپنے باپ ابرہام سے کہا۔ " اے باپ !" اس نے جواب دیا" اے میرے بیٹے ! میں حاضر ہوں" اس نے کہا۔ " دیکھ، آگ اور لکڑیاں تو ہیں پر سوختنی قربانی کے لئے **برّہ** کہاں ہے ؟" ابرہام نے کہا:" اے میرے بیٹے ! خدا آپ ہی اپنے واسطے **سوختنی** قربانی کے لئے برہ مہیا کرے گا سو وہ دونوں آگے چلتے گئے اور اس جگہ پہنچے جو خدا نے بتائی تھی۔ وہاں ابرہام نے **قربانگاہ** بنائی اور اس پر لکڑیاں چنیں۔ اپنے بیٹے اضحاق کو باندھا اور اسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے

اوپر رکھا اور ابرہام نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے۔ تب خداوند کے فرشتہ نے اسے آسمان سے پکارا "اے ابراہام!" اس نے کہا "میں حاضر ہوں"۔ پھر اس نے کہا "تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور اسے کچھ نہ کر، کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا **اکلوتا** ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔ ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جاکر اس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا۔ (پیدائش: ۲۲: ۱-۱۳)

کلام خدا میں یہودی تحریف

اقتباس مذکور پر بحث کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ جس طرح توریت کے دیگر مقامات پر یہود نے تحریف اور ردّ و بدل کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے اسی طرح یہ مقام بھی ان کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکا اور حضرت اسمٰعیلؑ کی بجائے حضرت اسحاقؑ (اضحاق) کا نام شامل کر دیا گیا تاکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی بجائے حضرت اسحٰقؑ جو بنی اسرائیل کے جدّ امجد تھے ذبیح اللہ سمجھے جائیں اور اقوامِ عالم میں صرف بنی اسرائیل ہی منعم علیہ امت متصور ہو۔ مذکورہ بالا آیہ توریت ہے۔

"تب اس نے کہا تو اپنے بیٹے اضحاق (اسحاقؑ) کو جو تیرا **اکلوتا** اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر **موریاہ** (کوہ مروہ نزد حرم مکہ) کے ملک میں جا۔ میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت اسحاقؑ تو حضرت اسمعیلؑ سے عمر میں چودہ سال چھوٹے تھے لہٰذا وہ اکلوتے ہو ہی نہیں سکتے۔ اکلوتے بیٹے صرف حضرت اسمٰعیل ہی ہو سکتے ہیں جو توریت مقدس کی مستند شہادت کی رو سے حضرت اسحٰقؑ سے بلحاظ عمر یقیناً چودہ سال بڑے تھے۔ پس اکلوتا بیٹا جس کی قربانی سے دریغ نہ کیا گیا۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی ذاتِ گرامی ہے جو آقائے نامدار سرور دو عالمؐ کے جدّ عالیمقدار ہیں ہمارا یہ دعویٰ کہ حضرت اسمٰعیلؑ بلحاظِ عمر حضرت اسحٰقؑ سے بڑے تھے توریت مقدس کی روشنی میں بآسانی ثابت ہوسکتا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی سال تھی اور حضرت اسحاقؑ کے تولد ہونے پر آپ پورے سو برس کے ہو چکے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

" جب ابراہام کے لئے ہاجرہ سے اسمٰعیلؑ پیدا ہوا ابراہام چھیاسی برس کا تھا۔" (پیدائش ۱۶ : ۱۶) " اور جب اس کا بیٹا اضحاق (اسحاقؑ) اس سے (سارہ) پیدا ہوا تو ابراہام سو برس کا تھا۔ (پیدائش ۲۱ : ۵)

معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے ذبیح اللہ کی فضیلت کا سہرا حضرت اسحٰقؑ کے سر باندھنے کے لئے لفظ اسمٰعیلؑ کو محو کر دیا اور وہاں اضحاق لکھ تو دیا لیکن یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ لفظ " اکلوتا " کی موجودگی میں ان کی ساری کوششیں اکارت جائیں گی اور توریت کی دوسری آیات ان کے اس فریب کارانہ تحریف کی قلعی کھول کر رکھ دیں گی۔ اسی طرح غالباً قربانی کے مقام مکہ یا منیٰ کو موڑ توڑ کر موریاہ بنایا گیا ہے بلکہ قرینِ قیاس تو یہ ہے کہ موریاہ سے مراد مروہ کی پہاڑی ہے جس کو قرآن حکیم میں " اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ " کی رو سے خدائی نشان قرار دیا گیا ہے۔ خود جناب رسالتمآبؐ نے "**مروہ**" کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا:۔

"**قربان گاہ یہ ہے**" (موطا امام مالک)

مولانا شبلی کی مؤرخانہ تحقیقات کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ **مریا**، **مورہ** یا **موریاہ** درحقیقت لفظ **مروہ** کی مختلف صورتیں ہیں جو حضرت اسمٰعیلؑ کے مقامِ قربانی پر دلالت کرتا ہے۔ مروہ کی پہاڑی بالکل بیت اللہ کے مقابل اور اس کے قرب میں واقع ہے۔ قربانی کی اصل جگہ کعبہ ہے، منیٰ نہیں، لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ

کی حدود کو مٹی تک وسعت دی گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے سیرۃ النبی حصہ اول ص ۱۳۹-۱۴۲) یہودی تحریف کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں :-

۱۔ "حضرت نوحؑ نے انگوروں کا باغ لگایا (معاذ اللہ) شراب نوشی اور نشہ کی حالت میں اپنے آپ کو ننگا کیا۔" (پیدائش ۹ : ۲۰-۲۱)

۲۔ (معاذ اللہ) حضرت لوطؑ نے نشہ کے عالم میں ایک نہایت ہی مکروہ و گھناؤنا جرم کیا (مولف کے قلم کو لکھنے کا یارا نہیں۔ شائق حضرات ملاحظ فرمائیں پیدائش ۱۹ : ۳۱-۳۷)

۳۔ (معاذ اللہ) حضرت ابراہیمؑ نے شاہِ مصر کے خوف سے جھوٹ بولا (پیدائش ۲۰ : ۲-۱۲)

۴۔ (معاذ اللہ) حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ گرامی حضرت ہاجرہؑ حضرت سارہؑ کی ایک لونڈی تھیں۔ (پیدائش ۱۶ : ۱-۳)

۵۔ حضرت اسحاق (اسحاق) قربانی ہوئے۔ (تفصیل گزر چکی ہے) خود قرآنِ حکیم کا دعویٰ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کلامِ خدا میں جا بجا تحریف کی ہے۔ ارشاد باری ملاحظ فرمایئے

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (البقرۃ : ۷۹)

پس ویل ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر (منہ سے) یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آئی ہے تاکہ اس کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ لیں۔"

عہدِ خداوندی و امامت کبریٰ

گزشتہ بحث سے عیاں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے قبل اپنے " اکلوتے " بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان گاہ کی نذر کیا تھا چونکہ حضرت ابراہیمؑ اس ابتلائے عظیم میں کامگار و کامران ثابت ہوئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خداوندی سے امامتِ کبریٰ کا درجہ عطا فرمایا۔ جس کو

توریت نے بایں الفاظ بیان کیا ہے :-

"خداوند کے فرشتہ نے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو جو تیرا "اکلوتا" ہے دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کناروں کی ریت کی مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی"۔ (پیدائش ۲۲: ۱۵-۱۸)

قرانِ حکیم میں اس چیز کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرہ: ۱۲۴)

(ترجمہ) جب ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے کئی باتوں میں آزمایا اور اس نے انہیں پورا کر دکھایا (خدا نے) فرمایا۔ میں تم کو تمام انسانوں کا امام مقرر کرنے والا ہوں۔ ابراہیمؑ نے عرض کیا۔ کیا میری اولاد میں سے بھی؟ کہا ہاں، مگر ظالم میرے عہد سے مستفیض نہ ہوں گے۔

چونکہ یہ عہدِ خداوندی حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے قبل حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے موقع پر ہوا تھا اس لئے یہ عہد درحقیقت حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولادِ طاہرہ ہی سے تھا۔ یہ درست ہے کہ اولادِ ابراہیمؑ ہونے کی بنا پر انبیائے بنی اسرائیل بھی اس عہدِ خداوندی کے حقدار و امانت دار تھے مگر حضرت اسمٰعیلؑ اور آپ کی مقدس اولاد بدرجۂ اولیٰ اس عہدِ خداوندی کی حقدار ہے۔ خود توریت کے اپنے الفاظ ہمارے اس قول کی تائید کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"(حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے ایک سال قبل) جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا۔ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور چل

اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد باندھوں گا اور تجھے بہت زیادہ بڑھاؤں گا۔ تب ابرام سرنگوں ہوگیا اور خدا نے اس سے ہمکلام ہوکر فرمایا کہ دیکھ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہیں کہلائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھیرا دیا ہے اور میں تجھے بہت برومند کروں گا اور قومیں تیری نسل سے ہوں گی اور بادشاہ تیری اولاد میں برپا ہونگے اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لئے اپنا عہد جو **"ابدی"** ہوگا باندھوں گا تاکہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے اور میں ان کا خدا ہوں گا۔ پھر خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانوگے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک **فرزندِ نرینہ کا ختنہ** کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ (پیدائش : ۱۷ : ۱-۱۱)

اقتباس مذکورہ سے یہ امر روشن ہے کہ پروردگارِ عالم ابراہیمؑ و اولادِ ابراہیمؑ کا خدا رہے گا اور ان کو کنعان کی مقدس سرزمین دائمی ملکیت کے طور پر عطا کرے گا حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولادِ طاہرہ اس عہد کی پابندی اس طرح کرے گی کہ ہر ایک فرزندِ نرینہ کا ختنہ کیا جائے گا۔ حضرت ابراہیمؑ کی عمر ننانوے سال اور حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ جب ہر دو حضرات کا بیک وقت ختنہ ہوا۔ اس عہد پر یہود یں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش تک عمل ہوتا رہا۔ خود حضرت عیسیٰؑ مسیح کا بھی ختنہ ہوا۔

(لوقا ۱ : ۵۹، ۲ : ۲۱) لیکن حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسائیوں نے بالخصوص اور یہود نے بالعموم اس عہدِ خداوندی کو توڑ دیا۔ خدا نے اولادِ اسمٰعیلؑ کے ساتھ یہ عہد باندھا اور کنعان کی مقدس سرزمین یہود و نصاریٰ سے لے کر مسلمانوں کی تحویل میں دیدی۔ پس ثابت ہوا کہ عیسائیوں و یہودیوں کے ساتھ عہد ابدی نہ تھا۔ خود ان دونوں قوموں نے نقضِ عہد کیا اور جو کوئی عہد توڑتا ہے وہ بروئے آئینِ موسوی مجرم ہے اور سزا کا مستحق و مستوجب ہے۔

"وہ فرزندِ نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو، اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا۔" (پیدائش ۱۷ : ۱۴)

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا (زبور)

حضرت ہاجرہؑ

یہود و نصاریٰ کے دلائل قطع کرنے کے لئے بائیبل کے مزید چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں :۔

"حضرت سارہ کو یہ ناگوار گزرا کہ ہاجرہؑ کے بیٹا ہو اور ابراہیمی نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت دن بدن بڑھتی جائے۔ دل میں آتشِ حسد بھڑک اٹھی حضرت ابراہیمؑ سے کہنے لگیں کہ آپ اپنی بیوی ہاجرہؑ اور بیٹے اسمٰعیلؑ کو گھر سے نکال دیں۔ مشفق باپ کی طبیعت پر یہ بات شاق گزری کہ کمسن بیٹے کو جلاوطنی کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لئے آبائی مسکن کی نعمتوں سے محروم کر دیا جائے مگر حکمِ خداوندی کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت ابراہیمؑ آزمائش کی کٹھن منازل طے کرنے کی خاطر بیوی اور بچے کو الوداعی سلام کہیں۔

وہی حکیم مطلق جو پھل پیدا کرنے کے لئے سمندر سے ابخرے اٹھاتا ہے،

بادلوں کو جنبش میں لاتا ہے، مٹی کو لکڑی، پھر پتے اور آخر پھول کی شکل میں نمایاں کرتا ہے، جانتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ آدم کو خلیفہ بنانے کا ارادہ پہلے ہی کر لیتا ہے اور ایک الزام سے ملزم بنا کر اپنا مقصد پورا کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے اور کن اغراض کو سامنے رکھ کر کرتا ہے؟ شاید اس بہانے سے عرب کے ریگستان میں اپنے گھر کی بنیادیں استوار کرانی مطلوب تھیں اور مکّہ کی پاک سرزمین کو ہدایتِ عالم کے لئے مرکز قرار دینا مقصود تھا تاکہ مثیلِ موسیٰؑ نبیؐ امی حضرت محمدؐ عربی شریعت کا آتشی شیشہ ہاتھ میں لے کر فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوں (استثنا ۱۸: ۱۸-۱۹)(۲:۳۳)

بہرکیف حضرت ابراہیمؑ تعمیلِ حکم میں روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر بیوی اور بچے کو الوداع کہتے ہیں۔ توریت مقدس کے اپنے الفاظ میں حقیقتِ حال سنئے:۔

"تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی اور جب مشک کا پانی ختم ہوگیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور خود اس کے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا۔" اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا! مت ڈر خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہوا ہے اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اس کو **ایک بڑی قوم** بناؤنگا پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور

بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی۔" (پیدائش ۲۱: ۱۴-۲۱)

توریت مقدس کا ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمائیے :۔

"خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا یہاں تک کہ کثرت کے سبب سے اس کا شمار نہ ہو سکے گا۔ (پیدائش ۱۶: ۱۰)

حضرت ہاجرہ اگرچہ حضرت سارہ یا یہود کی نگاہ میں ایک لونڈی تھی جس کو گھر سے نکال باہر کیا گیا تھا لیکن خدا کے حضور لونڈی کو وہ قدر و منزلت حاصل تھی جس سے خود گھر کی ملکہ حضرت سارہ بھی محروم تھیں۔ اقتباس مذکور سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے فرشتے آتے ہیں اور جناب ہاجرہ کی دلجوئی کرتے ہیں اور پروردگارِ عالم وعدہ فرماتے ہیں کہ غمگین مت ہو ہم تیرے بیٹے کو ضائع نہیں کریں گے بلکہ اس کو ایک عظیم الشان قوم بنائیں گے۔ یہ بے آب و گیاہ وادی جو آج لوؤں کی لپٹ اور بادِ صرصر کے طوفان کی آماجگاہ ہے اور جہاں میلوں تک پانی کا نام و نشان نہیں، سرسبز و شاداب ہوگی اور خلائقِ عالم کا مرجع بنے گی اور اس ریگزار کے سینہ پر خدائے واحد کی عبادت کے لئے دنیا کا سب سے پہلا گھر تعمیر ہوگا۔

یہی وہ عہد تھا جو خود حضرت ابراہیم کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یہ تھی لونڈی کی قدر و منزلت جس کے آگے شہزادیوں کی شہزادگی پانی بھرتی تھی۔ خدا کو اس مومنہ کی یہ حرکت کتنی پسند آئی کہ آپ جتنی دفعہ صفا و مروہ پر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتی رہیں آج اتنی ہی بار صفا و مروہ کے درمیان "دوڑنا" ارکانِ حج میں شامل کر دیا گیا۔ نیز ہر حاجی کے لئے ان پہاڑیوں کے مابین سات چکر کاٹنا واجب قرار دیا گیا۔ اور صفا و مروہ کو شعائر اللہ قرار دے کر واجب التعظیم ٹھہرایا گیا۔ حضرت اسمٰعیل کی شانِ منزلت ملاحظہ فرمائیے۔ پیاس سے نڈھال ہو کر جہاں

ایڑیاں رگڑیں وہاں چشمہ پھوٹ نکلا جو آج کل **زمزم** کے نام سے موسوم ہے۔ جس کا پانی آبِ حیات سمجھ کر ہر حاجی پینے کے لئے بے تاب و بیقرار نظر آتا ہے۔

حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ اور ان کے فرزند ارجمند حضرت اسمٰعیلؑ کو گھر سے نکلوا کر بزعمِ خود تمام آسمانی برکات کو اپنی ذات، اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ اور ان کی اولاد کے لئے مخصوص و مختص کرالیا تھا لیکن گھر سے نکالی ہوئی حضرت ہاجرہؑ کو خدا کے حضور وہ قدر و منزلت حاصل ہوئی جس سے خود حضرت سارہ بھی محروم رہیں۔ بالفاظِ دگر حضرت ہاجرہؑ کو جناب فخر موجودات خاتم النبیین حضرت رسالتمآبؐ کی جدۂ امجدہ ہونے کا فخر و شرف نصیب ہوا یعنی آپکے پوتے جناب محمد مصطفٰےؐ قصرِ نبوت میں کونے کے پتھر ٹھیرے اور آپ پر سلسلۂ نبوت ختم ہوا۔

اسی حیرت انگیز خدائی حکمت عملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مسیحؑ سردار کاہنوں اور فریسیوں سے تمثیل کے رنگ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یسوعؑ نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس (زبور) میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائیگی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائیگی دے دی جائیگی اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" (متی ۲۱: ۴۲-۴۴ - مرقس ۱۲: ۱۱ - زبور ۱۱۸: ۲۲-۲۳)

جناب رسالتمآبؐ فرماتے ہیں کہ قصرِ نبوت میں کونے کا پتھر میں ہی ہوں۔ میری آمد پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اس مقدس پتھر پر گرنے والوں نے جنگ بدر میں اپنا حشر دیکھ لیا۔ خیبر میں یہی پتھر یہود پر گرا۔ مسیحی تمثیل کے رنگ میں وہ پس کر رہ گئے۔

عہدِ خداوندی اور آئمہ اثنا عشر علیہم السلام

توریت میں مذکور ہے :۔ " اسمٰعیلؑ کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا۔ اسے بہت بڑھاؤں گا۔ اس سے **بارہ** سردار پیدا ہونگے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔" (پیدائش ۱۷: ۲۵)

اس آیۂ کریمہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کو بابرکت بنانے، برومند کرنے اور ایک عظیم الشان قوم بنانے کا عہد کیا گیا ہے اور جن کی اولادِ طیبہ میں بارہ سردار (بارہ امام) برپا ہونگے۔ آلِ محمدؐ میں سے یہی بارہ امام **(آئمہ اثنا عشر)** مذکورہ بالا بارہ سردار ہیں جو اس پیشین گوئی کے حقیقی مصداق ہیں۔ کیونکہ خدا کے حضور میں مادی جاہ و جبروت اور شاہانہ شان و شوکت قابلِ قدر نہیں بلکہ **اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ** (الحجرات: ۱۳) کی رُو سے تقویٰ ہی معیارِ فضیلت ہے۔ امامتِ کبریٰ ابراہیمی گھرانے میں دینے کا عہد تو ہوا لیکن **لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ** (البقرہ: ۱۲۴) کی رو سے یہ عہدِ خداوندی ظالم سے متعلق نہیں ہے اور بلحوائے آیۂ کریمہ **اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ** (لقمان ۱۳) ہر مشرک ظالم ہے لہٰذا وہ لوگ جو برسوں بتوں کے حضور جبیں سائی کرتے رہے کیونکر عہدۂ امامت کے حقدار اور توریت کی اس پیشین گوئی کے مصداق ہو سکتے ہیں۔ مزید براں آلِ محمدؐ کے علاوہ اولادِ اسمٰعیلؑ میں سے کوئی شخص بھی اس امر کا دعوے دار نہ ہوا کہ وہ بذاتِ خود یا اس کی نسل اس عہدِ خداوندی کی مقصود بالذات، وارث اور امانتدار ہے کیونکہ اہلِ بیتِ نبوت کے علاوہ کوئی ایسا گھرانہ ہی نہیں کہ جس میں پشت در پشت اور نسل در نسل پاکیزہ فطرت و بلند کردار رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے ہوں۔ یہ شرف اور خوش نصیبی حضرت ابوطالبؑ کی خدمتِ اسلام کے عوض میں محض ان کی اولاد کے لئے مختص و مقدر تھی کیا واقعہ کربلا نے یہ ثابت نہیں کر دیا؟ کیا یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت نہیں کہ درجۂ شہادت

پر فائز ہونے والے ہاشمی حضرات اٹھارہ کے اٹھارہ حضرت ابوطالبؑ کی اولاد میں سے تھے لیکن اپنی کثرتِ تعداد کے باوجود کسی عباسی (اولاد حضرت عباسؓ) کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ کہنے کو تو عشرہ مبشرہ و دیگر صحابہ کرام کی نسل میں سے سینکڑوں افراد موجود تھے مگر اسلام کی کشتی کو منجدھار میں غرقاب ہوتا دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر یزیدی طاقتوں کی ہمنوائی کرتے رہے۔ اور تو اور خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو ہاشمی قبیلہ کے ممتاز فرد تھے بیعتِ یزید میں میں داخل ہو گئے اور امامؑ کی عملاً کوئی امداد نہ کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاص جیسے جلیل القدر اور مقتدر صحابہ کرام بیعتِ یزید میں بخوشی شامل ہو گئے حالانکہ ان دونوں حضرات نے حضرت علیؑ کی بیعت سے تخلف فرمایا تھا۔

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

ہمارا یہ دعویٰ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد آلِ اسحاقؑ کی نسبت عہد ابراہیمی کی بدرجہ اولیٰ حقدار ہے قرآنِ حکیم کی روشنی میں بھی بآسانی صحیح و مبنی برحق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے :

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (البقرة ۱۲۷-۱۳۰)

(ترجمہ) اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ گھر (بیت اللہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ

عرض کرتے تھے) اے پروردگار! ہماری یہ خدمت قبول کرنا، بیشک تو سننے والا، اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار قرار دے اور ہماری اولاد میں سے ایک اطاعت گزار جماعت بنا اور ہمیں ہمارے قواعد تعلیم فرما اور ہم پر (نظرِ کرم سے) پھر آ۔ یقیناً تو ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ان پر ایک رسول ان ہی میں سے مبعوث فرما جو ان پر تیری آیات تلاوت کرے۔ ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ ان کا تزکیۂ نفس کرے بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔ ملّتِ ابراہیمؑ سے کون روگرداں ہو سکتا ہے سوائے اس شخص کے جو اپنے آپ کو بھی نہ سمجھا ہو حالانکہ ہم نے اس کو دنیا میں برگزیدہ قرار دیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہے۔

توریتِ مقدس و قرآنِ حکیم کی پیش کردہ آیات ایک دوسرے کی پرزور تائید کرتی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا جس کو حضرت اسمٰعیلؑ کی معیّت بھی حاصل تھی خدا کے حضور مستجاب ہوئی لہٰذا اس دعا کی رو سے بنی اسمٰعیلؑ میں سے ہی ایک اولوالعزم نبی مبعوث ہوگا جو کتاب وحکمت سکھا کر ان کا تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کرے گا۔ نیز بنی اسمٰعیل میں سے ہی وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا (مائدہ : ۱۲) کی رُو سے بارہ امام بنی اسرائیل کے نقباء کی طرح پیدا ہونگے جو بقولِ رسولِ مدنیؐ خلفائے امتِ محمدیہ ہونگے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"وَلَقَدْ سَأَلْنَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اثْنَا عَشَرَ كَعِدَّةِ نُقَبَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ" (مسند احمد حنبل الجزء الاول ص ۳۹۸ - البلاغ المبین ص ۱۷)

(ترجمہ) ابن مسعود نے کہا کہ ہم نے جناب رسول خداؐ سے دریافت کیا تھا اور آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ نقباء بنی اسرائیل کی تعداد کے موافق بارہ ہوں گے۔

ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیے:۔

"عن جابر بن سمرة السوائی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی حجۃ الوداع ان ھذا الدین لم یزال ظاھرا علی من ناواہ لا یضرہ مخالف ولا مفارق حتی یمضی من امتی اثنا عشر خلیفۃ قال ثم تکلم بشیئ لم افھمہ فقلت لابی ما قال۔ قال کلھم من قریش"۔

(ترجمہ) جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں میں نے جناب رسولخدا کو یہ کہتے سنا کہ دین اسلام اپنے بدخواہوں پر غالب رہے گا۔ اس کو مخالف و مرتد کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اس میں میری امت سے بارہ خلیفہ نہ ہو چکے ہوں۔ جابر کہتے ہیں کہ کچھ آنحضرتؐ نے فرمایا جو میں نہ سمجھا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آنحضرتؐ نے کیا کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے کہا کہ وہ سب قریش میں سے ہوں گے۔ (۱۔ مسند امام احمد حنبل الجزءالخامس ص ۸۷۔۹۰، ۹۲۔۱۰۱۔

۲۔ صحیح بخاری مطبوعہ مصر الجزء الرابع ص ۱۶۵۔ کتاب الاحکام باؔ لاستخلاف۔

۳۔ صحیح مسلم مطبوعہ بمیدان الازہر بمصر الجزء السادس ص ۳۔

۴۔ البلاغ المبین ص ۱۸۰۱۔

اپنے مقام پر اب یہ الگ موضوع بحث ہے کہ کیا آنحضرتؐ نے "کلھم من قریش" کا فقرہ ارشاد فرمایا تھا یا "کلھم من عترتی" کیونکہ جابر بن سمرۃ غل غپاڑے کی وجہ سے آنحضرتؐ کے آخری الفاظ بذاتِ خود نہ سمجھ سکا بلکہ اس نے باپ سے دریافت کیا اور باپ نے اس کو بتایا کہ کلھم من قریش کہا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بحث ہمارے دائرۂ موضوع سے خارج ہے تاہم قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے چند سطور تحریر ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارے متعصب مورخین نے حق کو چھپانے کی ناکام سعی کرکے نبی کریمؐ کی حدیث کو کس قدر مضحکہ خیز بنا دیا ہے کہ آج تک علمائے اسلامؒ ان بارہ خلفا پر اتفاق نہ ہو سکا جو مذکورہ حدیثِ رسولؐ کے مصداق ہوں۔ شیخ الاسلام علامہ

ابنِ حجر عسقلانی فتح الباری شرح صحیح بخاری میں مندرجہ ذیل بارہ خلفائے اسلام شمار کرتے ہیں: حضرت ابوبکرؓ[۱]۔ حضرت عمرؓ[۲]۔ حضرت عثمانؓ[۳]۔ حضرت علیؓ[۴]۔ امیر معاویہ[۵]۔ یزید[۶]۔ عبدالملک[۷] بن مروان بعد قتلِ ابن زبیر۔ ولید[۸]۔ سلیمان[۹]۔ حضرت عمر[۱۰] بن عبدالعزیز۔ یزید[۱۱]۔ ہشام[۱۲] اور ولید[۱۳] بن یزید۔ انہوں نے سلیمان و یزید کے درمیان شک کیا ہے لہٰذا ان دو کو ایک شمار کیا گیا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی اس طرح گنتے ہیں:۔ حضرت[۱] ابوبکرؓ۔ حضرت[۲] عمرؓ حضرت[۳] عثمانؓ۔ حضرت[۴] علیؓ۔ حضرت[۵] حسنؑ۔ امیر معاویہ[۶]۔ حضرت ابن[۷] زبیر۔ حضرت عمر بن[۸] عبدالعزیز۔ مہتدی[۹] عباسی۔ مہدی[۱۰] عباسی باقی دو کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک محمد مہدیؑ اہلِ بیت میں سے ہونگے اور دوسرا کوئی اور۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: تاریخ الخلفاء مطبع مجتبائی ص ۱۱-۱۲۔

مقامِ تعجب ہے کہ علامہ ابن حجر عسقلانی تو بارہ خلفاء کے نام بتلائیں۔ ان میں سے ایک تو جناب یزید ہوں جن کے کارنامے زبان زدِ خلائق ہیں اور جو کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں۔ خاندانِ امیہ کے اس چشم و چراغ نے واقعہ ہائلہ کربلا کے بعد مدینہ منورہ میں کشت و خون کا بازار گرم کرایا اور سینکڑوں صحابہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ مکہ مکرمہ میں اس قدر سنگ باری و آتش باری کرائی کہ غلاف کعبہ جل گیا اور عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ رہے ولید، ماشاء اللہ چشم بد دور۔ ہمیشہ نشہ شراب میں مخمور رہا کرتے تھے اور کچھ اس قسم کی مکروہ حرکات کرتے تھے جن کا یہاں تحریر کرنا کتاب ہذا کو ملوث کرنا ہے۔ شائق حضرات البلاغ المبین ص ۵-۱۸، ۱۹۷ ملاحظہ فرمائیں۔ نیز دیکھئے: تاریخ الخلفاء۔ جلال الدین سیوطی مطبوعہ مطبع مجتبائی ص ۱۲-۱۳

یہ ہیں حکومتِ الٰہیہ کے خلفائے الٰہیہ جو کھینچ تان کر جناب رسالت مآبؐ کی پیشین گوئی کے مصداق قرار دیئے جا رہے ہیں۔ اگر اس قسم کے لوگ حکومتِ الٰہیہ

کے خلفاء تصور کئے جائیں تو معلوم نہیں کہ حکومتِ فرعونیہ کے دیوِ استبداد کے لئے کون سا طرۂ امتیاز ہوگا۔

بُرا ہو آبائی و موروثی عقائد کے تعصبات کا۔ کُلُّھُم مِن عترتی کی بجائے کلھم من قریش کے بناوٹی فقرے کے پیچھے پڑ کر علمائے اسلام گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گئے اور آج تک حقیقی خلفائے اسلام کا صحیح پتہ نہ چلا سکے۔ ڈھکوسلے اور اٹکل پچو سے کام لیتے رہے۔ حالانکہ اہلِ بیتِ رسولؐ میں سے بارہ خلفاء (آئمہ اثنا عشرؑ) اپنی بے لوث زندگی، علمی کمالات و روحانی فضائل کے باعث اس پیشین گوئی کے حقیقی مصداق ہیں۔ بہرحال اتنا تو ضرور مسلماتِ تاریخیہ میں سے ہے کہ بنی اسمٰعیلؑ میں سے بارہ سردار پیدا کرنے کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ سے کیا گیا تھا۔ اس لئے تمام خیر و برکت حضرت اسمٰعیلؑ کے گھرانے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے جب ہی تو حکیم الامت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

باب پنجم

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

ہم نے اس کے فدیہ میں ایک عظیم قربانی
قرار دی ہے اور اس کو ہم نے آئندہ آنے
والوں میں باقی رکھا ہے

(والصّٰفّٰت-۱۰۷-۱۰۸)

ذبیحِ موعودؑ

گزشتہ باب میں حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی پر بائیبل کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ اب اسی عظیم فداکاری اور اس کے محیرّ العقول نعم البدل کو قرآن کے رنگ میں دیکھتے ہیں اور اسلامی زاویۂ نگاہ سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے:۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى
فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ
يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا
لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

(ترجمہ) پس ہم نے ابراہیمؑ کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔ جس وقت وہ ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو ابراہیمؑ نے کہا۔ اے میرے بیٹے یقیناً میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ پس تو دیکھ کہ تیرا کیا خیال ہے۔ اسمٰعیلؑ نے عرض کیا۔ اے باباجان! جو کچھ کہ آپ کو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجئے۔ اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ پس جب دونوں نے حکم خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کرلیا تو اسمٰعیلؑ کو ابراہیمؑ نے **پیشانی کے بل لٹا دیا** ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ بیشک تونے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک یہ تو ظاہراً ایک آزمائش تھی۔ ہم نے اس کے فدیہ میں ایک **عظیم قربانی** قرار دی ہے اور اس کو ہم نے آئندہ آنے والوں میں باقی رکھا ہے۔" (الصّٰفّٰت ۱۰۱ - ۱۰۸)

حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے (ابن رسول) کو ذبح کر رہے ہیں۔ آپ نے خیال فرمایا کہ قدرت بیٹے کی قربانی کی طالب ہے اور ایک ابتلائے عظیم درپیش ہے۔ یاد رہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قیاس حقائق پر مبنی تھا۔ اجتہادی غلطی نہ تھی

(مفصل بحث کا انتظار کیجئے) چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے امتحانِ صبر میں پورا اترنے کی سعی کی اور اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ سے خواب کا تذکرہ کیا۔ پیکرِ صبر و رضا نے قربانی کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ جب دونوں باپ بیٹا تعمیلِ حکمِ خداوندی کے لئے تیار ہو گئے تو حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا کر پشتِ گردن پر چھری رکھی یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو **مذبوح من القفاء** کرنا چاہا۔ ندا آئی کہ اے ابراہیمؑ! آپ نے خواب کو سچا کر دکھایا اور اپنے **اکلوتے بیٹے** کی قربانی پر آمادگی کا اظہار کیا "**اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَات**" کے تحت آپ کو اجرِ عظیم دیا جاتا ہے اور امامتِ کبریٰ کی فضیلت عطا کی جاتی ہے لیکن ہم نے اسمٰعیلؑ کے بدلے ایک عظیم الشان قربانی لینے کا فیصلہ کر رکھا ہے جس کو ہم نے آخرین میں چھوڑا ہے۔

اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا صریح حکم ملا اور پھر جانبین سے تعمیل پر آمادگی کا اظہار ہوا تو پھر تکمیل سے پہلے حکم کیوں واپس لے لیا گیا؟ اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ یہ امتحانِ صبر و شکر تھا۔ چونکہ نیت ہی سے اعمال کا اندازہ ہو سکتا ہے لہٰذا جناب ابراہیمؑ کی آمادگی ہی نظرِ قدرت میں تکمیلِ قربانی کی مترادف سمجھی گئی۔ گو یہ جواب کسی حد تک درست ہے لیکن "فَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ" سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی طالب نہ تھی بلکہ اس کے پسِ پردہ کوئی اور عظیم الشان قربانی مطلوب تھی۔ اگر اس عظیم الشان قربانی سے مراد مینڈھا یا گوسفند لیا جائے جیسا کہ بعض مفسّرین کا خیال ہے تو یہ درست نہ ہوگا کیونکہ کسی گوسفند کو خواہ اس کی پرورش جنّت ہی میں کیوں نہ ہوئی ہو، خواص کا تو ذکر ہی کیا، عام انسان پر بھی فضیلت محال ہے جیسا کہ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ سے ظاہر ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے ایک نبی زادہ پر، جو خود بھی نبی اور نبیِ ختم المرسلینؐ کے نور کا حامل بھی ہو، ایک دنبہ کو فضیلت دی جائے۔ مزید براں تعجب خیز امر یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ کے جدّ امجد حضرت

ابراہیمؑ جو اولوالعزم نبی، رسول، امام اور شارع اعظم ہیں بیٹے کو قربانی کرتے وقت ماتھے کے بل لٹاتے ہیں اور حلقوم پر چھری رکھنے کی بجائے بیٹے کو "مذبوح من القفاء" بنانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنا نہ تو کسی شریعت میں جائز ہے اور نہ کسی مہذب قوم میں رائج۔ کیا جناب ابراہیمؑ شریعت کے اس قانون سے (معاذاللہ) ناآشنا و ناواقف تھے کہ قربانی کرتے وقت ذبیحہ کو پشتِ گردن کی طرف سے ذبح نہیں کیا جاتا۔ یقیناً یہ لاعلمی حضرت ابراہیمؑ کی شان کے منافی ہے اور کسی نبی کے متعلق ایسا گمان کرنا بھی کفر و ضلالت ہے۔ گو بعض مفسرین اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا کر اس لئے ذبح کرنے کی کوشش کی کہ مبادا باپ بیٹے کی آنکھوں کا چار ہونا تکمیلِ فرض میں حائل ہو جائے مگر یہ جواب بھی درست نہ ہوگا۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے ہی سے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی لہٰذا نظریں چار ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ خواب میں **تمثیلی طور پر** حضرت ابراہیمؑ کو سانحۂ کربلا کا دردانگیز منظر دکھایا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا کوئی ابنِ رسول سر بسجدہ ماتھے کے بل پڑا ہوا ہے اور پشتِ گردن پر خنجر چل رہا ہے۔ آپ نے خیال فرمایا کہ خواب کا منظر مجھ سے متعلق ہے کہ میں اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو ماتھے کے بل لٹا کر پشتِ گردن پر چھری رکھ کر راہِ خدا میں نثار کردوں۔ ندا آتی ہے کہ قدرت تو ایک عظیم الشان قربانی کی متقاضی ہے جو اسمٰعیلؑ کے فدیہ میں مقدر ہو چکی ہے۔ اور جس کو ہم نے آئندہ آنے والوں میں باقی رکھا ہے ظاہر ہے کہ وہ عظیم الشان قربانی حضرت اسمٰعیلؑ ہی کی نسل سے کربلا کے بے آب وگیاہ بیابان میں پوری شان و منزلت سے پیش ہوئی لہٰذا ثابت ہوا کہ منیٰ کی قربانی کے سلسلہ میں جس ذبحِ عظیم کا عہد کیا گیا تھا وہ ذبیح موعود، مظلوم کربلا، مذبوح من القفاء ذبیح نینوا جناب حسینؑ ہیں جن کی عظیم الشان قربانی نے شہادت کی فضیلت کو چار چاند لگا دیئے۔

معترض اب صرف ایک ہی اعتراض کر سکتا ہے وہ یہ کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے خواب میں جب منظرِ کربلا دیکھا تو اس کو کیوں ذبحِ اسمٰعیلؑ پر محمول کیا ؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے ؟ ہم کہیں گے کہ سوادِ اعظم کے عقیدہ کے مطابق ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ صحیح بخاری باب ہجرۃ النبیؐ میں ہے کہ نبی کریمؐ نے خواب دیکھا کہ آپ نے مکّہ سے ایک سرسبز و شاداب مقام کی طرف ہجرت فرمائی۔ آپ کا خیال تھا کہ ہجرت یمامہ یا ہجر کی طرف ہوگی لیکن یمامہ یا ہجر کی بجائے مدینہ نکلا۔ اصل عبارت کا اردو ترجمہ علامہ شبلی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:۔

"آنحضرتؐ نے خواب دیکھا کہ دارالہجرت ایک پُر باغ و بہار مقام ہے، خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر مدینہ نکلا۔" (سیرۃ النبی حصہ اول طبع پنجم ص: ۲۶۸)

آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمان امن کی حالت میں حج کر رہے ہیں۔ آپؐ نے صحابہ کرام کی معیت میں روانگی فرمائی۔ قریش کی مزاحمت سے حج نہ ہو سکا حدیبیہ کا عہد نامہ مرتب ہوا اور آنحضرتؐ بغیر حج واپس آگئے۔ بعض مقتدر صحابہ نے اعتراضات بھی کئے اور بعض غلط فہمی کا شکار بھی ہو گئے۔ لیکن حج اس سال کی بجائے دو سال بعد ہوا اور کمزور دل و ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے شکوک رفع کرنے کے لئے قدرت کو یہ آیۂ کریمہ نازل فرمانی پڑی :۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ (الفتح : ۲۷)

(ترجمہ) "بیشک اللہ نے اپنے رسولؐ کے برحق خواب کو سچا کر دکھایا۔ اگر اللہ نے چاہا تو تم امن و امان سے اپنے سروں کو منڈاتے ہوئے اور بال کترواتے ہوئے مسجد الحرام میں جا داخل ہوگے۔ پھر کبھی تم کو خوف پیش نہ آئیگا۔ پس وہ جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے۔ اس نے اس کے علاوہ ایک اور فتح مقرر فرما دی۔"

ممکن ہے بحثِ مذکور سے بعض حضرات یہ نتیجہ اخذ کریں کہ تمثیلی رؤیا کے موقع و محل کے تعیّن میں انبیاء علیہم السلام وقتی طور پر غلطی کرتے ہیں جس کو بعض لوگ اجتہادی غلطی سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ علامہ شبلی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

" اکابر صوفیاء نے لکھا ہے کہ انبیاءؑ کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں دو قسم کے ہوتے ہیں **عینی** اور **تمثیلی**۔ عینی میں بعینہٖ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے۔ تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو پورا کرنا ہوتا ہے .... حضرت ابراہیمؑ نے خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہٖ اس کی تعمیل کرنا چاہی گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاءؑ سے ہوسکتی ہے (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اس پر متنبہ کردیتا ہے) اس بناء پر گو حضرت ابراہیمؑ اس فعل سے روک دیئے گئے لیکن خدا نے ان کے حسنِ نیّت کی قدر کی "

(سیرت النبیؐ شبلی نعمانی۔ جلد اوّل۔ طبع پنجم۔ ص ۱۴۵ - ۱۴۷)

علامہ شبلی اور ان کے ہم خیال حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاءؑ سے اجتہادی غلطی سرزد ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اب تک جو کچھ بیان ہوچکا ہے ان لوگوں کی تسلی کے لئے جو علامہ شبلی کے ہم عقیدہ ہیں کافی ہے مگر مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں علامہ موصوف کے اس نظریہ سے اختلاف ہے ان کا خیال ہے کہ انبیاءؑ اس قسم کی اجتہادی غلطی و خطا سے بالکل پاک و منزّہ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ایک طویل بحث کا آغاز کرنا کہ کیا انبیاءؑ سے اجتہادی غلطی ہوسکتی ہے یا نہیں ہمارا مقصود نہیں اور نہ ہی ہماری مختصر سی تالیف اس بارِ گراں کی متحمل ہوسکتی ہے ایک مسلمان کی تسلّی کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ خدا کے رسولؐ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى .... الخ کی رو سے کوئی بات بھی ہوا و ہوس سے نہیں کرتے بلکہ ان کا ہر قول و فعل حکمِ خدا کے تحت ہوتا ہے۔

امر واقعہ تو یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی غلط فہمی کا ازالہ خود حضور نبی کریمؐ نے اسی وقت اچھی طرح سے فرما دیا تھا۔ جب بعض صحابہؓ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اسی شک کی بنا پر اعتراض کیا تھا۔ اس واقعہ کو ہم علامہ شبلی کی زبانی نقل کرتے ہیں:۔

"حضرت عمرؓ ضبط نہ کرسکے۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے اور کہا "یا رسول اللہ! کیا آپ پیغمبر برحق نہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا "ہاں، ہوں"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "کیا ہم حق پر نہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا "ہاں ہم حق پر ہیں"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟" آپ نے فرمایا "میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔ خدا میری مدد کرے گا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ "کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟" آپ نے فرمایا۔ "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے"۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ "وہ پیغمبر خدا ہیں جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں"۔ (سیرت النبی مولانا شبلی نعمانی جلد اول۔ طبع پنجم ص ۴۵۶۔۴۵۷)

صحیح بخاری۔ کتاب الشروط۔

کتاب الخمیس و سیرت ابن ہشام میں ہے کہ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ جو فعل مجھ سے بروزِ حدیبیہ سرزد ہوا اس کے خوف سے میں ہمیشہ صدقہ دیتا رہا اور بطورِ کفارہ صوم و صلوٰۃ ادا کرتا رہا۔ (تاریخ احمدی۔ ص: ۵۶)

اس موقع پر مندرجہ ذیل **"امور"** خاص طور پر توجہ طلب ہیں:۔

۱۔ آنحضرتؐ پیغمبرِ خدا تھے۔ جو کچھ کرتے تھے خدا کے حکم سے کرتے تھے۔ نبی کریمؐ نے خواب دیکھا کہ ہم امن کی حالت میں حج کررہے ہیں۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے خواب کا تذکرہ فرمایا۔ حج کی تیاری کی اور بحکمِ خدا حج کے لئے روانہ ہوئے۔

۲۔ آپؐ نے صحابہؓ سے یہ مزید بیان فرمایا کہ ہم انشاءاللہ پُرامن حالت میں سروں کو منڈواتے ہوئے حج کریں گے لیکن یہ نہ کہا کہ حج اسی سال کریں گے۔

۳۔ بعض صحابہؓ حج کی پر امن تیاری سے یہ سمجھ رہے تھے کہ چونکہ عمرہ کا احرام باندھا جا رہا ہے اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے جا رہے ہیں لہٰذا اسی سال حج ہوگا۔ صلح حدیبیہ کے بعد حج (عمرہ) کے ناتمام رہنے سے وہ غلط فہمی کا شکار ہوگئے۔

۴۔ نبی کریمؐ نے بحکمِ خدا صلحنامہ حدیبیہ مرتب کرایا اور حدیبیہ ہی کے مقام پر احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائے، قربانی کے جانور ذبح کرائے اور کعبہ کا حج کئے بغیر وہاں ہی سے واپس پلٹ آئے۔

۵۔ دو سال بعد امن کی حالت میں سروں کو منڈواتے ہوئے دس ہزار قدسیوں کی معیت میں (استثنا۔ ۳۴: ۲) حج کیا۔ نبی کریمؐ کا خواب خدا نے سچ کر دکھلایا۔
لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ (الفتح: ۲۷)

حدیبیہ کا معمہ:۔ ان حقائق کے پیشِ نظر لازماً خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا معمہ تھا؟ آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے خواب کا ذکر فرمایا۔ عمرہ کا احرام باندھا۔ قربانی کے اونٹ ساتھ لئے (ابن ہشام) حج کو روانہ ہوئے اور بغیر حج کئے واپس تشریف لے آئے۔ بعض صحابہ کے استفسار پر فرمانے لگے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں حکمِ خدا سے کرتا ہوں اور میں نے کب کہا تھا کہ حج اسی سال کریں گے۔ آخر یہ ایسا کیوں ہوا؟ صحابہ کرامؓ غلط فہمی کا شکار کیوں ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور نبی کریمؐ بذاتِ خود کسی اجتہادی غلطی میں مبتلا نہ تھے۔ وہ ہر کام میں حکمِ خدا کے پابند تھے۔ حکم ہوا کہ صحابہ کو اپنے خواب سے آگاہ کردو۔ ارشادِ خداوندی کی تعمیل کی۔ پھر حکم ہوا کہ حج کی تیاری کرو۔ تیاری فرمائی اور روانہ ہوئے۔ ارشادِ باریؑ ہوا کہ حدیبیہ کا عہد نامہ مرتب کرو۔ تعمیلِ حکم کی۔ خدا نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اس کی

مصلحت تھی جس کو وہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے۔ تاہم چند باتیں جن تک انسانی ادراک کی رسائی ممکن ہے، بیان کی جاتی ہیں :-

۱۔ مسلمانوں کا امتحان کیا جائے کہ انہیں کہاں تک ایمان کی پختگی حاصل ہو چکی ہے کیا وہ رسولِ خدا کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرتے ہیں یا اپنی عقل و قیاس پر بھروسہ کرتے ہیں۔

۲۔ عملِ رسولؐ میں یہ مصلحتِ خداوندی پوشیدہ تھی کہ عہد نامہ حدیبیہ مرتب ہو تاکہ کفارِ عرب مسلمانوں سے کھلم کھلا میل جول پیدا کریں۔ باہمی تنفر دور ہو۔ مل بیٹھنے کے مواقع فراہم ہوں۔ اس طرح قریب ہو کر انہیں اسلام کے قوانین پر غور کرنے کا موقع ملے تاکہ ان کا باشعور طبقہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو سکے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس باہمی میل جول کی وجہ سے دو سال کے قلیل عرصہ میں اسلام نے اس قدر ترقی کی کہ حدیبیہ کے موقع پر آنحضرتؐ کے ساتھ چودہ سو صحابہ تھے مگر جب آپ دوسری بار حج کو تشریف لے گئے تھے تو آپ کے ساتھ دس ہزار قدسیاں کی تعداد کثیر موجود تھی۔

۳۔ خداوند تعالیٰ کو عہد نامہ حدیبیہ سے نبی کریمؐ کی امن پسندی، رواداری اور عہد کی پابندی دکھانا مطلوب تھی۔ ابوجندل کے واقعہ سے جس نے حضرت عمرؓ کو بیتاب کر دیا تھا مشرکینِ مکہ پر واضح ہو گیا کہ آنحضرتؐ عہد کی پابندی کس سختی کے ساتھ کرتے ہیں۔

۴۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو جناب رسالتمآب کے صبر و استقلال، جرأت و شجاعت اور عزمِ صمیم کا اظہار مقصود تھا۔ ابوجندل کا واقعہ دیکھ کر مسلمانوں کی اکثریت پر مایوسی و اضطراب کی کیفیت طاری ہوئی مگر آنحضرتؐ تمام صحابہ کے ناصحانہ و ہمدردانہ مشوروں کے خلاف سختی سے اپنے ارادہ پر ڈٹے رہے اور محض حکمِ خداوندی کی اطاعت کی اور صحابہ کے مشفقانہ و ناصحانہ مشوروں کو مسترد کر دیا۔

۵۔ نبی کریمؐ نے اپنے عمل سے دکھا دیا تھا کہ نبیؐ محض وحیٔ آسمان کا مطیع ہے

وہ لوگوں کے مشوروں اور رایوں کا محتاج نہیں ۔

۶۔ خدا اور رسولؐ کے ہر فعلِ حکیمانہ آمریت کارفرما رہتی ہے ۔ یہاں خود غرض و نفع کوش و مفاد پرست **جمہوریت** کا گزر نہیں ۔ حضرت آدمؑ کے مقابل حصولِ خلافت کے مسئلہ پر تمام فرشتوں کا مکمل اجماع تھا اور بلا تفریق ملائکہ کی اکثریت ایک طرف تھی لیکن **خدائی آمریت** نے فرشتوں کی جمہوری تنظیم و اتحاد کے خلاف حتمی فیصلہ صادر فرما دیا تھا **فَانْهَمُ وَ فَتَدَبَّر** ۔

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمے آید

۷۔ صلح حدیبیہ فی الحقیقت **فتح مبین** تھی کیونکہ مشرکینِ مکہ نے اس عہد نامہ سے نبی کریمؐ کو عملاً مساویانہ طاقت کا قائد تسلیم کر لیا تھا ۔ اس عہد نامہ سے پیشتر مسلمان ان کی نگاہ میں بالکل بے وقعت تھے ۔ اسی تاریخی حقیقت کو مشہور متعصب مؤرخ ولیم میور ان الفاظ میں تسلیم کرتا ہے :-

" In truth Mohamet had gained a real victory. He had forced the Coreish to recognise him, as a POWER to be treated with in equal terms. and LIBERTY had been accorded every one to join Islam at his discretion. " (Mohamet and Islam: page 163)

(ترجمہ) " فی الحقیقت حضرت محمدؐ نے حقیقی فتح حاصل کر لی تھی ۔ انہوں نے قریش کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ آنحضرتؐ کو ایک ایسی **قوت** تسلیم کر لیں جس کے ساتھ مساویانہ شرائط پر برتاؤ کیا جائے اور ہر شخص کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق قبول اسلام کی آزادی

دے دی گئی"۔

صلح حدیبیہ کے نتیجہ نے ثابت کردیا کہ یہ عہد نامہ "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا" کی رُو سے فتح مبین کا پیش خیمہ تھا جس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے خدا اپنی مصلحت کے مطابق اپنے رسولؐ سے عمل کرا رہا تھا۔ لیکن بعض صحابہؓ جو اس مصلحتِ خداوندی کی عمیق گہرائیوں تک نہ پہنچ سکے یہ سمجھنے لگے کہ نبی کریمؐ (معاذاللہ) خواب کی تعبیر سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں امر واقعہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر وحی آسمانی کا تابع ہوتا ہے وہ کسی حکم کی تعمیل میں قولاً یا فعلاً کمی یا بیشی نہیں کرسکتا۔ وہ ہر وقت مصلحتِ خداوندی کے مطابق عمل پیرا رہتا ہے۔ یہی اصول نبی کے ہر خواب سے متعلق ہے خواہ وہ عینی ہو یا تمثیلی ۔۔۔ چونکہ حقیقتِ خواب عوام کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے اس لئے بعض کم فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کا عمل خواب کی حقیقت کے خلاف ہے اور وہ اجتہادی غلطی کر رہے ہیں حالانکہ وہ اجتہادی غلطی نہیں بلکہ مصلحتِ خداوندی ہوتی ہے جس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے غالباً اس امر کی طرف آیۂ زیر بحث کے الفاظ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (الفتح ۲۷) میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مصلحتِ خداوندی کو جانتا تھا اور تم اس سے لاعلم تھے۔ یقیناً (وقت آنے پر) خدا نے اپنے پیغمبرؐ کا خواب سچا کر دکھایا کہ تم امن و امان کے ساتھ اپنے سروں کو منڈاتے ہوئے اور بال کترواتے ہوئے مسجد الحرام میں جا داخل ہوگئے۔

اس طویل بحث کے بعد ہم نفسِ مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا خواب عینی نہ تھا بلکہ تمثیلی تھا۔ اگر عینی ہوتا تو گوسفند ذبح نہ ہوتا بلکہ فی الحقیقت اسمٰعیلؑ ہی ذبح ہوتے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا ذبح ہونے سے بچ جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ خواب تمثیلی تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی اس حقیقت کی تائید میں امام ابوبکر ابن العربی مالکی کے بیان کو سیرت النبیؐ جلد اول۔ ص ۲۴۶۔ پر اس طرح نقل کرتے ہیں:۔

"بعض رؤیا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی و تصریحی جو بالکل لفظاً بلفظاً واقعہ

کے عین مطابق ہوتے ہیں) بعض کنیتوں کی طرح ہوتے ہیں لیعنی کسی معنوی مناسبت
سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ
کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا۔" (احکام القرآن جلد ۲۔ ص: ۱۹۴ مصر)

پس ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کا خواب مناسبتِ معنوی کے سبب سے کسی
دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھایا گیا تھا اور " تلہ للجبین " نے دوسرے ہم شکل
واقعہ کی حقیقت واضح کردی کہ ذبیحہ کو ماتھے کے بل لٹا کر پشتِ گردن سے ذبح
کیا جائے گا۔ تاریخ عالم میں پشتِ گردن سے ذبح ہونے والی ہستی بجز جناب حسینؑ
کون ہے ؟ گوسفند کسی صورت میں وہ حقیقی ذبیحہ نہیں ہوسکتا جس کو حضرت اسمٰعیلؑ
سے کوئی معنوی مناسبت ہو کیونکہ نہ اس کو حضرت اسمٰعیلؑ کے مقابلہ میں کوئی عظمت
حاصل تھی کہ وہ ذبحِ عظیم کا مصداق قرار دیا جائے اور نہ وہ پشتِ گردن کی طرف
سے ذبح ہوا کہ وہ تلہ للجبین کے ہم شکل واقعہ کا باعث بن سکتا۔ اگر وہ پشتِ گردن
کی طرف سے ذبح ہوتا تو ہمیشہ قربانی کے گوسفند جو مقامِ منیٰ پر آج تک قربان
ہوتے چلے آرہے ہیں پشتِ گردن کی جانب سے ذبح کئے جاتے کیونکہ یہ تمام
قربانیاں اسی قربانی کی یادگار میں دی جاتی ہیں جو حضرت ابراہیمؑ نے منیٰ کی وادی
میں دی تھی۔ ان حقائق سے صاف عیاں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی تمثیلی خواب کی
تعبیر گوسفند کا ذبح ہونا نہ تھا بلکہ اس ذاتِ گرامی کی شہادت تھی جس کو حضرت
اسمٰعیلؑ کے ساتھ خونی تعلق کی بنا پر معنوی مناسبت بھی تھی اور جس نے میدانِ
کربِ و بلا میں مذبوح من القفا ہوکر " تلہ للجبین " کے ہم شکل واقعہ کا نقشہ
بھی پیدا کردیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سانحۂ کربلا ہی اپنی معنوی مناسبت
کے اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں دکھایا گیا تھا۔ اس معنوی مناسبت کی
مثالیں قرآنِ حکیم و احادیثِ نبوی میں بکثرت موجود ہیں مثلاً حضرت یوسفؑ کا اپنے

ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں سجدہ کرتے دیکھنا حضور انور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں اور اُحد میں مسلمان شہداء کو مذبُوح گائیوں کے رنگ میں دیکھنا۔ شاہِ مصر کا خواب کہ سات دبلی پتلی گائیں سات موٹی تازی گایوں کو کھا جاتی ہیں اور سات سوکھی بالیاں سات ہری بھری بالیوں پر غالب آجاتی ہیں، اسی تمثیلی رنگ کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے ساتھ قید میں رہنے والے دونوں نوجوانوں کے خواب بھی تمثیلی حیثیت رکھتے تھے۔ پس جس طرح یہ تمام خواب عینی نہ تھے بلکہ تمثیلی تھے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا خواب بھی تمثیلی تھا۔ درحقیقت حضرت اسمٰعیلؑ ذبح نہیں ہو رہے تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے فرزند میدان کربلا میں ذبح ہو رہے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا بوقتِ ذبح ماتھے کے بل لٹایا جانا ظاہر کر رہا تھا کہ پیکرِ صبر و رضاء فرزندِ رسولؐ ماتھے کے بل پڑے دینِ خدا کے تحفظ کے لئے مذبوح من القفاء ہوں گے۔

جس طرح نبی کریمؐ حج کا اہتمام کر کے عازمِ حج ہوئے تھے مثلاً عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے اسی طرح حضرتِ ابراہیمؑ اہتمام ذبح کر کے روانہ ہوئے یعنی رسی، چھری وغیرہ ساتھ لی، جس طرح نبی کریمؐ نے حدیبیہ میں احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائے اور قربانی کے جانور اونٹ کو ذبح کیا اسی طرح مقامِ منیٰ پر حضرت ابراہیمؑ نے آنکھوں پر پٹی باندھی اور گوسفند ذبح کیا۔ نہ جناب رسالتمآب نے اس موقع پر فی الحقیقت بیت اللہ کا حج کیا اور نہ حضرت ابراہیمؑ نے جناب اسمٰعیلؑ کو فی الواقع ذبح کیا۔ جس طرح نبی کریمؐ نے حج کی رسومات ادا کر دیں اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی شرائط پوری کر دی تھیں۔ جس طرح نبی کریمؐ کی حدیبیہ میں ادا کردہ رسومات وہ حج نہ تھا جو تمثیلی خواب کا مقصود تھا اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی جو شرائط مقامِ منیٰ میں انجام دیں وہ درحقیقت وہی عظیم الشان قربانی نہ تھی

جو خوابِ ابراہیمی کا منشا تھا۔ جس طرح حضرت رسالتمآبؐ کا حج دو سال کے بعد دس ہزار قدسیوں کی معیّت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کا خواب میدانِ کرب و بلا میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ پس ثابت ہوا کہ ہر دو مواقع پر پیغمبرانِؑ خدا اجتہادی غلطی کا ارتکاب نہیں کر رہے تھے بلکہ مصلحتِ خداوندی کارفرما تھی۔

ایک نقطہ :۔ اس موقع پر ایک اور نکتہ وضاحت طلب ہے ورنہ ہمارے دعویٰ کا ایک پہلو بلا دلیل اور تشنۂ تکمیل رہ جائے گا۔ وہ یہ ہے کہ خوابِ ابراہیمؑ میں " اِنِّی اَذْبَحُكَ " کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے تھے لیکن میدانِ کربلا میں حضرتِ حسینؑ دشمنانِ دین کے ہاتھوں سے ذبح ہوئے۔ اس اعتبار سے ہر دو واقعات میں بظاہر معنوی مناسبت یا مماثلت مفقود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جنابِ خلیلؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کیوں پیش کی؟ محض خدا کی رضاجوئی کے لئے۔ حضرت حسینؑ میدانِ کربلا میں کیوں ذبح ہوئے؟ محض خدا کی خوشنودی اور دینِ خدا کے تحفّظ کی خاطر۔ اگر امام عالیمقامؑ اسلام کے تحفّظ کے لئے تیار نہ ہوتے تو کیا ذبح ہوتے؟ ہرگز نہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ امامؑ کا ذبح ہونا اس شجرِ اسلام کی آبیاری کے لئے تھا جس کو مکّہ کے بے آب و گیاہ بیابان میں خلیل اللہ نے یہ کہتے ہوئے لگایا تھا:۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ

(ابراہیمؑ : ۳۷) ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے پاس ایسے بیابان میں جس میں کھیتی باڑی کچھ نہیں ہے آباد کر دیا ہے۔ اور پھر بیت اللہ کی دیواریں اٹھاتے وقت یوں فرمایا۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرۃ : ۱۲۸)

(ترجمہ) ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار قرار دے اور ہماری اولاد میں سے امّت مسلمہ بنا...

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ حضرت حسینؑ نے اس ملت کی بقاء کے لئے جان دی جس کی بنیاد خود جناب ابراہیمؑ نے رکھی تھی۔ اگر حضرت خلیلؑ اس ملت کی بنیاد قائم نہ کرتے تو نہ اس کے تحفظ کا سوال پیدا ہوتا اور نہ ہی امامِ ذی شانؑ کو جان کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا۔ جناب ابراہیمؑ نے شجرِ اسلام کی آبیاری کے لئے امام حسینؑ کی قربانی کی وجہ پیدا کر دی۔ اس لئے تمثیلی رنگ میں شہادتِ عظمیٰ کو خلیل اللہؑ نے اپنی طرف منسوب کیا کہ۔ اے میرے بیٹے! میں تجھے ذبح کر رہا ہوں یعنی تو میری وجہ سے ذبح ہو رہا ہے۔ دیکھ تیری کیا رائے ہے؟ جواب ملتا ہے کہ آپ حکمِ خداوندی کی تعمیل کریں اور بنائے دین کو استوار کریں۔ آپ انشاءاللہ مجھے صابر و شاکر پائیں گے۔ کیا ان الفاظ میں ذبحِ عظیم کی نسبت ایک لطیف سا اشارہ موجود نہیں کہ عالی منزلت امامؑ کی یہ عظیم الشان قربانی ان کی مرضی کے خلاف بالجبر پیش نہ ہوگی بلکہ فرزندِ رسولؐ رضاکارانہ طور پر اس حیرت انگیز کارنامہ کو سرانجام دیں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مظلومِ کربلاؑ نے انتہائی صبر و شکر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ رَضِیْنَا بِقَضَاءِ اللّٰہِ وَ صَبَرْنَا عَلٰی بَلَائِہٖ اس حقانیت پر اپنے خونِ مقدس سے مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

حضرت ابراہیمؑ کے عمل میں مصلحتِ خداوندی پوشیدہ تھی اور خدا محض بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے ان سے اپنے احکام کی تعمیل کرا رہا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جناب رسالتمآبؐ نے صحابہؓ کے استفسار پر حقیقتِ حال کو واضح کر دیا تھا اسی طرح اگر حضرت ابراہیمؑ سے بھی کوئی استفسار کرنے والی ہستی وہاں موجود ہوتی جو یہ کہتی کہ آپ بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا کر قانونِ شریعت کے خلاف کیوں مذبوح من القفاء کرنے کا ارادہ فرما رہے ہیں تو کیا حضرت ابراہیمؑ معترض کو کوئی جواب نہ دیتے؟ یقیناً دیتے اور غالباً وہی جواب دیتے جو جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا تھا اور جسے سن کر حضرت عمرؓ کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

إِنِّي رَسُوْلُ اللّٰہ ولست اعصیہ وھو ناصری ۔ (صحیح بخاری)

(ترجمہ) "میں خدا کا رسول ہوں۔ اسکے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتا اور وہی میرا حامی و ناصر ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ کی زبانِ مبارک سے یہ ارشاد سن کر "میں تعمیل حکم خدا پر مجبور ہوں" معترض کو بھی حضرت عمرؓ کی طرح خاموش ہونا پڑتا مگر حقیقتِ خواب کسی حد تک آشکار ہو جاتی اور آج علامہ شبلی کے ہمخیال حضرات ایک اولوالعزم پیغمبر پر شاید اجتہادی غلطی کا الزام نہ لگاتے یا نہ لگا سکتے۔

المختصر جناب حسینؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ سے صرف معنوی مناسبت ہی نہ تھی بلکہ امام عالیمقامؑ جناب اسمٰعیلؑ کے گوشت و پوست کا ایک حصہ تھے اور وہی ابراہیمی خون ان کی رگوں میں موجزن تھا اور اس میں وہی ایمانی حرارت موجود تھی جس نے نمرود جیسے باجبروت دیو استبداد کی شان و عظمت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا۔ بقول علامہ اقبالؒ حسینؑ ہی وہ ذبح عظیم تھے جو حضرت اسمٰعیلؑ کے فدیہ میں مذبوح من القفاء ہوئے ؎

اللہ اللہ! بائے بسم اللہ پدر معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اپنے مقالہ "شہادتِ حسینیؑ" میں ڈاکٹر اقبالؒ کے معروف ثانی مذکور کی یوں تشریح کرتے ہیں:۔

اس کا تصفیہ کون کر سکتا ہے کہ ابراہیمؑ کے فرزندِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو امامت ملی کیا وہ بھی اسی امامت کی ایک شان نہ تھی جس کی بشارت ابراہیمؑ کو دی گئی۔ جو بیٹے کو ملا کیا وہ باپ ہی کو نہ ملا؟ پھر اس طرح ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کربلا میں جو شہید ہوا وہ بھی اسی ذبح کا ایک جزو تھا جس کو منیٰ کے ایک گوشہ میں ذبح کرنے کے لئے خلیل علیہ السلام نے پچھاڑا تھا۔ اسمٰعیلؑ نہیں شہید ہوئے تو حسین علیہ السلام جو اسحاقؑ کے نہیں بلکہ اسمٰعیلؑ ہی کے بچے تھے۔ کیا ان کی شہادت کو اسی مقدار کی

ہم خبر کہہ سکتے ہیں۔" (داستان کربلا۔ ص: ۱۲۸)

اسی زاویۂ نگاہ کو مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مقالہ "حادثۂ کربلا" میں یوں پیش فرماتے ہیں:

"خاندانِ نبوت دنیا کے آباد کرنے کے لئے ہمیشہ اجڑتا رہا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت کی۔ حضرت موسیٰؑ نے گھر بار چھوڑا۔ حضرت عیسیٰؑ نے آوارہ گردی کی اور نبوت محمدیؐ کے متبعین میں سے حضرت حسینؑ نے کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ سے خاندانِ نبوت کا سلسلہ ملا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک وادی غیر ذی زرع میں شدتِ تشنگی سے ایڑیاں رگڑی تھیں۔ حضرت حسینؑ نے میدانِ کربلا میں اس خاندانی روش کو زندہ کیا اور غالباً یہی مقصود ہے ان مفسرینِ امامیہ کا جو فَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کی تفسیر میں ذبحِ عظیم شہادتِ امامؑ کو قرار دیتے ہیں اور اس بارے میں بعض آئمۂ اہلِ بیتؑ کرام کے آثار نقل کرتے ہیں۔ (داستانِ کربلا ص: ۱۲۹۔ ۱۳۰)

حضرت عبداللہ کی قربانی

کارکنان قضا و قدر نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ سرتاجِ انبیاء، سرورِ کائنات، فخرِ موجودات بنی اسمٰعیلؑ کے مقدس گھرانے میں جنم لیں۔ اگر حضرت اسمٰعیلؑ ذبح ہو جاتے تو یہ منشائے خداوندی کیسے پورا ہوتا۔ لازماً اسمٰعیلؑ قربان ہونے سے بچا لئے گئے اور وقتی طور پر مینڈھا ذبح ہو گیا لیکن قدرت کا ذبحِ عظیم کے متعلق تقاضا بدستور باقی رہا اور کارکنانِ قضا و قدر نے اپنے مطالبہ کا تکرار کیا۔ اب کی بار یہ تقاضا رئیسِ کہ سردارِ قریش حضرت عبدالمطلب سے ہوا کہ وہ اپنے محبوب بیٹے حضرت عبداللہ کو قربان گاہ کی نذر کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں گجراتی زبان کی تالیف "حضرت محمدؐ پیغمبر" سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ مولف نرسیس پرساد کالی داس بھٹ

نے بہاؤ نگر سے یہ کتاب سمت ۱۹۸۴ میں شائع کی۔ فاضل مصنف گجراتی زبان میں رقم طراز ہے:-

શરૂઆતમાં અબ્દુલ-મુત્તલિબને એક જ દીકરો હતો. શત્રુઓની સાથે લડાઇ કરવામાં તથા વ્યવહારના પ્રસંગોમાં પોતાની પડખે ઉભા રહેવાવાળા વધારે પુત્રો હોય તો સારૂં એમ અબ્દુલ-મુત્તલિબને વારંવાર થઇ આવતું. એક વખત તો કાબાના દેવો સમક્ષ તેમણે માનતા કરી કે " હે પવિત્ર કાબાના દેવો, જો મારે દશ દીકરાઓ થશે તો તેમાંથી એક હું તમને અર્પણ કરીશ."

જતે દિવસે મુત્તલિબને દસ દીકરાઓ થયા. દેવોની સમક્ષ કરેલી પ્રતિજ્ઞા પ્રમાણે એક દીકરો અર્પણ કરવો જોઈએ પરંતુ ઘણા દિવસો સુધી મુત્તલિબે માનતા અધૂરી રાખી. છેવટે એક દિવસ અબ્દુલ-મુત્તલિબ આખા કુટુંબને લઈને કાબામાં ગયા; અને ત્યાં જઈને દસ દીકરાઓમાંથી કયો દીકરો અર્પણ કરવો તે સંબંધી દેવોની ઇચ્છા જાણવા કોશિશ કરી.

દેવોની માગણી અબ્દુલ્લાહ ઉપર પડી. અબ્દુલ્લાહ સૌથી નાનો હતો, ઘણો ખૂબસુરત હતો અને બધાં ભાંડુઓના હેતનું પાત્ર હતો. અબ્દુલ્લાહનું નામ પડ્યું કે તરત જ તેની બ્હેનો તેને ગળે વળગી પડી ને રડવા લાગી. પિતાનું હૈયું પણ ખળભળી ઉઠ્યું: " આ દેવોને હું મારી દોલત અર્પણ કરવા તૈયાર છું, જો તેઓ કૃપા કરીને મારા આ દીકરાને જતો કરે" ધીરજ લાવીને તે આગળ આવ્યો ને બોલ્યો: " હે કાબાના દેવો, જો તમે અબ્દુલ્લાહ ઉપરથી

તમારી માગણી ઉઠાવી લ્યો તો તેના બદલામાં હું તમને દસ ખોરાસાની ઊંટો અર્પણ કરૂં છું"

ઊંટો એ આરબોની દોલત હતી: તેમાં પણ ખોરા- સાનનાં ઊંટો બહુ જ કિંમતી ગણાતાં અને મુત્તલેબ જેવા આબરૂદારને ઘેર જ તે જોવામાં આવતાં. દસ ઊંટો અર્પણ કરવાની પ્રતિજ્ઞા કરી મુત્તલેબે ફરીથી દેવોની ઇચ્છા પુછી પણ દેવોએ તો અબ્દુલ્લાહને જ પસંદ કર્યો.

હવે અબ્દુલ-મુત્તલેબે દસને બદલે વીશ ઊંટો અર્પણ કરવા જણાવ્યું; પરંતુ દેવોની પસંદગી તો એ જ રહી. આ પ્રમાણે વધતાં વધતાં આ સ્નેહઘેલા પિતાએ છેવટે સો ઊંટો અર્પણ કરવાનું કબૂલ કર્યું અને આ વખતે દેવોએ અબ્દુલ્લાહને બદલે સો ઊંટોને સ્વીકાર્યાં.

આખા કુટુંબના હર્ષનો તો પાર ન રહ્યો. સૌ અબ્દુલ્લાહને ચૂમી લેવા લાગ્યાં ને તેને લઇને ઘેર પાછાં આવ્યાં.

(حضرت محمدؐ پیغمبر ص: ۳-۵ - نرسیس پرساد کالی داس بھٹ - پرکاشک شری وکشا مورتی پرکاش مندر بہاد نگر)

(ترجمہ)" ابتدا میں حضرت عبدالمطلبؑ کا ایک ہی لڑکا تھا۔ آپ کو وقتاً فوقتاً یہ خیال پیدا ہوتا رہتا تھا کہ دشمنوں کے ساتھ نبرد آزمائی کرتے وقت اور دوسرے دنیوی کاروبار سلجھانے کے لئے اپنے پہلو میں ثابت قدم رہنے والے اگر مزید فرزند ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ ایک دفعہ آپ نے کعبہ کے دیوتا (پروردگارِ کعبہ) کے حضور یہ منّت مانی کہ " اے کعبہ کے مقدس و پوتر دیوتا! اگر میرے دس بیٹے پیدا ہوں

تو ان میں سے ایک کو تیرے قدموں پر نثار کردوں گا۔" وقت گزرتا گیا اور حضرت عبدالمطلبؑ کے بیٹوں کی تعداد دس تک پہنچ گئی۔ دیوتا کے حضور مانی ہوئی منت کے مطابق ایک لڑکے کو قربانی کرنا چاہئے تھا لیکن ایک طویل عرصہ تک حضرت عبدالمطلبؑ نے تکمیلِ منت کو معرضِ التوا میں ڈالے رکھا۔ انجام کار ایک روز حضرت عبدالمطلبؑ تمام قبیلہ کی معیت میں کعبہ میں تشریف لے گئے اور وہاں جاکر دیوتا کا منشاء معلوم کرنے کی کوشش کی (غالباً فال یا قرعہ اندازی سے) کہ دس لڑکوں میں سے کون سا قربانی کے بھینٹ چڑھایا جائے۔ دیوتا نے عبداللہ کی قربانی کا مطالبہ کیا۔ حضرت عبداللہ عمر میں سب بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ بیحد خوبصورت اور تمام بھائیوں کے مقابلہ میں اعلیٰ کردار و ممتاز اخلاق کے مالک تھے جب **عبداللہ** کا نام آیا تو جلد آپ کی بہنیں آپ کے گلے سے لپٹ کر رونے لگیں۔ والد بزرگوار کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ نکلے اور فرمانے لگے "میں دیوتا کے حضور تمام دولت نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ وہ کرپا کرے اور مہربانی فرماکر عبداللہ کی قربانی کا مطالبہ چھوڑ دے"۔ صبر سے کام لیتے ہوئے حضرت عبدالمطلبؑ نے قدم آگے رکھا اور کہا۔" اے کعبہ کے دیوتا! اگر تو عبداللہ کا مطالبہ ترک کر دے تو اس کے عوض تیرے حضور میں دس خراسانی اونٹ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

عربوں کی دولت اونٹ ہی ہوتے تھے اور ان میں (بالخصوص) خراسانی اونٹ بہت ہی قیمتی شمار ہوتے تھے اور عبدالمطلبؑ ایسے معزز و مکرم آدمی کے گھر میں ہی صرف اس قسم کے اونٹ دکھائی دیتے تھے۔ دس اونٹوں کی قربانی کی پیشکش کرنے کے بعد پھر دیوتا کا منشا دریافت کیا لیکن دیوتا نے عبداللہ کا مطالبہ بدستور قائم رکھا۔ پھر عبدالمطلبؑ نے دس کے بدلے بیس اونٹ کی پیشکش کی

مگر دیوتا کا مطالبہ بدستور وہی رہا۔ فیاض والد نے اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے بالآخر سو اونٹ کی پیشکش کی جس کو دیوتا نے عبداللہ کے بدلے قبول کر لیا۔ تمام خاندان کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی اور سب نے عبداللہ کے بوسے لینے شروع کئے اور اسے گھر واپس لائے۔"

احادیث نبوی میں متعدد روایات مذکورہ بالا بیان کی تائید میں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مختصر سی بحث ذبح عظیم (مولفہ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی۔ ص ۳۵۶ - ۳۵۷) میں سپرد قلم کی گئی ہے۔ شائق حضرات ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ ارشاد فرماتے ہیں: اَنَا ابْنُ الذَّبِیْحَیْنِ۔ میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔ ذبیحِ اوّل حضرت اسمٰعیلؑ ٹھیرے اور ذبیح دوم جناب رسالتمآبؐ کے پدرِ بزرگوار حضرت عبداللہؑ ہوئے۔ پس اگر اس موقع پر حضرت عبداللہؑ ذبح ہو جاتے تو کارکنانِ قضا و قدر کا وہ منشا پورا نہ ہوتا کہ: وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْنَ (الشعرا: ۲۱۹) کے تحت حضرت عبداللہؑ کی پشتِ مبارک سے سلطانِ عرب و عجم متولد ہوں۔ پس جس طرح وقتی طور پر مینڈھا ذبح ہوا اور حضرت اسمٰعیلؑ بچا لئے گئے اسی طرح فیاض باپ نے سو خراسانی اونٹ کی قربانی پیش کر کے اپنے عزیز بیٹے حضرت عبداللہؑ کو بچا لیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کا اصلی مقصد ابھی تک پورا نہ ہوا تھا کیونکہ سو اونٹ کی قربانی بھی اگرچہ اس قدر مالِ کثیر خدا کی راہ میں دے ڈالنا امرِ عظیم ہے ذبحِ عظیم کے مترادف و متبادل نہیں ہو سکتی۔ غور و فکر کا مقام ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کا بدل ممکن ہو سکا۔ ایک مینڈھے کی قربانی پر چھوڑ دیئے گئے۔ حضرت عبداللہؑ کا بھی بدل ممکن ہوا۔ سو اونٹ کی قربانی پر بچا لئے گئے۔ لیکن آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ امام حسینؑ کا نہ دنیوی چیزوں میں سے اور نہ ہی اخروی اشیا میں سے کوئی بدل ممکن ہو سکا اگر عالمِ ناسوت یا عالمِ ملکوت میں سے کوئی عوض ممکن ہوتا تو حسینؑ بھی اسی طرح

بچالئے جاتے ۔ ان حقائق کی روشنی میں حسینی قربانی کا اندازہ فرمائیے اس "سرِ عجیب" کو دیکھئے اور اس رازِ پنہاں پر غور کیجئے کہ صدہا زخموں کے باوجود سیّد الشہداء کی روحِ مبارک نے جسدِ اطہر سے اس وقت تک مفارقت نہ کی جب تک گلوئے تشنہ پر خنجرِ جفا پھر کر لفظ ذبح کا مکمل اطلاق نہ ہولیا اور عالی منزلت امامؑ نے مَذْبُوح مِنَ القفاء ہو کر "تلہ للجبین" کا صحیح نقشہ اور صحیح فوٹو پیش نہ کر دیا ان حقائق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ ہی **ذبحِ عظیم** ہیں اور حسینؑ ہی **ذبیح موعود** ہیں ۔

شہادتِ پیغمبر سے منصبِ نبوت میں اختلال کا اندیشہ

کارکنانِ قضا و قدر کے فیصلہ کے مطابق دنیا سے تاریکی و جہالت اور گمراہی و ضلالت دور کرنے کے لئے جناب محمد مصطفےٰؐ تولد ہوئے ۔ آپ نے تئیس (۲۳) سال کے قلیل عرصہ میں کفر و ضلالت کو سرنگوں کر دیا اور توحید و معرفت کو اقصائے عالم میں پھیلا دیا لیکن آپ کے فضائل کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ شہادت کا منصب آپ کو عطا ہوتا اور آپ ہی حقیقی ذبحِ عظیم قرار دیئے جاتے لیکن بقول شاہ عبدالعزیزؒ آپ کی شہادت سے منصبِ نبوت میں **اختلال کا اندیشہ** تھا اس لئے آپ کی بجائے آپ ہی کے فرزند کو میدانِ کرب و بلا میں یہ حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دینا پڑا ۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں :-

" شہادت دراصل فضائل و کمالات کے سلسلہ میں ایک اہم حقیقت ہے اور نبوتِ کبریٰ جو تمام فضائل و کمالات کی آخری حد ہے ضرور تھا کہ اس میں یہ کمال بھی شریک ہوتا لیکن منصبِ نبوت کی شانِ عالی میں اس سے اختلال کا اندیشہ تھا اس لئے قدرت نے اس کمال کو بجائے باپ کے بیٹے کی طرف منتقل کر دیا ۔ شاہ صاحب

نے صحیح حدیثوں سے امام حسین علیہ السلام کا فقط نواسہ ہونا نہیں بلکہ (ابن) بیٹا ہونا ثابت کیا ہے اور عقلی طور پر اپنے اس دعویٰ کو اس سے مدلل کیا ہے کہ حضرت امامؑ اپنے جسم کے نصف حصہ میں آنحضرتؐ سے خلقتہً اشبہ تھے۔ پس جو کمال بیٹے کو ملا وہ باپ ہی کو ملا۔ کیونکہ گو انجیل میں ہے کہ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب بیٹے کا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بیٹے کا ہے سب باپ کا ہے اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ۔ یعنی تو اور جو کچھ تیرا ہے درحقیقت تیرے باپ کا ہے۔ اس بنیاد پر شاہ صاحب کا قول بالکل درست ہے کہ جو فضیلت امام حسینؑ کو حاصل ہوئی وہ دراصل سرورِ کائناتؐ کے فضائل میں داخل سمجھی جائے گی۔" (داستانِ کربلا۔ نفیس اکیڈمی۔ حیدرآباد دکن۔ ص ۱۹۱-۱۹۲)

فی الواقعہ نبی کریمؐ کا یہ قول کہ اَلْحُسَيْنُ مِنِّيْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَيْنِ یعنی حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مذکورہ بالا دعویٰ کی تائید کرتا ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جب بعض احباب نے جنابِ حسینؑ کو سفرِ کوفہ سے باز رکھنے کی سعی کی تو آپ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ نے مجھے ایک ایسے امر کا حکم دیا ہے جس کی تعمیل مجھ پر واجب ہے۔ اسد الغابہ و تاریخ خمیس میں ہے:۔

قَالَ فَنَهَاهُ جَمَاعَةٌ فَقَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَنَامِ وَاَمَرَنِيْ بِاَمْرٍ فَاَنَا فَاعِلٌ مَا اُمِرْ۔ (تاریخ احمدی۔ ص: ۲۹۰)

(ترجمہ) جب امام حسینؑ نے سفرِ عراق کا قصد کیا اور کئی اشخاص مانع ہوئے تو امامؑ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا اور آنحضرتؐ نے مجھے ایک ایسے امر کا حکم دیا کہ جس کی تعمیل مجھ پر واجب ہے۔

مزید برآں تاریخ ابن جریر طبری اور تاریخ کامل ابن اثیر میں لکھا ہے:۔

قَالَ الْحُسَيْنُ لِيَحْيٰى ابن سعيد وَعَبْدُ اللّٰهِ ابْنِ جَعْفَرٍ اِنِّيْ رَأَيْتُ رُؤْيَا فِيْهَا

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ وَاَمَرَنِیْھَا بِاَمرٍ اَنَا مَاضٍ لَہٗ عَلٰی کَانَ اَوْلٰی فَقَالَ لَہٗ فَمَا تِلْکَ الرُّؤْیَا قَالَ مَاحَدَثْتُ اَحدًا بِھَا وَاَنَا مُحَدِّثٌ حَتّٰی اَلْقٰی رَبِّیْ (تاریخ الخمیس ۲)

(ترجمہ) " امام حسینؑ نے یحییٰ ابن سعید اور عبداللہ ابن جعفر سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آنحضرتؐ نے مجھے ایک امر کے لئے مامور کیا ہے جس کی تعمیل میرے لئے اولیٰ ہے اور میں اس کام کا انجام دینے والا ہوں۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا امر ہے جس کی بجا آوری کا آپکو حکم دیا گیا ہے۔ امام حسینؑ نے کہا کہ اس امر کا ذکر نہ میں نے کسی سے کیا ہے اور نہ زندگی بھر کروں گا۔"

ان حقائق سے عیاں ہے کہ ذبح عظیم کی خلعتِ فضیلت جناب رسالتمآبؐ کے لئے مختص تھی لیکن بقول شاہ صاحب ممدوح شہادتِ پیغمبر سے منصبِ نبوت میں اختلال کا اندیشہ تھا اس لئے قدرت نے اس کمال کو بجائے باپ کے بیٹے کی طرف منتقل کردیا اور فرزندِ رسولؐ نے اپنے جدعالی مقدار کے حکم کی تعمیل میں وہ حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا جو رہتی دنیا تک عدیم المثال رہے گا۔ لہٰذا اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِؑ کی بنیاد پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حضرت حسینؑ ذبح عظیم کے حقیقی مصداق ہیں کیونکہ وہ اپنے نانا کے مکارم اخلاق، نسبی شرافت، علمی فضائل اور روحانی کمالات کے وارث تھے۔

کارِ رسالت میں شرکت

اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کہ کارِ رسالت میں شرکت ہوسکتی ہے اور اہلبیتِ رسولؐ میں سے کوئی فرد بھی وہی فرائض سرانجام دے سکتا ہے جو بنفسِ نفیس جناب رسالتمآبؐ کو دینے چاہئیں۔ ٹھوس تاریخی حقائق پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ذی فہم حضرات کی تسلی ہوسکے کہ جنابِ حسینؑ کی قربانی درحقیقت پیغمبرِ اسلامؐ کی قربانی ہے اور شہادتِ

عظمیٰ نبوی کمالات کا حقیقی مظہر ہونے کی بنا پر یہ ذبح عظیم کی عملی تفسیر ہے۔

جنابِ رسولِ خداؐ نے سورۂ برأت کی ابتدائی آیات کی تبلیغ کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو مامور کیا کہ حج کے موقع پر ان کا اعلان کیا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ کی روانگی کے بعد جبریلِ امینؑ یہ حکم لے کر نازل ہوئے کہ تبلیغ رسالت کا کام آنحضرتؐ خود سرانجام دیں یا وہ شخص دے جو آپؐ میں سے ہو۔ چنانچہ اس حکمِ خداوندی کی تعمیل میں سرورِ دوعالمؐ نے حضرت علیؑ کو حضرت ابوبکرؓ کے عقب میں روانہ کیا اور حکم دیا کہ حضرت ابوبکرؓ سے سورۂ برأت کی آیات لے لیں اور خود تبلیغ کریں۔ حضرت علیؑ خاص ناقۂ رسولؐ پر سوار ہو کر چلے اور ایک دن رات کے سفر کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو جالیا اور بحکمِ خدا و رسولؐ ان کو اس فریضہ کی ادائگی سے سبکدوش فرما دیا اور تبلیغ آیات کے لئے خود روانہ ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کبیدہ خاطر واپس آئے اور خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر شکائیتاً عرض کیا کہ "کیا میرے خلاف کوئی وحی نازل ہوئی ہے؟" جناب رسالتمآبؐ فرمانے لگے "نہیں۔ ماسوائے اس امر کے کہ مجھے بذریعہ وحی حکم دیا گیا ہے کہ تبلیغِ رسالت کا کام میں خود سرانجام دوں یا وہ شخص جو میرے اہلِ بیتؑ میں سے ہو" صحیح بخاری میں یہی واقعہ تین مقام پر مذکور ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعہ کو تمام مستند کتب تواریخ و احادیث نے روایت کیا ہے:۔

" ثُمَّ قَالَ بعلی الحقہ فرو علی ابی بکر و بلغہا ففعل فلما قدم ابوبکر بکیٰ فقالَ یا رسول اللّٰہ حدث فی شیئً قالَ ما حدث نیك الا خیر ولکن امرت ان لا یبلغہ الا اَنا و رَجلٌ مِنّی۔" (علی المتقی کنز العمال الجزء الاول ص: ۲۴۶۔ حدیث: ۴۴۰۰۔ ص: ۲۴۷۔ حدیث: ۴۴۱۱)

(ترجمہ) (ابوبکر کے روانہ ہونے کے بعد) جناب رسولِ خدا نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ جاؤ حضرت ابوبکرؓ تک پہنچو اور ان کو میرے پاس واپس کردو اور تم خود اس

سورۃ کی تبلیغ کرو۔ پس حضرت علیؑ نے ایسا ہی کیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ واپس جناب رسولخداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بہت روئے۔ عرض کیا کہ کیا میرے خلاف کوئی بات نازل ہوئی ہے ؟" آپ نے فرمایا۔" نہیں خیریت ہے۔ لیکن مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اسکی تبلیغ میں خود کروں یا وہ شخص کرے جو مثل میرے نفس کے ہو"

(البلاغ المبین ص ۲۰۰) اس واقعہ کے لئے دیکھئے :-

(۱) مسند امام احمد حنبل۔ الجزء الاوّل۔ ص ۳، ۱۵۰، ۱۵۱۔ الجزء الثانی ص ۲۹۹ - الجزء الثالث ص ۲۱۴، ۲۸۳ (۲) مستدرک علی الصحیحین ابوعبداللہ الحاکم الجزء الثالث کتاب معرفت الصحابہ ص ۱۴۳ (۳) تاریخ الکامل الجزء الثانی ذکر حج ابی بکر ص ۱۱۱۔ (۴) تاریخ حبیب السیر جلد ۱، جزء سوم ص ۴۷۔ صحیح بخاری پارہ ۲ ص ۲۳۸۔ کتاب الصلوٰۃ۔

اسی طرح نجران کے عیسائیوں کے ساتھ واقعہ مباہلہ پیش آتے وقت آلِ عباؑ کی شمولیت کارِ نبوت میں براہِ راست شرکت ہے ہم بخوفِ طوالت تفصیل کو قلم انداز کرتے ہیں۔ شائقین حضرات آیہ مباہلہ کی تفسیر و تشریح کا مطالعہ فرمانے کے لئے کتب تفاسیر کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ ارشاد باری ہوتا ہے :-

آیۂ مباہلہ : فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (آل عمران: ۶۱)

(ترجمہ) کہدو۔ آؤ۔ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلائیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر ہم خدا کی طرف رجوع کریں اور خدا کی لعنت جھوٹوں پر قرار دیں۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے مدارج النبوۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مطبوعہ نولکشور ص ۴۹۸---۵۰۰ ۱۹۰۴ء۔ البلاغ المبین ص ۲۰۵-۲۰۹)

کتب محولہ بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آلِ عباؑ و اصحاب کساء (حضرت

علیؑ۔ حضرت فاطمہؑ۔ حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ) میں سے کوئی فرد بھی اگر کسی کارِ رسالت کو سرانجام دیتا ہے تو وہ درحقیقت فریضۂ رسالت کی ادائیگی متصور ہوگی گویا کہ جناب رسالتمآبؐ نے خود بنفسِ نفیس اس فرض کو سرانجام دیا لہٰذا ان قرآنی حقائق و تاریخی شواہد کی روشنی میں ثابت ہوا کہ میدانِ کرب و بلا میں شہادت کا جو حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا گیا وہ بھی فی الحقیقت اَنَا اَوْ رَجلٌ مِنّی (میں خود انجام دوں یا وہ شخص جو مثل میرے نفس کے ہو) کی رُو سے حضرت رسالتمآبؐ ہی نے سرانجام دیا۔

اب بھی اگر معترض کا خیال ہو کہ کارِ حسینؑ کس طرح کار رسالت قرار دیا جا سکتا ہے اور کار نبوت میں شرکت کے کیا معنی ہیں تو ہم اس کی توجہ اس آیۂ کریمہ کی طرف منعطف کرتے ہیں جہاں حضرت موسیٰؑ اپنی دعا میں خداوند تعالیٰ سے شریکِ امر عطا کرنے کی التجا کر رہے ہیں :۔

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِیْ ۝ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ۝ وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ۝ (طٰهٰ ۲۹-۳۰)

(ترجمہ) میرے ہی کنبہ سے میرا ایک بوجھ بٹانے والا مقرر کردے ۔ میرا بھائی ہارونؑ ۔ اس کے ذریعے میری کمر مضبوط کردے اور اس کو میرے کام میں شریک کردے ۔

تبلیغِ حق میں حسینی شرکت

امام حسینؑ نے کارِ نبوت میں شرکت فرمائی ۔ بحیثیت حجتِ خدا و امامِ ھدیٰ تبلیغ حق کی خاطر رشد و ہدایت کا فریضہ اس طرح سرانجام دیا کہ رہتی دنیا تک عدیم النظیر و بے مثال رہے گا اور آنے والے دور میں امامؑ کا مقام بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائیگا۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ یزید کی تخت نشینی پر امت وسطیٰ کی اجتماعی قوتِ مدافعت

نیست و نابود ہو چکی تھی۔ وہ حوادث کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ایک ہی ریلے کے سامنے کفِ آب کی طرح بہ رہی تھی۔ مسلمان اب ایک طوفان نہ تھے بلکہ طوفان کے دھارے پر بہنے والے خس و خاشاک تھے۔ آفتابِ نبوّت کو غروب ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ حق و صداقت کی ضیا پاشیاں دن بدن مدھم ہو رہی تھیں۔ کفر و ضلالت کی تاریکیاں عالم اسلام پر پھر مسلط ہو چکی تھیں۔ اموی دورِ حکومت کیا آیا کہ اپنے جلو میں فسق و فجور اور جور و استبداد کی تمام برائیاں لے کر آیا۔ ملّتِ اسلامیہ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ فتنہ و فساد کی آندھیاں اٹھیں اور وحشت و بربریت کے طوفان امڈے جن کی آغوش میں تباہی و بربادی کی ایسی ہولناکیاں تھیں کہ جن کے آگے مہیب چٹانوں کا ٹھہرنا دشوار تھا ایسے ہیبت ناک و دہشت انگیز موقع پر دینِ خدا کے پشتیبان، فرزندِ رسولؐ حضرت حسینؑ تحفظِ اسلام کے لئے آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے غیر متزلزل ثباتِ قدم، حیرت انگیز فداکاری اور آہنی عزم سے ان طوفانوں کا منہ پھیر دیا۔ ان آندھیوں کا رخ بدل دیا اور ان سیلابوں کے دھارے کا رخ سرے ہی سے موڑ کر رکھ دیا جو قصرِ اسلام کی دیواروں کو متزلزل کرنے کے لئے چنگھاڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ اسلام کے علمبردار حسینؑ ہر جانکاہ معرکہ میں ثابت قدم رہے اور بھولی بھٹکی ہوئی انسانیت کو رشد و ہدایت کا پیغام سناتے رہے۔ زندگی کے حریص انسانوں کو حسینؑ آج بھی یاد دلا رہے ہیں کہ زندگی ہر حال میں جئے جانے کا نام نہیں بلکہ آپ تنبیہہ کرتے ہیں کہ :-

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادیؔ نے حقیقت نگاری کا کیسا بہترین نمونہ پیش کیا ہے :-

اے حسینؑ اب تک گل افشاں ہے تیری ہمت کا باغ
آندھیوں سے لڑ رہا ہے آج بھی تیرا چراغ
تو نے دھو ڈالے جبینِ ملّتِ بیضا سے داغ
تیرے دل کے سامنے لرزاں ہے باطل کا دماغ
فخر کا دل میں دریچہ باز کرنا چاہیے
جس کا تو آقا ہو اس کو ناز کرنا چاہیے

باب ششم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ……

اے ایمان والو !

صبر و نماز کے ساتھ اعانت چاہو۔ بیشک صابرین
کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں
مارے گئے ہیں انہیں مردہ نہ کہنا بلکہ (وہ لوگ) زندہ ہیں مگر تم
(ان کی زندگی کی حقیقت) کی سمجھ نہیں رکھتے اور ہم تمہیں کچھ خوف
اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور
آزمائیں گے اور (اے رسولؐ) ایسے صبر کرنیوالوں کو .....
صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں

(البقرۃ ۱۵۳-۱۵۸)

ابتلائے عظیم کا مصداقِ خصوصی

اخفائے نام کی وجوہات

قرآنِ حکیم میں بعض صحابہ رسول کی مذمت بھی کی گئی ہے اور اکثر ایسے بھی ہیں جن کے ذکرِ فضائل سے کتابِ مقدس مزین ہے لیکن حکیم مطلق و ستار العیوب نے ان آیاتِ کریمہ میں نہ تو اُن صحابہ کا نام ظاہر کیا ہے جن کے معائب بیان کرکے ان کی تقلید سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی ہے اور نہ ہی ان صحابۂ کرام کے اسمائے گرامی سے عوام کو متعارف و روشناس کرایا ہے جن کے اوصاف کا تذکرہ فرما کر ان کے اعمالِ حسنہ کو آنے والی نسلوں کے لئے نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔ ہر دو صورتوں میں اخفائے نام کی حقیقی وجہ تو وہ خود حکیمِ مطلق و علیمِ کل ہی جانتا ہے مگر جہاں تک انسانی ادراک و شعور کام کرتا ہے ہم اس کی وجوہات یہ سمجھتے ہیں:۔

اوّلاً: چونکہ خدا ستار العیوب ہے اس لئے اصلاح کی خاطر برائی کا ذکر تو فرما دیا لیکن مجرم کے نام کو مخفی رکھ کر اس کو شرم و ندامت سے بچالیا تاکہ وہ عوام کے طعن و تشنیع کا نشانہ بن کر اس قدر مایوس نہ ہو جائے کہ آئندہ اپنی اصلاح کی تمام تر کوششیں اکارت سمجھ کر نیکی و تقویٰ کی طرف رجوع کرنا ہی چھوڑ دے قرآنِ کریم کی تنزیل کی غرض و غایت ہی دنیا کی اصلاح تھی نہ کہ کسی مخصوص شخص کے عیوب کو طشت ازبام کرنا۔ قرآن نے دنیا کے سامنے ایک ضابطۂ حیات پیش کیا جس کا واحد مقصد اصلاحِ عالم تھا اور ہے۔

ثانیاً: فضائلِ صحابہ کرام کا ذکر فرماتے وقت ان کے نام کا اظہار نہ کیا گیا تاکہ عوام یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ صرف خدا کا مخصوص ہی گروہ تھا جو اس قسم کے کارہائے خیر سرانجام دے سکتا تھا۔

۔ قدرت نے انہیں کچھ ایسی مافوق البشر خوبیاں عطا کر رکھی تھیں جن کی وجہ سے وہ اس قسم کے کارہائے نمایاں سرانجام دے سکنے کے اہل تھے۔

خوش تر آں باشد کہ سرِ دلبراں — گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مذکورہ بالا بیان کی تائید میں قرآنِ حکیم سے متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس قاعدہ کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے مشہور **واقعہ افک** کی تردید کی، زوجۂ رسولؐ کو غلط اتہام سے بَری کیا اور ان صحابہ کا نام بھی پردۂ اخفا میں رکھا جنہوں نے افترا پردازی و کذب بیانی پر عمل کر کے رسولِ اکرمؐ کو ایذا پہنچائی تھی اور عفت مآب ام المومنین رضؓ پر غلط بہتان باندھ کر برائی و بے حیائی کی تشہیر کی تھی۔ واقعہ اِفک کو قرآنِ حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ (النور : ۱۱)

(ترجمہ) "بیشک جن لوگوں نے افترا پردازی کی ہے وہ تم ہی میں سے ایک جماعت ہے۔ اس کو اپنے لئے بُرا مت گمان کرو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ جس شخص نے جس قدر گناہ کمایا اسی قدر وہ پھل پائے گا۔ ان میں سے اس شخص کے لئے جو اس جُرمِ عظیم کا مرتکب ہوا ہے عذابِ عظیم ہے"۔

۱۔ اگرچہ یہاں زوجۂ رسولؐ کا نام مذکور نہیں تاہم سب جانتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو ایک جھوٹے الزام سے بَری کیا گیا ہے۔ اسی طرح "عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ" کے نام بھی پردۂ اخفا میں ہیں لیکن بخاری کی ایک روایت کے مطابق ان کا سرگروہ سردارِ منافقین عبداللہ بن ابی تھا جو " وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ " کا مصداق ہے۔ بخاری کی دوسری روایت کے مطابق یہ کارنامہ حسان بن ثابت شاعر کا تھا جس کی آخری عمر میں

بنائی جاتی رہی اور وہ " لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ " کی پیشینگوئی کے مطابق مصائب بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔

۲۔ سوادِ اعظم کی اکثریت اس امر کی قائل ہے کہ آیۂ غار " اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ " میں صَاحِبِهٖ سے مراد حضرت ابوبکرؓ ہیں جنہیں ہجرت کے موقع پر غارِ ثور میں جناب رسولخداؐ کی ہمراہی و معیت کا شرف حاصل ہوا حالانکہ آیۂ مذکور میں حضرت ابوبکرؓ کا نام نہیں ہے۔

۳۔ سورۂ التحریم بھی اسی رمز و کنایہ کی مثال ہے۔ آیۂ کریمہ " اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا " میں دو امہات المومنین کی طرف اشارہ ہے لیکن ہر دو کے نامہائے نامی پردۂ اخفا میں ہیں۔ حالانکہ ان ناموں کی مسند امام احمد حنبل جلد اوّل ص ۳۳، ۴۸ اور کنزالعمال جلد اوّل ص ۲۹۹ حدیث نمبر ۴۷۲ میں تصریح کر دی گئی ہے۔

۴۔ جنگِ احد کے سلسلہ میں بعض اصحابِ رسول کے اوصاف اور بعض کے عیوب بیان کئے گئے ہیں لیکن قرآن حکیم میں ان کے نام پوشیدہ ہی رکھے گئے۔ دونوں قسم کے لوگوں کی مثالیں ہم اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

جنگِ اُحد : پروفیسر ڈی ایس مارگولیتھ جنگ احد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"It appears too that at the commencements events were going on as the Prophet had imagined. The champions of Badr ALI and HAMZA dealt out death as unsparingly as before. The heroism of the Quresh compell -ed them to meet these champions in a

series of single combat in which their own champions were killed and their over-throw spread discomfiture and panic".

(D.S.Margoliouth:Life of Mohammad:Page 296)

(ترجمہ) "شروع جنگ میں واقعات اس طرح رونما ہوئے جیساکہ رسولخداؐ کا خیال تھا۔ جنگِ بدر کے فاتحین **حضرت علیؑ** اور **حضرت حمزہؑ** نے قریش کے لشکر میں موت کا بازار اسی طرح گرم کیا جس طرح کہ انہوں نے بدر میں کیا تھا۔ قریش کی روایاتِ بہادری نے انہیں مجبور کیا کہ ان دونوں کے مقابلہ کے لئے ایک ایک نبرد آزما بھیجیں لیکن ان لڑائیوں میں ان کے سب بہادر مارے گئے۔ ان کی موت نے قریش کے لشکر میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔"

اسی سلسلہ میں مولوی عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب مدارج النبوۃ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"در روزِ احد از گروہِ مخالف چناں پیکارِ شدید واضح شد کہ مسلماناں رُو بہزیمت آوردند و حضرت رسول صلعم را تنہا گذاشتند۔ حضرتؐ در غضب آمد و عرق از پیشانئ ہمایونش متقاطر گشت۔ درآں حالت نظر کرد علیؑ ابن ابیطالبؑ را کہ بر پہلوے مبارکش ایستادہ بود۔ فرمود کہ چرا بہ برادرانِ خود ملحق نہ گشتی یعنی فرار نہ کردی۔ علیؑ گفت: "ءَاَکْفُرُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ" یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان بہ تحقیق کہ مرا با تو اقتدا است۔ با یاران مفرور چہ سروکار باشد۔"

(مدارج النبوۃ نولکشوری جلدِ دوم ص ۱۶۷ - البلاغ المبین جلد اوّل ص ۵۹۵)

(ترجمہ) جنگِ اُحد کے دن مخالفینِ اسلام نے اس شدّت سے جنگ کی کہ مسلمانوں نے راہِ فرار اختیار کی اور جناب رسالتمآبؐ کو تنہا چھوڑ دیا۔ آپ غضبناک ہو رہے

تھے اور آپ کی پیشانیٔ مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ آپ نے نگاہ کی اور علیؑ ابن ابی طالب کو اپنے پہلوئے مبارک میں کھڑا پایا۔ فرمانے لگے: "اے علیؑ! تم نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیوں موافقت نہ کی یعنی راہِ فرار کیوں اختیار نہ کی" علیؑ کہنے لگے: "کیا میں ایمان لانے کے بعد کفر کرتا؟ مجھے تو آپ کی ذاتِ ستودہ صفات سے وابستگی ہے۔ بھاگنے والے یاروں سے کیا کام؟"

قرآنِ حکیم نے بھی جنگِ احد کے واقعہ کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے:-

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (آلِ عمران ۱۵۲-۱۵۳)

(ترجمہ) بیشک اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کیا جب کہ تم اس کے حکم سے ان کو قتل کرتے رہے یہاں تک کہ جب تم نے نامردی کی (ہمت ہار دی) اور اپنی پسند کی چیزیں دیکھنے کے بعد امر میں جھگڑا کیا اور رسولؐ کی نافرمانی کی۔ تم سے بعض دنیا کے طالب تھے اور بعض آخرت کے خواستگار۔ پھر تمہارا رُخ ان کی طرف سے پھیر دیا کہ تمہارا امتحان لے۔ یقیناً خدا نے تم سے درگزر کی اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ جس وقت تم (پہاڑ پر) چڑھے جاتے تھے اور کسی کو بھی پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور پیغمبرِ خدا تم کو تمہارے عقب سے پکار رہے تھے پھر خدا نے تم کو رنج پر رنج پہنچایا تاکہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اس پر اور جو تم پر مصیبتیں پڑی ہیں ان پر افسوس نہ کرو۔ اللہ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔"

ان آیات کریمہ میں دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ موجود ہے ایک تو وہ جو دنیا کے طالب تھے اور "مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا" کے مطابق مالِ غنیمت کو لوٹنے کے لئے سب سے آگے اور میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دینے کے لئے سب سے پیچھے رہنے والے تھے اور اس طرح شاید مخالف حالات میں بھاگنے والوں پر بھی سبقت کرنے والے ہوں۔ دوسرا گروہ ان بزرگانِ دین پر مشتمل تھا جو آخرت کا ارادہ رکھتے تھے اور "مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ" کے بموجب میدانِ کار زار میں دشمن کی صفیں الٹ دینے والے تھے۔ جن کے راس و رئیس حضرت علیؑ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن جبیر تھے۔ آیاتِ مبارکہ میں دونوں گروہوں میں سے کسی ایک فرد کا نام بھی بیان نہیں کیا گیا۔ پس حکیم مطلق کی یہ حکمتِ کاملہ ہے کہ ڈٹ کر لڑنے والوں کا نام بھی بیان نہیں کرتا تاکہ فخر و مباہات کا موقع پیدا نہ ہو اور بھاگنے والوں کے نام پردۂ اخفاء میں رکھتا ہے تاکہ ان کے سر ہمیشہ ذلت سے نہ جھکے رہیں اور وہ عوام کی نظروں میں موردِ طعن و تشنیع نہ ہوں حالانکہ ڈٹ کر لڑنے والوں کے نام آپ یورپین مؤرخ ڈی۔ایس۔ مارگولیتھ اور عبدالحق محدث دہلوی کی زبانی سن چکے ہیں۔ اسی طرح بھاگنے والے حضرات کا ذکرِ خیر بھی کتبِ تواریخ و تفاسیر میں محفوظ ہے جس کو بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ شائق حضرات علامہ جلال الدین سیوطی اور فخرالدین رازی کی کتابوں کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قدرت نے اپنی حکمتِ کاملہ کی بنا پر جس کو حکیم مطلق خود ہی بہتر سمجھتا ہے۔ صحابۂ رسولؐ میں سے کسی فرد کا نام (ماسوائے زید) قرآن میں بیان نہیں فرمایا لیکن اصلاحِ خلق، تبلیغِ حسنات، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے ان کے اعمال کا ذکر فرما دیا تاکہ اچھے اعمال کی تقلید اور برے اعمال سے اجتناب و احتراز کیا جائے۔ اسی طرح قرآنِ حکیم کے ایک پورے

رکوع میں واقعہ ہائلہ کربلا کا تذکرہ موجود ہے جس پر استدلال کرکے ہم ثابت کریں گے کہ ابتلائے عظیم کی پیشین گوئی کے مصداق خصوصی حضرت حسینؑ ہیں لیکن بیان کردہ قاعدہ کے بموجب آپ کا نام موجود نہیں حالانکہ پیشین گوئی مذکور کی ہر ایک شق آپ کی ذاتِ ستودہ صفات پر پوری اترتی ہے اور آیاتِ کریمہ کا ایک ایک حرف آپ کے حالاتِ زندگی کی آئینہ دار ہے۔

آیاتِ قرآنی کے مصداق

قرآنی آیات جو کسی ارفع ہستی کی شان میں نازل ہوتی ہیں۔ ان کے مصداق دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں :- ۱۔ مصداق عمومی۔ ۲۔ مصداق خصوصی۔

مصداقِ عمومی :- عام مومنین کی وہ جماعت ہے جو ان صفاتِ حمیدہ و ملکاتِ فاضلہ سے انفرادی یا اجتماعی طور پر متصف ہو جن کا ذکر آیۂ کریمہ تفصیلاً یا اجمالاً کرے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی زندگی کو ایسے سانچے میں ڈھالے کہ اس کی سوانح حیات آیۂ مبارکہ کی عملی تفسیر بن جائیں۔ وہ شخص یہی سمجھے کہ آیہ وانی ہدایہ نے مومن کے جو اوصاف بیان کئے ہیں وہ فی الحقیقت ان سے متصف ہے۔ اگر وہ اپنے اندر کمی محسوس کرے گا تو نقائص کے رفع کرنے اور ویسی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریگا جس کا لازماً نتیجہ یہ ہوگا کہ نیکی و تقویٰ کی بخوبی نشرو اشاعت ہو سکے گی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آیۂ کریمہ " مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ " میں بھی جو درحقیقت حضرت علیؑ کی شان میں، اس بے مثال قربانی، ایثار و سرفروشی کے صلہ میں، نازل ہوئی جو آپ نے ننگی تلواروں اور کھچی ہوئی کمانوں کے سامنے، شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر لیٹ کر پیش کی تھی۔ حضرت علیؑ کا نام حذف

کر دیا گیا ہے تاکہ آئندہ کے لئے اس امر کا موقع باقی رہے کہ مومنین اس قسم کے ماحول میں اسی نوع کی سرفروشی سے ویسے ہی درجات حاصل کرسکیں۔ اگر اس قسم کی عمومیت کا اہتمام نہ ہوتا تو خدائے تبارک و تعالیٰ پر بندوں کی حجت قائم رہتی کہ ہمیں حصولِ درجات کے لئے قدرت نے وہ مواقع فراہم نہ کئے ورنہ ہم بھی ویسے ہی کارنامے سرانجام دے کر اعلیٰ مراتب سے سرفراز ہو سکتے۔ لہٰذا حکیم مطلق نے بندوں پر اتمامِ حجت کر دیا تاکہ وہ یہ عذر پیش نہ کرسکیں کہ فلاں مخصوص ہستی کو خصوصی انعامات و اکرامات سے بہرہ ور کرکے باقی لوگوں کے لئے رحمتِ خداوندی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ برعکس اس کے آج بھی ارتقاء و عروج کے دروازے کھلے ہیں اور اسی قسم کے ایثار و جانفروشی کا ثبوت دے کر ویسے ہی درجات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

۲۔ **مصداقِ خصوصی**:۔ آیاتِ مبارکہ کی حقیقی مصداق وہ ذاتِ مقدسہ ہوتی ہے جو انفرادی طور پر ان جمیع صفاتِ کاملہ سے متصف ہو جس کا تذکرہ وضاحتاً یا کنایۃً آیۂ مذکور کرے اور اس کی عملی زندگی کا ہر پہلو اور ہر ایک شعبہ آیاتِ بیّنات کا آئینہ دار ہو۔

ابتلائے عظیم

اس مقام پر سورۂ بقرہ رکوع سوم کی آیات پر اجمالاً بحث کی جاتی ہے جس سے یہ امر واضح کرنا مقصود ہے کہ ان آیاتِ بیّنات کی مصداقِ خصوصی حضرت امام حسینؑ کی ذاتِ گرامی ہی ہے جن کی زندگی کا ہر پہلو اور جن کے لائحہ عمل کا ہر شعبہ آیۂ مبارکہ کی مکمل عملی تفسیر ہے۔ لسانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے کہ "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ....... الخ" ان آیات پر غور کرنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عمومیت کے رنگ میں ان مومنین کا ذکر فرمایا گیا جو ابتلا کی کٹھن منازل طے کرتے وقت صبر و استقامت کو بروئے کار لاکر عین اسلامی شعارِ زندگی و طرزِ عمل پیش کرتے ہیں۔ چونکہ قرآنِ حکیم جملہ ابنائے آدم کے لئے مشعلِ ہدایت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے عمومیت کا لحاظ عین اقتضائے فطرت ہے لیکن تاریخ اسلام کی ورق گردانی اس امر کی شاہد ہے کہ مظلومِ کربلاؑ کی دردناک و عبرت آموز داستانِ زندگی آیات زیرِ بحث کی حقیقی عملی تفسیر ہے۔ چونکہ صرف آپ ہی کی ذاتِ ستودہ صفات پر آیاتِ بیّنات کی تمام شقیں مکمل طور پر پوری اترتی ہیں اس لئے محض آپ کی ذاتِ بابرکات آیاتِ مبارکہ کی مصداقِ خصوصی ہے۔ ان آیات کے ایک ایک حرف میں وہ صدہا پیشین گوئیاں مضمر ہیں جو دشتِ کربلا میں عالمِ ظہور میں آئیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے علمِ غیب سے قبل از وقت ان تمام واقعاتِ شدنی کا ذکر فرما دیا ہے جو میدانِ کرب و بلا میں ابتلائے عظیم کی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ پرداز ہوئے۔ ہم ان آیات کی تفسیر بیان کرتے وقت حضرت حسینؑ کے حالاتِ زندگی سے ان کو مطابقت دے کر ثابت کریں گے کہ آیاتِ مبارکہ تمام تر جناب حسینؑ کی شانِ اقدس میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے سرفروشی، ایثار اور فدائیت کا حیرت انگیز مظاہرہ کرکے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام باطل کی نفی سے شروع ہوتا ہے اور حق کے اثبات پر مکمل ہوتا ہے۔ مسلمان اس وقت تک صاحبِ ایمان متصوّر نہیں ہوتا جب تک ان سب اقتدار پسندوں کی نفی نہ کر دے جو حرص و آز کے پنجہ میں گرفتار ہو کر اہلِ عالم کو معبودِ حقیقی کے آستانۂ مقدس پر جبیں سائی سے روکتے ہیں۔ عالی منزلت امامؑ نے ان سرمایہ دار اقتدار پسندوں کے بالمقابل ریگ زارِ کربلا میں حق و حریّت کی علمبرداری کرکے مسلمانوں کو درسِ عمل دیا کہ مسلمان اِلَّا اللہ

کے رستے میں مٹ سکتا ہے لیکن لَا اِلٰہ سے روکا نہیں جا سکتا ؎

ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد — ملّتِ خوابیدہ را بیدار کرد

(علامہ اقبالؒ)

صبر و نماز

زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے :۔

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

(ترجمہ) اے ایمان والو! صبر و نماز کے ساتھ اعانت چاہو۔ خداوند تعالیٰ کی معیت محض صابرین کو حاصل ہے۔" (البقرہ : ۱۵۳)

اس ناپائدار دنیا میں رہ کر جس کی کیفیات ہر لمحہ تغیر پذیر ہیں اور زندگی کی کشمکش میں پڑ کر مشکلات و مصائب کا پیش آنا ہر فرد و ہر جماعت کے لئے ناگزیر ہے۔ ہجومِ مشکلات کے وقت مشکل کشائے حقیقی سے تعلق جوڑے رکھنا، اسی کی ذات پر بھروسہ رکھنا، اسی کے آگے سر افگندہ رہنا، اسی سے نصرت طلب کرنا دل کو بالکل اسی طرح تقویت دیتا ہے جس طرح خطرہ کے وقت پولیس کے پہنچ جانے اور شدید بیماری کے وقت کسی نامور طبیب یا ماہرِ فن ڈاکٹر کے آ جانے سے دل کو ڈھارس بندھ جاتی ہے اور ٹوٹی ہوئی آس پھر جڑ جاتی ہے۔ اس لئے حکیمِ مطلق مصائب کے مقابلہ کے لئے مومن کو ایک اکسیر نسخہ بتاتا ہے کہ انتہائی مصائب و آلام میں گرفتار ہو کر بھی صبر و استقلال کا دامن مت چھوڑو اور خالقِ ارض و سما سے صبر و نماز کے ذریعہ اعانت کے طالب اور توفیق کے متمنی رہو خدا کے محبوب بندوں کو ہر قسم کی ابتلاء و آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ مومن کی پوری

زندگی صبر سے عبارت ہے۔ صابر ہی جانکاہ تکالیف کا مقابلہ کر کے اپنے اخلاقی فرائض کو سرانجام دے سکتا ہے۔ بزدل موت سے پہلے بارہا مرتا ہے کیونکہ صبر کے فقدان کی وجہ سے تکلیف کو بخیر و خوبی برداشت نہیں کر سکتا۔ صابر کی حوصلہ افزا جرأت اس کو مشکلات پر قابو پانے کے لئے مستعد رکھتی ہے۔ صبر کا یہی جذبہ مومن کو راہِ حق میں اپنی جان تک لڑا دینے پر اکساتا ہے۔ وہ موت سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ برضا و رغبت جہاد فی سبیل اللہ کے لئے میدان میں کود پڑتا ہے۔ شہادت اس کا مطمعِ نظر ہوتا ہے۔ وہ ایثار و جانفروشی کا مجسمہ بن کر بہادری کی موت مرتا ہے اور حیاتِ جاوید سے ہم آغوش ہو جاتا ہے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

انبیاء و اولیاء نے مصائب کا مقابلہ صبر ہی سے کیا۔ آنحضرتؐ اپنے خاندان کے تمام افراد سمیت ایک تنگ گھاٹی (شعب ابی طالب) میں مسلسل تین سال تک محصور رہ کر قریش کے سماجی مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ کا مقابلہ صبر و استقلال سے کرتے رہے۔ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کی جدائی پر صبرِ جمیل کا مظاہرہ کیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کرتے وقت انتہائی صبر و استقامت کا ثبوت دیا۔

حضرت علیؑ جب خلافتِ ظاہری سے محروم کر دیئے گئے اور عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمانؓ کا تقرر عہدۂ خلافت پر کر دیا تو جنابِ علیؑ مسجدِ نبوی سے یہ احتجاج فرماتے ہوئے اٹھے: "لَيْسَ هٰذَا اَوَّلَ يَوْمٍ تَظَاهَرْتُمْ عَلَيْنَا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔" (تاریخ الامم والملوک الجزء الخامس محمد بن جریر الطبری)

(ترجمہ) یہ پہلا دن نہیں ہے کہ امرِ خلافت میں تم نے ہم پر غلبہ کیا۔ پس صبرِ جمیل ہی مناسب ہے اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس کے مقابل اللہ سے مدد مانگی گئی ہے۔

حسینی صبر و نماز کا مظاہرہ

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ عیاں ہے کہ انبیاء و اوصیاء کا طریق کار یہی رہا کہ وہ مصیبت کے وقت صبرِ جمیل سے کام لیتے تھے لیکن انتہائی کرب و مصیبت میں فخرِ ابراہیمؑ، مہمانِ کربلا نے جس صبر و شکر کا مظاہرہ کیا تھا۔ تاریخ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ محرم کی دسویں تاریخ ہے۔ ظالم کے ظلم اور مظلوم کے صبر کی انتہا ہو چکی ہے۔ کربلا کا بے آب و گیاہ بیابان بے گناہوں کے خون سے سیراب ہو چکا ہے۔ خاندانِ رسالت کی عصمت مآب بیبیوں پر وسعتِ دنیا تنگ ہے۔ خدائے قدوس کے عاشقِ حقیقی، اسلام کے مخلص شیدائی اتمامِ حجت کے لئے اصغرِ معصومؑ کو ہاتھوں پر اٹھا کر قومِ اشقیاء سے خطاب کرتے ہیں "اے قوم! حسینؑ تو تمہاری نظروں میں اس لئے مجرم ہے کہ یزید کو خلیفۃ اللہ و نائبِ رسولؐ تسلیم کرنے سے انکاری ہے لیکن اس شش ماہے بچے اصغرِ معصوم کا کیا قصور ہے جس کی پاداش میں اسے شدتِ تشنگی کی ایذا پہنچائی جا رہی ہے۔" جواب میں حرملا کے ناپاک ہاتھوں سے تیرِ جفا چھوٹتا ہے۔ جنابِ حسینؑ کے بازو کو چیرتا ہوا اصغرِ گلفام کے حلق میں پیوست ہو جاتا ہے۔ جنابؑ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کے الفاظ زبانِ اقدس سے ادا فرماتے ہوئے کہتے ہیں "رَضِیْنَا بِقَضَاءِ اللّٰہِ وَصَبَرْنَا عَلٰی بَلَائِہٖ۔" ہم اللہ کی رضا پر راضی اور مصائب پر صابر و شاکر ہیں کیا صبر و شکر کی کوئی ایسی مثال تاریخ عالم پیش کر سکتی ہے؟ پھر صبر بھی ایسا جس کے ساتھ نماز و دعا کو بھی شمولیت حاصل ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی شواہد سے یہ امر ثابت کیا جائے کہ حضرت امامؑ کس قدر عابدِ شب زندہ دار تھے کہ انتہائی حزن و ملال اور رنج و تعب کے عالم میں بھی صبر و شکر کے ساتھ محوِ عبادت رہے۔ چنانچہ شبِ عاشور آپ

اور آپ کے تمام ساتھیوں نے نماز و استغفار اور دعا و تضرع میں گزار دی۔ تاریخ کامل اور تاریخ طبری میں مرقوم ہے کہ نویں محرم کو جب دشمنوں نے حملہ آور ہونے کی تیاری کی اور امامؑ کو حضرتِ عباسؑ، زہیر بن القین اور حبیب ابن مظاہر کی معرفت ابن زیاد کا آخری فیصلہ کن حکم پہنچایا گیا کہ امامؑ معہ رفقاء امیرالمومنین یزید کی بیعت اختیار کرلیں ورنہ ان کے سر قلم کر دیئے جائیں گے تو امامؑ نے صورتِ واقعہ سے اطلاع پاکر تھوڑی دیر تامل فرمایا اور حضرت عباسؑ سے مخاطب ہو کر ذیل کے کلمات ارشاد فرمائے :-

اِرجِعْ اِلَیْھِمْ فَاِنْ اسْتَطَعْتَ ان تؤخرھم وَ تدفعھم عنّا الغشیۃ لعلنا نصلی اللّیلۃ وَندعوہٗ و نستغفرہ فَھُوَ یعلم انی قَداحب الصّلوٰۃ وَتِلَاوۃ وکتابہ وکثرۃ الدّعآ والاستغفار"۔ (ذبح عظیم فوق بلگرامی ص ۳۴۴)

(ترجمہ) "ان کے پاس پھر جاؤ اور اگر تم سے ممکن ہو تو آج شب بھر کے لئے ان کو ہٹا دو تاکہ ہم اس شب میں نماز پڑھ لیں اور خدا سے توبہ و استغفار کرلیں کیونکہ پروردگارِ عالم خوب جانتا ہے کہ میں اس کی نماز کو، اس کی کتاب کی تلاوت کو اور زیادہ دعا و استغفار کرنے کو بہت پسند کرتا ہوں۔"

پس حضرت عباسؑ نے امام حسینؑ کا پیغام اہل شام کو پہنچایا۔ عمر بن سعد شمر سے پوچھنے لگا۔ "تیری کیا رائے ؟"۔ اس نے کہا۔ "آپ سردارِ فوج ہیں جو مصلحتِ وقت سمجھیں، کریں۔ اگر میں امیرِ لشکر ہوتا تو میں ذرا بھی ان لوگوں کو مہلت نہ دیتا۔" عمر نے کہا۔ "بہتر ہوتا کہ اس فوج کی سرداری میرے سپرد نہ ہوتی اور میں اس تہلکۂ عظیم میں نہ پڑتا۔"

حبیب السیر میں ہے : "چوں عمر بن سعد دریں باب با اصحاب شقاوت انتساب مشاورت نمودہ عمرو بن حجاج الزبیدی گفت۔ "اگر کفار دیلم ایں التماس کنند باید کہ

باجازت اقتران یابد۔ فکیف کہ ایں جماعت اہلبیتؑ حضرت رسالت اند"۔ لاجرم عمر بازگشتہ مقرر شد کہ روز دیگر بامر حرب قیام نمایند"۔ (تاریخ احمدی۔ ص ۲۷۱۔۲۷۲)

(ترجمہ) عمر بن سعد نے اپنے رفقاء سے مشورہ لیا تو عمرو بن الحجاج نے کہا۔ اگر کفارِ دیلم بھی اس قسم کی درخواست کریں تو منظور کرنا چاہیئے نہ یہ کہ اہلبیتِ رسالت ایک شب کی مہلت چاہیں اور ہم منظور نہ کریں۔ یہ سن کر عمر بن سعد معہ اپنے لشکر کے واپس گیا اور لڑائی کو اس نے دوسرے دن پر موقوف رکھا"۔

تمام مورخین و محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ شبِ عاشور جناب امامؑ نے شب بیداری و عبادت گزاری میں کاٹی۔ علامہ ابو اسحٰق اپنی کتاب ضیاء العینین فی مقتل الحسینؑ میں لکھتے ہیں کہ حضرت حسینؑ اور ان کے تمام اصحاب نے یہ رات عبادت میں گزار دی۔ ان کی تسبیح کی آوازیں ایسی تھیں جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اڑتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ تمام رات کوئی قیام میں تھا، کوئی رکوع میں اور کوئی سجود میں۔ روضۃ الصفاء، صواعق محرقہ، ینابیع المودۃ، تاریخ طبری اور مقتل ابو مخنف میں یہی واقعہ بعینہٖ بالتفصیل مذکور ہے۔

بیان کردہ تاریخی حقائق سے جو جناب حسینؑ کی عبادت گزاری و شب بیداری پر بیّن دلیل ہیں صاف عیاں ہے کہ امام عالی مقامؑ نے عین منشائے خداوندی کے مطابق بلائے عظیم کا مقابلہ صبر و نماز سے کیا۔ تاریخ عالم میں یہ واقعہ جس قدر بے مثل و بے نظیر ہونے کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے اسی قدر عبرت آموز بھی ہے

تیمّم خاک سے ہو اور لہو سے غسلِ میّت ہو۔
عبادت ہو تو ایسی ہو شہادت ہو تو ایسی ہو

جب عالی منزلت امامؑ زخموں سے نڈھال ہو کر زین سے فرشِ زمین پر تشریف لائے اور بارگاہِ احدیت میں سر بسجود ہوئے تو شمر ملعون کا خونی خنجر آپ کو مذبوح

من القضاء کرنے کے لئے مصروفِ عمل ہوا۔ زمین کو زلزلہ آیا۔ فضائے عالم پر تیرگی چھاگئی۔ فلکِ پیر نے دیکھا کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک بلائے عظیم کا صبر و نماز کے ساتھ ایسا عظیم اجتماع کہیں بھی نہیں ہوا۔ تاریخ عالم کا ایک خونی ورق الٹا اور صبر و نماز کے باب میں ایک حیرت انگیز نمونۂ عمل کا اضافہ ہوا۔ شاعر قلم اٹھانے پر مجبور ہوا اور اس عبرت خیز واقعہ کی تصویر کشی میں درد و غم کی رنگینی بھر دی ؎

شہید نے نماز فرض کس طرح تمام کی
صلوٰۃِ عصر دیکھئے حسینؑ تشنہ کام کی
کٹی ہوئی رگوں سے آرہی تھی حمد کی صدا
سناں پہ سر تھا ، شکل تھی یہ آخری قیام کی

ایک غیر مسلم مدّاحِ اہلبیتؑ (دلو رام کوثری) اس حقیقت کے چہرے سے یوں نقاب کشائی کرتا ہے :۔

قرآن حسینؑ پڑھتے تھے اس وقت بالیقیں
سینے پہ جب چڑھا ہوا تھا قاتلِ لعیں
آوازِ دردناک سے کہتے تھے شاہِ دیں
اِیَّاکَ نَعْبُدُ ، کبھی اِیَّاکَ نَسْتَعِین
مصحف سے ساتھ کیا تھا شہِ مشرقین کا
قران پڑھتے پڑھتے کٹا سر حسینؑ کا
خونِ چکیدہ نے بھی رفاقت کی بات کی
ہر قطرہ میں صدا تھی اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کی

کیا اہلِ اسلام نے کبھی ایسے صبر و استقلال کی داستان سنی ہے؟ کیا نوریانِ فلک پرواز نے کبھی ایسا خونی منظر دیکھا ہے؟ کلّا سوف کلّا بقولِ

شخصے ~ نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

پس یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ آیۂ کریمہ "یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اسْتَعِینُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ" کے حقیقی مصداق نواسۂ رسولؐ حضرت حسینؑ ہیں اور آپ کی ذاتِ گرامی کے سوا تاریخِ اسلام میں دوسری کوئی ایسی برگزیدہ ہستی نہیں جس پر قرآنِ حکیم کی یہ آیہ کریمہ اسی شان و منزلت کے ساتھ چسپاں ہوسکے۔

شہیدِ راہِ خدا کی حیاتِ جاوداں

آیہ مابعد ۱۵۴ پر غور کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مصداقِ حقیقی ناموسِ دینِ مصطفےٰؐ کی خاطر اپنی جان فی سبیل اللہ قربان کردے گا۔ چنانچہ خدائے قدوس عالمِ کون و فساد کے بسنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔
"وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ"

(ترجمہ) اے ساکنانِ عالمِ آب و گل! ایسی بلند پایہ ہستی کے بارے میں جس نے عظمتِ اسلام اور تحفظِ دینِ مبین کی خاطر اپنی جانِ عزیز نثار کردی ہے موت کا گمان نہ کرو بلکہ عنداللہ اس کو ایک غیر فانی زندگی حاصل ہے جو تمہاری قوت ادراک و شعور سے بلند و بالاتر ہے۔ (البقرۃ: ۱۵۴)

اس میں شک نہیں کہ متعصب مؤرخین کی رائے کے مطابق امام حسینؑ نہ تو تاجِ زریں چھین سکے اور نہ ہی حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا اہتمام کرسکے حتیٰ کہ اپنے معصوم و مظلوم بچوں کی جگر دوز چیخ و پکار سن کر بھی ان کی پیاس بجھانے کے لئے موجیں مارتے ہوئے دریائے فرات سے پانی کا ایک قطرہ بھی حاصل نہ کر سکے۔ لیکن حقیقت شناس نگاہیں جانتی ہیں کہ حسینؑ نے اپنا سر کٹوا کر حسینیت

کو زندۂ جاوید کر دیا۔ یزید اپنی تمام فتح مندیوں کے باوجود ذلّت کی موت مر گیا اور یزیدیت جو فی الحقیقت کفر و باطل کی آئینہ دار تھی معرضِ ہلاکت میں پڑ کر صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوگئی۔ جب تک یزید کی روح کارفرما رہی تو اس سے کوفیوں کی فوج پیدا ہوئی اور لباسِ اسلام میں ابنِ زیاد، عمر بن سعد اور شمر ایسوں کا ظہور ہوا۔ جب حسینؑ کو حیاتِ جاوید بخشی گئی تو اسی کوفہ نے ابراہیم نخعی و مختار ثقفی جیسے اکابر پیدا کئے۔ غرضیکہ کربلا کے بعد جو بھی آئے جہاں بھی آئے جنیدؒ بن کر آئے یا سفیان ثوریؒ و معین الدین چشتی اجمیریؒ کی شکل میں نمودار ہوئے خود دولتکدۂ حسینیہ کا تو کیا کہنا اس سے تو دنیا بھر کے علوم کو شگافتہ کرنے والے باقر العلوم حضرت ابوجعفر محمد بن علی اٹھے۔ جن کے نقشِ قدم پر چل کر ان کے فرزندِ ارجمند حضرت ابوعبداللہ جعفر "عالم الوثیق، صادق الصدیق والہادی الی الطریق" کے لباس میں جلوہ نما ہوئے جنہوں نے جابر بن حیان ایسے لائق شاگردوں کو آغوشِ عاطفت میں تربیت دی جو دنیائے سائنس میں فادر آف کیمسٹری (FATHER OF CHEMISTRY) کے نام سے مشہور ہوئے جن کی سینکڑوں تصانیف کے تراجم یورپ کی مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سب حسینیت کا زندہ معجزہ تھا۔ دورِ حاضرہ میں جب اسلام کا جہاز پھر اسی گردابِ بلا میں آ پھنسا، مسلمانوں کے اجسام، اجسام کے بعد عقول اور عقول کے ساتھ قلوب پر ایک طرف تو مغربیّت اثر انداز ہوئی اور دوسری طرف ہندو اکثریت انڈین نیشنل کانگرس کے لباس میں ہندی مسلمانوں کو دائمی غلام بنانے کے لئے رام راجیہ کے قیام کی منصوبہ بندی کرنے لگی تو حسینیت کی زندہ کرامت سے حسینؑ کے نام لیواؤں میں سے ایک ہستی **محمد علی جناح** کے نام سے اٹھی جس نے مسلمانوں کے سامنے حسینی لائحہ عمل پیش کیا اور منتشر افراد کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور حسینی صبر و استقلال کی مثال سے غلام کو آزاد اور

مفتوح کو فاتح بنا دیا۔ مفلسی و تنگدستی کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے، صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اور غفلت و جہالت کی تاریکیوں میں سوئے ہوئے اللہ کے شیروں نے بالآخر انگڑائی لی اور ہندو منصوبہ کے تار و پود کو بکھیر کر رکھدیا

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بقول مناظر احسن گیلانی: "امامؑ کی عظمت کون پیدا کر سکتا ہے اس بلند مینار پر کون قدم جما سکتا ہے جہاں حضرت حسینؑ کھڑے ہوئے تھے۔ ایسی ہمہ گیر ہر دلعزیزی کس کے حصہ میں آسکتی ہے کہ جس کا انتقام دنیا صدیوں سے لے رہی ہے اور اب تک انتقام پورا نہیں ہوا ہے۔ قرنوں سے نفرت کی موسلا دھار بارش یزید اور اس کے ساتھیوں پر ہو رہی ہے لیکن تشنگی نہیں بجھتی جس طرح پہلی صدی ہجری میں اس کے اعمال سے لوگوں نے بیزاری ظاہر کی آج تک وہ بیزاری اسی آن بان کے ساتھ قائم ہے۔ کتنا گہرا، کتنا پختہ رنگ اے خونِ حسینؑ! تو نے پیدا کیا۔"
(داستانِ کربلا۔ ص ۱۹۸)

یہی مقصود ہے آیۂ زیر بحث کا اور یہی دائمی زندگی ہے جو انسانی ادراک سے بلند و بالا ہے۔

ابتلاء کی منازل اور حسینی لائحہ عمل

ہم اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آیۂ مابعد کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کرتے ہیں۔ آیہ وافی ہدایہ کا حقیقی مصداق ملتِ بیضا کی راہ میں جامِ شہادت نوش فرمائے گا اور اس کی یہ شہادت محض ابتلا کے رنگ میں ہوگی جیسا کہ آیۂ کریمہ زیر بحث سے روشن ہے۔ زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ○ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ (البقرة ۱۵۵-۱۵۶)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مقالہ "اسوۂ حسنہ" کے صفحہ ۱۴۱ پر آیۂ مذکور کا اردو ترجمہ اس طرح تحریر فرمایا ہے :-

"اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائشوں میں ڈالے گا۔ وہ حالتِ خوف و ہراس بھوک اور پیاس، نقصانِ مال و جان اور ہلاکتِ اولاد و اقارب میں مبتلا کرکے تمہارے صبر و استقامت کو آزمائے گا۔ پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے ان کے لئے جن کے ثبات و استقامت کا یہ حال ہے کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے تمام معاملات کو یہ کہہ کر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" (داستان کربلا۔ اسوۂ حسنہ ص ۱۴۱)

اس آیۂ کریمہ میں آزمائش و ابتلا کے پانچ مدارج قرار دیئے گئے :-

۱۔ خوف و ہراس۔
۲۔ بھوک اور پیاس۔
۳۔ نقصانِ مال و متاع۔
۴۔ قتلِ نفس۔
۵۔ قتلِ اولاد۔

یہی پانچ چیزیں انسان کے لئے اس دنیا میں انتہائی مصیبت ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ان ہی چیزوں کو راہِ حق میں آزمائش قرار دیا گیا ہے۔ اب ہم تاریخی شواہد کی روشنی میں ان پانچ امور پر یکے بعد دیگرے غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا یہ تمام مراحل جنابِ حسینؑ کو پیش آئے؟ اگر پیش آئے تو کیا امام عالی مقامؑ ان کو بخوبی طے کرکے منزلِ مقصود پر فائز المرام ہو سکے؟

۱۔ **خوف و ہراس** :۔ یزید نے تختِ حکومت پر متمکن ہوتے ہی اوّلاً جو کام سرانجام دیا تھا وہ یہ تھا کہ ولید بن عقبہ حاکم مدینہ کو خط لکھا کہ حسینؑ سے میری بیعت لو۔ اگر وہ انکار کریں تو ان کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دو۔ تاریخ حبیب السیر میں ہے۔

"چوں حاکم شام بعالمِ آخرت شتافت و یزید در دمشق بر مسندِ حکومت متمکن گردید نامہ بولید بن عتبہ بن ابی سفیان کہ در آں زمان والیِ مدینہ بود نوشت مضمون آں کہ بیعتِ من از حسینؑ ابن علیؑ و عبداللہ ابن زبیر بستاں و اگر بقدم قبول پیش نیایند، سرہائے ایشاں را بشام بفرست۔"

(ترجمہ) جب حاکمِ شام مرگیا تو یزید تختِ حکومت پر مقامِ دمشق متمکن ہوا اور فوراً ایک خط ولید بن عتبہ بن ابی سفیان والئی مدینہ کے نام اس مضمون کا بھیجا کہ میری بیعت حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے فوراً لے لے۔ اگر کوئی ان میں سے انکار کرے تو اس کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دے۔ (البلاغ المبین ۷۰،۱)

روضۃ الاحباب میں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہوا ہے :۔

"ولید نے بارِ دگر جب عبداللہ بن زبیرؓ کی تلاش میں آدمی بھیجے تو اس روز جناب امام حسینؑ بھی تفتیشِ حالات کی غرض سے باہر نکلے۔ راہ میں مروان سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا "اے ابا عبداللہ! بہتر ہوگا کہ آپ یزید کی بیعت کرلیں تاکہ آپ کو کوئی ضرر نہ پہنچے اور آتشِ فتنہ فرو ہو جائے۔ یزید کو اس بات کی اطلاع ہوگی تو آپ کے ساتھ انعام و اکرام کا برتاؤ کرے گا۔ اگر آپ میری بات پر عمل نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے۔" امام حسینؑ نے فرمایا "اے مروان! افسوس کہ تو جان بوجھ کر مجھے فاسق اور ظالم حاکم کی بیعت کا مشورہ دیتا ہے۔ بھلا تجھ سے کیا توقع رکھی جائے جب کہ رسول اللہؐ نے تیری پیدائش سے پہلے تجھ پر لعنت کی ہے۔" نیز امام حسینؑ نے اسی طرح کے درشت الفاظ امیر معاویہ

۱۔ **خوف و ہراس**:۔ یزید نے تختِ حکومت پر متمکن ہوتے ہی اوّلاً جو کام سرانجام دیا تھا، وہ یہ تھا کہ ولید بن عقبہ حاکم مدینہ کو خط لکھا کہ حسینؑ سے میری بیعت لو۔ اگر وہ انکار کریں تو ان کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دو۔ تاریخ حبیب السیر میں ہے۔

"چوں حاکم شام بعالمِ آخرت شتافت و یزید در دمشق بر مسندِ حکومت متمکن گردید نامہ بولید بن عتبہ بن ابی سفیان کہ در آں زمان والیِ مدینہ بود نوشت مضمون آں کہ بیعتِ من از حسینؑ ابن علیؑ و عبداللہ ابن زبیر بستاں و اگر بقدم قبول پیش نیایند، سرہائے ایشاں را بشام بفرست۔"

(ترجمہ) جب حاکم شام مرگیا تو یزید تختِ حکومت پر مقام دمشق متمکن ہوا اور فوراً ایک خط ولید بن عتبہ بن ابی سفیان والئی مدینہ کے نام اس مضمون کا بھیجا کہ میری بیعت حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے فوراً لے لے۔ اگر کوئی ان میں سے انکار کرے تو اس کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیجدے۔ (البلاغ المبین ۷۰،۷۱)

روضۃ الاحباب میں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہوا ہے:۔

" ولید نے بارِ دگر جب عبداللہ بن زبیرؓ کی تلاش میں آدمی بھیجے تو اس روز جناب امام حسینؑ بھی تفتیشِ حالات کی غرض سے باہر نکلے۔ راہ میں مروان سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا۔" اے ابا عبداللہ! بہتر ہوگا کہ آپ یزید کی بیعت کریں تاکہ آپ کو کوئی ضرر نہ پہنچے اور آتشِ فتنہ فرو ہوجائے۔ یزید کو اس بات کی اطلاع ہوگی تو آپ کے ساتھ انعام و اکرام کا برتاؤ کرے گا۔ اگر آپ میری بات پر عمل نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے۔" امام حسینؑ نے فرمایا۔" اے مروان! افسوس کہ تو جان بوجھ کر مجھے فاسق اور ظالم حاکم کی بیعت کا مشورہ دیتا ہے۔ بھلا تجھ سے کیا توقع رکھی جائے جب کہ رسولؐ اللہ نے تیری پیدائش سے پہلے تجھ پر لعنت کی ہے۔" نیز امام حسینؑ نے اسی طرح کے درشت الفاظ امیر معاویہ

کر دیئے جاؤ گے۔ جس شدت کے ساتھ امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا جارہا تھا اس سختی کے ساتھ ابن زبیر کو بیعت پر مجبور نہیں کیا جارہا تھا جیسا کہ مذکورہ بالا حوالہ جات سے ظاہر ہے۔ ان حالات میں حضرت حسینؑ بھی جب اپنے اہل وعیال کو لے کر مدینہ سے مکّہ مکرمہ کی طرف نکلے تو یہی کہتے ہوئے نکلے۔ "خداوندا! مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے۔" حوالہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"فَلَمَّا سَارَ الْحُسَيْنُ نَحْوَ مَكَّةَ قَالَ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفاً يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ فَلَمَّا دَخَلَ مَكَّةَ قَالَ فلما توجه تلقاء مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ" (تاریخ طبری الجزء السادس۔ ص ۱۹۱)

(ترجمہ) امام حسینؑ نے مکّہ کی طرف چلتے ہوئے یہ آیت پڑھی کہ موسیٰؑ اپنے شہر سے وہاں کے امراء کے خوف سے نکلے۔ پیچھے دیکھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ خداوندا! مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے اور جب امام حسینؑ مکہ میں داخل ہوئے تو آیت کا باقی حصہ پڑھا کہ جب موسیٰؑ نے مدین کی طرف رخ کیا تو کہا کہ شاید میرا خدا اب صراط مستقیم کی طرف لے جائے۔" بہر صورت یہ **حالتِ خوف** کا اظہار ہے۔ (البلاغ المبین۔ ص ۱۶۶)

لہٰذا آیۂ زیر بحث کے مطابق امام عالیمقامؑ ابتلا کی پہلی منزل خوف و ہراس طے کرتے ہیں۔ مدینہ کی سکونت اور روضہ مطہرہ رسولؐ کا قرب بحالتِ خوف ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن فاسق و فاجر حاکم کی بیعت نہ کرنے کا جو عزم کر چکے ہیں اس پر چٹان کی طرح سختی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کی رگوں میں محمد عربیؐ کا خون دوڑ رہا تھا اور دل میں حق کا خوف اور حق کا عشق تھا۔ باطل کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ یزید کا حکم حکم باطل ہے اور اس کے باطل ہونے پر مجھے اس درجہ یقین ہے اور اس کے قبول کرنے پر اس شدت

سے انکار ہے کہ ترکِ وطن کی تکلیف اٹھانے اور روضۂ رسولؐ کی جدائی برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ آزمائش کی پہلی کڑی منزل تھی جس کو حضرت حسینؑ نے اس صبر و استقلال سے طے کیا کہ آپ کے پائے ثبات میں ذرا بھر بھی لغزش نہ آئی۔

۲۔ بھوک اور پیاس :۔ مفلسی و تنگدستی ایک بڑی مصیبت ہے لیکن فاقہ کشی، مفلسی و ناداری کی انتہائی صورت کا نام ہے۔ فاقہ کشی کی مصیبت تو قلیل عرصہ کے لئے برداشت کی جاسکتی ہے لیکن شدّتِ تشنگی۔ خدا کی پناہ! ایک لمحہ کے لئے برداشت کرنا محال ہو جاتا ہے۔ ماہِ صیام میں روزہ داروں کو ذاتی تجربہ ہو جاتا ہے کہ شدتِ گرسنگی اگرچہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے مگر شدّتِ تشنگی کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ پیاس کی شدّت۔ پناہ بخدا! ایک ایسی جانکاہ و حوصلہ شکن مصیبت ہوتی ہے کہ کہ اس کا برداشت کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ جناب حسینؑ اور اہلِ بیتِ رسالت کا امتحان ان ہی شدائد میں لیا گیا لیکن مرحبا اے جگر گوشۂ بتولؑ! آپ کے صبر اور قوتِ برداشت کو دیکھ کر دنیا "انگشت بد دہاں" کے مصداق ہے۔ قارئینِ کرام کو معلوم ہے کہ آفت رسیدہ و غم دیدہ قافلۂ رسالت ساتویں محرم سے پانی کی نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم ہو چکا تھا۔ کمسن بچوں کے قلبی اضطرار و انتشار کی حالت کو بیان کرنے کا کس کو یارا ہے۔ اہلِ بیتؑ کی تشنگی اور بے قراری کا ایک درد بھرا واقعہ "مشیر الاحزان" میں مرقوم ہے جس کو سید اولاد حیدر فوق بلگرامی نے اپنی کتاب "ذبحِ عظیم" کے صفحات ۲۰۹-۲۱۲ پر درج کیا ہے ہم اس کا مختصر خلاصہ اپنے الفاظ میں یہاں درج کرتے ہیں :۔

جناب سکینہ صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیہا فرماتی ہیں: نویں تاریخ محرم وفورِ تشنگی کا یہ عالم تھا کہ ہم تقریباً بیس لڑکوں اور لڑکیوں نے پیاس سے بیتاب ہو کر جنابِ زینبؑ کے گرد ہالہ بنالیا۔ عرب کے مشہور قاری بریر ہمدانیؓ یہ کیفیت

دیکھ کر بیقرار و بے تاب ہو گئے اور تین افراد کو ساتھ لے کر پانی لانے کے لئے دریائے فرات کی جانب چل پڑے۔ گھاٹ کے محافظوں نے آہٹ سن کر پکارا۔ "تم کون ہو؟" جواب میں حضرت بریرؓ نے کہا۔ "میں تمہارے رئیس اسحاق کا قرابت دار ہوں۔ پیاس نے ہمیں بے تاب کر دیا ہے"۔ محافظوں نے فوراً یہ اطلاع اسحاق تک پہنچائی۔ اسحاق نے بصد خوشی حضرت بریر کا نام سنتے ہی بلا تکلّف ان کو آبِ دریا سے سیراب ہونے کی اجازت دیدی مگر بعد میں جب اس پر یہ ظاہر کیا گیا کہ بریرؓ خود پانی نہیں پیتے بلکہ مشک بھر کر اطفالِ حسینؑ کی پیاس بجھانا چاہتے ہیں تو اسحٰق نے فوراً امتناعی حکم نافذ کر دیا لیکن اسی اثنا میں بریرؓ کا ایک سعادت مند رفیق پانی سے مشک بھر چکا تھا۔ اشقیاء نے ان کو گھیر لیا اور مشکیزہ پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ایک تیر مشکیزہ کے تسمہ پر آکر لگا اور بہادر کے شانہ میں آکر پیوست ہو گیا۔ تمام کپڑے خون سے رنگین ہو گئے لیکن وفا کے پتلے، اسلام کے مخلص شیدائی دشمنوں سے لڑتے ہوئے اور زخموں پر زخم کھاتے ہوئے مشک کو صحیح و سالم خیمۂ اہلبیتؑ تک لے آئے۔ بہادر مجاہد کہنے لگا۔ "اس خدائے بے نیاز کا صد شکر، جس نے میری گردن کو مشک کی سپر بنا دیا قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جب مشک کو زمین پر رکھا گیا تو پیاس کے مارے ہوئے بچوں کا ہجوم انتہائی بیقراری و بیتابی سے مشک پر آگرا۔ یکایک مشک کا دہانہ الٹ گیا اور منہ کھل گیا۔ وہ سب پانی خاک پر بہ گیا۔ بچے چلّا چلّا کر رونے لگے۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت بریرؓ اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگے اور کہتے تھے۔" ہزار افسوس! ہم اپنی جان دے کر یہ پانی لائے مگر قسمت میں نہ تھا کہ دخترانِ رسولؐ کے جلتے ہوئے جگر اس سے ٹھنڈے ہوں۔

ان حقائق کی موجودگی میں بچوں کی شدّتِ تشنگی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے

اس واقعہ سے حضرت بریرؓ اور ان کے رفقائے کار کے اعلیٰ درجہ کے محاسنِ خدمات، حقیقی جانثاری و مخلصانہ وفاکیشی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جاں نثارانِ حسینؑ کی والہانہ محبت و قلبی خلوص محض جناب حسینؑ کی ذاتِ گرامی تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اہلبیتِ نبوی کے ہر بچے سے حقیقی انس و روحانی تعلق ویسا ہی تھا جیسا خود سبطِ پیغمبرؐ کی ذاتِ ستودہ صفات سے۔ یہی والہانہ محبت و حقیقی روحانی مؤدت تھی جس نے حضرت بریرؓ کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ معصوم بچوں کی مضطربانہ حالت دیکھ کر وہ امام عالی مقامؑ کی اجازت کا بھی انتظار نہ کر سکے اور سربکف ہو کر پانی حاصل کرنے کے لئے فرات کی جانب چل پڑے۔ اصحابِ حسینؑ کا یہ خلوص و ایثار تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ دنیا کے ممالک کو تسخیر کرنے کی شعبدہ بازی تو بہت سے حریفوں نے کر دکھائی مگر موت پر فتح پانا حضرت حسینؑ اور ان کے اصحاب کے لئے مخصوص تھا۔

دوسری چیز جو اس واقعہ سے منظرِ عام پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اشقیاء کو جو عداوت تھی وہ صرف فرزندِ رسولؐ سے۔ جو انکار تھا وہ محض جناب حسینؑ کے استحقاق کا اور جو ایذا رسانی و کینہ پروری کی سلسلہ جنبانی تھی وہ صرف امام عالی مقامؑ کی ذاتِ مقدس کے لئے۔ وہ سب کو اور سب کی قرابتوں کو پہچانتے تھے۔ نہ پہچانتے تھے تو جناب حسینؑ کو۔ نہ رعایت و مروّت کرتے تھے تو نواسۂ رسولؐ کی قرابت داری کی۔ زمانہ کی ستم ظریفی اور قوم اشقیاء کی سنگدلی دیکھئے۔ حضرت بریر ہمدانیؓ کو تو فوجِ اشقیاء کے رئیس اسحٰق کی قرابت داری سے یہ رعایت مل سکتی ہے کہ وہ اپنے تین ساتھیوں سمیت دریائے فرات کے پانی سے بلا تکلف پیاس بجھا سکتے ہیں لیکن جناب حسینؑ و دخترانِ رسولؐ کو جناب رسالتمآبؐ کی رشتہ داری کی بناء پر کوئی مراعات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ پس دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت ہو گیا کہ ابتلائے عظیم

جس کی طرف آیۂ کریمہ " وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ " اشارہ کرتی ہے کی مصداقِ خصوصی جناب امام ذی شان کی ذاتِ گرامی ہے جنہوں نے امتحانِ صبر و شکر میں حضرت ایوبؑ و حضرت نوحؑ سے بدرجہا بڑھ کر ثابت قدمی و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے۔

۳۔ نقصانِ مال و متاع :۔ آیۂ زیرِ بحث میں ابتلائے عظیم کی تیسری منزل کو قرآنی اصطلاح میں نَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پیشنگوئی کا یہ پہلو اس صراحت کے ساتھ جناب حسینؑ کی زندگی پر چسپاں ہوتا ہے کہ متعصب دشمن کو بھی مجالِ انکار نہیں اور نہ ہی چون وچرا کی کوئی گنجائش موجود ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ امام حسینؑ کا دشمنوں نے جب مدینہ منورہ کی پاک سرزمین میں زندگی بسر کرنا ناممکن بنا دیا اور آپ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے تو آپ کا تمام اثاث البیت وہیں کا وہیں دھرا رہ گیا۔ تاریخ عالم کے مشاہدات میں سے یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جب کسی شخص کو ترکِ وطن پر مجبور کیا جاتا ہے اور وہ مہاجر الی اللہ بن کر اپنے گھر کا مال و متاع، زیورات و پارچات، جائداد منقولہ و غیر منقولہ حتیٰ کہ آبائی سکونتی مکانات بھی چھوڑ کر راہِ خدا میں قدم رکھتا ہے تو اس کے پاس محض خدا کا نام ہی ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بحالتِ خوف جب ترکِ سکونت فرمائی تو آپ کے پاس سوائے چند کپڑوں کے جن سے جسم ڈھکا ہوا تھا اور کیا مال و متاع رہ گیا تھا آقائے نامدار جناب احمد مجتبےٰؐ نے جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو آپ کے پاس کون سا مال و متاع رہ گیا تھا۔ آبائی سکونتی مکانات پر مشرکینِ مکہ قابض ہو گئے تھے۔ اگر یہ تاریخی مقولہ (History repeats itself) کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے درست ہے تو وہ حضرات جو ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران سکھوں کے وحشانہ و بہیمانہ ظلم و ستم اور جور و جفا کا شکار ہو کر انتہائی بیکسی و کس مپرسی

کے عالم میں، مہاجرین کے لباس میں مشرقی پنجاب سے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب سمجھتے ہیں کہ جب کسی مومن کو دشمنانِ دینِ خدا ترکِ وطن پر مجبور کر دیتے ہیں تو اس مہاجر الی اللہ کے ساز و سامان اور مال و متاع کا کیا حشر ہوتا ہے۔ وہ بیچارہ تو نانِ شبینہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت امامؑ جب ترکِ وطن پر مجبور ہوکر عازمِ مکۂ مکرمہ ہوئے تو آپ کا مال و متاع وہیں رہ گیا تھا اور محض درویشانہ حالت میں مکۂ معظمہ کے اندر قیام پذیر ہوئے۔ ابھی آپ کو چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ یزیدی سپاہی حاجیوں کے بھیس میں قتل کی غرض سے آ پہنچے۔ امامؑ مجبوراً حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے عراق کی بآبارِ دگر مہاجر الی اللہ بن کر روانہ ہوئے۔ اس شخص کے پاس جس کا گھر پہلے ہی لٹ چکا ہو کون سی دولت باقی رہ سکتی ہے کہ جس کو مال و متاع سے تعبیر کیا جائے۔ پھر جب آپ کو اس عجلت سے مکۂ معظمہ کی سکونت ترک کرنا پڑی کہ آپ حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے ۸ ذوالحجہ کو عازمِ عراق ہوئے تو کون سا وقت اور کون سا موقع آپ کو مل سکا کہ آپ سامانِ سفر کا تسلی بخش اہتمام کر سکتے۔ بہر حال تھوڑا سا اثاث البیت جو باقی رہ گیا تھا اس کا اغیار کے تصرف میں چلا جانا ایک قدرتی امر تھا۔ خواہ وہ عبداللہ بن زبیر کے حواری ہوں یا یزیدی حکومت کے نمائندے۔ جس طرح ابتلائے مذکور کی دوسری جزئیات انتہائی شدّت کو پہنچی ہوئی ہیں اسی طرح یہ جز **"نقص من الاموال"** بھی کچھ کم شدید نہیں۔

میدانِ کربلا میں قومِ اشقیاء نے شہادتِ حسینؑ کے بعد صرف اسی پر اکتفا نہ کیا کہ اہلِ بیتِ عظام کے خیموں میں گھس کر ان کو لوٹا، آیۂ تطہیر کی شہزادیوں کو بے رِدا کیا، خیموں کو نذرِ آتش کیا بلکہ جناب سکینہ کے کانوں سے دُرہائے گراں مایہ کو اس طرح کھینچا گیا کہ زخمی کانوں سے خون کے فوارے بہ نکلے۔ آیہ کریمہ "نقص

مِن الاموال" کی تعبیر و تفسیر اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ تاریخ اس سے بڑھ کر اندوہ ناک اور دل ہلا دینے والا واقعہ اپنے دامن میں نہاں رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ

* قتلِ حسینؑ کے بعد قومِ جفا کار نے آپ کے جسمِ اطہر سے نہ صرف لباسِ مقدس ہی اتار لیا بلکہ بجدل بن مسلم کلبی نے انگشتری اتارنے کی غرض سے انگشتِ مبارک کو بھی قلم کر لیا تھا۔

نیز ملاحظہ فرمائیے: "وَفی الخطط المقریزی قال وسلب الحسین ما کان علیہ حتیٰ سراویلہ۔ (تاریخ احمدی ص:۳۱۶)

(ترجمہ) کتاب الخطط و الآثار مقریزی میں ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کا لباس دشمنوں نے اتار لیا حتیٰ زیر جامہ تک بدن پر نہ رہنے دیا۔

* تاریخِ کامل میں ہے کہ یزیدیوں نے امام حسینؑ کا مال و متاع لوٹ لیا حتیٰ کہ مخدرات کے سروں کی چادریں بھی چھین لیں۔

پس یہ عملی تفسیر تھی آیہ مبارکہ "نقص من الاموال کی جو جناب حسینؑ کی مظلومیت اور صبر و ثبات کے علاوہ قوم اشقیا کی سنگ دلی، جفا جوئی اور کینہ پروری پر دال ہے۔

۴۔ **قتلِ نفس** :۔ قرآن حکیم کی یہ پیشین گوئی جس شان سے جناب حسینؑ کی مقدس ذات پر پوری اترتی ہے اگر اس کو تفصیل وار بیان کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں معرضِ وجود میں آجائیں۔ کس کو یارا ہے کہ وہ ان بہتر ۷۲ نفوسِ مقدسہ کی شاندار قربانی، بےمثل

* جوانمردی اور بے نظیر جوشِ جہاد کا تذکرہ کرے جنہوں نے تحفظِ دین کی خاطر اس عدیم المثال ایثار و ثابت قدمی اور حیرت انگیز صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے جس کو دیکھ کر آج بھی دنیا محوِ حیرت ہے۔ تاریخ کے مقدس اوراق اصحاب حسینؑ کی جانثاری و فدا کاری کے عظیم الشان کارناموں سے مملو ہیں۔ آیۂ کریمہ" نقص من الاموال و

الْاَنْفُسْ " میں نفس کا صیغہ جمع استعمال کر کے بہتر ۷۲ نفوسِ مقدسہ کی حیرت انگیز قربانی کا ذکرِ جمیل فرما دیا گیا ہے۔ ہم بخوف طوالت اس موقع پر صرف حضرت ابوالفضل العباسؑ بن علی کے جرأت مندانہ ایثار کے ثبوت میں مختصر سی بحث سپرد قلم کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

عباسِ جری کی وفاشعاری

روضۃ الاحباب میں ہے کہ جب حضرت عباسؑ بن علیؑ نے عزیزوں اور بھائیوں کو یکے بعد دیگرے قتل ہوتا دیکھا تو ان کی آنکھوں سے خون ٹپک پڑا۔ عَلم اٹھائے امام حسینؑ کے سامنے آکر کہنے لگے کہ "اب حضور مجھے بھی اجازتِ جنگ عطا کریں کیونکہ بھائیوں کی مفارقت مجھ پر بیحد شاق ہو رہی ہے"۔ یہ سن کر امام حسینؑ رونے لگے۔ حضرت عباسؑ نے عرض کیا "یا ابن رسول اللہ! میری جان آپ پر فدا ہو۔ اب میرا دل زندگی سے سیر ہو گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو ان ظالموں سے انتقام لوں"۔
(تاریخ احمدی۔ص ۲۹۹)

روضۃ الشہداء میں مذکور ہے کہ امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کی یہ تقریر سن کر فرمایا۔ "اگر تمہاری یہی تمنا ہے تو بسم اللہ جاؤ مگر پہلے دشمنوں سے قطع حجت کر لو یعنی جو کچھ میں کہوں ان کے سامنے بیان کرو اور جب وہ نہ مانیں تو ان سے لڑو"۔ یہ فرما کر جو کچھ کہنا تھا آپ نے حضرت عباسؑ سے کہہ دیا اور ان کو رخصت کیا۔
(تاریخ احمدی۔ص ۳۰۰)

روضۃ الاحباب میں ہے کہ جب حضرت عباسؑ علمدار میدانِ جنگ میں پہنچے تو انہوں نے گھوڑے کو روک لیا اور دشمنوں سے مخاطب ہو کہا۔ "اے قوم! فرزندِ رسولِ خدا فرماتے ہیں کہ میرے بھائیوں اور میرے ہواخواہوں کو تم نے قتل

کر ڈالا۔ اب کم از کم اتنا کرو کہ ہم کو تھوڑا سا پانی دے دو تاکہ بچے اور عورتیں تشنگی سے ہلاک نہ ہوں .... شمر بن ذالجوشن اور شیث بن ربعی نے سامنے آکر کہا۔

"اے علیؑ کے بیٹے! جاکر اپنے بھائی سے کہو کہ اگر تمام روئے زمین پانی ہو کر ہمارے تصرف میں آجائے تب بھی ہم اس میں سے ایک قطرہ تم کو اس وقت تک نہ دیں گے جب تک تم یزید کی بیعت نہ کر لوگے۔ حضرت عباسؑ دشمنوں پر نفریں کرتے ہوئے واپس آئے اور جو کچھ شمر وغیرہ نے کہا تھا۔ امام حسینؑ کی خدمت میں عرض کر دیا۔ (تاریخ احمدی۔ ص ۳۰۰۔۳۰۱)

ناگہاں خیمے میں صدائے "العطش۔ العطش" بلند ہوئی۔ حضرت عباسؑ اہلِ بیتِ رسالتؐ کی فریاد و زاری سن کر بیتاب ہو گئے اور مشک لے کر فرات کی جانب روانہ ہوئے۔ راوی کہتا ہے کہ دریائے فرات پر ابن سعد کی چار ہزار فوج متعین تھی۔ جب حضرت عباسؑ نے ادھر کا رخ کیا تو وہ فوج مانع و سدِّراہ ہوئی۔ حضرت عباسؑ نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ کیا تم کافر ہو یا مسلمان؟ انہوں نے کہا ہم مسلمان ہیں۔ حضرت عباسؑ بولے کہ مذہبِ اسلام میں کب جائز ہے کہ سگ وخوک۔ دام و دَدْ اور چرند و پرند تو اس دریا سے سیراب ہوں اور پیغمبرؐ کے نورِ نظر و فاطمہ زہراؑ کے لختِ جگر محروم رہیں۔ کیا تم کو تشنگیِ روزِ قیامت کا ذرا خوف نہیں؟ یہ سن کر گروہِ اشقیا کے پانچ سو جوانوں نے حضرت عباسؑ پر تیر برسانے شروع کئے۔ حضرتِ عباسؑ نے ان پر حملہ کر کے ان میں سے اکثر کو مار گرایا اور باقی ادھر ادھر متفرق ہو گئے۔ حضرت عباسؑ نے گھوڑا دریا میں ڈالا ہی تھا کہ پھر ابن سعد کے سواروں نے آکر گھیر لیا۔ حضرت عباسؑ نے دریا سے باہر نکل کر للکارا اور حملہ کر کے ان سواروں کو بھی منتشر کر دیا۔ اسی طرح کئی بار حملہ کرنے کے بعد گھاٹ پر پہنچ کر مشک پانی سے بھری۔ (تاریخ احمدی۔ ص ۳۰۱)

تاریخِ عالم میں یہ واقعہ یادگار رہے گا کہ ہزاروں سپاہیوں نے ایک بہادر کو روکنا چاہا اور نہ روک سکے ۔ عباسؑ کے شیرانہ حملوں نے دشمن کو اس قدر پسپا کردیا تھا کہ انہوں نے اطمینان سے نہر میں گھوڑا ڈال کر مشک میں پانی بھر لیا ۔

دو معرکے تاحشر نہ بھولے گا زمانہ — خیبر میں اکیلے اسداللہ کا جانا
یاں مشک لئے نہر پہ عباسؑ کا آنا — وہ باپ کا قصہ تھا یہ بیٹے کا فسانہ
اس قلعہ کا در حیدرِ کرار نے توڑا — دیواروں کو لوہے کی علمدار نے توڑا

عباسِ جری کے ہونٹ پیاس کے مارے خشک تھے لیکن واہ رے وفا شعاری امامؑ کی پیاس کے خیال نے لبوں کو پانی سے تر کرنے کی اجازت نہ دی اور پیاسے ہی نہر سے باہر نکل آئے اور بھری ہوئی مشک دوش پر لئے خیمہ کی جانب روانہ ہوئے۔

فوجِ اشقیا غصہ سے پہلے ہی پیچ و تاب کھا رہی تھی ۔ احساسِ شکست نے جذبات کو اور بھی مشتعل کردیا کہ ایک مردِ مجاہد ہزاروں کو شکست دے کر بامراد خیمہ کی طرف لوٹ کر جا رہا ہے ۔ دشمن نے چاروں طرف سے یورش کی ۔ ان حالات میں ہر شخص حضرت عباسؑ کی مشکلات کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے ۔ دوش پر مشک مستقل طور پر جنگ سے مانع تھی ۔ علم بھی موجود تھا مگر کیا کہنا اس حیدری شیر کی شجاعت کا جو اس عالم میں بھی پورے جوش و خروش سے حملہ کر رہا تھا ۔ حضرت عباسؑ کو اپنی جان سے زیادہ مشک کی حفاظت اور علم کو بلند رکھنے کا خیال تھا ۔ اچانک ایک شقی ازلی نے خنجر کی ایک ایسی ضرب لگائی کہ علمبردار کا داہنا ہاتھ کٹ گیا ۔ انہوں نے مشک فوراً بائیں کندھے پر رکھ لی ۔ دشمنوں نے نرغہ کرکے بایاں ہاتھ بھی قلم کر ڈالا ۔ حضرت عباسؑ نے مشک کو دانتوں سے پکڑ لیا ۔ اتنے میں ایک شقی نے تیر مارا کہ مشک میں سوراخ ہو گیا اور تمام پانی مشک سے بہ نکلا ۔ حضرت عباسؑ مجروح ہو کر گھوڑے سے گر پڑے ۔

اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگے۔ "بھائی میری خبر لیجئے"۔ امامؑ اس آواز کو سن کر سخت متاثر ہوئے اور شکاری باز کی طرح جھپٹے۔ زخمی بھائی کی لاش پر پہنچ کر دیکھا کہ دونوں ہاتھ قطع ہیں۔ پیشانی شکستہ، آنکھ پر تیر اور زخموں سے چور، امامؑ سرہانے جھکے کہ شیر دل عباسؑ کی روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کی۔ اب کوئی نہ تھا جس کا حسینؑ کو سہارا ہوتا۔ امامؑ بھائی کی لاش سے اٹھے، آگے بڑھے اور تیغ خون آشام کو حرکت دی۔ دشمن تھے کہ دائیں بائیں بھاگے جا رہے تھے۔ میدان جنگِ صفین کا نمونہ بن رہا تھا اور بھولی ہوئی دنیا کو حیدرِ کرار کی شجاعت یاد آ رہی تھی۔ امامؑ نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بھائی کو تو مار ڈالا۔ بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بازو کو تو شکستہ کر دیا"۔ آہ! امامؑ خیمہ گاہ کی طرف واپس پلٹے اور فرماتے جاتے تھے۔ "اَلْآنَ انْکَسَرَ ظَهْرِی"۔ کہ آہ! اب میری کمر ٹوٹ گئی۔ (روضۃ الاحباب)

اقتباسات مذکور سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اوّلاً: حضرت عباسؑ کی بہادری ہاشمی جرأت و شجاعت کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ثانیاً: حسینی علمدار کا بلند پایہ کردار منظرِ عام پر آتا ہے کہ تن تنہا مردِ میدان کس طرح چار ہزار مسلح سواروں اور پیادہ سپاہ سے نبرد آزما ہوا اور ایک تعدادِ کثیر کو واصلِ جہنم کر کے دریا کے کنارے فاتحانہ انداز سے پہنچا۔ تیروں کی بے پناہ بارش ہو رہی تھی لیکن اہلبیتِ رسالتؐ کی تشنگی فرائضِ منصبی کی یاد دہانی کرا رہی تھی۔ قلبی محبت کے احساسات اور جوشِ جہاد مردِ مجاہد کو ہر لحہ خطرات و مشکلات سے دوچار ہونے کی دعوت دے رہا تھا ایک عجیب شانِ استغنا سے شیرِ خداؑ کے نورِ نظر نے مشک کو پانی سے پُر کیا اور اسے کندھے پر اٹھا کر باہر لائے۔ گروہِ اشقیاء نے پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا لیکن حضرت عباسؑ کے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ دایاں ہاتھ کٹا تو مشک

کو بائیں شانہ پر رکھ کر مجاہد نے گرج کر کہا: "خدا کی قسم! اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے دین کی حمایت نہ کروں گا۔ اس فرض کو تو میں ہمیشہ انجام دیتا رہوں گا۔"

بایاں ہاتھ قلم ہوا تو مشک کو دانتوں سے پکڑ کر خیمۂ اہلبیتِ رسالتؐ تک پہنچانے کی سعی کی۔ مشک کو تیر لگا، سوراخ سے پانی بہہ نکلا۔ اسداللہ کے لختِ جگر زخموں سے نڈھال ہو کر فرشِ زمین کے لئے باعثِ زینت بنے اور شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے، تاریخ کے صفحات سے پوچھئے کہ حضرتِ عباسؑ کیا تھے جنابِ عباسؑ جرأت و شجاعت کے پیکر، اخلاص و محبت کا مجسمہ، حق پرستی و وفا کیشی کا مرقع اور ایثار و سرفروشی کا بہترین نمونہ تھے۔

قومِ یزید کی شقاوتِ قلبی

ان تاریخی حقائق سے جہاں ایک طرف گروہِ اتقیاء کے بلند پایہ اطوار و محاسنِ اخلاق عوام کے سامنے آتے ہیں وہاں دوسری طرف فوجِ اشقیا کی سنگ دلی، سفاکی اور بزدلی طشت از بام ہوتی ہے۔ حضرتِ عباسؑ جب دشمنانِ دین کو امامؑ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور تشنہ دہن اطفال کے لئے پانی مانگتے ہیں تو قسی القلب قوم جواب میں کہتی ہے کہ حسینؑ سے کہدو کہ اگر تمام روئے زمین کا پانی ہمارے تصرف میں آجائے تب بھی اس میں سے ایک قطرہ تم کو اس وقت تک نہ دیں گے جب تک تم یزید کی بیعت نہ کر لو گے۔ حضرتِ عباسؑ کے اس اتمامِ حجت پر کہ تم اسلام کے دعوے دار ہو کر اہلِ بیتِ رسولؐ کو دریائے فرات کے پانی سے کیوں محروم کر رہے ہو حالانکہ پرند و چرند اس نعمتِ خداوندی سے فیض یاب ہو رہے ہیں، زیورِ انسانیت سے عاری قوم کو جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

اللہ اکبر! نیرنگیٔ عالم ملاحظہ کیجئے۔ ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ منزلِ شراف پر حُر کا لشکر پیاس کے مارے ہلاکت کا شکار ہو رہا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کوسوں پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ اڑتی ہوئی گرم ریت کے بگولے پیاسے لشکر کی ہلاکت کا سامان کر رہے تھے۔ فرزندِ رسولؐ نے فوجِ مخالف کی پریشانی دیکھی اپنی بے پایاں فیض رسانی کا جائزہ لیا۔ غلاموں کو حکم دیا کہ پیاسے لشکر کو پانی سے سیراب کیا جائے اور دشمن کے گھوڑوں کو بھی اس نعمت سے محروم نہ رکھا جائے۔ چنانچہ فرزندِ ساقیِ کوثر کے جود و سخا سے تمام کا تمام پیاسا لشکر سیراب ہو گیا اور ان کے پیاس سے جلتے ہوئے دلوں، دہکتے ہوئے کلیجوں کی آگ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی ؎

کیا سخی تھا ساقیِ تسنیم و کوثر کا پسر　　غیر کو پانی پلایا خود پیاسا رہ گیا

آپ نے اہلِ بیتِ نبوت کی فیض رسانی بھی دیکھی اور قومِ بدکار کی محسن کشی و احسان فراموشی بھی ملاحظہ کی جس قدر قومِ اشقیا کا تشدد بڑھتا گیا حسینی ارادوں میں اتنی ہی توانائی و پختگی آتی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ قومِ جفا کار کی بربریت و بہیمیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی لیکن امام عالی مقامؑ عزم و ایقان کا وہ پہاڑ تھے جس سے جبر و تشدد اور جور و ستم کے مہیب طوفان ٹکراتے رہے مگر اسے سرِ مو جنبش نہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں قومِ جفاکار کی شقاوتِ قلبی کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے:۔

وَ قَالَ ابن الاثیر فی الکامل وَجَاءَ شِمر فدعا العباس بن علی واخوته فخرجُوا اِلَیهِ فَقَالَ انتُم یابنی اختی اٰمنون فَقَالُوا لهٗ لَعَنَكَ الله و لَعَنَ اَمَانَكَ اتؤمنّنا وابن رسول الله لا امانَ لهٗ۔ (تاریخ احمدی۔ص ۲۶۹)

(ترجمہ) تاریخ کامل میں ہے کہ شمر نے کربلا پہنچ کر حضرت عباسؑ بن علیؑ اور ان کے بھائیوں کو بلا بھیجا اور کہا: "اے پھوپھی زادگان! میں تم کو امان دیتا ہوں۔" حضرت عباسؑ وغیرہ نے فرمایا: "خدا تجھ پر اور تیری امان پر لعنت کرے۔ اے بے حیا!

تو ہم کو امان دیتا ہے اور فرزندِ رسولؐ کے لئے امان نہیں۔"

صدق و صفا اور ایمان و وفا کے مجسمہ سے ایسے ہی جواب کی توقع ہو سکتی تھی۔ جب موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی اور تمام دنیا کے مصائب و آلام نے احاطہ کیا ہوا تھا تو یہ جناب عباسؑ ہی کا دل گردہ تھا کہ فوجِ مخالف کے اعلیٰ افسر کے پیش کردہ امان نامہ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا اور امامؑ کی نصرت میں بیکسی و غربت کی موت کو بدرجہا بہتر سمجھا۔ ذرا قوم جفاپیشہ کی قلبی شقاوت ملاحظہ فرمائیے۔ امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ دونوں امیرِ خیبر گیر حضرت علی مرتضیٰؑ کے فرزندانِ ارجمند تھے اور دونوں ہی کو بیعتِ یزید سے انکار تھا۔ حضرت عباسؑ کو تو شمر لعین ابن زیاد کے حکم سے امان دے رہا تھا لیکن نواسۂ رسولؐ، جگر گوشۂ بتول امام حسینؑ کے لئے کوئی امان نہیں۔ اگر کینہ و عناد علیؑ کے گھرانہ سے مختص ہوتا تو حضرت عباسؑ کے سامنے یہ امتیازی مراعات ہرگز نہ پیش کی جاتیں جس سے صاف عیاں ہے کہ قوم کی خونخواری و درندگی کا یہ عالم تھا کہ وہ خود اپنے پیغمبرؐ کا خون بہانے پر آمادہ تھی بلکہ "اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنَ الْحُسَیْن" کی روشنی میں مسلمانوں نے خود اپنے پیغمبرؐ کا خون بہایا ؎

ویکبرون بان قتلت وانما قتلوا بك التكبير والتهليلا

وکانما بك یابن بنت محمدٍ قتلوا جهارا عامدین رسولا

(ترجمہ) شہیدِ ظلم! آپ کو قتل کر کے لوگ نعرۂ تکبیر بلند کر رہے ہیں حالانکہ آپ کو قتل کر کے ان لوگوں نے اصلِ تکبیر و کلمۂ توحید ہی کا خاتمہ کر دیا اے فرزندِ رسولؐ! آپ کو کیا قتل کیا بلکہ ان لوگوں نے تو کھلم کھلا اور جان بوجھ کر آپ کے نانا رسولؐ کو قتل کیا۔

(تاریخ عزاداری ص ۳)

جہادِ آخر

آیۂ کریمہ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِنَ الْخَوْفِ ...... الخ کی روشنی میں پیشین گوئی
مذکور کی شق نمبر۴ (قتلِ نفس) پر بحث کرنا فی الحال ہمارے پیشِ نظر ہے۔
حضرت عباسؑ کی شہادت اسی سلسلہ کی ایک کڑی تصور کرکے چند تاریخی حقائق
پیشتر ازیں بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب امامؑ کی شہادت کے متعلق چند تاریخی شواہد
پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ پیشین گوئی کی موجودہ شق جناب حسینؑ کی ذات
ستودہ صفات پر ہی چسپاں ہوتی ہے۔ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ
کے بلند پایہ کردار و اعلیٰ نصب العین سے متعارف ہونے اور ان کا نقطۂ نظر
سمجھنے کے لئے امامؑ کے ان متعدد خطبوں میں سے جو آپ نے اتمام حجت
کے طور پر یوم عاشور صفِ اعدا کے سامنے ارشاد فرمائے تھے، ایک خطبہ
مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں نقل کردیں۔ خطبہ کے الفاظ زبانِ حال سے
پکار کر کہہ رہے ہیں کہ حضرت شبیرؑ راہ مصائب و جہادِ حق میں صبر و استقامت
اور عزم و ثبات کے ایک غیر متزلزل کوہِ پر وقار اور اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ
اسْتَقَامُوْا (حٰم ۳۰) کی حقیقی عملی تفسیر تھے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں :-
جب دشمن قریب آگیا تو آپ نے اونٹنی طلب کی۔ سوار ہوئے۔ قرآن سامنے رکھا اور
دشمن کی صفوں کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے یہ خطبہ دیا :-

یومِ عاشور فوجِ یزید کے سامنے پہلا خطبہ :- لوگو۔ میری بات
سنو۔ جلدی نہ کرو۔ مجھے نصیحت کر لینے دو۔ اپنا عذر بیان کرنے دو۔ اپنی آمد کی
وجہ کہنے دو۔ اگر میرا عذر معقول ہو اور تم اسے قبول کرسکو اور میرے ساتھ انصاف
کرو تو یہ تمہارے لئے **خوش نصیبی** کا باعث ہوگا اور تم میری مخالفت سے باز
آجاؤ گے لیکن اگر سننے کے بعد بھی تم میرا عذر قبول نہ کرو اور انصاف کرنے سے

انکار کردو تو پھر مجھے کسی بات سے انکار نہیں۔ تم اور تمہارے ساتھی ایکا کرلو۔ مجھ پر ٹوٹ پڑو۔ مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا اعتماد ہر حال میں پروردگارِ عالم پر ہے وہی نیکو کاروں کا حامی ہے۔ لوگو میرا حسب نسب یاد کرو۔ سوچو کہ میں کون ہوں؟ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو اور اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ غور کرو۔ کیا تمہارے لئے میرا قتل کرنا اور میری حرمت کا رشتہ توڑنا روا ہے؟ کیا میں تمہارے نبیؐ کی لڑکی کا بیٹا اور ان کے عم زاد کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا سید الشہدا حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہ تھے۔ کیا ذوالجناحین جعفرِ طیار میرے چچا نہیں ہیں۔ کیا تم نے رسولؐ اللہ کا یہ مشہور قول نہیں سنا کہ آپ میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرماتے تھے "سیدا شباب اهل الجنة" (جنت میں نوعمروں کے سردار) اگر میرا یہ بیان سچا ہے اور ضرور سچا ہے کیونکہ واللہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا تو بتلاؤ کہ کیا تمہیں برہنہ تلواروں سے میرا استقبال کرنا چاہیئے؟ اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے تو تم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے تصدیق کر سکتے ہو۔ جابر بن عبداللہ انصاری سے پوچھو۔ ابوسعید خدری سے پوچھو سہیل بن سعد ساعدی سے پوچھو۔ زید بن ارقم سے پوچھو۔ انس بن مالک سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے یا نہیں۔ کیا یہ بات بھی میرے خون بہانے سے نہیں روک سکتی؟ واللہ اس وقت روئے زمین پر بجز میرے کسی نبی کی لڑکی کا بیٹا موجود نہیں۔ میں تمہارے نبی کا بلا واسطہ نواسہ ہوں۔ کیا تم اس لئے مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ میں نے کسی کی جان لی ہے؟ کسی کا خون بہایا ہے؟ کہو کیا بات ہے آخر میرا قصور کیا ہے؟ (داستانِ کربلا۔ ص ۶۹-۷۱)

آپ نے بار بار پوچھا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ امامؑ اسی طرح مختلف اوقات

میں فوجِ اشقیاء کے سامنے خطبے ارشاد فرماکر اتمامِ حجت کرتے رہے۔ اپنی تشریف آوری کے مقصد، یزید کے فسق و فجور، اسلام پر اپنے حقوق، رسولؐ سے اپنے تعلقات کوفہ والوں کے خطوط کے مضامین اور اپنی بے گناہی کو اچھی طرح واضح کرتے رہے مگر ایسے کوتاہ اندیش و عاقبت برباددں پر حضرتؑ کے کلام کا کیا اثر ہوتا جو ملک و دولت اور جاہ و منصب کے لالچ میں قتلِ امامؑ پر کمربستہ تھے۔ ان کے دل و دماغ پر یزیدی حکومت کا خوف اور ابن زیاد کا غلط پراپگنڈہ مسلط تھا۔ وہ اپنے زعمِ ناقص میں امام علیہ السلام کو حکومتِ شام کا باغی، دشمنِ امن اور ملک و دولت کا حریص سمجھے ہوئے تھے۔ امامؑ آخری وقت تک فرضِ امامت سرانجام دیتے رہے تاکہ وہ کم بخت بھڑکتی ہوئی نارِ جہنم کا ایندھن نہ بنیں مگر یہ خوش بختی صرف حضرت حرؓ اور ان کے چند متعلقین کے مقدر میں تھی کہ ایک ہی جست میں نارِ جہنم سے گلزارِ جناں میں پہنچ گئے۔ صبحِ عاشور سے ظہر تک میدان کار زار گرم رہا۔ امامؑ کے تمام ساتھی یکے بعد دیگرے جاں نثاری و فداکاری کا ثبوت دے کر جامِ شہادت نوش کرتے رہے۔ آخر قبلِ عصر ایک وہ وقت آیا کہ آپ تن تنہا میدانِ جنگ میں کھڑے تھے اور چاروں طرف سے دشمن یلغار کر کے آ رہے تھے۔

جب حضرت امام زین العابدینؑ نے دیکھا کہ والد بزرگوار تنہا رہ گئے ہیں تو بے اختیار خیمہ سے باہر نکل آئے اور نیزہ اٹھا کر میدانِ جنگ کا عزم کیا حالانکہ ان کا بدن بیماری اور شدتِ ضعف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ جب امام حسینؑ نے ان کو میدانِ جنگ میں آتے ہوئے دیکھا تو بعجلت ان کے پاس پہنچ کر فرمانے لگے "واللہ اے جانِ پدر! لوٹ چلو۔ لڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔" یہ فرما کر دست گرفتہ ان کو خیمہ میں واپس لائے اور سامنے بٹھا کر ان سے کہا۔ "اے فرزند! میں نے اپنے والدین اور جدِ امجد سے سنا ہے کہ میری نسل تم ہی سے باقی رہے گی۔ تم پدرِ آئمۂ اہلبیتؑ ہو

اور تمہاری نسل انشاءاللہ تعالیٰ قیامت تک منقطع نہ ہوگی۔ اب میں تم کو اپنا وصی قرار دیتا ہوں اور اہلبیتِ رسالت کو تمہاری نگرانی میں چھوڑتا ہوں اور جو امانتیں اَب و جَد سے مجھے ملی ہیں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔" (روضتہ الشہدا۔ تاریخ احمدی ص۲۰۰)

پھر امام حسینؑ نے وہ تمام علوم جو سوائے اہل بیتؑ کسی کو معلوم نہیں ہیں حضرت امام زین العابدینؑ کے سپرد فرمائے اور پرہیزگاری و رضائے مولیٰ کی وصیت فرمائی۔ (روضۃ الاحباب)

وہ حسینؑ جن کی آنکھوں کے سامنے اصحاب ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے عزیز جدا ہوگئے، بھتیجے قتل ہوئے۔ بیٹا تلواروں سے مقتول ہوا، بھائی تہِ تیغ ہوئے اب تک صبرو تحمل کی منزلیں طے کرتے رہے اور اسلامی آئین کی محافظت کرتے رہے ظاہری اسباب کی بناء پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص جس نے اس قدر صبر آزما دحوصلہ شکن مراحل کو نہایت صبر و سکون سے طے کیا ہے اور تیغِ خون آشام کو اس شان سے بے نیام نہیں کیا جو ہاشمی کردار اور حیدری شجاعت کا شیوہ تھا۔ اب یقیناً جنگ نہیں لڑے گا بلکہ حوصلہ شکن و نامساعد حالات سے مجبور ہوکر اپنے آپ کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیگا۔ بالفرضِ محال جنگ بھی کرنا چاہے تو ایک آدمی کا ہزاروں سے کیا مقابلہ ہوسکتا ہے جب کہ عزیزوں کی موت نے اسے پہلے ہی دل شکستہ اور نڈھال کردیا ہو۔ عباسؑ کی موت نے جس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہو۔ علی اکبرؑ کی شہادت کے ساتھ ساتھ جس کی آنکھوں کی بصارت کم ہوچکی ہو، بھلا ستاون برس کی عمر کا انسان اس عالم میں تلوار کھینچ سکتا ہے اور جنگ کرسکتا ہے؟ عقلِ سلیم یقیناً اس سوال کا جواب نفی میں دے گی کہ نہیں، ہرگز نہیں۔ مگر تاریخِ عالم شاہد ہے کہ میدانِ کربلا میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔

حسینؑ بیابانِ کربلا میں صبرو ثبات کی منزلیں طے کرنے کے ساتھ ساتھ حدودِ

الٰہی کی نگہداشت بھی کر رہے تھے۔ امامؑ اسلامی آئین کے محافظ تھے اور ان قوانین کے تحفظ و بقا کے لئے سب کچھ نثار کر رہے تھے۔ حسینؑ دیکھ رہے تھے کہ اتمامِ حجت ہو چکا۔ اسلامی آئین کی محافظت ہو چکی۔ اب حفاظتِ خود اختیاری کے لئے دفاع آخری منزل میں پہنچ چکا ہے۔ حسینؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ دشمن کے سامنے **سپردگی یا غیر مشروط اطاعت** (UNCONDITIONAL SURRENDER) آئینِ اسلامی کے منافی ہے۔ امام حسینؑ امکانی دفاع کے فرض کو اس وقت تک انجام دینا چاہتے تھے جب کوئی دوسرا آدمی اسے انجام نہ دے سکتا ہو۔ امامؑ اس فرض کی تکمیل کے لئے اٹھے۔ قبائے خز مصری زیبِ تن فرمائی۔ جناب رسولِ خداؐ کا عمامہ باندھا سید الشہدا حضرت حمزہؓ کی سپر پشت پر لگائی۔ پدر بزرگوار کی شمشیر ذوالفقار حمائل کی اور اسپ ذوالجناح پر سوار ہو کر میدانِ جنگ میں تشریف لائے۔ (روضۃ الشہداء)
اس وقت آپ یہ اشعار بطور رجز پڑھ رہے تھے۔ " میں فرزند ہوں علیؑ کا جو بنی ہاشم میں بہتر تھے۔ میرے فخر کو یہی کافی ہے کہ میرے جدِّ امجد خدا کے رسولؐ و افضل ترین مخلوق ہیں۔ ہم زمین پر خدا کے روشن چراغ ہیں۔ میری ماں فاطمہؑ بنت محمدؐ اور میرے چچا جعفرؓ ہیں جو ذوالجناحین کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ہم اہلِ بیتِ رسالت ہی میں خدا کی برحق کتاب نازل ہوئی اور وحیٔ الٰہی و ہدایتِ امرِ خیر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (صواعق محرقہ)

اس رجز کے بعد امام حسینؑ نے فرمایا کہ " اے قوم اس خدا سے ڈرو جو رات کو دن کرتا ہے۔ مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ روزی دیتا ہے۔ دیکھو! اگر خدا کے قائل ہو اور رسولِ خدا پر ایمان رکھتے ہو تو مجھ پر ظلم نہ کرو کیونکہ میں اسی رسولؐ کی ذریت ہوں۔ اے قوم! کیا تم کو اس کا خوف نہیں ہے کہ قیامت کے دن میرے والدین اور جدِّ امجدؐ تم سے خصومت کریں گے۔ بہتّر جانیں میرے

اصحاب، اعزہ و اولاد کی تم نے ضائع کیں اور اب میرے قتل کے درپے ہو۔
(روضۃ الشہدا۔ تاریخ احمدی۔ ص ۳۰۹)

عمر سعد نے اپنے سپاہیوں کو آواز دی کہ حسینؑ کی باتوں میں نہ پڑو اور چاروں طرف سے ان کو گھیر کر تیر برساؤ۔ تقریباً پندرہ ہزار آدمیوں نے تیروں کی بارش شروع کی۔ (روضۃ الاحباب)

جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ دشمنوں کا عناد ترقی کرتا جاتا ہے اور یہ لوگ خصومت سے باز نہیں آتے تو دوبارہ میدانِ جنگ میں آکر دونوں صفوں کے بیچ کھڑے ہو گئے۔ (روضۃ الشہدا)

حسینی استغاثہ

پھر امام حسینؑ نے اتمام حجت کے لئے استغاثہ فرمایا جو آج تک فضائے نیلگوں میں گونج رہا ہے اور ہمیں دعوتِ عمل دے رہا ہے۔ اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ ہم مدعیانِ محبت میں سے ایسے کتنے ہیں جو صدائے استغاثہ کے جواب میں "لبّیک یابن رسول اللہ" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ امامؑ نے ارشاد فرمایا:۔

" اما من مغیث یغیثنا۔ اما من ذاب یذب عن حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اما من معین یعیننا۔ اما من ناصر ینصرنا۔ اما من محام عن حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مقتل ابو مخنف، سرالشہادتین، تاریخ احمدی۔ ص ۳۱۰)

(ترجمہ) آیا کوئی ایسا ہے جو ہماری فریاد کو پہنچے۔ آیا کوئی ہے جو حرمِ رسولؐ کی حفاظت اور ہماری اعانت و نصرت کرے۔ آیا کوئی ہے جو حرمِ رسولؐ کو بچائے۔

الوداعی سلام:۔ امام حسینؑ نے ندا کی کہ "اے ام کلثومؑ! اے زینبؑ! اے سکینہؑ! اے فاطمہؑ! تم سب کو میرا آخری سلام پہنچے۔" اس صدا کا آنا تھا کہ اہل بیت میں کہرام مچ گیا۔ چاروں طرف سے صدائے الوداع، الوداع اور ندائے الفراق، الفراق بلند ہوئی۔ حضرت ام کلثومؑ چیخ اٹھیں اور کہنے لگیں "اے بھائی! کیا آپ مرنے پر آمادہ ہو گئے؟" امامؑ نے فرمایا۔ "اے بہن! کیونکر وہ شخص مرنے پر آمادہ نہ ہو جس کا نہ کوئی ناصر ہے اور نہ مددگار۔ (مقتل ابومخنف)

اس کے بعد امام حسینؑ نے حضرت زین العابدینؑ کو لپٹا کر پیار کیا اور کہا۔ "اے فرزند! جب مدینہ واپس جانا تو میرے دوستداران کو میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ جب تم رنج غربت میں مبتلا ہو تو میرے مصائبِ غربت کو یاد کرنا اور جب خوشگوار پانی پیو تو میری پیاس کو نہ بھولنا۔" (روضۃ الاحباب۔ تاریخ احمدی ص ۳۱۱)

قتالِ امامؑ

مؤرخین کا بیان ہے کہ امامؑ نے میدان جنگ میں پہنچ کر اتمامِ حجت کے طور پر فوجِ یزید کے سامنے آخری خطبہ ارشاد فرمایا اور بعد دعا بہ نفسِ نفیس مصروفِ قتال ہوئے۔ سب سے پہلا شقی ازلی جو حضرتؑ سے مقابل ہوا وہ تمیم بن قحطبہ تھا جس کو اپنی پھرتی و تیزدستی پر بڑا ناز تھا مگر پسر حیدر کرارؑ کے سامنے پھرتی کوئی کام نہ آسکی اور آن کی آن میں مقتول ہو کر زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کے بعد دوسرا شقی گرجتا ہوا آیا اور دم کے دم میں فی النار ہو گیا۔ پھر تیسرا صفِ مخالف سے اکڑتا ہوا باہر نکلا اور فوراً لقمۂ اجل ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسرا آتا گیا اور قتل ہوتا گیا یہاں تک کہ فوجِ شام کی ایک معتدبہ جمعیت اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر میدانِ جنگ میں کام آگئی۔ عمر سعد نے حواس باختہ ہو کر اپنی فوج کو امامؑ کے مقابلہ سے روک لیا اور

چلا کر کہا۔ "تم لوگوں پر سخت افسوس ہے کیا تم نہیں جانتے یہ شخص انزاع البطین شیرِ غالب، علی ابن ابی طالبؑ کا بیٹا ہے جس نے قومِ عرب کے شجاعوں میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑا اور سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔" فاحملوا علیہ من کل جانبہٖ" ان پر چاروں طرف سے یکبارگی حملہ کرو۔ پھر کیا تھا حکم پاتے ہی رسالے کے رسالے، فوجوں کی فوجیں، پرے کے پرے نواسۂ رسولؐ کی ایک جان پر تلواریں نکالے، نیزے سنبھالے، تیر جوڑے چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ مگر واہ رے شانِ شجاعت اس انتشار و اضطرار کی حالت میں بھی امامؑ کی جرأت و استقلال میں سرمو فرق نہ آیا بلکہ ہجومِ کثیر کو دیکھ کر آپ گھوڑے پر مضبوطی سے جم کر بیٹھ گئے۔ آپ کی تیغِ خون آشام نے میمنہ سے میسرہ تک اور میسرہ سے میمنہ تک فوجِ مخالف میں وہ ہلچل مچادی کہ ہر شخص اپنی شجاعت و دلیری کے دعوے بھول گیا۔ باوجودیکہ تشنگی کی شدّت، احباب کے غم، اور عزیز و اقارب کے ماتم نے نڈھال کر رکھا تھا مگر پھر بھی آپ کی تیغ شرربار فوجِ کفار کے ساتھ وہی کام کر رہی تھی جو برق، خرمن کے ساتھ، بادِ صرصر چمن کے ساتھ کرتی ہے تلواروں پر تلواریں اور پیادوں پر سوار گر رہے تھے جسے دیکھ کر فوجِ مخالف سے عبداللہ بن عماد کو یہ کہنا پڑا کہ ہم نے کسی ایسے شخص کو جس کا دل ٹوٹ چکا ہو، جس کا جسم چور چور ہو، جس کے عزیز و اقارب مقتول اور جس کے اہلِ بیت محصور ہو چکے ہوں۔ ایسا قوی دل اور ثابت قدم نہیں دیکھا۔

عبداللہ بن حسنؑ کی شہادت:۔ شمر بن ذوالجوشن نے لوگوں کو برانگیختہ کرنا شروع کیا۔ ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا گیا۔ اہلِ بیت کے خیمے میں عورتیں اور چند کم عمر لڑکے رہ گئے تھے۔ اندر سے ایک لڑکے (عبداللہ بن حسنؑ) نے آپ کو اس طرح کھڑا دیکھا تو جوش سے بیخود ہو گیا اور خیمہ کی لکڑی لے کر دوڑ پڑا۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے کانوں میں دُر پڑے ہل رہے تھے۔ یہ گھبرایا ہوا دائیں بائیں دیکھتا چلا۔ حضرت زینبؑ کی نظر

پڑ گئی۔ دوڑ کر پکڑ لیا۔ حضرت حسینؑ نے بھی دیکھ لیا اور بہن سے کہا۔" روکے رہو آنے نہ پائے"۔ مگر لڑکے نے زور کر کے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور حضرت کے پہلو میں پہنچ گیا۔ عین اسی وقت بحر بن کعب نے آپ پر تلوار اٹھائی۔ لڑکے نے فوراً ڈانٹ بتائی" او خبیث! میرے چچا کو قتل کرے گا"۔ سنگدل حملہ آور نے اپنی بلند تلوار لڑکے پر چھوڑ دی۔ اس نے ہاتھ پر روکی۔ ہاتھ کٹ گیا۔ ذرا سی کھال لگی رہ گئی۔ بچہ تکلیف سے چلایا۔ حضرت نے اسے سینہ سے چمٹا لیا اور فرمایا" صبر کر۔ اسے ثواب خداوندی کا ذریعہ بنا۔ اللہ تعالیٰ تجھے بھی تیرے صالح بزرگوں تک پہنچا دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، علیؑ ابن ابیطالب، حمزہؓ، جعفرؓ اور حسنؑ بن علیؑ تک"۔ (داستانِ کربلا۔ ابوالکلام آزاد ص ۸۹۔۹۰)

حضرت حسینؑ کی شجاعت:۔ امام حسینؑ نے ایک زیر جامہ کہنہ منگایا اور اس کو جابجا سے چاک کر کے پہنا تاکہ ان کی شہادت کے بعد دشمن اس کے لینے کی طمع نہ کریں۔ اتنے میں دشمنوں نے دونوں جانب سے امام حسینؑ کو گھیر لیا۔ امامؑ نے دہنی جانب والوں پر ایسا حملہ کیا کہ اس پوری جماعت کو تتر بتر کر دیا۔ بعد ازاں بائیں طرف والوں پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ ان سب کو مار کر متفرق کر دیا۔ راوی کہتا ہے کہ واللہ میں نے امام حسینؑ سے زیادہ ثابت قدم اور قوی دل کسی ایسے شخص کو نہیں پایا جو ہر طرح مغلوب ہو چکا ہو اور جس کے بھائی، بھتیجے، بیٹے، عزیز اور رفیق سب قتل ہو گئے ہوں۔ بخدا عمر بن سعد کے لشکر والے امام حسینؑ کے حملوں سے داہنے بائیں اس طرح بھاگتے تھے جس طرح بھیڑیئے کے حملہ سے بکریاں بھاگتی ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت امام حسین خز معری کی عبا پہنے اور سر پر عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ ان کے بالوں میں وسمے کا خضاب تھا اور وہ پیادہ پا اس طرح لڑ رہے تھے جس طرح بہادر سوار لڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر شمر نے اپنے لشکر کو ڈانٹا کہ وائے ہو تم پر۔ فرد واحد کے قتل میں اس قدر دیر کرتے ہو۔ جلد حسینؑ کا کام

تمام کرو۔ یہ سن کر سب نے ہر طرف سے حملہ کر دیا اور زرعہ بن شریک نے امام حسینؑ کے دست و بازو پر تلوار کے وار کئے۔ اس غیر مساوی جنگ کا نتیجہ اب قریب تھا۔ حسینؑ زخموں سے چُور چُور ہو چکے تھے۔ وہ یکہ و تنہا تھے اور خستہ و مجروح۔ تاہم انہوں نے اپنے دشمنوں کے دلوں پر وہ دھاک بٹھا دی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی تنہا ان پر حملہ کرنے کی جسارت نہ کرتا تھا۔ آخر شمر کی چیخ و پکار اور لعن طعن سے مجبور ہو کر لوگ حسینؑ پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینہ برسنے لگا۔ آخر سینکڑوں زخم کھا کر آپ فرشِ زمین پر تشریف لائے ؎

تنہاست حسینؑ ابن علیؑ در صفِ اعدا　　اکبرؑ تو کجا رفتی و عباسؑ کجائی

امامؑ کی شہادت

ابو حنیفہ دینوری کا اخبار الطوال میں بیان ہے کہ دیر تک حضرت امام حسینؑ زمین پر خستہ و مجروح حالت میں پڑے رہے اور اب آپ کے قتل کرنے میں انتظار کی ضرورت نہ تھی مگر ہر قبیلہ اسے دوسرے کے حوالے کرتا تھا اور خود اس بڑے جرم کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا تھا لیکن دنیا میں اکثر ایسے افراد بھی ہوا کرتے ہیں جو وحشی درندوں کی نسبت زیادہ خونخوار جن کا ضمیر بالکل مردہ اور جو "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" کے حقیقی مصداق ہوتے ہیں۔ آخر زرعہ بن شریک کی تلوار، سنان بن انس کا نیزہ اور پھر شمر بن ذوالجوشن کا خنجر تھا جس نے اس پیکرِ صبر و وفا اور مجسمۂ صدق و صفا کے خونِ ناحق سے دشتِ نینوا کو لالہ زار بنا دیا۔ سر اور بدن کا باہمی ارتباط قطع ہوا۔ سچائی کی گردن قلم ہوئی۔ روح اور جسم کا ظاہری تعلق ختم ہوا۔ ذبیح موعود کا مقدس سر نوکِ سناں پر بلند ہوا۔ جہادِ آخر کی خونریز منزل اپنی انتہا کو پہنچی۔ انسانی تاریخ کا ورق اس خونِ ناحق کے چھینٹوں سے ہمیشہ کے لئے داغدار ہو گیا۔ زمین احساسِ غم سے کانپ اٹھی۔ تمام دنیا

پر تیرگی چھا گئی، آسمان سے خون برسا۔ شفق خون کے آنسو روئی۔ قُتِلَ وَاللّٰہِ الْاِمَامُ ابن الامام قُتِلَ الاسد الباسل وَکھف الارامل کی آواز فضائے عالم میں گونجی۔ قسم بخدا امامؑ ابن امامؑ مارے گئے۔ شیر جوانمرد مارا گیا۔ پشت و پناہ بیوگان قتل کیا گیا۔ (مقتل ابو مخنف)

اَلا لعنت اللّٰہ علی القوم الظّٰلمین وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

۵۔ قتلِ اولاد:۔ (نقص من الاموال والانفس والثمرات)

ابتلائے عظیم کی پانچویں شق ثمرات یعنی اولاد کا نقصان ہے۔ گو زبانِ قدرت سے اس مقام پر "ثمرات" کا لفظ ارشاد ہوا ہے جس کے معنی بلحاظِ لغت پھل کے ہیں مگر مفسّرین کی ایک کثیر تعداد نے اولاد کو بمنزلہ ثمر سمجھ کر اس مقام پر ثمرات کو اولاد کے معنی میں لیا ہے۔ سیاق و سباق کلام کو مدّنظر رکھتے ہوئے صرف یہی معنی درست ہو سکتے ہیں کیونکہ افراد کے بعد ان کی اولاد کا ذکر بے محل نہیں، البتہ یہاں پھلوں اور فصلوں کے نقصان کا مذکور ہونا قرینِ قیاس نہیں کیونکہ درحقیقت نقص من الاموال کے تحت آچکا ہے لہٰذا اس کا علیحدہ ذکر کرنا غیر ضروری تھا۔ چونکہ آیہ وافی ہدایہ اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ (التغابن) کی رُو سے اموال کے ساتھ ساتھ اولاد بھی ایک اہم ذریعۂ آزمائش ہے اس لئے مصداقِ حقیقی کا اس بارے میں بھی امتحان ضروری تھا۔ پس آیہ زیر بحث میں ثمرات کے معنی اولاد ہی کے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابو الکلام آزاد نے اس آیہ کریمہ کی تشریح کرتے وقت ثمرات کو اولاد ہی کے معنی میں لیا ہے جس کی تفصیل اسی باب میں گزر چکی ہے۔ ان الفاظ میں نہ صرف امامین الحسنینؑ کی اولادِ طاہرہ حضرت علی اکبرؑ و حضرت علی اصغرؑ و حضرت قاسمؑ بن حسنؑ وغیرہ کے قتل کی

پیشین گوئی مضمر ہے بلکہ ایک قسم کا لطیف اشارہ اس امر کی طرف دلالت کرتا ہے کہ ابتلائے عظیم صرف سانحۂ کربلا تک محدود نہیں بلکہ آپ کی اولاد (آئمۃ الطاہرین علیہم السلام) نسل در نسل قتل ہوتی رہے گی۔ چنانچہ تاریخ کا ہر ایک طالب علم جانتا ہے کہ امامِ چہارم سید سجاد حضرت علی بن حسینؑ کو ولید بن عبدالملک اموی، امامِ پنجم باقرالعلوم حضرت محمد باقرؑ کو ہشام بن عبدالملک اموی، اور امام ششم ہادی طریقت حضرت جعفر صادقؑ کو منصور عباسی نے زہر قاتل سے شہید کیا۔ امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظمؑ ہارون عباسی کے ہاتھوں چودہ سال مقید رہنے کے بعد زہر ہلاہل نوش کر کے درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ امام ہشتم حضرت علی رضاؑ کی مقدس زندگی مامون الرشید عباسی کے ہاتھوں سے بذریعہ سمّ قاتل انجام پذیر ہوئی۔ امام نہم حضرت محمد تقیؑ معتصم عباسی کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرما کر راہئ ملکِ بقا ہوئے۔ امام دہم حضرت علی نقیؑ متوکل عباسی کے قید خانہ میں بیس برس مقید و محبوس رہے اور بعد میں معتمد عباسی کے ہاتھوں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ اس کم بخت ازلی معتمد عباسی نے امام یازدہم حضرت حسن عسکریؑ کو ایک طویل مدت تک قید رکھنے کے بعد سمّ قاتل سے شہید کیا۔

یہ جور و جفا، یہ ظلم و ستم صرف آئمۃ الطاہرینؑ کی ذواتِ مقدسہ تک محدود نہ رہا بلکہ بعض مسلمان حکمرانوں نے سنّتِ یزید کی تقلید میں ہزاروں علویین اور سادات بنی فاطمہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔ دمشق کے قید خانے، کوفہ کی گلیاں اور بغداد کی دیواریں آلِ رسولؐ کی مظلومیت کی درد بھری داستانیں اب تک زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں۔ حضرت زید شہید، حضرت یحییٰ بن زید اور حضرت محمد نفس زکیہ کی مظلومانہ موت کچھ کم درد آمیز و رقت انگیز نہیں۔ کیا دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ اندوہناک واقعہ کہیں نظر آتا ہے کہ کسی پیشوائے دین کی اولاد کو پشت در پشت، صدیوں تک

اس کی اپنی امت اس بیدردی و سفاکی سے قتل کرتی رہی ہو جس طرح ذریت رسولؐ عربی کو مسلمانوں نے نسل در نسل قتل کیا۔ ہمارے بعض مسلمان بھائی جب کبھی اپنی سابقہ روایات پر فخر کرتے ہیں اور اسلامی حکومتوں کی شان و شوکت اور جاہ و جبروت کا تذکرہ سن کر سر دھننے لگتے ہیں کہ "سبحان اللہ! کیا شاندار حکومتیں تھیں" تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ کیا کبھی ان لوگوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں میں جس قدر نامور بادشاہ گزرے ہیں ان میں سے اکثر کے ہاتھ آلِ نبیؐ کے خونِ ناحق سے رنگین نظر آتے ہیں۔ کیا اولادِ رسولؐ (معاذاللہ) ایسی مجرم و گنہگار تھی کہ ہر مسلمان حکومت ان کا استیصال اپنا فرضِ اوّلیں سمجھتی رہی یا خود قوم کے اندر تقویٰ و طہارت کا کوئی شائبہ تک باقی نہ رہا اور عدل و انصاف مفقود ہو چکا تھا جو یہ ظالمانہ و سفاکانہ روش بدستور جاری رہی۔ پس یہ ایک ایسی **تلخ حقیقت** ہے کہ تاریخ کے اوراق ملاحظہ کیجئے اور آنکھوں سے مسلسل خونِ جگر بہاتے رہیئے۔ بہرکیف اگر اس قسم کے جفاجو اور کینہ پرور لوگ حکومتِ الٰہیہ کے خلفاء اور جانشینانِ پیغمبرؐ تھے تو ہم حیران ہیں کہ حکومت فرعونیہ کے سلاطین کے لئے کون سا طرۂ امتیاز ہوگا۔ ہم اس مقام پر اس درد بھری داستان کو بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہوئے نفسِ مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں اور صرف دو شاہزادوں حضرت علی اکبرؑ اور حضرت قاسمؑ بن حسنؑ کی شہادت کا مختصر سا تذکرہ کرتے ہیں۔

حضرت علی اکبرؑ کی شہادت

شاہزادہ علی اکبرؑ صبح عاشور سے بیچین تھے کہ میدانِ جہاد میں جاکر ہاشمی شجاعت کے جوہر دکھائیں اور حیدری جرأت کا مظاہرہ کریں مگر امامؑ کی دوربین نگاہوں نے جو نظام قائم کر رکھا تھا اس کو بدلنے کا کسی کو حق نہ تھا۔ جب اصحاب و انصارِ حق خدمت

ادا کر چکے تو شہزادہ اذنِ جہاد کے لئے آگے بڑھا۔ امامؑ نے اپنے لختِ جگر کو میدانِ جہاد میں جانے سے نہ روکا مگر دل کی بے چینی نے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا اور آپ نے بارگاہ الٰہی میں دستِ بدعا بلند کئے اور عرض کرنے لگے " خداوندا ! گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر۔ اب ان کی طرف وہ نوجوان جا رہا ہے جو صورت و سیرت اور گفتار میں تیرے رسولؐ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ جب ہم تیرے پیغمبرؐ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔"

اٹھارہ برس کے کڑیل جوان، ہمشکل پیغمبرؐ کا عقاب نامی گھوڑے پر سوار ہو کر خیمۂ اہلِ بیت سے نکلنا ہی تھا کہ حرم سرا میں ایک کہرام مچ گیا اور شہزادہ کی آخری رخصت قیامت کا نمونہ تھی۔ علی اکبرؑ میدان کی طرف یہ رجز پڑھتے ہوئے بڑھے۔ " میں علی، فرزندِ حسینؑ بن علیؑ ہوں۔ ہم بخدا سب سے زیادہ رسولؐ کے حق دار ہیں خدا کی قسم، ابن مرجانہ ہمارا حاکم نہیں بن سکتا۔" پھر فوجِ مخالف پر ایسے جرأت مندانہ حملے کئے کہ بڑے بڑے شجاعانِ عرب کے چھکے چھوٹ گئے۔ صاحبِ ناسخ التواریخ کی تحقیق میں ایک سو بیس سواروں، ابو اسحٰق اسفرائینی کی دانست میں پانچ سو سواروں اور راوی ابو مخنف کے چشم دید بیان کے مطابق بیاسی آدمیوں کو ایک حملہ میں مار گرایا۔ اگرچہ پیاس کی شدت نے بے حال کر رکھا تھا اور کپڑے خون سے شرابور ہو چکے تھے تاہم دشمن پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ بحار کی تصریح کے مطابق شہزادہ نے اس شدت سے جنگ کی کہ دشمن کثرتِ مقتولین کی وجہ سے چیخ اٹھا۔ آخر اشقیاء نے چاروں طرف سے شہزادہ کو محصور کر لیا اور پے در پے ضربات لگانے لگے۔ انجام کار مرہ بن منقذ عبدی نے دھوکہ دے کر پشت پر نیزہ مارا جو سینہ سے پار ہو گیا۔ علی اکبرؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے۔ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور شہزادہ کے جسمِ مقدس کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

حضرت قاسمؑ بن حسنؑ کی شجاعانہ موت

حضرت قاسمؑ چچا سے اجازت حاصل کر کے میدانِ دغا کی طرف بڑھے۔ صغرسنی کے باوجود مقاتلۂ عظیم کیا۔ تقریباً تیس پیادے اور پچاس سوار تہ تیغ کئے اور چاہا کہ صفوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئیں کہ ناگہاں اعدا نے یکبارگی ایسی تیر باری کی کہ حضرت قاسمؑ کا گھوڑا بیکار ہوگیا اور شیث نے شہزادہ کے سینہ پر نیزہ مارا۔ حضرت قاسمؑ ستائیس زخم کھا چکے تھے۔ شیث کے نیزے سے مجروح ہو کر گر پڑے اور آواز دی کہ "اے عمِ محترم! میری خبر لیجئے۔" (روضۃ الشہداء۔ تاریخ احمدی۔ ص ۲۹۸)

تاریخ کامل میں ہے کہ جب حضرت قاسمؑ، عمرو بن سعد ازدی کی ضربِ شمشیر سے مجروح ہو کر زمین پر گرے تو آواز دی۔ "اے چچا جان! مجھ خستہ جان کی خبر لیجئے۔" یہ سنتے ہی امام حسینؑ شکاری پرندے کی طرح جھپٹ کر حضرت قاسمؑ کے پاس پہنچے اور مثلِ شیرِ پُرغضب عمرو پر حملہ آور ہوئے۔ اس نے امام حسینؑ کی تلوار ہاتھ پر روکی تو ہاتھ کہنی سے کٹ گیا اور وہ چیخنے لگا۔ سوارانِ کوفہ عمرو کو بچانے کے قصد سے ایسے ٹوٹ پڑے کہ عمرو ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل کر مر گیا۔ جب غبار صاف ہوا تو امام حسینؑ نے حضرت قاسمؑ کو خاک و خوں میں غلطاں دیکھ کر کہا کہ "اے فرزند! جس قوم نے تجھے قتل کیا ہے خدا اس کو ملعونِ ابدی فرمائے۔ قیامت کے دن تیرے جدِّ امجدؐ اس قوم سے تیرے خون کے مدعی ہونگے۔ پھر فرمانے لگے تیرے چچا پر بڑا ناگوار ہے یہ امر کہ تو اسے پکارے اور وہ تیری خبر نہ لے سکے یا تیری آواز پر آئے مگر تجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔"

اس کے بعد آپ نے خود قاسمؑ کی لاش کو اٹھایا اور اسے وہیں جہاں حضرت علی اکبرؑ کی لاش پہلے سے موجود تھی لا کر لٹا دیا۔

محاکمۂ قطعی

امامؑ درگاہِ بے نیاز میں نہایت صبر و سکون کے ساتھ قربانیاں پیش کرتے رہے قاسمؑ ایسے بھتیجے پیش کئے۔ عون و محمد ایسے بھانجے نذر کئے۔ اکبرؑ ایسے کڑیل جوان بیٹے کو قربان گاہ کی بھینٹ چڑھایا۔ گلستانِ فاطمہؑ میں صرف ایک گلِ نوشگفتہ باقی تھا۔ آخر امامؑ اتمام حجت کے لئے اس کو بھی دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر رزم گاہ میں لے آئے تاکہ اس کے مقدس خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی جائے اور دینِ خدا کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونکی جائے۔ حرملہ کے ناپاک ہاتھوں سے تیرِ جفا چھوٹا اور امامؑ کے بازو کو چیرتا ہوا اصغرؑ کے حلقوم میں پیوست ہو گیا۔ شش ماہے معصوم کی روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کی۔ امامؑ کے منہ سے "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کے الفاظ بلند ہوئے اور راہِ حق میں جس قدر مصائب پیش آئے یہ کہتے ہوئے کہ "رَضِيْنَا بِقَضَاءِ اللّٰهِ وَصَبَرْنَا عَلٰى بَلَائِهٖ" صبر و شکر کے ساتھ برداشت کئے۔ دنیا والوں نے دیکھا کہ "وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کی عملی تفسیر پیش ہو گئی جس کے متعلق قدرت نے ارشاد فرما رکھا تھا کہ "اے پیغمبرؐ! ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری پہنچا دے جو مصیبت پڑنے کے وقت یہ کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کے حضور پلٹ کر جانے والے ہیں۔ عاشقِ صادق کو اس آزمائش میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور "بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ" کے رنگ میں جو بشارت دی گئی تھی وہ پوری ہو کر رہی۔ نوریانِ فلک پر یہ راز منکشف ہوا کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کے الفاظ کس موزوں موقع و محل کے لئے وضع ہوئے تھے۔ حضرت آدمؑ کے مقابل دعوئ خلافت کے مسترد ہونے کی حقیقی وجہ اب ان کے ذہن نشین ہوئی۔ اب وہ سمجھے کہ حقیقی خلیفہ

خدا کی یہ شان نہیں کہ وہ دنیا میں فساد و خونریزی کرے البتہ اس کا نصب العین اپنے مقدس خون کے چھینٹوں سے دینِ حق کے مردہ جسم میں دمِ عیسوی پھونکنا ہے لہٰذا خلیفہ برحق کی شان میں ملائکہ کا یہ کہنا "اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ" درست نہ تھا (کہ کیا تو ایسوں کو خلیفہ مقرر کرے گا جو زمین میں فساد پھیلائے اور خونریزی کرے) البتہ اتنا ضرور درست تھا اور ہے کہ کچھ دشمنانِ خدا ایسے ضرور ہوں گے جو اسلام کا لبادہ اوڑھے، خلافتِ الٰہیہ کے مدعی بن کر دنیا میں فساد و خونریزی کا بازار گرم کریں گے اور جانشینانِ برحق کا بیدریغ خون بہاتے رہیں گے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ خداوند تعالیٰ نے فرشتوں کے اعتراض کے جواب میں یوں نہ فرمایا کہ "اِنِّیٓ اَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (میں جانتا ہوں اور تم کچھ نہیں جانتے) بلکہ یوں ارشاد کیا کہ "اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" (جو کچھ میں جانتا ہوں وہ کچھ تم نہیں جانتے یعنی تم کچھ نہ کچھ تو ضرور جانتے ہو مگر اتنا کچھ نہیں جانتے جتنا کہ میں جانتا ہوں) پس ظاہر ہے کہ خلیفہ کے نام کے ساتھ خونریزی کی وابستگی تو ضرور تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ خلافتِ الٰہیہ کے ورثا نہ تو زمین میں فساد پھیلائیں گے اور نہ کسی کا ناحق خون بہائیں گے بلکہ جھوٹے مدعیانِ خلافت ان کو ایذا پہنچائیں گے اور ان کا خون بہاتے رہا کریں گے۔ پس راہِ حق و صداقت میں ان بزرگواروں کے خون کا بہایا جانا مشیت کے علم قدیم میں موجود تھا۔ خواہ خلفائے برحق حضرت زکریاؑ و حضرت یحییٰؑ کے لباس میں جلوہ گر ہوں تاکہ موسوی دین کا تحفظ کریں یا حضرت علیؑ و امام حسینؑ کے رنگ میں تشریف لاکر شریعتِ محمدی کی بقا کے لئے سرگرم عمل ہوں۔

اس عالمِ آب و گل کا قدیم الایام سے دستور چلا آتا ہے کہ آزمائش میں پورا اترنے پر اور امتحان میں کامیابی حاصل کرنے پر انعامات و اکرامات عطا ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امام حسینؑ کو ابتلائے عظیم میں شاندار کامیابی حاصل کرنے پر کیا

انعام ملا؟ زبانِ بے زبانی پکار اٹھتی ہے کہ ہم آزمائش میں کامیابی حاصل کرنے والے شخص کو " أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ " کے تمغہ عطا کرتے ہیں اور ان ہی لوگوں پر پروردگار عالم کی صلوٰۃ و رحمت ہے اور یہی لوگ حقیقی ہدایت و معرفت کے سرچشمے ہیں۔

لفظ **صلوٰۃ** میں جو خاص نقطہ پوشیدہ ہے اس موقع پر اس کا بیان کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سورۂ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے۔ " إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا "۔ خدائے قدوس کی طرف سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر تمغۂ صلوٰۃ ہے۔ لیکن مومنین کو صلوٰۃ و سلام ہر دو تحائف پیش کرنے کی تاکید ہے۔ " صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا " کے درمیان **واوِ عاطفہ** رکھ کر قدرت نے یہ دکھا دیا ہے کہ سلام و صلوٰۃ دو مختلف چیزیں ہیں۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ باقی انبیائے کرامؑ کی شان میں کہیں بھی لفظ صلوٰۃ موجود نہیں بلکہ صرف سلام ہے جیسا کہ سورہ الصّٰفّٰت کی مختلف آیات شاہد ہیں: " سَلَامٌ عَلٰى نُوحٍ فِي الْعٰلَمِينَ ۔ سَلَامٌ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ ۔ سَلَامٌ عَلٰى مُوسٰى وَهَارُونَ "۔ لفظ صلوٰۃ کا محض جناب رسالت مآبؐ کے لئے مخصوص و مختص ہونا خود اس امر کی دلیل ہے کہ صلوٰۃ کا درجہ سلام سے بلند تر ہے۔ آیۂ زیرِ بحث: " أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ "۔ میں لفظ صلوٰۃ واضح کرتا ہے کہ ان آیاتِ بیّنات کا مصداقِ خصوصی بجز حضورِ پُرنور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باقی انبیائے سابقہ پر کم از کم اس رنگ میں ضرور فضیلت رکھتا ہے کہ اس کو عظیم الشان قربانی کے صلے میں جو انعام ملا اس سے دوسرے انبیاءؑ محروم ہیں۔ لفظِ صلوٰۃ کی یہ توضیح حضرت امام حسینؑ کی عظمت و شان کو اور بلند کرتی ہے اور ان کے علوِ مرتبت کا کیا کہنا کہ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ رحمت بھی عطا ہو رہی ہے۔

اس مقام پر آیۂ کریمہ هُوَالَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ (الاحزاب ۴۳) بھی تشریح طلب ہے ورنہ غلط فہمی کا امکان ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں ضمیر جمع مخاطب سے بالخصوص آئمۃ الطاہرین مراد ہیں اور بقولِ صادق آلِ محمدؑ بالعموم وہ مومنین بھی جو حضور سرورِ دوعالمؐ اور ان کے اہلِ بیت اطہارؑ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ جزا کے مقررہ اصول کے مطابق کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے۔ایک دفعہ درود پڑھنے والے مومن پر دس دفعہ صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ منافقین و فاسقین پر خدا کا درود بھیجنا خود محالِ عقلی ہے اس لئے عقلاً ہر مسلمان اس آیہ دانی ہدایہ کا مصداق نہیں ٹھہرتا۔

ابتلائے عظیم کے مصداقِ حقیقی پر نزولِ صلوٰۃ و رحمت کے ذکرِ خیر کے بعد قرآن حکیم اپنا فصیحانہ انداز بدلتا ہے اور ایک نہایت ہی لطیف مگر حکیمانہ پیرائے میں ایک اہم گذشتہ واقعہ کو تلمیحاً بیان کرتا ہے جو اسلام کی داستانِ رنگیں کا بابِ اول ہے۔ " اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَۃَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ "۔ بے شک صفا و مروہ اللہ کے نشانات میں سے ہیں۔ اہلِ علم حضرات جانتے ہیں کہ صفا و مروہ کے شعائر کا تذکرہ درحقیقت حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کے تاریخی واقعات کی تلمیح ہے جس پر ہم گذشتہ باب میں مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔اس تاریخی تلمیح کے باعث ہماری آنکھوں کے سامنے فی الفور واقعاتِ ماضیہ کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ کمسن حضرت اسمٰعیلؑ کا ریگستانِ مکّہ میں پیاس سے تڑپنا۔ان کی والدہ محترمہ کا جستجوئے آب میں ہر دو پہاڑیوں پر انتہائی بیتابی سے دوڑ دھوپ کرنا۔ ابتلائے حضرت ابراہیمؑ میں حضرت اسمٰعیلؑ کا ذبیح قرار دیا جانا اور " فَدَیۡنٰہُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ " کے تحت عملی طور پر ذبح ہونے سے بچ جانا۔ ان تمام واقعاتِ سال خوردہ کے پردے یکے بعد دیگرے اٹھتے ہیں۔ اس موقع پر پہنچ کر قدرتاً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رکوع ہذا کی ابتدا سے مسلسل ایک

واقعہ جو آزمائش من اللہ سے متعلق ہے اپنے لوازمات کی معیت میں بیان ہوتا چلا آ رہا ہے اور یہاں پہنچ کر فی الفور قرآنِ حکیم ایک ایسے امر کا ذکر کر دیتا ہے جس کو اپنے واقعاتِ ماسبق سے بظاہر دور کا واسطہ بھی نہیں تو لازماً ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم میں تسلسل و ربط کا اہتمام نہیں۔ عدم تسلسل و فقدانِ ربط کے باعث قرآن پر عدم فصاحت کا حرف آتا ہے لہٰذا غیر فصیح کتاب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دنیا والوں کو " فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ " کا چیلنج دے مگر یہ چیلنج موجود ہے۔ پس چیلنج کی موجودگی خود اس امر کی دلیل ہے کتاب غیر فصیح نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت سے پُر ہے اس لئے اس کی ہر آیۂ ماسبق کا آیۂ مابعد سے گہرا تعلق ہونا چاہئے اور فی الحقیقت یہ تعلق موجود ہے۔ اب صفا و مروہ کے نشانات کو آیۂ ماسبق کے ساتھ تعلق دینے سے بالصراحت یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ صفا و مروہ کے شعائر گذشتہ ابتلا کی تمثیل و تشریح ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآن حکیم وضاحت کرتا ہے کہ مشیتِ ایزدی نے حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبیح قرار دے کر جس فدیہ کی طرف اشارہ کیا تھا وہ ذبح عظیم اسی بیان کردہ آزمائش کے مختلف مرحلے طے کرے گا اور اپنی عظیم الشان و بے مثال قربانی کی بنا پر ذِبحِ عظیم کہلائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آزمائش کے وہ مراحل کون کون سے تھے جن کو رکوع زیرِ بحث بیان کرتا ہے۔ مختصر الفاظ میں ان کا خاکہ یہ ہے کہ مومن مصیبت کے وقت صبر و نماز کے ذریعے اعانت طلب کرے گا۔ وہ مصیبت جاں بازی و سرفروشی ہوگی اور مومنِ کامل دینِ خدا کے تحفظ میں مقتول ہوگا۔ اس شہیدِ راہِ خدا کو ایسی حیاتِ جاوداں عطا ہوگی جو انسانی شعور و ادراک سے بلند و بالا ہے۔ نیز یہ شہادت آزمائش کے رنگ میں پانچ امور پر مشتمل ہوگی :-

(۱) خوف و ہراس (۲) بھوک اور پیاس (۳) نقصانِ مال و متاع (۴) قتلِ نفس (۵) قتلِ اولاد

آزمائش میں مبتلا ہو کر اس مومن کے ہاتھ سے دامنِ صبر نہ چھوٹنے پائے گا بلکہ وہ ہر مصیبت اور ہر صدمۂ جانکاہ کے موقع پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا ورد کرے گا اس پر خدا کی صلوٰۃ و رحمت ہے اور فی الحقیقت وہ ہدایت یافتہ ہے۔

ہم جنابِ حسینؑ کے واقعاتِ زندگی بیان کرکے اچھی طرح ثابت کر آئے ہیں کہ یہ تمام باتیں صرف امام عالیمقامؑ کی زندگی سے وابستہ ہیں اور وہ صرف آپ ہی کی ذاتِ گرامی ہے جس پر اس پیشین گوئی کی تمام شقیں بیک وقت بہ تمام و کمال پوری اترتی ہیں۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ایسی نامور ہستی نہیں گزری جس پر یہ تمام کی تمام باتیں پوری طرح چسپاں ہوسکتی ہوں۔ پس ثابت ہوا کہ امامؑ کی ذاتِ گرامی ہی اس ابتلائے عظیم کی مصداقِ خصوصی ہے اور اسی خصوصیّت کی بنا پر آپ ذبحِ عظیم ہیں۔ ہادئ مطلق، حجّتِ خدا، امامِ ہدیٰ اور وصیِ مصطفٰےؐ ہونے کی حیثیت سے آپ حضرت اسمٰعیلؑ سے افضل بھی ہیں اور صلوٰۃ و رحمت کے حقدار بھی۔ گوسفند کو ایک پیغمبرِ خدا پر فضیلت دینا صریح لغزش اور لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ کی موجودگی میں راہِ حق سے کھلم کھلا انحراف ہے ؎

سرِّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود (اقبالؒ)

باب ہفتم

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝

بیشک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار
اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے ان پر موت
کے وقت رحمت کے فرشتے (یہ پیغام لے کر) نازل
ہونگے کہ تم نہ آئندہ کیلئے خوف کرو اور نہ گزشتہ کے متعلق
افسوس اور جس جنت کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا
اس کی بشارت لو۔

(حٰمٓ السجدۃ ۳۰)

اصحابِ حسینؑ کی عدیم المثال جاں نثاری و فداکاری

شبِ عاشور کی مہلت

شبِ عاشور کی مہلت کے سلسلے میں کئی امور غور طلب ہیں۔ کیا جناب حسینؑ نے اس لئے مہلت مانگی تھی کہ آپ جنگ کے لئے تیار نہ تھے اور رات کے پردہ میں لڑائی کا مناسب اہتمام کرنا چاہتے تھے؟ یا کیا کہیں سے کمک پہنچنے کی امید تھی جس کے لئے آپ چشم براہ تھے؟ امر واقعہ تو یہ ہے کہ دو محرم سے لے کر نویں محرم تک کوئی امدادی فوج نہ پہنچی اور اب توقع کہاں سے ہو سکتی تھی؟ دعوت دینے والے آخر کوفی ہی تو تھے جو نصرت کی بجائے اب خون کے پیاسے ہو رہے تھے تو پھر کیا جناب حسینؑ رات کے پردہ میں میدانِ جنگ چھوڑ کر کہیں اور نکل جانا چاہتے تھے؟ ایسا بھی نہیں کیونکہ آپ کا عمل سراسر اس کے خلاف رہا۔ تو پھر کیا آپ اس وقفہ کے دوران کچھ اور سوچنا چاہتے تھے اور تمام باتوں پر غور و فکر کر کے صبح کو بیعت کر لینے کا ارادہ تھا؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ کیونکہ آپ کے قول و فعل کی موجودگی میں ایسا تصور کرنا بھی پرلے درجے کی حماقت ہے تو پھر کیا رات کی بجائے دن کے قتل میں کچھ نمایاں خصوصیت تھی کہ آپ نے رات کی تاریکی کی بجائے دن کی تمازت خیز حرارت میں درجۂ شہادت پر فائز ہونے کو ترجیح دی؟ ہماری نگاہ میں دن اور رات کی شہادت میں کوئی نمایاں تفاوت نہیں تو پھر آخر کیا وجہ تھی کہ آپ نے شبِ عاشور کو دشمن کی حملہ آور فوجوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونے کی بجائے ایک رات کی مہلت کو بہتر سمجھا۔

مہلت مانگنے کا ایک سبب تو آپ نے اسی وقت ظاہر کر دیا جب حضرت عباسؑ کو مہلت مانگنے کے لئے بھیجا گیا۔ آپ نے فرمایا: "ہم آج کی رات اپنے پروردگار کی خوب عبادت کر لیں اور دعا و استغفار میں مصروف رہیں کیونکہ خدا خوب واقف ہے کہ ہمیشہ سے اس کی عبادت، تلاوتِ قرآن، کثرتِ دعا و استغفار کو محبوب سمجھتا رہا ہوں۔"

(طبری جلد ۶۔ مطبوعہ مصر۔ ص ۲۳۸)

دوسری بڑی مصلحت اس شب کی مہلت میں یہ تھی کہ آپ نے آنے والی اٹل جنگ کے لئے امکانی حد تک دفاع و حفاظتِ خود اختیاری کا بندوبست کرلیا۔ حسینؑ جیسے مردِ شجاع کے لئے یہ تو زیبا نہ تھا کہ قلتِ انصار و فقدانِ سامانِ حرب کی بنا پر حوصلہ ہار بیٹھیں۔ اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر قوم اشقیاء کے سپرد کردیں اور دفاعی جنگ لڑے بغیر دشمن کی تلواروں کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔ چنانچہ دور اندیش و بلند نگاہ امامؑ نے ایک خاص مقام، لشکر اور اپنے حرم سرا کے لئے منتخب کیا جہاں تین اطراف سے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا ایک سلسلہ ہلالی صورت میں آکر ملتا تھا اور یہ محصور حسینی سپاہ کے لئے تین اطراف سے حفاظت کا کام دے سکتا تھا۔ سامنے وسیع میدانِ جنگ حرب و ضرب کے لئے موجود تھا۔ خیمے قریب قریب نصب کئے گئے اور ان کی طنابیں باہم باندھ دی گئیں۔ پشت کی جانب ایک خندق کھدوا کر اس میں لکڑیاں جمع کرادیں تاکہ وقت پڑے ان کو آگ لگا دی جائے۔ اس طرف سے دشمن کے ہجوم کا اندیشہ نہ رہے۔ یہ تمام تیاریاں شبِ عاشور مکمل ہوئیں اور صبح اس خندق میں آگ روشن کردی گئی۔ اس طرح دشمن کی فوج کے لئے چاروں طرف سے گھیر کر حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

شبِ عاشور کی مہلت میں تیسری مصلحت یہ تھی کہ اتمامِ حجت کے طور پر قومِ اشقیا کو اپنے کردار کا جائزہ لینے کے لئے ایک اور موقع دیا جائے تاکہ وہ ٹھنڈے دل سے حسینؑ کی باتوں پر غور کرسکے اور جنت و دوزخ کے دوراہے پر کھڑے ہوئے لشکری اپنا آخری اور قطعی لائحہ عمل سوچ لیں اور فیصلہ کریں کہ آیا حق کی حمایت میں ابدی زندگی حاصل کریں یا باطل کا ساتھ دے کر دائمی ہلاکت کے مستوجب ٹھیریں۔ اسی ایک رات کی مہلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ فوجِ یزید کا ایک نامور سردار حُر بن یزید ریاحی کو جو امام عالیمقامؑ کو سب سے پہلے گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا، اپنے

کردار کے محاسبہ کا موقع مل گیا۔ اپنے ضمیر کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے قومِ اشقیاء سے علیحدہ ہو گیا اور دینِ حق کی نصرت کرتے ہوئے آپ کے قدموں میں جانِ عزیز نثار کر کے زندۂ جاوید بن گیا۔ یہ داعیِ حق کی بڑی کامیابی تھی کہ انسان کو گمراہی و ضلالت کے عمیق غار سے نکال کر صراطِ مستقیم پر ڈال دیا۔ حسینؑ کے اس اصول کی یہ شاندار فتح اسی رات کی مہلت کا نتیجہ تھی۔

سب سے بڑی مصلحت جو شبِ عاشور کی مہلت میں مضمر تھی وہ یہ تھی کہ امام علیہ السلام خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے اصحاب کو احتسابِ طبع یعنی اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دینا چاہتے تھے تاکہ وہ آنے والے ہیبتناک خطرات کا بخوبی جائزہ لے سکیں اگر کوئی شخص محض جذبات کی رو میں بہ کر یا مالِ غنیمت کے لالچ سے ابتدا میں آپ کے ساتھ شامل ہوا ہو اور امتحان کے سخت مصائب جھیلنے کا اس میں حوصلہ نہ ہو تو وہ اس نازک گھڑی سے قبل ہی آپ کا ساتھ چھوڑ دے مبادا وہ عین نازک مرحلہ پر راہِ فرار اختیار کر کے حسینی قربانی کے بلند نصب العین کو داغ دار کر دے۔ چنانچہ آپ نے شبِ عاشور اپنے مجمع کو چھانٹنے کی کوشش کی۔ لوگوں کو غور و خوض کر لینے کا پورا پورا موقع دیا اور واشگاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ جو ہمارا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہے، چلا جائے کیونکہ یہاں حصولِ مالِ غنیمت تو امرِ محال ہے البتہ جان کی قربانی پیش کرنا ناگزیر ہے۔ پس وہ لوگ جن کا نظریہ حصولِ جاہ و کسبِ مال و منال ہے اس وادیٔ پُر خار میں قدم نہ رکھیں۔ عالی منزلت امامؑ نے شبِ عاشور اپنے یار و انصار کے مجمع میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اسے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"خدا کی حمد و ستائش کرتا ہوں۔ رنج و راحت، ہر حالت میں اس کا شکر گزار ہوں الٰہی تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمارے گھر کو نبوت سے مشرف کیا، قرآن کا فہم عطا کیا، مسائلِ

دین کے سمجھنے کی قوت بخشی۔ ہمارے لئے گوش شنوا، چشم بینا اور قلبِ مطمئن کی دولت کرامت فرمائی اور ہم کو شرک سے محفوظ رکھا۔ امابعد لوگو! میں نہیں جانتا، آج روئے زمین پر میرے ساتھیوں سے افضل اور بہتر لوگ بھی موجود ہیں یا میرے اہلِ بیتؑ سے زیادہ ہمدرد اور غمگسار اہلِ بیت کسی کے ساتھ ہیں۔ اے لوگو! تم سب کو اللہ میری طرف سے جزائے خیر دے۔ میں سمجھتا ہوں کل میرا ان کا فیصلہ ہو جائیگا غور و فکر کے بعد میری رائے یہ ہے کہ تم سب خاموشی سے نکل جاؤ ــــ میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تم کو بری الذمہ کرتا ہوں۔ رات کی تاریکی تمہارے لئے پردہ ہے۔ تمام شب رہروی اختیار کرو۔ بعد ازاں اپنے جوار اور شہروں میں متفرق ہو جاؤ تاکہ اس تکلیف سے تمہاری مخلصی ہو۔ دشمن کا مطلب صرف مجھ ہی سے ہے۔ میری جان لے کر تم سے غافل ہو جائیں گے۔"

اس کے بعد آپ نے چراغ گل کر دیا تاکہ ساتھ چھوڑنے والے حضرات کو شرم و حیا مانع نہ ہو۔ (ابن جریر طبری۔ علامہ ابن خلدون۔ داستانِ کربلا مولانا ابوالکلام آزاد۔ ص ۶۳)

احباب کی وفاداری

یہ سن کر آپ کے اہلِ بیت رنجیدہ اور بے چین ہوئے۔ حضرت عباس نے کہا۔

"یہ کیوں؟ کیا اس لئے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں۔ خدا ہمیں وہ دن نہ دکھائے۔"

(داستانِ کربلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ص ۶۳)

آپ کے بھائی، بیٹے، بھتیجے اور عبداللہ بن جعفر کے دونوں لڑکے کہنے لگے۔ "ہم کیوں ایسا کریں؟ کیا اس لئے، کہ آپ کے بعد زندہ رہیں۔ خدا ہم کو وہ وقت نہ دکھائے" (ابن جریر طبری)

پھر امام حسینؑ نے اولادِ عقیل کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ "مسلمؑ کی جانثاری تمہارے لئے کافی ہے اور میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔" انہوں نے کہا

"اگر ہم ایسا کریں تو لوگ کیا کہیں گے ؛ یہی کہیں گے کہ یہ لوگ اپنے بزرگ آقا اور بہترین بنی عم کو چھوڑ کر چلے آئے۔ نہ ان کے ساتھ کوئی تیر پھینکا، نہ نیزہ چلایا نہ تلوار چلائی۔ نہیں، واللہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں بلکہ آپ کی رفاقت میں دشمنوں سے قتال کر کے اپنی جان، مال، آل و اولاد سب کچھ آپ پر قربان کر دیں گے مرتے دم تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ جو آپ پر گزرے گی وہی ہم پر گزرے گی۔ آپ کے بعد خدا ہمیں زندہ نہ رکھے۔" (ابن جریر طبری۔ داستانِ کربلا۔ ص ۶۴)

جب بنی عقیل یہ کہہ چکے تو مسلم بن عوسجہ نے عرض کیا: "میں ہرگز آپ کی مفارقت گوارا نہ کروں گا بلکہ جب تک دم میں دم ہے میں اپنا نیزہ دشمن کے سینۂ پر کینہ میں توڑوں گا جب تک قبضہ ہاتھ میں رہے گا تلوار چلاتا رہوں گا۔ نہتا ہو جاؤں گا تو پتھر پھینکوں گا یہاں تک کہ موت میرا خاتمہ کر دے۔" (تاریخ کامل)

سعد بن عبداللہ الحنفی نے کہا: "واللہ ہم آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک خدا جان نہ لے کہ ہم نے رسول اللہؐ کا حق محفوظ رکھا۔ واللہ اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل ہوں گا، جلا دیا جاؤں گا، آگ میں بھونا جاؤں گا، پھر میری خاک ہوا میں اڑا دی جائے گی اور ایک مرتبہ نہیں ستر مرتبہ مجھ سے یہی سلوک کیا جائیگا پھر بھی میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ آپ کی حمایت میں فنا ہو جاؤں اور جب یہ جانتا ہوں کہ ایک ہی بار مرنا ہے اور اس طرح کا مرنا موجبِ کرامتِ ابدی ہے تو پھر کیوں اپنے قصد سے باز رہوں۔" (تاریخ ابن جریر طبری)

زہیر بن القین نے کہا: "بخدا اگر میں ہزار مرتبہ بھی آرے سے چیرا جاؤں تو بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ خوشا نصیب! اگر میرے قتل سے آپ کی اور آپ کے اہلِ بیت کے ان نونہالوں کی جانیں بچ جائیں۔"

(ابن جریر طبری۔ تاریخ کامل۔ شرح نہج البلاغہ۔ داستانِ کربلا۔ ص ۶۵)

ان حضرات کے بعد سارے اصحاب نے اسی قسم کی تقریریں کیں اور سب نے عرض کیا کہ واللہ ہم آپ سے جدا نہ ہونگے بلکہ اپنی جانوں کو آپ پر فدا کریں گے اور جب قتل ہونگے تو یقین کریں گے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا۔

(تاریخ ابن جریر طبری۔ جلد ۶۔ ص ۲۳۸-۲۳۹)

یہ تھا مجاہدِ کربلا کی حقانیت کا ایک بےمثال مظاہرہ۔ وہ دل لبھانے والی تقریروں جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات، خوش آئند امیدوں کے سبز باغ اور دلفریب توقعات کے خیالی سراب سے اپنے ساتھ والوں کو گرویدہ بنانے کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے سامنے حقیقتِ حال کو واضح کر کے غلط فہمیوں کے پردہ کو چاک کر دینا چاہتے تھے۔ اگر شبِ عاشور جناب حسینؑ کا خطبہ بلند پایہ کردار و بالغ نظری کا حقیقی ترجمان تھا تو اصحابِ حسینؑ کی وفاکیشی، جاں نثاری، ثبات و استقلال کا جرأت مندانہ اعلان بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا۔ آپ کے یار و انصار نے تمام رات عبادت میں بسر کی۔ وہ محض قادرِ مطلق سے امداد کے طالب تھے وہ محض اس امید پر زندہ تھے کہ کل درجۂ شہادت پر فائز ہونگے۔ وہ موت کو اپنے سامنے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے اس پر آمادہ تھے۔ اس لئے کمزوری کا ان میں شائبہ نہ تھا۔ ان کی بے مثال ثابت قدمی و حیرت انگیز فداکاری تاریخ عالم میں اپنی مثال آپ ہی ہے۔

اب ہم چند تاریخی شواہد پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اصحاب نے شبِ عاشور جس وفاداری و ایثار کا عہد کیا تھا یومِ عاشور تپتے ہوئے ریگزارِ کربلا میں پورا کر دکھایا یہاں تک کہ ہر ایک مردِ مجاہد جامِ شہادت نوش کرنے میں دوسرے پر سبقت کر رہا تھا۔ فی الحقیقت عاشقانِ باصفا نے جو عہدِ وفا باندھا تھا اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کے چھوڑا۔ یہ حیرت انگیز معجزہ حسینؑ کی شانِ امامت کا نتیجہ تھا ؎

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے　　فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست ۔ زندگی ترے لئے اور بھی دشوار کرے

آغازِ جنگ اور اصحابِ حسینؑ کی فداکاری

عمر بن سعد نے اپنی کمان میں تیرِ جفا جوڑا اور لشکرِ حسینؑ کی طرف پھینک کر کہا۔ "گواہ رہو کہ سب سے پہلا تیر میں نے چلایا ہے۔" سالارِ لشکر کے الفاظ بلند ہونے کی دیر تھی کہ ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلّے چڑھے اور ہزاروں تیر چھوٹے۔ فوجِ اشقیاء کی کمزوری و بزدلی کی یہ پہلی دلیل تھی کہ ایک ایسی قلیل تعداد پر جو کم و بیش ایک صد افراد پر مشتمل تھی ایک کثیرالتعداد مسلّح منظّم فوج جس کی تعداد تیس ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حملہ کرنے کے لئے تیروں کی بے پناہ بارش سے ابتدا کرتی ہے۔ فوجِ حسینؑ نے اپنے تنے ہوئے سینوں سے تیروں کا استقبال کیا اور بغیر کسی اضطراب و انتشار کے اِذنِ جہاد کے منتظر رہے۔ اصحابِ حسینؑ کے ضبط و تنظیم کا یہ کارنامہ تاریخ کے سنہری باب کے لئے سرمایۂ افتخار رہے گا۔ جنابِ حسینؑ نے بغیر کسی ہراس و پریشانی کے، بغیر کسی تردّد و سراسیمگی کے فرمایا۔ "موت کے استقبال کے لئے ثابت قدمی سے ڈٹے رہو۔ خدا کی ہزاروں رحمتیں تمہارے شاملِ حال ہوں۔ یہ تیر نہیں بلکہ دشمن کے قاصد ہیں جو جنگ کا پیغام لائے ہیں۔ اتمامِ حجّت ہو چکا۔ صرف ایک حجّت باقی تھی کہ جنگ کی ابتدا دشمن کی طرف سے ہو اور وہ بھی ہو چکی۔ اب رواداری کا دور ختم ہو چکا ہے۔ صلح کے مواقع باقی نہیں رہے۔ حفاظتِ خود اختیاری میں اب تمہیں بھی تیر پھینکنے کی اجازت ہے۔" اذنِ جہاد پاتے ہی اصحابِ حسینؑ نے کم و بیش ایک صد جوابی تیر دشمن کی طرف پھینکے جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ تمہارے تیروں کی بوچھاڑ ہم مٹھی بھر حق پرستوں کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ بہرکیف تمہیں جان توڑ مقابلہ کا چیلنج ہے جس میں ان گنت ہتھیاروں کی طاقت کے علاوہ دل کی طاقت، قوتِ ایمان

اور ارادے کی پختگی کی بھی ضرورت ہے۔

تیروں کی بے پناہ بارش کے بعد نخوت و غرور کے دو پتلے، زیاد و ابن زیاد کے غلام یسار و سالم فوجِ اشقیا سے اتراتے ہوئے نکلے اور میدانِ جنگ میں آکر مبارزت طلب کی۔ شوقِ شہادت کے نشہ میں مخمور بوڑھے جرنیل حبیب ابن مظاہرؓ اور سن رسیدہ، عبادت گزار اور حافظِ قران تابعی بُریر بن خضیرؓ جوش سے بھرے ہوئے آگے بڑھے مگر دور بین امامؑ کی نگاہِ شوق ایک گندم گوں، تنومند، کشادہ سینہ مجاہد کی منتظر تھی۔ قبیلۂ کلب کے سپوت عبداللہ بن عمیرؓ جہاد کے نشے سے سرشار ہو کر سبقت کے لئے آگے بڑھے اور دست بدست لڑائی کے پہلے ہی وار میں یسار کا کام تمام کر دیا۔ سالم کی تلوار کا اچانک وار سر پر پڑنے ہی والا تھا کہ بائیں ہاتھ کو سپر بنا کر زخم خوردہ شیر کی طرح ایک ہی جوابی ضربِ شمشیر سے اس کو بھی واصلِ جہنم کر دیا۔ ہاتھ کی انگلیاں قطع ہو چکی تھیں لیکن دو سپاہیوں پر فتح پا کر جوشِ شجاعت میں نمایاں اضافہ ہو چکا تھا اور یوں رجز خوانی میں مصروف تھے۔ "اے اُمِّ وہب! میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ میں بڑھ بڑھ کر نیزے لگاؤں گا۔ تلواریں ماروں گا۔ اس طرح شمشیر زنی کروں گا جو خدا پر ایمان رکھنے والے، جواں ہمت انسان کے شایاں شان ہے۔" ان کی بیوی ام وہب بے تحاشا ایک گرز لے کر میدانِ جنگ میں آگئی اور خاوند سے پکار کر کہنے لگی "میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں۔ اولادِ رسولؐ کی نصرت میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔" پھر یکایک اسے اس قدر جوش آیا کہ دشمن کی طرف بڑھنے لگی۔ حضرت حسینؑ یہ دیکھ کر بہت ہی متأثر ہوئے فرمایا "اہلِ بیت کی طرف سے خدا تمہیں جزائے خیر دے لیکن عورتوں پر جہاد ساقط ہے۔" ایمان و اطاعتِ امامؑ کا احساس جوشِ جہاد پر غالب آیا اور وہ مخدراتِ عصمت کے پاس خیمہ میں واپس چلی آئیں۔

اس کے بعد ابنِ سعد کا میمنہ حملہ آور ہوا۔ جب دشمن بالکل قریب پہنچ گئے تو

حسینی بہادروں نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور نیزے سیدھے تان لئے۔ دشمن کے گھوڑے نیزوں کی باڑھیں دیکھ کر آگے نہ بڑھ سکے اور لوٹنے لگے۔ اصحابِ حسینؑ نے دشمن کی ناکامی و بزدلی کا فائدہ اٹھاکر تیروں سے کئی آدمی مار گرائے۔ جنگ شدت کی منزل سے گزر رہی تھی۔ حُر کو خیال آیا کہ میں تاخیر کر رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ناصرِ امامؑ مجھ سے پہلے قتل ہو جائے اور اس طرح شہادت میں اوّلیت کا سہرا اس کے سر بندھ جائے۔ خدمتِ امامؑ میں حاضر ہو کر جہاد کی اجازت چاہی اور اِذنِ جہاد ملنے پر دم کے دم میں یزید بن سفیان تمیمی کو اس طرح جہنم داصل کیا کہ فوجِ مخالف پر ہیبت چھا گئی۔ دشمن کے پرّے منتشر ہو گئے اور حُر کے مقابلہ کے لئے کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حُر نے مقابل میں حریف کو نہ پاکر مجبوراً گھوڑے کو واپس اڑ لگائی۔

اس کے بعد نافع بن ہلال جملی نے آگے بڑھ کر لڑائی کا آغاز کیا اور وہ کہہ رہے تھے "میں جملی ہوں۔ میں پیروِ دینِ علیؑ ہوں"۔ مزاحم بن حریث نے اس کے جواب میں کہا "میں پیروِ دینِ عثمان ہوں"۔ نافع نے کہا "بلکہ تو پیروِ **دینِ شیطان** ہے"۔ بعد ازاں نافع نے مزاحم کو قتل کر ڈالا۔ (ابن جریر طبری)

مسلم بن عوسجہ کی جاں نثاری

میمنہ کے سپہ سالار عمرو بن الحجاج نے یہ حالت دیکھی تو پکار اٹھا "بے وقوفو! پہلے جان لو کن سے لڑ رہے ہو۔ یہ لوگ جان پر کھیلے ہوئے ہیں۔ تم اسی طرح ایک ایک کر کے قتل ہوتے جاؤ گے۔ ایسا نہ کرو۔ یہ مٹھی بھر تو ہیں۔ پتھروں سے ان کو مار سکتے ہو"۔ عمر بن سعد نے یہ رائے پسند کی اور مبارزت موقوف کر کے عام حملہ کا حکم دیا۔ دشمن کی لاتعداد سپاہ آگے بڑھی اور کشت و خون کا بازار گرم ہوا۔ اب جنگ چھڑنے کے بعد بھلا کیا یہ ممکن تھا کہ مسلم بن عوسجہ جنہوں نے شبِ عاشور خطبۂ امامؑ کے جواب میں کہا تھا

"اپنے نیزے کو دشمن کے سینے میں توڑوں گا، جب تک تلوار کا قبضہ ہاتھ میں رہا تلوار چلاؤں گا۔ اگر ہتھیار ہاتھ میں نہ رہا تو آپ کی نصرت میں پتھر ماروں گا۔" کس طرح معرکۂ کارزار میں پیچھے رہتے۔ وہ بوڑھے ضرور تھے مگر نصرتِ حسینؑ میں ان کا جوش و ولولہ جوانوں سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ دشمنانِ دین کے سر پر بڑھ بڑھ کر ضربات لگائیں جب تھوڑی دیر کے لئے لڑائی تھمی اور غبار کا دامن چاک ہوا تو مسلم بن عوسجہ خاک و خون میں غلطاں نظر آئے۔ امام حسینؑ مسلم کے سرہانے گئے دیکھا کہ رمقِ حیات باقی ہے اور فرمایا۔ "اے مسلم! خدا تمہاری مغفرت فرمائے۔" پھر آیۂ کریمہ تلاوت فرمائی: فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (الاحزاب ۲۳) بعض ان میں سے درجۂ شہادت حاصل کر چکے ہیں اور بعض منتظر ہیں اس طرح اللہ سے جو عہد کر رکھا تھا اسے سچ کر دکھایا اور ایفائے عہد میں کوئی ردّ و بدل نہ کیا۔

پھر حبیب ابن مظاہرؓ نے مسلم بن عوسجہؓ کے پاس جاکر کہا۔ "تم کو جنت کی بشارت ہو۔ اگر میں یہ نہ جانتا کہ تمہارے بعد ہی میں بھی تم سے لاحق ہونے والا ہوں تو کہتا کہ کچھ وصیت کرو۔" مسلم بن عوسجہ نے کہا۔ "خدا تمہارے حال پر رحم کرے بس میں تم سے یہی وصیت کرتا ہوں کہ امام حسینؑ کی نصرت میں اپنی جان قربان کرنا۔" حبیب ابن مظاہرؓ نے کہا۔ "انشاءاللہ ایسا ہی کروں گا۔" اتنے میں مسلم بن عوسجہؓ کی روح رابطۂ ملکِ بقا ہوئی۔ (تاریخ کامل)

مسلمؓ بن عوسجہ نے لشکرِ مخالف کے چھپن ۵۶ آدمی نیزہ و شمشیر کی ضربات سے ہلاک کئے تھے۔ بالآخر کاری زخموں سے مجروح ہو کر گر گئے۔ (روضۃ الاحباب)

مسلمؓ بن عوسجہ نے شبِ عاشور جو پیمانِ وفا باندھا تھا اپنے سرخ و گرم خون سے اس پر ایفائے عہد کی مہر ثبت کر دی اس طرح نصرتِ امامؑ میں درجۂ شہادت

پر فائز ہونے والوں میں اولیّت کا سہرا ان کے سر رہا۔ ملک گیری، استعمار پسندی اور توسیعِ سلطنت کی شعبدہ بازی تو بہت سے حریفوں نے کر دکھائی لیکن موت پر فتح پانا امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب کے لئے مخصوص تھا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

رنگیں مرقع میں خونِ نسوانیّت کی شمولیّت

اس کے بعد فوجِ مخالف کے میسرہ نے شمر لعین کی قیادت میں حملہ کیا۔ امام حسینؑ کے اصحاب نے نہایت حیرت انگیز جرأت و پامردی سے مقابلہ کر کے امڈتے ہوئے سیلابِ بلا کے رُخ کو پھیر کر رکھ دیا۔ اس موقع پر عبداللہ بن عمیرؓ نے انتہائی جانفشانی کا مظاہرہ کیا اور دو جنگ آزما دشمنوں کو جہنّم واصل کر کے جامِ شہادت نوش کر لیا۔ طبری (جلد ۶ ص ۲۴۹) کی تصریح کے مطابق آپ اصحابِ حسینؑ میں دوسرے شجاع تھے جنہوں نے مسلم بن عوسجہؓ کے نقشِ قدم پر چل کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور اپنی حیرت انگیز فداکاری و ایثار سے جہادِ حسینی کو چار چاند لگا دیئے۔ جب نیک طینت، پاکیزہ فطرت خاتون اُمِّ وہب کو معلوم ہوا کہ ان کے شوہر عبداللہ بن عمیر کربلا کی گرم زمین پر اپنے بہتے ہوئے خون کی سرخ چادر اوڑھے موت کی نیند سو رہے ہیں تو بے چین ہو گئیں اور اپنے شوہر کی لاش کی آخری زیارت کے لئے میدان میں آئیں اور مقتول شوہر کے سرہانے بیٹھ کر اس کے خون آلودہ چہرے سے گرد و غبار صاف کرتے ہوئے یوں گویا ہوئیں "تمہیں جنّت مبارک ہو"۔ مگر سنگدل و سفاک دشمن جو انسانی لباس میں خونخوار درندے تھے یہ کب گوارا کر سکتے تھے کہ اپنے شوہر کو آڑے وقت میں ڈھارس بندھانے والی اور آتشِ شوقِ جہاد کو ہوا دینے والی مقدس خاتون جور و جفا کے بے پناہ طوفان

سے بچ جائے۔ چنانچہ رستم نامی غلام نے اپنے آقا شمر لعین کے حکم کی تعمیل میں ستم رسیدہ و خستہ دل خاتون کے سر پر ایک ایسا گرز مارا کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور اس طرح کربلا کے رنگین مرقع میں ایک قابلِ احترام خاتون کے مقدس خون کی سرخی بھی شامل ہو گئی۔

اللہ رے اے حسینؑ! مرد تو مرد۔ تو نے صنفِ نازک کے دلوں میں بھی شوقِ شہادت، جوشِ حریت اور آزادئ فکر کا جذبہ پیدا کر دیا۔ خوشا اے بختِ رسا! اے امِ وہب! تو اہلِ بیتِ رسولؐ کی سچی عقیدت و بے پایاں محبت کے صدقہ میں درجۂ شہادت پر فائز ہو کر اپنے شوہر کی معیت میں گلزارِ جناں میں پہنچ گئی۔

مباہلۂ کربلا

یزید بن معقل نے فوجِ یزید سے نکل کر بریر بن خضیرؓ ہمدانی کو جن کے ساتھ اس کی پرانی شناسائی تھی اور بسا اوقات باہم مذہبی نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی باآواز بلند پکار کر کہا۔ "دیکھا تم نے، خدا نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تم کہا کرتے تھے کہ عثمانؓ گنہگار تھے اور معاویہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے اور سچے امام علیؑ ابن ابیطالب ہیں۔" بریرؓ نے کہا۔ "میں اب بھی اسی خیال پر قائم ہوں۔ خدا نے تو میرے ساتھ بہت بہتر سلوک کیا ہے البتہ تم بڑے بدنصیب ہو۔" یزید نے کہا۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم گمراہ ہو۔" بریرؓ نے کہا۔ "اچھا اس پر تیار ہو کہ میں تم سے **مباہلہ** کروں۔ ہم تم دونوں مل کر خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے پر لعنت کرے اور ہم دونوں میں سے جو حق پر ہو اس کے ہاتھ سے باطل پرست کو قتل کرا دے۔" یزید نے یہ منظور کر لیا۔ پھر جانبین سے دونوں نے صفوں سے باہر آکر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور مقابلہ کے لئے بڑھے۔ یزید نے ضرب لگائی جو بریرؓ پر اچٹتی ہوئی پڑی اور انہیں کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ پھر حسن رسید تابعی

بریرؓ نے تلوار کا وار کیا جو خود کو کاٹ کر جبڑوں تک جا پہنچی۔ شقی ازلی گھوڑے کی زین سے سر کے بل فرشِ زمین پر اس حالت میں گرا کہ تلوار سر میں اٹکی ہوئی تھی اور بریرؓ اسے سر کے اندر سے کھینچ رہے تھے۔ اسی حالت میں رضی بن منقذ عبدی نے بریرؓ پر حملہ کیا لیکن جواں ہمت بوڑھے مجاہد بریرؓ نے اسے زمین پر پچھاڑا اور اس کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ بزدل دشمن گھبرا کر امداد کے لئے چیخا۔ اشقیا کا ہجوم آگے بڑھا۔ کعب بن جابر ازدی نے سید القراء بریرؓ پر پشت کی جانب سے نیزے کا وار کیا جو سینہ سے پار ہو گیا۔ بریرؓ زمین پر گر گئے۔ جفاجو، کینہ پرور نے دوسرے سپاہیوں کی ممانعت کے باوجود حافظِ قرآن کو جو مسجدِ کوفہ میں درسِ قرآن دیا کرتے تھے تلوار کی ضربات سے شہید کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حملۂ اولیٰ

تاریخِ عالم کا یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تیس ہزار مسلح و منظم فوج کے مقابل بہتر[۷۲] بھوکے اور پیاسے افراد صبح سے دوپہر تک چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے اور فوجِ کثیر اس تعدادِ قلیل سے ٹکرا کر پے در پے شکستیں کھا رہی تھی۔ تمام فوج پر پریشانی و اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ نظم و نسق میں تزلزل رونما تھا اور طریقِ جنگ ہر لحہ تغیّر پذیر ہو رہا تھا۔ کوئی حیلہ کارگر نہ ہوتا تھا۔ حسینی فوج سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑی تھی جس سے بادِ مخالف کا ہر طوفان ٹکرا کر اپنا رخ بدل دینے پر مجبور تھا۔ بقولِ طبری لشکرِ حسینؑ میں کل بتیس[۳۲] سوار تھے لیکن جس طرف رخ کرتے تھے صفِ اعدا کو درہم برہم کر دیتے تھے۔ جب عمر بن سعد کو اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا تو حصین بن نمیر کو پانچ سو[۵۰۰] تجربہ کار و ماہرِ فن تیر اندازوں کا قائد بنا کر حکم دیا کہ وہ فوجِ حسینی کے قریب جا کر تیروں کا مینہ برسائیں۔ بقولے پانچسد بقولے ایک ہزار تیر اندازوں نے فوجِ حسینی

کے قریب پہنچ کر مجموعی طور پر یکجہتی و ہم آہنگی سے ، ایک نشانہ پر ، ایک ہی مقصد کو سامنے رکھ کر بہت دور سے نہیں بلکہ محدود فاصلہ سے ، بیک وقت زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی بارش برسانا شروع کی۔ تیروں کی بوچھاڑ کیا تھی ؟ ایک عظیم سیلاب کا بہاؤ تھا ایک ہیبتناک طوفان کا تھپیڑا تھا۔ ایک تیز آندھی کا جھکڑ تھا۔ ایک لوہے کی بڑی چادر تھی جو تیروں کی صورت میں چپ و راست ، غرضیکہ ہر طرف سے اس مختصر جماعت کو ڈھانپ رہی تھی۔ ان کے جسم کے کسی حصہ پر ، داہنے بائیں ، کسی گوشہ میں بھی ایسا کوئی نقطہ نہ تھا جو ان تیروں کی زد سے خالی ہو اور اس مختصر سی جماعت کے لئے کہیں امن و پناہ کا ذریعہ ہو۔ مگر واہ رے انصارِ حسینؑ ! تیروں کے اس ہیبت ناک سیلاب کا جواب ان کی طرف سے یہ تھا کہ انہوں نے تلواریں سونت لیں ، تیروں کے آتے ہوئے طوفان کا اپنے سینہ سے مقابلہ کرتے ہوئے اور لوہے کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو ریلتے ہوئے جا پڑے ، دشمن کی فوج کے اندر گھس گئے اور تیغِ خون آشام کے جوہر دکھانے لگے۔ اس قیامت خیز بہادری اور اس حیرت انگیز فدا کاری کا کیا کہنا کہ جس نے آخر دشمن کو پھر شکست دی اور فوجِ اشقیاء کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑا مگر اس حملہ کا نتیجہ فوجِ حسینی کے لئے بہت درد انگیز ثابت ہوا۔ جب گرد و غبار کا دامن چاک ہوا تو معلوم ہوا کہ مختصر تعداد بہت مختصر ہو گئی ہے اور کم و بیش پچاس انصار درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں جن میں سے بعض زہر آلود تیروں کا نشانہ بنے اور بعض نبرد آزمائی کر کے نیزہ و تلوار کی ضربات سے شہید ہوئے تمام گھوڑے بے کار ہو گئے اور سواروں کو مجبوراً پیادہ ہونا پڑا۔

حُر کی شجاعت :۔ ایوب بن مشرح روایت کرتا ہے کہ حُر بن یزید کا گھوڑا خود میں نے زخمی کیا تھا۔ میں نے اسے تیروں سے چھلنی کر ڈالا۔ حُر بن یزید زمین پر کود پڑے۔ تلوار ہاتھ میں لئے شیرِ ببر معلوم ہوتے تھے۔ تلوار ہر طرف متحرک تھی اور یہ شعر زبان پر تھا "اگر تم نے میرا گھوڑا بیکار کر دیا تو کیا ہوا میں شریف کا بیٹا ہوں۔ خونخوار شیر سے زیادہ بہادر ہوں"۔ (داستان کربلا۔ ص ۸۰)

حسینی خیام پر یلغار

لڑائی اپنی پوری جولانی سے جاری تھی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی مگر کوفی فوج اپنی غیر محدود اکثریت کے باوجود گنتی کے چند مجاہدین پر ابھی تک غلبہ حاصل کرنے سے عاجز تھی فوجِ اشقیاء اب سامنے آکر جرأت مندانہ حملہ کرنے کی بجائے اس فکر میں تھی کہ کسی طرح پس پشت سے حملہ کر کے معدودے چند بہادروں کو چاروں طرف سے محصور کر کے بے پناہ تیروں کی بارش سے نڈھال کیا جائے۔ لیکن پشت کی جانب خیموں کی قطار اس طرح طناب اندر طناب کھڑی تھی کہ ایک مضبوط و مستحکم حصار کا کام دے رہی تھی۔ عمر بن سعد نے اپنی فوج کی بیچارگی کی کیفیت دیکھ کر حکم دیا کہ خیموں کو ان کے چپ و راست سے گرا دیا جائے تاکہ پورے طور سے محاصرہ کر کے زوردار حملہ کا امکان پیدا ہو سکے۔ حسینی فوج کے چند مجاہدین خیموں کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ طنابیں کاٹنے کے لئے جو دشمن آگے بڑھتا تیغِ خون آشام کا ایسا تُلا ہوا وار اس پر پڑتا کہ اس کا سر لڑھکتا ہوا چلا جاتا۔ اس طرح بیسیوں دشمن فی النار ہو گئے اور فوجِ اشقیار کو کافی زک اٹھانا پڑی۔ عمر بن سعد ناکامیٔ تدبیر کی بنا پر سخت پشیمان ہوا اور دماغی توازن کھو کر انتہائی بربریت کا ثبوت دیتے ہوئے خیموں کو آگ لگا دینے کا حکم دیا۔ دشمن کے سپاہی آگ لے دوڑے۔ حسینی فوج یہ دیکھ کر مضطرب ہوئی مگر دوربین امام عالیمقامؑ نے فرمایا۔ "کچھ پرواہ نہیں۔ جلانے دو۔ ہمارے لئے اور بھی زیادہ بہتر ہے۔ اب وہ پیچھے سے حملہ نہیں کر سکیں گے۔" اصحابِ حسینؑ نے مدافعت چھوڑ دی اور فوجِ یزید خیموں کو نذرِ آتش کرنے میں کامیاب ہو گئی مگر نتیجہ نے بتا دیا کہ عمر بن سعد نے سیاستِ جنگ میں جناب حسینؑ کے بالمقابل ایک مزید زک اٹھائی۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے دشمن کی راہ مسدود کر دی اور مقابلہ کا موقع صرف سامنے ہی کی جانب سے باقی رہ گیا۔

پے در پے **تدابیر کی ناکامی** دیکھ کر شمر برافروختہ ہوگیا اور اہل بیت اطہار کے خیمہ کو بھی نذرِ آتش کرنا چاہا جس پر پیکرِ شرافت، امامؑ غیور کو تاب نہ رہی اور پکار کر فرمایا "اے شمر! تو آگ اس لئے منگوا رہا ہے کہ میرے گھر کو میرے اہل وعیال سمیت جلا دے۔ خدا تجھے آگ سے جلانا نصیب کرے۔" شمر، شبث بن ربعی کے لعن وطعن سے شرمسار ہوگیا اور اس بدتر اقدام سے باز رہا۔ زہیر بن القین شمر ملعون کی یہ مذموم حرکت دیکھ کر بیتاب ہوگیا اور دس بہادروں کی معیت میں شمر کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑا۔ سخت خونریز لڑائی ہوئی۔ بالآخر دشمن کو پسپا ہونا پڑا۔ شمر کا دستِ راست ابو عزہ ضابی اس معرکہ کارزار میں جہنم واصل ہوگیا۔ مگر محدود قلت کا غیر محدود کثرت سے کیا مقابلہ؟ بقولِ مورخ ابنِ اثیر اور محمد بن جریر الطبری اگر لشکرِ امامؑ کے ایک دو آدمی قتل ہوتے تو بوجہ قلتِ اصحاب ان کی جماعت میں بیّن کمی نمایاں ہوجاتی اور اگر فوجِ اشقیاء کی ایک بڑی تعداد بھی قتل ہوجاتی تو بوجہ کثرتِ سپاہ غیر محدود فوجِ یزید میں کچھ نمایاں فرق نظر نہ آتا تھا

نمازِ ظہر پر ہنگامہ

دورانِ جنگ نمازِ ظہر کا وقت آگیا تو ابو ثمامہ صائدی نے امامِ حسینؑ سے کہا "میری جان آپ پر فدا ہو، اگرچہ دشمن کی فوج بالکل قریب آگئی ہے لیکن واللہ جب تک میں زندہ ہوں اشقیا آپ کو جسمانی صدمہ نہ پہنچا سکیں گے۔ اب میری یہ خواہش ہے کہ نمازِ ظہر ادا کرکے خدا سے ملاقات کروں۔" یہ سن کر امامؑ نے سر اٹھایا اور فرمایا "اے ابو ثمامہ! اللہ تم کو نماز گزاروں اور ذاکرین میں محسوب کرے۔ تم نے نماز کا ذکر کیا۔ بیشک یہ اوّل وقتِ نماز ہے۔ مخالفین سے کہو کہ ہم کو نماز ادا کرنے کی تھوڑی سی مہلت دیں۔" حصین بن نمیر بولا۔ "تمہاری نماز قبول نہ ہوگی۔" حبیب ابن مظاہرؑ نے غضب میں آکر جواب دیا۔ "زَعَمْتَ لَا تُقْبَلُ الصَّلٰوۃُ مِنْ اٰلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ"

وَتقبل مِنکَ یا حمار۔" (ترجمہ) اے گدھے! تو گمان کرتا ہے کہ آلِ رسولؐ کی نماز قبول نہ ہوگی اور تیری نماز قبول ہوگی۔"

یہ دندان شکن جواب سن کر حصین بن نمیر نے حبیب ابن مظاہرؓ پر حملہ کر دیا۔ حبیبؓ نے ابن نمیر کے گھوڑے پر تلوار چلائی۔ گھوڑا بھڑکا اور ابن نمیر گر پڑا مگر اس کے ساتھیوں نے پہنچ کر اس کو بچا لیا۔ (تاریخ ابن اثیر۔ تاریخ احمدی ص ۲۹۲)

حبیب ابن مظاہرؓ کی شہادت

حبیب ابنِ مظاہرؓ نے دشمنوں سے شدید قتال کیا۔ اسی اثنا میں بدیل بن حریم ان پر حملہ آور ہوا۔ حبیبؓ نے ایک ضربِ شمشیر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اتنے میں بنی تمیم کے ایک دوسرے شخص نے حبیب ابن مظاہرؓ کو نیزہ مارا۔ حبیبؓ گر پڑے۔ اٹھنا چاہتے تھے کہ حصین بن نمیر نے ان کے سر پر ایسی تلوار لگائی کہ وہ پھر گر پڑے۔ حبیبؓ کا سر قلم کیا گیا اور ابن نمیر نے گھوڑے کی گردن میں باندھ کر لشکرِ یزید میں گردش کی تاکہ اس شکست کی خفت کو مٹایا جائے جو اسے حبیبؓ کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی (تاریخ طبری)

یاد رہے کہ حصین ابن نمیر وہی مردود ازلی تھا جس نے واقعہ ہائلہ کربلا کے بعد مکہ معظمہ پر عبداللہؓ بن زبیر کے خلاف فوج کشی کی تھی۔ بیت اللہ پر اتنی سنگ باری کرائی کہ عمارت کو شدید نقصان پہنچا اور اس قدر آگ برسائی کہ غلافِ کعبہ جل گیا تھا۔ جس شخص کے ذاتی اخلاق و کردار کی یہ کیفیت تھی وہ اپنے تئیں تو مومن کامل اور سچا مسلمان سمجھے اور نواسۂ رسولؐ کی شان میں گستاخی و یاوہ گوئی سے کام لے کہ ان کی نماز مقبول نہ ہوگی۔ حبیبؓ کے شہید ہو جانے پر ان کے مقدس سر کو گھوڑے کی گردن میں باندھ کر تشہیر کرنا پرلے درجہ کی اخلاقی گراوٹ، اوچھاپن اور کمینگی کا مظاہرہ تھا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا تھا کہ ابن نمیر کے خیال میں صحیح اسلام وہی تھا جو امیرالمومنین

خلیفۃ المسلمین حاکمِ شام امیر یزید کا ذاتی کردار تھا اس لئے وہ بزعمِ خود سمجھتا تھا کہ (معاذاللہ) حسینؑ خلیفۂ برحق یزید کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں اس لئے ان کی عبادات و اعمال اکارت جا رہے ہیں۔ اس نے اپنے سیاسی رہناؤں اور دینی مرشدوں سے یہی سبق سیکھا تھا کہ خلیفہ کا ہر قول و فعل مستحسن اور اس کا ہر حکم واجب الاحترام و واجب التعمیل ہے خواہ وہ نواسۂ رسولؐ کے قتل و انہدامِ بیت اللہ کے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی نگاہ میں قرآنِ حکیم کا یہ فیصلہ کہ تقویٰ معیارِ فضیلت ہے کوئی معنی نہیں رکھتا اور اس کا مسلمان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یزید اگر شراب پئے، جؤا کھیلے، خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے، کتوں کے ساتھ دل لگی کرے بندروں کو علماء کا لباس پہنا کر اسلامی تہذیب کا مضحکہ اڑائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ عوام کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ مطلق العنان آمر کے خلاف آواز بلند کریں۔ اس کے خلافِ اسلام اعمال پر حرف گیری اور اس کی خلافِ قرآن روش پر نکتہ چینی کریں ؎

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بکجا

اس مقام پر ہم ذی علم و ذی شعور اشخاص کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ غور فرمائیں کہ کیا یزید ملتِ اسلامیہ کو اپنے آبائی دورِ جاہلیت کی طرف واپس لے جا کر اس میں وہی قیصرائی طرزِ حکومت تو نہ رائج کرنا چاہتا تھا جس میں جور و استبداد کے طوفان اٹھا کرتے تھے اور جہاں آمریت پورے پورے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ فرما ہوتی تھی اور جہاں آمر کا ہر حکم واجب الاطاعت و واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ یہ جنابِ حسینؑ کی قربانی کا ایک کمال ہے جس نے خلافتِ راشدہ اور قیصرائی طرزِ حکومت کے درمیان حدِّ فاصل قائم کر دی۔

امیر معاویہ و آلِ مروان کو خلافتِ اسلامیہ کا جائز وارث سمجھنے والا شخص اب یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ اموی دورِ حکومت کو **خلافتِ راشدہ** تصور کرے۔ وہ بھی

مجبور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت امام حسنؑ تک تیس سالہ دورِ حکومت کو ہی صرف خلافتِ راشدہ کے نام سے تعبیر کرے۔ اگر امام حسینؑ یہ عظیم الشان قربانی پیش نہ کرتے تو آج ہر مسلمان یزید کو خلافتِ راشدہ کا ایک رکنِ عظیم سمجھتا اور اس کے رائج کردہ ہر معیوب فعل و قباحت کو صحیح اسلام تصوّر کرتا۔ جب ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے تو ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اسلام کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے شہادتِ حسینؑ کی کس قدر عظیم ضرورت تھی۔

حُر کی فداکاری

حسینی میسرہ کے سپہ سالار حبیب ابن مظاہرؓ کے قتل سے فوجِ حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی۔ حبیبؓ کے بعد حُر بن یزید کی باری تھی۔ وہ انتہائی جوش و خروش سے یہ شعر پڑھتے دشمن کی صفوں میں گھس پڑے۔ "میں نے قسم کھا لی ہے کہ قتل نہیں ہوں گا جب تک قتل نہ کرلوں۔ مروں گا تو اس حال میں مروں گا انہیں تلوار کی کاری ضربوں سے ماروں گا۔ نہ بھاگوں گا۔ نہ دوڑوں گا۔" (داستانِ کربلا۔ ص۸۳)

صفوان نے غضب میں آکر حُر کو نیزہ مارا۔ حُر نے اس کے وار کو رد کرکے اسی گرمی میں ایسا نیزہ لگایا کہ اس کی انّی صفوان کی پیٹھ سے نکل گئی۔ بعدہٗ حُر نے لشکرِ دشمن سے یہاں تک قتال کیا کہ نیزہ ٹوٹ گیا۔ حر نے تلوار میان سے نکال کر ایسی شمشیر زنی کی کہ کسی کو سر سے سینہ تک کاٹا اور کسی کو کمر کے پاس سے دو ٹکڑے کیا۔ یہ دیکھ کر شمر نے لشکر کو آواز دی کہ سب مل کر حُر کو گھیر لیں۔ چنانچہ لشکرِ یزید نے حُر کو گھیر کر چاروں طرف سے تیر و شمشیر کا مینہ برسانا شروع کیا۔ (روضۃ الاحباب)

بالآخر حُر زخموں سے چوُر ہوکر گرے اور جاں بحق تسلیم ہوگئے۔ حُر کی لاش میدانِ جنگ سے اٹھاکر امامؑ کے سامنے لاکر رکھی گئی تو آپ حُر کے چہرے سے خاک و خون صاف کرنے لگے اور فرمایا۔ "تمہارے والدین نے تمہارا نام حُر

بہت ٹھیک رکھا۔ تم دنیا میں بھی حُر ہو اور آخرت میں بھی حُر"۔ یقیناً حضرت حُر نے تمام دنیوی تحریصاتِ جاہ و مال کو ٹھکرا کے حق کے راستے پر قدم رکھا تو وہ اس عالمِ فانی میں حُر ثابت ہوئے اور حریّت کے اصل جوہر کو اپنے عمل سے نمایاں کر کے راہِ حق میں جامِ شہادت نوش کیا تو آخرت میں **حُر** ٹھیرے۔

ایفائے عہد

جنگ ملتوی نہ ہوئی اور نماز کی مہلت نہ مل سکی لیکن امامؑ نے اس نازک مرحلہ پر بھی فرض شناسی کا حیرت انگیز منظر پیش کیا اور اپنے اصحاب کے ساتھ نماز ظہر "بعنوان صلوٰۃ الخوف" پڑھی۔ اعدائے دین شدید نرغہ کرکے امام عالیمقامؑ اور ان کے صف بستہ اصحاب پر تیر برسانے لگے۔ یہ حال دیکھ کر سعید بن عبداللہ حنفی امام حسینؑ کے آگے کھڑے ہو گئے تاکہ جو تیر آئیں ان کو اپنے جسم پر لیں اور امامؑ تک نہ پہنچنے دیں۔ چنانچہ اس قدر تیر سعید بن عبداللہ کے بدن پر لگے کہ وہ گر کر شہید ہو گئے (تاریخ کامل) پس سعید بن عبداللہ نے امام مظلومؑ کے ساتھ شبِ عاشور جو **پیمانِ وفا** باندھا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ یکے بعد دیگرے زہر میں بجھے ہوئے تیرہ۱۳ تیر ان کے جسم میں پیوست ہوئے۔ اس حیرت خیز وفاداری و جانثاری کی مثال تاریخِ عالم میں ناپید ہے ؎

کیا کفر یزید کی فوج میں تھا کیا دین خدا کے پیاروں میں
سجدوں پہ وہاں تلواریں تھیں سجدے تھے یہاں تلواروں میں

زہیر بن القین کی جاں نثاری

حضرت حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کی معیت میں فریضۂ ظہر ادا کیا۔ دشمن کا دباؤ

بدستور بڑھ رہا تھا۔ میسرہ کے سپہ سالار زہیر بن القین نے میدان اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ شعر پڑھتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے ۔

" میں زہیر بن القین ہوں۔ اپنی تلوار کی نوک سے انہیں حسینؑ سے دور کروں گا "۔

صفیں درہم برہم کر ڈالیں۔ پھر لوٹے اور حضرت حسینؑ کے شانے پر ہاتھ مار کر جوش سے یہ شعر پڑھے۔ " بڑھ خدا نے تجھے ہدایت دی۔ آج تو اپنے نانا نبیؐ سے ملاقات کرے گا، اور حسنؑ سے علی مرتضیٰؑ سے، بہادر جوان جعفر طیارؑ سے اور شہید زندہ اسد اللہ حمزہؑ سے "۔ پھر دشمن کی طرف لوٹے اور قتل کرتے رہے یہاں تک کہ قتل ہو گئے "۔

(داستانِ کربلا۔ مولانا آزاد۔ ص ۸۲)

نافع بن ہلال جملی کی شہادت

نافع تیر اندازی میں بڑے مشاق و یگانہ روزگار تھے۔ انہوں نے تیروں کے سوفار پر اپنا نام لکھ دیا تھا۔ نماز ظہر کے بعد انہوں نے تیر اندازی شروع کی، بارہ اشقیاء کو قتل کیا اور ایک تعدادِ کثیر کو زخموں سے نڈھال کر دیا۔ مگر تابکے۔ دشمن کی اَن گنت فوجوں نے چاروں طرف سے محصور کر دیا۔ دونوں بازو شکستہ ہو گئے۔ گرفتار ہوئے اور شمر کے سامنے اس حالت میں لائے گئے کہ ڈاڑھی خون سے خضاب ہو چکی تھی۔ جسم پر متعدد زخم تھے۔ بازو قطع ہو چکے تھے مگر جرأت و ہمت کا اندازہ کیجئے۔ شمر کے منہ پر کہنے لگے۔ " خدا کی قسم، میں نے تمہارے بارہ آدمی قتل کئے ہیں۔ مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنے فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ یہ سن کر شمر کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور پست حوصلہ دکمینہ فطرت شقی نے زخمی و مجبور مجاہد کو شہید کر دیا۔

غفاری بھائیوں کی بہادری

اَب آپ کے ساتھیوں نے دیکھا کہ دشمن کو روکنا ناممکن ہے لہٰذا انہوں نے

طے کیا کہ آپ کے سامنے ایک ایک کر کے قتل ہو جائیں۔ چنانچہ دونوں غفاری بھائی آگے بڑھے اور اپنی شمشیرہائے آبدار سے فاجروں کے ٹکڑے اڑاتے ہوئے شہید ہوئے۔

جابری لڑکوں کی فداکاری

ان کے بعد دو جابری لڑکے سیف بن حارث اور مالک بن عبد سریع خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے۔ حضرت حسینؑ نے دیکھا کہ دونوں زار و قطار رو رہے ہیں۔ حضرتؑ نے رونے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا۔ "واللہ ہم جانوں کیلئے نہیں روتے بلکہ اس بات پر روتے ہیں کہ دشمن نے آپ کو گھیر لیا ہے اور اب ہم میں یہ طاقت نہیں کہ آپ کی حفاظت کر سکیں۔" امام عالیمقامؑ نے فرمایا۔ "خدا تم دونوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔" پھر دونوں نے بڑی شجاعت سے لڑنا شروع کیا۔ اور بار بار چلّاتے تھے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَابنَ رَسُولِ اللہ"۔ اور امام جواب دیتے تھے۔ "وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہٗ"۔ وہ دونوں دشمن پر ٹوٹ پڑے اور بالآخر دونوں شہید ہو گئے۔

حنظلہ بن اسعد کی شہادت

حنظلہ بن اسعد آگے بڑھے اور بآوازِ بلند دشمن سے خطاب کیا۔ "اے قوم! میں ڈرتا ہوں کہ عاد و ثمود کی طرح تمہیں بھی روزِ بد نہ دیکھنا پڑے۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم برباد نہ ہو جاؤ۔ اے قومِ جفاکار! حسینؑ کو قتل نہ کرو ایسا نہ ہو کہ خدا تم پر عذاب نازل کر دے۔" لیکن قومِ جفاپیشہ نے "دعوت اِلی الحق" کے جواب میں تیر پھینکے۔ حنظلہ اہلبیتِ رسولؐ پر درود و سلام بھیجتے ہوئے میدانِ جنگ میں پہنچے اور شدید قتال کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

غرضیکہ یکے بعد دیگرے تمام یار و انصار شہید ہو گئے اور بنی ہاشم و خاندانِ نبوت

کی باری آئی۔ حقیقت میں یہ اصحابِ حسینؑ کی وفاداری و ایثار نفسی کا ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا کہ جب تک ان میں سے ایک شخص بھی باقی رہا، بنی ہاشم کو کوئی گزند نہ پہنچ سکا۔ اس وفاشعاری و جاں فروشی کی مثال اصحاب انبیائے کرامؑ میں بھی ملنا محال ہے۔ اس کے بعد بنی ہاشم و خاندانِ نبوت کے اٹھارہ افراد نے یکے بعد دیگرے دادِ شجاعت دے کر جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان کی مجاہدانہ سرفروشی و شوقِ شہادت کا مفصل تذکرہ گذشتہ باب میں کیا جاچکا ہے لہٰذا تکرارِ بیان کو قلم انداز کرتے ہوئے اصحابِ انبیائے کرامؑ کی فداکاری کا اصحابِ حسینؑ کی جانثاری و وفاشعاری سے موازنہ کرتے ہیں۔

اصحابِ موسیٰؑ سے اصحابِ حسینؑ کا موازنہ

اصحابِ حسینؑ کی محیّرالعقول سرفروشی و حیرت انگیز فداکاری کی تفصیلات گذشتہ ابواب میں بیان کی جا چکی ہیں۔ اب توریت مقدس و قرآن حکیم کی روشنی میں اصحابِ موسیٰؑ کے ایثار و ثابت قدمی کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ فریقین کی قوتِ ایمان، جوشِ جہاد اور صبر و استقلال کا موازنہ ہو سکے۔

توریت (کتاب گنتی۔ باب ۱۳) میں مذکور ہے کہ جب بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس میں داخل ہونے کے لئے حضرت موسیٰؑ کی معرفت خدائی حکم پہنچا تو بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں میں سے بارہ سردار انتخاب کر کے اس غایت و غرض کے تحت سرزمینِ کنعان میں بھیجے گئے کہ وہ وہاں کے بسنے والوں کی طرز رہائش، بود و باش، قوت و شوکت اور وہاں کی زمین کی پیداوار و دیگر حالات کا جائزہ لے کر واپس آئیں تاکہ مناسب اقدامات کے ذریعہ بنی اسرائیل اس سرزمین میں فاتحانہ طور پر داخل ہو کر اس پر قابض ہو سکیں۔ کیونکہ خداوند بنی اسرائیل کے خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے عہد کر رکھا تھا کہ میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا وہ قطعہ زمین جس

میں تو آج پردیسی ہے ہمیشہ کے لئے بطور ورثہ کے دوں گا اور میں ان کا خدا رہوں گا۔ (پیدائش ۱۷: ۸)

چالیس دن کی جاسوسی (تفتیشِ حالات) کے بعد وہ نمائندہ جماعت واپس آئی اور اپنے ساتھ انگور کے گچھے کی ایک ڈالی اور کچھ انار و انجیر لاکر عوام کی موجودگی میں موسیٰؑ کے حضور پیش کی اور کہا کہ واقعی اس سرزمین میں دودھ و شہد کی نہریں بہتی ہیں اور یہ اس کا میوہ ہے وہاں کے لوگ بہت زور آور و طاقتور ہیں سنگین مضبوط قلعوں میں بستے ہیں۔ ان کو مفتوح بنانا اور اس سرزمین پر قابض ہونا ہمارے بس کا روگ نہیں **کالب بن یوفنہ** نے قوم کے اندر بڑھتے ہوئے اضطراب و انتشار کو ختم کرنے کے لئے کہا کہ ہم میں یقیناً ان پر غلبہ پانے کی طاقت موجود ہے۔ توریت کے الفاظ میں اس کے ساتھیوں کی تردید ملاحظہ فرمایئے:۔

"لیکن جو اور آدمی اس کے ساتھ گئے تھے وہ کہنے لگے کہ ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔ ان آدمیوں نے بنی اسرائیل کو اس ملک کی جسے وہ دیکھنے گئے تھے بُری خبر دی اور یہ کہا کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے ایک ایسا ملک ہے جو اپنے باشندوں کو کھا جاتا ہے اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قدآور ہیں اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔" (گنتی ۱۳: ۳۲-۳۳)

"تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ اس رات روتے رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی: ہائے کاش ہم مصر ہی میں مرجاتے! یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے!

خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لئے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر واپس چلے جائیں۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ تب موسیٰؑ اور ہارونؑ بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے سامنے اوندھے منہ ہو گئے۔ نون کا بیٹا **یشوع** اور یفنہ کا بیٹا **کالب** جو اس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس سے گزرے نہایت اچھا ملک ہے اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک ہے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے ہم کو دے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو ہماری خوراک ہیں ان کی پناہ (   ) ان کے سر پر سے جاتی رہی اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سو ان کا خوف نہ کرو۔ تب ساری جماعت بول اٹھی کہ ان کو سنگسار کرو۔" (گنتی ۱۴: ۱-۱۰)

اصحاب موسیٰؑ نے حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی منت و سماجت کی چنداں پرواہ نہ کی۔ یوشع بن نون اور کالب بن یوفنہ کی پند و نصائح کا مطلقاً ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عہدِ خداوندی پر ان کو کوئی یقین نہ آیا۔ لہٰذا چالیس سال اس نافرمانی کی سزا میں سرگرداں رہے اور اس عہد شکنی کی پاداش میں دشت و بیابان میں تباہ و برباد ہوئے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ گنتی باب ۱۳-۱۵)

قرآنِ حکیم نے اسی واقعہ کو سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں مفصل بیان کیا ہے اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا۔ اے میری قوم! تم اس ارضِ مقدس

میں داخل ہو جاؤ جس کو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور پیچھے کی طرف نہ پلٹو ورنہ خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے"۔ انہوں نے کہا "اے موسیٰؑ! اس میں تو ایک قوم بڑے زبردست لوگوں کی ہے اور جب تک وہ اس میں سے نہ نکل جائیں ہم تو اس میں ہرگز نہ جائیں گے اگر وہ اس میں سے نکل جائیں تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ ان لوگوں میں سے جو اللہ سے ڈرتے تھے دو شخصوں (یوشع بن نون اور کالب بن یوفنہ) نے جن کو خداوند نے نعمت عطا فرمائی تھی یہ کہا کہ ان کے دروازوں میں گھس پڑو۔ اگر تم اس میں گھس پڑو گے تو تم ہی غالب آجاؤ گے۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرو" (المائدہ ۴: ۲۱-۲۳)

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (المائدہ: ۲۴)

(ترجمہ) "انہوں نے کہا اے موسیٰؑ! جب تک وہ اس میں موجود ہیں ہم تو ہرگز ہرگز اس میں داخل نہ ہونگے۔ اب تم اور تمہارا پروردگار جاؤ اور دونوں لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں"

تفسیر عیاشی میں حضرت امام باقر العلومؑ سے منقول ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کی تعداد چھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی جس کو ارضِ مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔

بنی اسرائیل کے اس شوخی و گستاخی بھرے جواب پر غور کیجئے کہ "تو جا اور تیرا پروردگار جائے اور تم دونوں ہی لڑو۔ ہم تو یقیناً یہیں بیٹھے (تماشا) دیکھیں گے پس ان حقائق کی موجودگی میں کیا یہ کہنا درست نہیں کہ اصحابِ موسیٰؑ کو اصحابِ حسینؑ سے دور کی نسبت بھی نہیں ہوسکتی؟ چھ لاکھ کی تعدادِ کثیر میں سے صرف دو اشخاص یوشع بن نون اور کالب بن یوفنہ کے سوا کسی فرد نے لفظی تائید بھی نہ کی چہ جائیکہ اصحابِ حسینؑ سے ان کا کوئی مقابلہ یا موازنہ ہو سکے جن کا تیروں کی بے پناہ بارش میں، زخموں سے چور چور ہو کر بھی جو قدم اٹھا آگے ہی کو اٹھا اور پائے ثبات میں ذرا بھر

بھی لغزش نہ آئی۔ امامؑ تو ہر ساتھی کی شہادت پر کہہ اٹھتے تھے "فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا" (احزاب ۲۳) بعض ان میں سے درجۂ شہادت حاصل کر چکے ہیں اور بعض ہنوز منتظر ہیں لیکن ان کے لائحۂ عمل میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا۔ جناب موسیٰؑ کی یہ حالت تھی کہ گڑگڑا کر منت و سماجت کرنا بھی بیکار ثابت ہوا بلکہ قوم ناہنجار پتھر مار کر سنگسار کرنے پر تل گئی۔ بالآخر پیغمبر خدا کو قوم سے مایوس ہو کر مجبوراً کہنا پڑا۔ "قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ" (مائدہ ۲۵) موسیٰؑ نے عرض کیا "اے میرے پروردگار! میں صرف اپنی ذات کا اختیار رکھتا ہوں اور اپنے بھائی کا۔ پس ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔ ارشاد خداوندی ہوا کہ ارض مقدس چالیس برس کے لئے ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ اب وہ اسی زمین میں سرگرداں پھریں گے۔ پس نافرمان لوگوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔

مسیحؑ کے حواریوں سے اصحاب حسینؑ کا موازنہ

جناب عیسیٰؑ کی تبلیغ قوم یہود پر اثرانداز نہ ہو سکی وہ سختی سے انکار مسیحؑ اور کفر و باطل پر ڈٹی رہی۔ صرف بارہ اشخاص کو ایمان لانے کی توفیق مرحمت ہوئی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔ "فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ" (آل عمران ۵۲)

(ترجمہ) پھر جب عیسیٰؑ نے ان (یہود) کی طرف سے انکار محسوس کیا تو بولے اللہ کے کام میں میرے مددگار کون ہیں۔ حواری بولے ہم اللہ کی نصرت کرنے والے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہیئے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

بلاشبہ مسیح ناصری کے بارہ شاگرد (حواری) جناب مسیح پر ایمان اور نصرت کا وعدہ بھی کیا لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ جب آزمائش کی نازک گھڑی پہنچی تو کیا وہ اپنے وعدہ کے مطابق ثابت قدم رہے یا اپنے آقا، پیشوا اور استاد کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر انہوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس سلسلہ میں انجیلِ مقدس کی شہادت ملاحظہ فرمائیے

شاگردوں کی بیوفائی کی پیشینگوئی

"یسوع نے ان سے کہا۔ تم سب ٹھوکر کھاؤ گے....... پطرس نے اس سے کہا۔ گو سب ٹھوکر کھائیں گے لیکن میں نہ کھاؤں گا۔ یسوع نے اس سے کہا۔ میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ تو آج اسی رات مرغ کے دو بار بانگ دینے سے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا لیکن اس نے بہت زور دے کر کہا۔ اگر تیرے ساتھ مجھے مرنا بھی پڑے تو بھی تیرا انکار ہرگز نہ کروں گا۔ اسی طرح اور سب نے بھی کہا۔" (مرقس ۱۴: ۲۸-۳۱) مزید حوالہ جات ملاحظہ فرمائیے:۔

(لوقا ۲۲: ۳۱-۳۴)، (یوحنا ۱۳: ۳۶-۳۸)، (متی ۲۶: ۳۱-۳۵)

آپ کو یاد ہوگا کہ اصحابِ حسین نے جو وعدہ شبِ عاشور کیا تھا کس شان سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اب مسیح ناصری کے شاگرد وعدہ کرتے ہیں۔ دیکھئے کیسے ایفائے عہد ہوتا ہے:

یہوداہ کی غدّاری کی پیشینگوئی

"جب شام ہوئی تو وہ ان بارہ کے ساتھ آیا اور جب وہ بیٹھے کھا رہے تھے تو یسوع نے کہا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک جو میرے ساتھ کھاتا ہے مجھے پکڑوائے گا۔" (مرقس ۱۴: ۱۷-۱۸) (متی ۲۶: ۲۰-۲۲) (لوقا ۲۲: ۲۱-۲۳) (یوحنا ۱۳: ۲۱-۲۶)

مسیحؑ کی پریشانی اور شاگردوں کا خوابِ شیریں

اصحابِ حسینؑ نے شبِ عاشور عبادت اور جہاد کی تیاری میں گزار دی لیکن مسیحی شاگردوں کی حالت یہ ہے کہ صبحدم استاد سولی چڑھے گا اور شاگرد تمام رات میٹھی نیند میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ شہادت ملاحظہ فرمایئے:۔

"(مسیحؑ) پطرس، یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر نہایت حیران و بیقرار ہونے لگا اور ان سے کہا۔ میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تم یہاں ٹھیرو اور **جاگتے رہو**...... پھر وہ آیا۔ انہیں سوتا پاکر پطرس سے کہا۔ اے شمعون! تو **سوتا ہے** کیا تو ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکا۔ جاگو اور دعا مانگو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو...... پھر آکر انہیں سوتا پایا کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں۔" (مرقس ۱۴: ۳۴-۴۱) (لوقا ۲۲: ۴۵-۴۶)

رشوت اور مسیحؑ کی گرفتاری

"اس وقت ان بارہ میں سے ایک نے جس کا نام یہوداہ اسکریوتی تھا، سردار کاہنوں کے پاس جاکر کہا کہ اگر میں اسے تمہارے حوالے کردوں۔ تو مجھے کیا دوگے؛ انہوں نے اسے تیس روپے تول کر دے دیئے اور وہ اس وقت اس کے پکڑوانے کا موقع ڈھونڈنے لگا۔" (متی ۲۶: ۱۴-۱۶) (لوقا ۲۲: ۳-۶)

"فی الفور یہوداہ جو ان بارہ میں سے تھا اور اس کے ساتھ ایک بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سردار کاہنوں، فقیہوں اور بزرگوں کی طرف سے آپہنچی اور اس کے پکڑوانے والے نے انہیں یہ پتہ بتا دیا تھا کہ جس کا میں بوسہ لوں" وہی ہے" اسے پکڑ کر حفاظت سے لے جانا۔ وہ آکر فی الفور اس

کے پاس گیا اور کہا۔ "اے استاد!" اور اس کے بوسے لئے۔ انہوں نے اس پر ہاتھ ڈال کر اسے پکڑ لیا.......... اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔"

(مرقس ۱۴: ۴۳-۵۰) (متی ۲۶: ۴۷-۵۶) (لوقا ۲۲: ۴۷-۵۳) (یوحنا ۱۸: ۲-۱۱)

حواری راہِ فرار اختیار کرتے ہیں

"اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔" (متی ۲۶: ۵۶)

"اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے مگر ایک جوان اپنے ننگے بدن پر مہین چادر اوڑھے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیا۔ اسے لوگوں نے پکڑا مگر وہ چادر چھوڑ کر ننگا بھاگ گیا۔" (مرقس ۱۴: ۵۰-۵۲)

مسیحؑ کی شاگردی سے انکار

"جب پطرس نیچے صحن میں تھا تو سردار کاہن کی لونڈیوں میں سے ایک وہاں آئی۔ پطرس کو آگ تاپتے دیکھ کر اس پر نظر کی اور کہنے لگی۔" تو بھی اس ناصری یسوعؑ کے ساتھ تھا؟" اس نے انکار کیا اور کہا۔" میں تو نہ جانتا ہوں اور نہ سمجھتا ہوں کہ تو کیا کہتی ہے؟" پھر وہ ڈیوڑھی میں گیا اور مرغ نے بانگ دی۔ وہ لونڈی اسے دیکھ کر ان سے جو پاس کھڑے تھے پھر کہنے لگی۔ "یہ ان میں سے ہے؟" مگر اس نے پھر انکار کیا اور تھوڑی دیر بعد انہوں نے جو پاس کھڑے تھے پطرس سے پھر کہا۔" بیشک تو ان میں سے ہے کیونکہ تو گلیلی بھی ہے۔" مگر وہ **لعنت** کرنے لگا اور قسم کھانے لگا کہ میں اس آدمی کو جس کا تم ذکر کر رہے ہو نہیں جانتا۔ اور فی الفور مرغ نے

دوسری بار بانگ دی۔ پطرس کو وہ بات جو یسوع ؑ نے اسے کہی تھی یاد آئی کہ مرغ کے دو بار بانگ دینے سے پہلے تو تین بار میرا انکار کرے گا اور اس پر غور کر کے وہ رو پڑا۔"

(مرقس ۱۴: ۶۶-۷۲) (متی ۲۶: ۶۹-۷۵) (لوقا ۲۲: ۵۵-۶۲) (یوحنا ۱۸: ۱۵-۲۷)

انجیلِ مقدس کے اقتباسات سے مسیحی شاگردوں کی حالت کا پتہ چلتا ہے کہ تمام نے نصرت کا وعدہ تو کیا لیکن جب ابتلا کی نازک گھڑی قریب آئی تو یہوداہ اسکریوتی نے غداری کی اور تیس روپے رشوت لے کر استاد کو فریب سے گرفتار کرا دیا اور باقی تمام شاگردوں نے راہِ فرار اختیار کی حتیٰ کہ شاگردوں میں سے ایک جو چادر اوڑھے چند قدم مسیح ؑ کے پیچھے پیچھے گیا لوگوں کے استفسار پر اس قدر خوفزدہ ہوا کہ چادر پھینک کر ننگ دھڑنگ بھاگ گیا۔ پطرس حواری نے مرغ کی دوسری اذان سے پہلے تین بار مسیح ؑ کا انکار کیا اور اپنے انکار کی تائید میں جھوٹی قسمیں بھی کھائیں حتیٰ کہ حضرت مسیح ؑ پر (العیاذ باللہ) لعنت بھی کی۔ اس کیریکٹر اور اس کردار کے شاگردوں پر مسیحی فخر کرتے ہیں اور رسولوں کے اعمال نامہ کو انجیل کے ساتھ بغل میں دابے پھرتے ہیں۔ مگر واہ رے شانِ اصحابِ حسین ؑ۔ جامِ شہادت نوش کرنے کے لئے ہر ایک مجاہد نے دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کی۔ تیروں کی بوچھاڑ کو سینے پر لیا۔ نصرتِ امام ؑ میں جو قدم آگے بڑھا پیچھے نہ ہٹا۔ قربانی و ایثار کی مثال قائم کی اور شہادت کا عظیم ترین درجہ حاصل کیا۔

صحابہ کرام رض سے اصحابِ حسین ؑ کا موازنہ

نہ صرف اصحابِ موسیٰ ؑ نے شرکتِ جہاد سے انکار کیا اور نہ ہی صرف حضرت مسیح ؑ کے حواری اپنے نامور آقا کو مصائب میں الجھا ہوا چھوڑ کر بھاگ گئے بلکہ

خود جناب رسالتمآبؐ کے بعض صحابہ نے آنحضرتؐ کو لڑائی کے دوران عین معرضِ خطرات میں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی۔ نہ صرف یہ کہ جناب رسولخداؐ خطرات میں محصور رہے بلکہ آپ کو شدید زخم بھی پہنچے۔ در دندان شہید ہوئے اور چہرۂ اقدس خون سے رنگین ہوا۔

جنگِ احد میں اکثریت کا فرار

جنگِ احد مسلمانوں کی آزمائش کا ایک نہایت ہی نازک مرحلہ تھا۔ صحابہ کی اکثریت جناب رسالتمآبؐ کو کفّار کے نرغہ میں محصور چھوڑ کر بھاگ گئی۔ بعض حضرات نے تو جائے پناہ کی تلاش میں پہاڑ کی طرف رخ کیا اور بعض موضع اعوص کی جانب روانہ ہوئے۔ (تاریخ الامم والملوک۔ الجزالثالث ص ۲۱)

کچھ بھاگنے والے اس بدحواسی سے بھاگے کہ رسولِ خداؐ پیچھے سے ان کو بآوازِ بلند پلٹ آنے کے لئے پکارتے رہے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ پلٹا مفسّرین نے جناب رسالتمآبؐ کی پکار کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

اِلیَّ عِبَادَاللہ۔ اِلیَّ عباداللہ اِرجعوا اَنَا رسول اللہ الیٰ این تفرون عن اللہ و عن رسولہ۔

(ترجمہ) بندگانِ خدا میری طرف آؤ۔ میری طرف پلٹ کر آؤ۔ میں خدا کا رسول ہوں۔ تم اللہ اور اس کے رسول سے بھاگ کر کہاں جاتے ہو؟

اسی جنگ میں مسلمانوں پر ایک وہ نازک دور بھی آیا کہ آنحضرتؐ کے ساتھ صرف چودہ اصحابؓ رہ گئے تھے۔ (تاریخ کامل اور تاریخ ابن الوردی)

قرآنِ حکیم نے سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں کی اس کمزوری کی واضح تصویر کھینچی ہے اور فرار کی وجہ بھی بیان کردی ہے۔ ہم گذشتہ باب میں جنگِ احد کے متعلق چند ضروری امور درج کر چکے ہیں۔ ورق الٹ کر ملاحظہ فرمالیں۔

جنگِ احزاب

اسلام کی روز افزوں ترقی دیکھ کر مشرکین مکہ اور یہود مدینہ کے دلوں میں آتش حسد و غضب بھڑکنے لگی اور انہوں نے عرب قبائل کے ساتھ سازش کرکے اسلام کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا چاہی۔ چنانچہ اسلام کے مسلمہ دشمن ابوسفیان اموی کی قیادت میں دس ہزار کا عظیم الشان لشکر مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ اسلام کے استیصال کے لئے قریش و قبائل عرب کی یہ آخری منظم کوشش تھی۔ اس خبر کو سن کر کمزور ایمان والوں کے ہوش اڑ گئے اور کچھ بالکل مبہوت ہو گئے اور بعض کے اعضاء از کار رفتہ ہو کر رہ گئے۔ مسلمانوں کی اس کمزوری کا نقشہ قرآن حکیم میں اس طرح کھینچا گیا ہے:-

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ (الاحزاب ۱۰-۱۳)

(ترجمہ) (یاد کرو) جس وقت دشمن تم پر تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اترے اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور (مارے خوف کے تمہاری) آنکھیں پھری (کی پھری) رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے اور خدا کی نسبت تم (لوگ طرح طرح کے) گمان کرنے لگے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں (کے استقلال و ایمان) کی آزمائش کی گئی تھی اور خوب ہی جھڑ جھڑائے گئے اور جب کہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں

(شک کے) روگ تھے بے اختیار بول اٹھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے جو ہم سے وعدہ کیا تھا بس نرا دھوکہ (ہی دھوکہ) تھا اور جب ان میں سے ایک گروہ کہنے لگا کہ مدینہ کے لوگو! تم سے (اس جگہ دشمن کے مقابلہ میں) نہیں ٹھیرا جائیگا تو (بہتر ہے کہ) لوٹ چلو اور ان میں سے کچھ لوگ پیغمبر سے گھر لوٹ جانے کی اجازت مانگنے لگے (اور) کہنے لگے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں (بلکہ) ان کا ارادہ صرف **بھاگنے** ہی کا ہے۔" (ترجمہ مولوی نذیر احمد)

اسی جنگ کے دوران عرب کے مشہور جنگجو پہلوان عمرو بن عبدود نے جس کی جرأت و دلیری کی دھاک تمام عرب میں بیٹھی ہوئی تھی، جوشِ شجاعت میں گھوڑے کو ایک ایڑ لگائی اور خندق کے اس پار آن کر مبارز طلبی کرنے لگا۔ اس کو دیکھ کر بعض مسلمان گھبرا گئے اور مبہوت کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اس نے مسلمانوں کی خاموشی کو کمزوری پر محمول کر کے بار بار مبارز طلبی کی لیکن مسلمانوں پر خاموشی طاری تھی۔ محدث شیرازی رقم طراز ہیں۔ "یارانِ رسولؐ ہمہ ایستادہ بودند، ہیچ سخن گفتند کَاَنَّمَا عَلٰی رُؤُسِھِم الطَّیر" حضرت علیؑ نے اس خاموشی اور خوف و ہراس کا مطالعہ و معائنہ فرما کر عمرو بن عبدود کے مقابلہ کے لئے اپنی ذاتِ گرامی کو پیش کر کے تین بار آنحضرتؐ سے اجازت طلب کی لیکن ہر بار جناب رسولخداؐ نے یہ کہہ کر "اے علیؑ! کیا تم نہیں جانتے یہ عمرو بن عبدود ہے۔؟" اجازت مرحمت نہ فرمائی۔ اس تاخیرِ اجازت میں **خاص مصلحت** مضمر تھی۔ جناب رسالتمآبؐ کو یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ بعدِ رسولؐ دینی نیابت و ابراہیمی امامت کا کون مستحق ہے۔ وہ جو خطرات کے تلاطم خیز طوفانوں سے ٹکرا جائے یا وہ جو ہنگامۂ کارزار میں گوشۂ عافیت کا متلاشی ہو۔ میراثِ پدر خواہی علمِ پدر بیاموز۔ بالآخر آنحضرتؐ نے آسمان کیطرف دستِ دعا بلند کر کے التجا کی۔

"الٰہی عبیدہ را در روزِ بدر از من گرفتی، و حمزہ را در روزِ احد از من جدا ساختی و ایں علیؑ است برادرِ من و پسرِ عمِ من فَلَا تَذَرْنِی فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ۔"
(ترجمہ) اے خدا تو نے عبیدہؓ کو روزِ بدر اور حمزہؓ کو روزِ احد مجھ سے لے لیا اب یہ علیؑ ابن ابیطالب باقی ہے۔ پس تو مجھے بغیر وارث کے نہ چھوڑ۔ تو ہی بہترین وارث ہے۔

پیغمبرؐ کی دستارِ فضیلت زیبِ سر، زرۂ مقدس زیبِ تن کر کے اور تیغِ جوہر دار ہاتھ میں لے کر، مجاہدِ اسلام حضرت علیؑ، کفرِ مجسم عمرو بن عبدود کے مقابلہ کے لئے اس طرح نکلے کہ سرورِ دو عالم مختارِ کائنات ؐ بے اختیار پکار کے اٹھے۔ "بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّہٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّہٖ۔" یعنی ایمان مجسم کفرِ مجسم کی طرف بڑھا۔
(ینابیع المودۃ شیخ سلیمان قندوزی مفتی اعظم قسطنطنیہ۔ الباب الثالث والعشرون ص ۹۴ ۹۵۔ حیاۃ الحیوان الکبریٰ شیخ کمال الدین الدمیری الجزء الاول۔ ص ۲۷۴۔ ارجح المطالب عبید اللہ امرتسری۔ باب سوئم۔ ص ۲۴۷)

حضرت علیؑ نے عرب کے شہسوار و نامور پہلوان عمرو بن عبدود کو قتل کر کے کفرِ مجسم کا سر قلم کر کے پیغمبرؐ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا اور حاملِ بارِ نبوت، باعثِ تخلیقِ کائنات، مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی کے مصداق، حضرت رسالتِ مآبؐ سے ایک عظیم الشان تمغہ "المبارزۃ علی بعمرو بن عبدود یوم الخندق افضل من اعمال امتی اِلٰی یَوْمَ الْقِیَامَۃِ" حاصل کیا کیونکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ امتِ محمدیہ قیامت تک جو اعمال لائے گی ان کی ہست و بود کا موجب یہی قتالِ علی ابن ابیطالبؑ تھا۔ علیؑ کا وجود ذی جود ہی تھا جس کے طفیل خدا و رسولؐ کا وعدہ سچا ہوا۔ جس کو کمزور ایمان مسلمان تو فریب اور نرے دھوکے سے تعبیر کر رہا تھا۔ لیکن صادق الایمان مومن یوں کہہ رہا تھا۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ

رَسُولُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ (الاحزاب : ۲۲)

جس وقت مومنین نے کافروں کے گروہوں کو دیکھا تو یہ کہا کہ یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اسکے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ فرمایا تھا اور اس (موقع پیش آنے) سے لوگوں کے ایمان اور شیوۂ فرمانبرداری میں اضافہ ہو گیا۔

جنگ خیبر

یہود کی بدکرداری کی سزا دینے کے لئے پیغمبر خداؐ نے خیبر پر فوج کشی کی۔ قلعہ قاموص جو یہودی سردار مرحب کا تخت گاہ تھا استحکام و حفاظت کے اعتبار سے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے متعدد صحابۂ کرامؓ یکے بعد دیگرے مامور ہوئے لیکن ناکام ہو کر میدانِ جنگ سے واپس پلٹے۔ اس ہزیمت و ناکامی کے واقعات سن کر آنحضرتؐ کو طیش آگیا۔ فرمایا :" اما واللہ لاعطین الرایۃ غداً رجلاً یحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہٗ کراراً غیر فرار یاخذھا عنوۃ۔"

(تاریخ الامم والملوک۔ طبری الجزء الثالث ص ۹۴۔ صحیح مسلم کتاب ۳۲ الجہاد حدیث ۱۳۲ صحیح بخاری کتاب الجہاد ۵۶ باب ۱۰۲، ۱۲۱، ۱۴۳)

(ترجمہ) قسم بخدا کل میں یہ عَلَم ایک ایسے شخص کو دوں گا جو خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہو اور خدا اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہیں۔ وہ بہت جری، میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے والا ہے اور بھگوڑا نہیں وہ اس قلعہ کو سختی سے فتح کرے گا۔

اگلے روز عَلَم حضرت علیؑ کو عطا ہوا۔ آپ نے مرحب و عنتر کو قتل کر کے مسلمانوں کی مشکلکشائی کی۔ دورانِ جنگ سپر ہاتھوں سے گر پڑی تو خیبر کا درِ آہنی اکھاڑ کر اس کو سپر بنالیا اور نبرد آزمائی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ قلعہ فتح ہو گیا۔ اسی واقعہ کو مشہور متعصب انگریز مؤرخ سر ولیم میور اس طرح بیان کرتا ہے :۔

A severe engagement ensued in which ALI as usual distinguished himself by signal bravery Having lost his shield, he seized the lintel of door, which SAMSON like he weilded in its stead (Mohamet & Islam page 168)

(ترجمہ) جنگ پوری ہولناکی سے شروع ہوئی جس میں حضرت علیؑ نے حسبِ معمول اپنی عدیم المثال شجاعت سے امتیاز حاصل کیا۔ سپر گر پڑنے پر درِ آہنی اکھاڑ لیا اور سمسن کی (حضرت شمعونؑ) طرح اس کو سپر کی بجائے استعمال کیا۔

جنگِ حُنین

فتح مکّہ کے بعد قبیلۂ ہوازن کے لوگ اپنے سردار مالک بن عوف کی سرکردگی میں پیغمبرِ اسلامؐ کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے جمع ہوئے۔ جناب رسالتمآبؐ بارہ ہزار افراد کا لشکرِ کثیر لے کر ان کے مقابلہ کے لئے جا پہنچے۔ جب دونوں فوجیں باہم ملاقی ہوئیں تو مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پیغمبرِ اسلامؐ کو نرغۂ کفّار میں محصور چھوڑ کر اس طرح بدحواس ہو کر بھاگے کہ کوئی کسی طرف ملتفت نہیں ہوتا تھا۔ جناب رسولِ خداؐ لوگوں کو اپنی طرف بلاتے رہے لیکن کہیں بھی صدائے لبّیک بلند نہ ہوئی۔ آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ سے کہا کہ تم بھی بلند آواز سے لوگوں کو واپسی کے لئے بلاتے رہو لیکن ان کی پکار بھی بے سود ثابت ہوئی۔ خود قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کے اس فرار کو بھی نظرانداز نہ کیا چنانچہ زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے:-

وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۝ (التوبہ:۲۵)

مسلمانوں کا حنین نے دن بھاگنا اُحد کے دن سے بھی تعجب خیز ہے۔ جنگِ احد میں مسلمانوں کی ایک غیر مسلح محدود تعداد کو ایک منظّم و مسلح فوجِ کثیر کا مقابلہ درپیش تھا لیکن

جنگِ حنین میں معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ مسلمان تعداد کثیر میں تھے اور کفار قلیل، لیکن پھر بھی مسلمان اس بدحواسی سے بھاگے کہ رسولؐ کے سامنے سے لوگ گروہ در گروہ بھاگے جا رہے تھے اور آنحضرتؐ کی پکار بے اثر ثابت ہو رہی تھی۔ انگریز مورخ ولیم میور لکھتا ہے :-

Panic seized the whole force; they all turned and fled Whither away? "Return!" cried Mohamet, as troop after troop hurried past him. But the rush and crush went on, the multitude of camels jostled widely one against the other and the Prophet's voice was lost amid the din".

(Mohamet and Islam page 189)

(ترجمہ) تمام فوج پر ہراس چھا گیا اور سب پیٹھ دکھا کر بھاگے۔ جونہی مسلمان گروہ در گروہ رسولخداؐ کے سامنے سے بھاگے جا رہے تھے حضرت محمدؐ نے باآواز بلند پکارا ۔ "کہاں جاتے ہو؟ پلٹو، واپس آؤ!" لیکن بھاگ دوڑ جاری رہی اور اونٹوں کی تعدادِ کثیر باہم ٹکراتی رہی۔ پیغمبرؐ کی آواز اس شور و شغب میں کھو گئی۔"

نفیسہ بنت کعب مازنیہ بھاگنے والوں کے منہ پر خاک پھینکتی جاتی تھی اور یہ کہتی جاتی تھی کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ سے بھاگ کر کہاں جاتے ہو؟ علی متقی لکھتے ہیں: کہ جناب رسالتمآب کے ساتھ ثابت قدم رہنے والے حضرت علیؑ کے علاوہ چھ افراد تھے

(کنز العمال۔ الجزء الخامس۔ ص ۳۰۴)

برہان الدین حلبی اور حسین دیار بکری نے سات کی تعداد میں بھی تخفیف کی ہے ۔

(سیرۃ الحلبیہ۔ الجزء الثالث ص ۱۲۵ ۔ تاریخ الخمیس الجزء الثانی ص ۱۱۳)

غزوۂ تبوک

غزوۂ تبوک کے موقع پر بھی اکثریت نے کمزوری و پست ہمتی کا مظاہرہ کیا جس کو قرآن حکیم نے سورہ التوبہ (آیت ۳۸ - ۳۹) میں بیان کیا ہے۔

جنگ اُحد، احزاب، خیبر، حنین اور تبوک کے مذکورہ بالا واقعات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی مشکل مرحلہ میں یا تو رسولِ خداؐ کو نرغۂ کفار میں تنہا چھوڑتی رہی یا شروع ہی سے پست ہمتی کی بناء پر نُصرت سے باز رہی۔ امر واقعہ تو یہی ہے کہ اولوالعزم انبیاءؑ کے صحابہ دشواریوں کے قدم ماسوائے معدودے چند کے مصائب و آلام کی نازک گھڑی کے موقع پر ڈگمگا گئے۔ یہ خصوصیت محض اصحابِ حسینؑ کو حاصل تھی کہ تیروں کی بے پناہ بارش میں بھی پائے استقامت کو ذرا بھر لغزش نہ آئی اور ہر ایک نے فرزندِ رسولؐ پر اپنی جان قربان کرکے حقِ خدمت کا فریضہ کما حقہٗ سرانجام دیا جس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

جماعتِ حسینی کی نوعیت و حیثیت

اصحابِ حسینؑ کی زندگیاں ایک معیاری حیثیت رکھتی تھیں اور وہ اسلامی اخلاق و اوصاف کی ایک زندہ تصویر تھے۔ یہ تمام حضرات غیر معروف ہستیاں نہ تھیں بلکہ ان میں سے آٹھ تو خود جنابِ رسالتمآبؐ کے صحابی تھے جن کی عمریں کسی طرح پچاس ساٹھ سال سے کم قرار نہیں دی جا سکتیں اور بعض کی عمریں یقیناً اس سے بھی زیادہ تھیں۔ حبیب ابن مظاہر، مسلم بن عوسجہ اور انس بن حارث وغیرہ بزرگوں سے واقعۂ کربلا کے بوڑھے مجاہدین کی فہرست مرتب ہوتی ہے جن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو محض ہنگامی جوش اور وقتی ولولہ کے تحت میدانِ کارزار میں آ گیا ہو بلکہ ایسے سن رسیدہ و پاک نفس حضرات کی شمولیت بذاتِ خود شہادتِ حسینؑ کے عظیم مقصد کی حقانیت پر ایک بیّن دلیل ہے۔

ان میں سے اکیس۲۱ حضرات ایسے تھے جو جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں شرکت کر چکے تھے اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو حضرت علیؑ کے زمانۂ خلافتِ ظاہری میں مختلف سرکاری عہدوں پر سرفراز رہ چکے تھے۔ بعض تو آپ کے شاگرد تھے اور آپ سے علمی استفادہ کئے ہوئے تھے۔ ان میں چھ افراد مشہور حفاظ قرآن و علمائے متبحر تھے اور بالخصوص بریر بن خضیرؓ ہمدانی **سید القراء** کے لقب سے ملقب تھے اور مسجد کوفہ میں قرآنِ حکیم کا درس دیا کرتے تھے۔ ان میں نو (۹) شہرۂ آفاق علماء و راویانِ حدیث تھے اور دس شجاعانِ روزگار تھے جن کے حیرت انگیز کارنامے زبان زدِ خاص و عام تھے۔ زہد و عبادت اور تقویٰ و ریاضت میں ہر ایک یگانۂ روزگار تھا۔ عابس بن ابی شبیب اور زیاد بن عریب مشہور عابدِ شب زندہ دار تھے۔

امام حسینؑ کے عظیم مقصد کی نوعیت بالکل انوکھی تھی۔ یہاں فریقِ مخالف کو مادی شکست دے کر اس کے تاج و تخت پر قابض ہونا مقصود نہ تھا بلکہ یہاں تو طاقت کا مقابلہ کردار سے، باطل کا مقابلہ حق سے، استبداد و تشدّد کا مقابلہ ثباتِ قدم اور استقلال سے تھا۔ یہاں اپنی حقانیت و ثابت قدمی سے ظلم اور تشدد کی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا مطلوب تھا۔ آزادی و حریّت کی روح کو جو پنجۂ استبداد میں تڑپ رہی تھی نجات دلا کر اہلِ دنیا کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کرنا تھا جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکے اور دنیا پر بےحسی و جمود کی چھائی ہوئی گھٹائیں یکسر نیست و نابود ہو جائیں۔ یہ مرحلہ بڑا نازک تھا جس کو سرانجام دینے کے لئے ساتھیوں کا انتخاب ایک اہم مسئلہ تھا تاکہ کسی نازک موقع پر کسی ساتھی کی معمولی سی کمزوری سے بھی مقصدِ عظیم ناکام و ناتمام ہو کر نہ رہ جائے اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا مقصود ہوتا تو حسینؑ یقیناً نوجوانوں اور پہلوانوں کی جماعت فراہم کرتے۔ آپ کو ایسے بوڑھوں کی ضرورت نہ تھی جن کی بھویں لٹک کر آنکھوں پر آگئی تھیں اور جن کی عمریں محرابِ عبادت ہی میں گزری تھیں لیکن چونکہ حسینؑ کا مقصد ایک

جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے آپ نے ایسے عابد و زاہد اور متقی و پارسا افراد کو دعوت دی کہ جن کی جہاد میں شمولیت خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دے کہ اسلام پر کیا وقت آپڑا ہے کہ مسلم ابن عوسجہؓ ایسے عابد، تہجد گزار اور ضعیف العمر سردارِ قوم، انس بن حارثؓ ایسے متقی صحابی رسولؐ، حبیب ابن مظاہرؓ ایسے شہرہ آفاق اور بوڑھے مبلغ اسلام اور بریر بن خضیرؓ ہمدانی ایسے سن رسیدہ تابعی و سید القراء اپنی خمیدہ کمریں کس کر، تلواریں کھینچکر میدانِ وغا میں اتر پڑے ہیں۔

حضرت حسینؑ کے اس بے مثال انتخاب کا اثر یہ ہوا کہ غیر جانبدار مسلمانوں کا تو کیا کہنا، خود فوجِ مخالف کے اکثر افراد متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر شبث بن ربعی ایسے لوگ جو ہوا و ہوس کے پنجہ میں اسیر اور اطاعتِ حکومت کے شکنجہ میں گرفتار تھے۔ مسلم بن عوسجہؓ کی شہادت پر فوجِ یزید سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "کیا غضب ہے کہ مسلم بن عوسجہؓ ایسا آدمی قتل ہو اور تم لوگ خوشیاں مناؤ۔ میں نے خود خدمتِ اسلام میں ان کے کارنامے دیکھے ہیں"۔ اسی طرح بریر بن خضیرؓ ہمدانی پر جب ایک شقی پشتِ گردن سے وار کرتا ہے تو اپنے ہی سپاہی چیخ اٹھتے ہیں کہ "ان پر وار نہ کرو۔ ارے یہ تو بریرؓ حافظِ قرآن ہیں جو مسجدِ کوفہ میں قرآن حفظ یاد کرایا کرتے تھے"۔ عابسؓ بن ابی شبیب میدانِ جنگ میں آئے تو فوجِ مخالف میں آواز بلند ہوئی کہ "شیروں کے شیر۔ عابس بن ابی شبیب ہیں"۔

واقعہ ہائلہ کربلا میں ان اصحاب کی شرکت اس اعتبار سے بھی ضروری تھی کہ اگر حضرت امام حسینؑ صرف اپنے خاندان کے لوگوں کو لے کر کربلا کی سرزمین پر اپنی عظیم الشان قربانی کا مظاہرہ کرتے تو یہ کہا اور سمجھا جاتا کہ یہ محض ایک خاندانی و گھریلو جنگ تھی جو ایک ہی خاندان کی دو شاخوں (بنی امیہ اور بنی ہاشم) کے مابین وقوع پذیر ہوئی اور یہ اسی دیرینہ مخالفت و عداوت کا ایک شگوفہ تھا جو کربلا میں پھوٹا۔ اس طرح وہ حیرت انگیز قربانی

جس مقصدِ عظیم کے پیشِ نظر دی جا رہی تھی بے کار جاتی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ آپ کے گھرانے کے گرامی قدر لوگوں کے علاوہ تقریباً عرب کے تمام قبیلوں اور مختلف مقامات کے ممتاز افراد اس میں حصہ لیتے تاکہ اختلافِ قبائل و تنوعِ مقامات سکونت سے اندازہ ہو سکتا کہ یہ تمام افراد سے جن میں احساسِ اصول کی ہم آہنگی اور جرأتِ اظہار کا اشتراکِ عمل تھا لہٰذا اسی اصول کے پیشِ نظر حجاز و عراق کے تمام ممتاز اسلامی قبائل کو اس قربانی میں پوری پوری نمائندگی حاصل تھی۔ امامؑ نے اس اصول اور مقصد کے ہر پہلو کو شبِ عاشور کے حیرت انگیز خطبہ سے اور بھی نمایاں کر دیا۔ جب آپ نے اصرار کیا کہ تم تمام میرا ساتھ چھوڑ دو اور مجھے اس راستے پر اکیلا جانے دو اور پھر فیاض و نباض فطرتِ امامؑ نے انسانی کمزوریوں کا احساس کرتے ہوئے خیموں کے تمام چراغ گل کرا دئے تاکہ ساتھ چھوڑنے والوں کو شرم و حجاب مانع نہ ہو اور ندامت کی الجھن سے بری ہو کر رات کی تاریکیوں میں روپوش ہو جائیں۔

بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام مختار بالرائے نہیں ہوتے یعنی فی نفسہٖ وہ اپنی کوئی ذاتی رائے قائم نہیں کر سکتے بلکہ لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام احباب کو اندھیرے میں رکھ کر حضرت امامؑ بھی ان سے کوئی اقدام کراتے تو وہ صرف جنابِ حسینؑ کا اقدام ہوتا اور کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ دوسروں نے صرف آپ کے اثر و دباؤ سے اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیا۔ امامؑ یہ چاہتے تھے کہ ہر شخص اپنے دماغ سے کام لے کر اپنے نیک و بد کا خود فیصلہ کرے تاکہ اس کے فعل کی ذمہ داری اسی پر عائد ہو۔ امام عالیمقامؑ کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اس لئے وہاں یہ نہ تھا کہ ایک مقرر یا لیڈر اپنی پر اثر و پر فسوں تقریر سے مسحور کر کے ان کو قربانگاہ کی بھینٹ چڑھا رہا تھا بلکہ وہ خود اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر حسینی مقصد پر قربان ہو رہے تھے۔ اس لئے وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کون قیادت کر رہا ہے اور کون تقلید

بلکہ ہر ایک اٹھنے والا قدم **ضمیر کی تحریک** سے اٹھ رہا تھا۔ اس لئے اس میں تزلزل و لغزش کا شائبہ نہ تھا اور اسی میں اصحابِ حسینؑ کے غیر متزلزل ثباتِ قدم، عدیم المثال فداکاری اور حیرت انگیز جاں نثاری کا راز مضمر تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انتہائی مصیبت کے وقت بھی، اصحابِ امامؑ میں سے ایک شخص بھی، بوڑھے سے لے کر بچے تک، اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک، آقا سے لے کر غلام تک ایسا نہ نکلا جو امام مظلومؑ کو نرغۂ اشقیاء میں محصور چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرتا۔ بلکہ تاریخ عالم کا یہ حیرت انگیز واقعہ تیرہ صدیوں سے لاجواب چلا آتا ہے اور شاید ابدالآباد تک لاجواب چلا جائے۔ کہ جب تک یار و انصار میں سے ایک شخص بھی سلامت تھا خاندانِ نبوت کے کسی فرد کو کوئی گزند نہ پہنچا۔

اصحابِ حسینؑ فی الحقیقت اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کی حقیقی و عملی تفسیر تھے۔ اور یہی لوگ آیۂ کریمہ کے جو باب زیرِ بحث کا عنوان ہے حقیقی وارث ہیں۔ جن کے حق میں زبانِ بے زبانی سے ارشاد ہوتا ہے کہ " بیشک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے۔ ان پر فرشتے یہ پیغام لے کر نازل ہونگے کہ نہ تم آئندہ کے لئے خوف کرو اور نہ گذشتہ کے متعلق افسوس اور جس جنّت کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا اس کی بشارت لو "۔

(حمٓ السجدہ ۳۰)

باب ہشتم

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

جو عمل صالح کرتا ہے وہ اپنے لئے اور جو برائی کرتا ہے وہ اپنے لئے۔ تمہارا پروردگار بندوں پر مطلقاً ظلم روا نہیں رکھتا

(حٰم السجدۃ ۴۶)

شہادتِ مظلومؑ کا ردِّ عمل

ردِّ عمل

To every action there is an equal and opposite reaction.

قوت کے ہر عمل کے لئے برابر اور متضاد ردِّ عمل ہوتا ہے جو "حرکت کا کلیہّ سوم" (Third Law of Motion) کے نام سے موسوم ہے اور جس کی دریافت کا سہرا مشہور سائنیدان **نیوٹن** کے سر پر ہے۔ نیوٹن نے اس نظریہ کی تائید میں یہ مثال پیش کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی انگلی سے پتھر کے ٹکڑے پر دباؤ ڈالتا ہے تو اس کی انگلی بھی پتھر کے جوابی دباؤ سے متاثر ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر پتھر میں مزاحمت موجود ہے۔ پس جو قوت انگلی نے پتھر پر دباؤ ڈالنے میں صرف کی ہے اسے **عمل** (action) کہتے ہیں اور اس کے مساوی و مخالف سمت میں پتھر نے جو جوابی قوت دباؤ میں استعمال کی ہے وہ **ردِّ عمل** (reaction) کہلاتی ہے۔ پس عمل و ردِّ عمل برابر اور مخالف سمت میں ہوتے ہیں۔ وضاحت کے لئے مثالیں ملاحظہ فرمائیے :۔

۱۔ جب ملاح کشتی کو دریا کے کنارے سے دور لے جانا چاہتا ہے تو وہ چپّو کو کنارے پر رکھ کر زور لگاتا ہے۔ چپو پر کنارے کا ردِّ عمل کشتی کو کنارے سے دور ہٹا دیتا ہے۔

۲۔ جب پرندہ اڑتا ہے تو وہ اپنے پروں سے ہوا کو نیچے دباتا ہے اور ہوا کا ردِّ عمل اسے اوپر اٹھاتا ہے۔

۳۔ ایک چلتا ہوا آدمی زمین کو پیچھے کی طرف اپنے پاؤں سے دباتا ہے تو زمین اس کو آگے کی طرف برابر قوت سے دھکیلتی ہے اور زمین کے اس ردِّ عمل کی وجہ سے وہ آدمی آگے کو چلتا ہے۔ اگر وہی شخص ریت پر چل رہا ہو تو وہ اتنا ہی تیز آسانی سے نہیں چل سکتا۔ اس کے پاؤں کا زمین پر عمل کمزور ہوتا ہے اس لئے زمین کا ردِّ عمل بھی کمزور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریت اس کے پاؤں کو زیادہ مزاحمت پیش نہیں کرتی اس لئے

اس پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ کسی چیز کی قوت اس کی مزاحمت کے متناسب ہوتی ہے جس کا اس چیز کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر مزاحمت بالکل نہ ہو تو کوئی قوت عمل میں نہیں آتی۔ جب بندوق کی گولی ہوا میں گزرتی ہے تو ہوا گولی پر تقریباً کوئی قوت نہیں لگاتی اس لئے گولی بھی ہوا پر کوئی قوت صرف نہیں کرتی۔ مگر جب گولی کسی جانور یا دوسری چیز سے ٹکراتی ہے تو وہ اس کے راستے میں مزاحمت پیش کرتی ہے اس لئے گولی بھی اس پر قوت لگاتی ہے۔ (مبادیات طبعیات۔ محبوب شاہ ہاشمی۔ ایم ایس سی۔ ص ۲۷۶-۲۷۷)

سائنس کے اصولِ مذکورسے یہ بات عیاں ہے کہ جس قدر مزاحمت زیادہ ہوگی اسی قدر زیادہ قوتِ عمل استعمال ہوگی۔ جس قدر قوتِ عمل (ACTION) شدید ہوگی اسی اعتبار سے ردِ عمل (RE-ACTION) بھی شدت پذیر ہوگا۔ جب ہم غور کرتے ہیں تو واقعاتِ کربلا کے پس منظر میں ہمیں یہی قانونِ فطرت کارفرما نظر آتا ہے۔ یزید نے اپنی فرعونی بادشاہت کو خلافتِ الٰہیہ کا مصنوعی لباس پہنا کر خاص و عام سے اپنی حکومت کا لوہا منوانے کی کوشش کی اور انتہائی شدت کے ساتھ حضرت حسینؑ سے بیعت کا اصرار کیا اور امامؑ نے بھی اپنے آہنی عزم کی بناء پر اتنی ہی شدید مزاحمت کی جس قدر امامؑ نے اپنے ارادے کی پختگی اور قوتِ ایمان کی مضبوطی سے شدید مزاحمت کا مظاہرہ کیا اسی قدر یزیدی طاقتوں کی آتشِ غضب بھڑکتی گئی اور انہوں نے سفاکی و بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی قوتِ عمل سے کام لیا۔ یہانتک کہ قتلِ حسینؑ کے بعد بھی ان کی آتشِ غضب فرو نہ ہوئی، خیام اہلِ بیتؑ کو نذرِ آتش کیا اور لاشہائے شہدا کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا گیا لیکن یزید نے یہی سختی عبداللہ بن عمرؓ و عبداللہ بن زبیرؓ کے معاملہ میں روا نہ رکھی حالانکہ ابتدا میں ان دونوں نے بھی بیعتِ یزید سے انکار کیا تھا۔ چونکہ عبداللہ بن عمرؓ نے عملاً کوئی مزاحمت نہ کی اور بعد میں فوراً بیعت کرلی لہذا اس پر کوئی تشدد نہ ہوا۔ عبداللہ بن زبیرؓ پر عبدالملک بن مروان کے عہد میں تشدد ضرور

ہوا لیکن وہ اسی نسبت سے جس کے ساتھ انہوں نے اموی خلافت کو خلافتِ حقہ تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان کی مزاحمت کے متناسب ان پر تشدد ضرور ہوا۔ ان کا سر کاٹ کر جگہ جگہ نمائش کی گئی اور ان کی لاش سولی پر کئی روز تک لٹکتی رہی لیکن نہ گھوڑوں کے سموں سے پامال ہوئی اور نہ ہی ان کی اولاد اہلبیتِ رسول ؐ کی طرح نسل در نسل قتل ہوتی رہی۔ امام حسینؑ کو جس قدر شدت کے ساتھ اپنے اصول کی صداقت و حقانیت پر ایمان تھا اور یزید کی بدکاری و بد اعمالی کا یقین تھا اسی شدت کے ساتھ آپ نے بیعتِ یزید کی مزاحمت کی۔ جس قدر شدت کے ساتھ آپ نے اپنے عزمِ صمیم و قوتِ ایمان کے استحکام کا مظاہرہ کیا اسی سختی کے ساتھ یزید کی طاغوتی طاقتوں نے آپکو اور آپ کے بلند مقاصد کو کچلنے کی کوشش کی۔ بالفاظِ دگر جس انتہائی شدت کے ساتھ یزیدی قوتِ عمل کام میں لائی گئی اسی شدت کے ساتھ شہادتِ مظلوم کا **ردِّ عمل** بھی **ناگزیر** تھا۔

سابقہ سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہر مجسم چیز کو ایک خاص **لچک** (ELASTICITY) بخشی گئی ہے جس کے باعث یہ قانونِ قدرت غیر متبدل ہے۔ ایک گیند جس قدر زور کے ساتھ دیوار کے ساتھ ماری جاتی ہے وہ اسی قوت اور رفتار کے ساتھ جو درحقیقت صرف کردہ توانائی کے متناسب ہو واپس آتی ہے بشرطیکہ بیرونی عناصر اس پر اثر انداز ہو کر اس توانائی کو زائل یا کسی دوسری قوت میں تبدیل نہ کر دیں **توانائی** کے رخ میں تغیر یا کسی دوسری قوت میں تبدل کی بناء پر دنیا کی کوئی ہستی ردِ عمل کی موجودگی سے انکار نہیں کرسکتی۔ یہ شہادتِ حسینؑ کے ردِعمل کی توانائی کے رخ کو پھیر دینے کا نتیجہ تھا کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے قتلِ حسینؑ کے انتقام کی آڑ لے کر اپنی سیاسی اغراض کے تحت ایک وسیع سلطنت قائم کرلی تھی اور عباسیوں نے اسی توانائی کے بل بوتے پر اموی نظامِ حکومت کی بیخ کنی کر

دی تھی۔ ردِ عمل کی موجودگی سے تو کسی کو انکار کی مجال نہیں ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی مجسم پر صرف کردہ توانائی کا ردِ عمل اسی واقعہ کے فوراً بعد رونما نہ ہو بلکہ کچھ نامعلوم عرصہ تک معرضِ التوا میں رہے۔ ربڑ کے دبے ہوئے ٹکڑے میں پھیلنے کی توانائی و صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ جونہی کہ اس پر اثر انداز ہونے والی قوت کو ہٹایا جائے، وہ اپنی اصلی حالت میں واپس آجاتا ہے۔ ایک لپٹا ہوا سپرنگ اسی قوت سے کھلتا ہے جس قوت کے ساتھ اس کو لپٹایا گیا ہو جس طرح یہ قانونِ قدرت دنیا کی ہر ایک مادی چیز پر، ایک قوی ہیکل عظیم الجثہ شے سے لے کر ایک معمولی خاکی ذرہ تک حاوی ہے۔ اسی طرح یہ قانونِ قدرت اخلاقی، نفسیاتی اور روحانی دنیا میں بھی کار فرما ہے۔ ہر انسانی تخیل دنیائے خیالات میں ایک ہستی رکھتا ہے۔ جب تخیل انسانی دماغ میں پیدا ہوتا ہے تو کسی نہ کسی مقام پر ٹکرا کر اسی جگہ واپس آتا ہے جہاں وہ عالمِ وجود میں آیا تھا۔ سوچنے والے کے لئے اچھا خیال نیکی اور برا خیال برائی لاتا ہے۔ بعض اوقات قوتِ ارادی انسانی افعال میں تبدیل ہو جاتی ہے اور روح کی پاکیزگی و ناپاکی کے اثرات سے خیالات افعال کے رنگ میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک قسم کی توانائی دوسری قسم میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ چونکہ روح، نفس اور جسم ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں اور مکمل طور پر اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور ان کا باہمی اشتراکِ عمل اس طرح قرار دیا گیا ہے کہ ایک کے اثرات دوسرے میں نمایاں ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ مذکورہ بالا قانونِ فطرت کو انگریزی فلاسفی میں (CAUSATION) کہتے ہیں جس کو ہندو مسئلہ کرم سے تعبیر کرتے ہیں اور قرآنِ حکیم نے اس قانونِ فطرت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○ (حٰمٓ ۴۶) (ترجمہ) جو عمل صالح کرتا ہے وہ اپنے لئے اور جو برائی کرتا ہے وہ اپنے لئے۔ تمہارا پروردگار بندوں پر مطلقاً ظلم روا نہیں رکھتا۔

یزید پلید کا انجام

یزیدی افواج نے اہلِ مکہ پر مظالم توڑنے میں کوئی کمی نہ کی اور خانۂ خدا کی بے حرمتی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ الفخری لکھتا ہے۔ "یزید کا عہدِ حکومت صحیح حساب کی رُو سے تین سال چھ ماہ ہوتا ہے۔ پہلے سال اس نے حسین ابن علیؑ کو شہید کیا۔ دوسرے سال اس نے مدینہ پر چڑھائی کی اور اسے تین روز تک تاخت وتاراج کیا۔ تیسرے سال خود خانۂ خدا پر فوج کشی کی۔ ان ہر سہ مظالم میں سے کربلا کے حادثہ نے بالخصوص دنیائے اسلام میں ایک خوفناک سنسنی پھیلا دی۔"

اموی دورِ حکومت کے یہ کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے اور صفحاتِ تاریخ سے یہ بدنما دھبے تا قیامِ قیامت نہ مٹ سکیں گے کہ میدانِ کربلا میں نواسۂ رسولؐ کو بے جرم وخطا شہید کیا گیا۔ مدینہ کو تاخت وتاراج کر کے اصحابِ رسولؐ وحفاظِ قرآن مجید کو تہِ تیغ کیا گیا اور مسجدِ نبوی سے یزیدی افواج کے گھوڑوں کے لئے اصطبل کا کام لیا گیا۔ بیت اللہ پر سنگباری کر کے اس کی بے حرمتی کی گئی۔ ابرہہ صرف اسی ایک جرم کے ارتکاب پر عذابِ خداوندی سے بچ نہ سکا تو یزید اس قدر ظلمِ عظیم کے ارتکاب کے بعد کس طرح قدرت کی بے آواز لاٹھی کی زد سے بچ سکتا تھا۔ یزید کو اس منتقمِ حقیقی نے اپنے اسی ازلی قانونِ فطرت کے مطابق مہلت دے رکھی تھی کہ جس کا اعلان دور اندیش امامؑ نے شبِ عاشور قرآن کی زبان میں یوں ارشاد فرمایا تھا:۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۚ اِنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (آلِ عمران ۱۷۷)

(ترجمہ) کافر (دشمنانِ حسینؑ) یہ خیال نہ کریں کہ ہماری ڈھیل ان کے لئے بھلائی ہے۔ ہم صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ ان کے جرائم اور زیادہ ہو جائیں تاکہ وہ اہانت آمیز عذاب کی گرفت میں آنے کے مستحق ہو جائیں۔

مجسم شاہکار تھا۔ امام عالیمقامؑ پر اپنے تمام اوصافِ حمیدہ و خصائلِ پسندیدہ کی موجودگی میں اس قدر ناروا تشدّد کیا گیا اور کڑے دباؤ ڈالا گیا کہ جس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس کا قدرتی و فطری نتیجہ یہ بھی ہوکر رہا کہ شہادتِ حسینؑ کا ردّ عمل بھی اتنا ہی شدید ہوا کہ تاریخ عالم میں اپنی مثال آپ ہی ہے۔ کاز لیشن کے قانون کی رُو سے اموی حکومت کا وہی حشر ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔

ردِّ عمل کی ابتدا اور مجرموں کی پشیمانی

امام حسینؑ کی المناک شہادت اور عفت مآب مخدرات کی شہر بہ شہر تشہیر سے تمام عالمِ اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور جو لوگ اس جرم کے ارتکاب کے ذمہ دار سمجھے گئے ان کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ نہایت سرعت سے عوام میں پھیل گیا۔ مجرمین کے ماتھے پر کلنک کا ایسا ٹیکہ لگ چکا تھا گویا رسوائی و ذلّت ان کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ جب ان کی بداعمالیوں کے نتائج ان کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوئے تو انہیں اپنے جرائم پر پشیمانی محسوس ہونے لگی۔ ندامت کے باعث مردنی و مایوسی کے آثار ان کے منحوس چہروں سے جھلکنے لگے۔ یہ اس عظیم الشان شہادت کے ردِّ عمل کی ابتدا تھی۔ نفسیاتی نقطۂ خیال سے پشیمانی کی کئی صورتیں ہوتی ہیں:۔

۱۔ اپنے عمل کی تاویلیں کرنا اور بہانے ڈھونڈنا۔

۲۔ اپنے سر سے ذمہ داری ہٹاکر دوسروں کے سر تھوپنا۔

۳۔ اپنے عمل پر علانیہ افسوس کرتے ہوئے اظہار ندامت کرنا۔

حُر بن یزید ریاحی کی پشیمانی برمحل اور خود اختیاری تھی۔ ان کے زندہ ضمیر نے ان کے لئے موقع بہم پہنچا دیا کہ وہ نصرتِ حسینؑ میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوکر اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ داغوں کو اپنے گرم و سرخ خون سے صاف کردیں اور ظلم کی

حدود کو پھاند کر مظلومیت کے حلقہ میں داخل ہو جائیں **خوش نصیب تھے حُر** جو جہنم کے دہکتے ہوئے انگاروں کی زد سے بچ کر ایک ہی جست میں جنت الفردوس کے دائمی امن و سکون میں پہنچ گئے۔ حُرؓ کے بعد جن لوگوں میں پشیمانی کا جذبہ پیدا ہوا وہ بعد از وقت تھا۔ خود اختیاری نہ تھا بلکہ بداعمالیوں کے نتائج کے جبر و اثر کا نتیجہ تھا یا یوں سمجھا جائے کہ شہادتِ مظلوم کے ردِعمل کی ابتدا تھی اور شہید کی حقانیت و فاتحانہ شان کا اظہار تھا۔

سب سے خفیف درجہ کے مجرم وہ اہلِ کوفہ تھے جنہوں نے جنابِ حسینؑ کو دعوت دے کر بلایا تھا اور نصرت کے وعدے کئے تھے لیکن جب آزمائش و ابتلا کا نازک دور آیا تو حکومت کے جبر و تشدد کی تاب نہ لا کر جادۂ حق سے منحرف ہوگئے اور ایفائے عہد نہ کیا۔ کربلا کے میدانِ کارزار میں نصرتِ امامؑ کے لئے نہ پہنچ سکے یا پہنچنے کی سعی نہ کی لیکن قتلِ حسینؑ کے بعد اپنی کمزوری و بدعہدی پر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اس ننگ و عار کو دور کرنے کے لئے چار پانچ ہزار **توابین** کی جماعت تیار ہوئی اور ستر سالہ بوڑھے جرنیل **سلیمانؓ بن صرد خزاعی** کی قیادت میں **عین الوردہ** کے مقام پر ابن زیاد کی افواج کے ساتھ نبرد آزما ہوئی۔ گو توابین کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور ان کی ایک بڑی اکثریت ہزاروں شامیوں کو فی النار کرنے کے بعد تلافئِ مافات کے طور پر خود بھی شہید ہوگئی اور اس طرح اپنی بے وفائی کے چھینٹے اپنے دامن سے اپنے ہی خون کے ذریعے صاف کر دیئے۔ فی الحقیقت اپنے اعمال پر یہ علانیہ اظہارِ افسوس و **اظہارِ ندامت** تھا۔ یہ تھا سب شہادتِ مظلوم کے ردِعمل کا کرشمہ۔

نصرتِ امامؑ سے اجتناب کرنے والوں میں ایک بدبخت عبداللہ الحر الجعفی بھی تھا جس کو راہِ کوفہ میں جنابِ حسینؑ نے خود نصرت کی دعوت دی تھی لیکن کم بخت نے ٹال مٹول

سے جان بچائی اور اس طرح ابدی سعادت سے محروم رہا۔ واقعۂ کربلا کے بعد اس کے ضمیر نے اس پر لعنت ملامت کی اور اس کے دل میں جذباتِ غم کا طوفان متلاطم ہوا۔ وہ اپنے چند دوستوں کی معیت میں کوفہ چھوڑ کر کربلا پہنچا۔ قبورِ شہداء کی زیارت سے مشرف ہوکر اپنی بدبختی پر ندامت کے آنسو بہائے۔ کوفہ اس کی نگاہوں میں مجرموں و گنہگاروں کی بستی تھی۔ کوفہ واپس جانے کی بجائے مدائن کی راہ لی اور جذباتِ غم میں ڈوبا ہوا مرثیہ کہا جس کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اسی مرثیہ کے دو اشعار کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

وہ امیر جو انتہائی غدار ہے مجھ سے کہتا ہے کہ تم فرزندِ زہراؑ سے جنگ میں کیوں شریک نہ ہوئے حالانکہ مجھے تو اس پر ندامت ہے کہ میں نے انکی نصرت کیوں نہ کی یقیناً جو شخص بھی صحیح راستہ اختیار نہ کرے اسے نادم ہونا ہی چاہیئے۔" (طبری جزو ثانی ص ۳۴)

ان لوگوں سے زیادہ مجرم وہ پاپی تھے جو حضرت امام حسینؑ کے مقابلہ میں خود شریکِ جنگ ہوئے تھے۔ ان کی پشیمانی کے اقوال جستہ جستہ فقرات کی صورت میں بعض کتبِ تواریخ میں موجود ہیں۔ ان ہی میں قرہ بن قیس ایک شخص تھا جو فوجِ اشقیاء میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور عمر بن سعد کا نمائندہ بن کر امام حسینؑ کے پاس آیا تھا۔ واقعہ کربلا کے بعد بسا اوقات کہا کرتا تھا۔ "کاش! حُر بن یزید مجھے بتلاتے کہ وہ فوجِ حسینؑ کی طرف جا رہے ہیں تو میں بھی انکی معیت میں نصرتِ امامؑ کرتا۔"

رضی بن منقذ عبدی جس کو میدانِ کربلا میں حضرت بریرؓ نے پچھاڑا تھا اور خود اس کے سینہ پر سوار ہو گئے تھے چیخنے لگا تھا کہ میری مدد کرو اور کعب بن جابر بن عمر ازدی نے حضرت بریرؓ کو نیزہ مار کر شہید کر دیا تھا۔ واقعۂ کربلا کے بعد اپنی پشیمانی کا اظہار اشعار میں یوں کرتا تھا:۔

" مقدر میں اس طرح لکھا نہ ہوتا تو میں اس جنگ میں شریک نہ ہوتا اور نہ ابنِ جابر کا

احسان مجھ پر ہوتا۔ وہ دن ہمیشہ کے لیے عار و ننگ کا موقع تھا جو نسلوں تک طعن و تشنیع کا باعث رہے گا۔ کاش میں بریرؓ کے قتل اور حسینؑ سے مقابلہ کے دن سے پہلے مر کر قبر میں پہنچ گیا ہوتا۔" (طبری جلد ۶۔ ص ۲۴۸)

یہ کمزور نفس اور بزدل انسان کا شیوہ ہے کہ وہ اپنی بدکرداریوں کو نوشتۂ تقدیر پر محمول کرتا ہے مگر اس سے اس کی خجالت و ندامت پر کذب و فریب کا پردہ تو نہیں پڑ سکتا بلکہ اس کی کمزوری، مایوسی اور پشیمانی منظرِ عام پر آجاتی ہے۔

ان سے بڑھ کر مجرم، فوجِ اشقیار کا ظالم افسر عمر بن سعد تھا جو اپنی پشیمانی و ندامت کا واشگاف الفاظ میں اقرار کرتا ہے۔ مشہور مؤرخ **ابو حنیفہ** دینوری حمید بن مسلم کی زبانی نقل کرتا ہے۔ حمید کا بیان ہے کہ عمر بن سعد میرا دوست تھا۔ وہ جب حسینؑ سے جنگ کے بعد واپس ہوا تو میں نے جاکر حالات دریافت کئے۔ اس نے کہا" کچھ نہ پوچھو۔ کوئی مسافر اپنی منزل کی طرف ایسے برے انجام کے ساتھ واپس نہیں ہوا جس انجام کے ساتھ میں واپس ہوا۔ میں نے قریبی رشتہ داری کا پاس چھوڑا اور ایک جرمِ عظیم کا ارتکاب کیا۔ (الاخبار الطوال۔ ص ۲۵۷)

عمر بن سعد سے **بڑا مجرم** حاکمِ کوفہ عبیداللہ بن زیاد تھا جس نے عمر بن سعد کو فوج دے کر قتلِ حسینؑ پر مامور کیا تھا لیکن وہ بھی اس عمل کا خود ذمہ دار بننا پسند نہ کرتا تھا۔ اس بیان کی تائید میں ہم ایک تاریخی واقعہ نقل کرتے ہیں۔

"یزید کی موت کے بعد جب عراق میں بغاوت کی چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں اور ابنِ زیاد کو بصرہ سے فرار ہونا پڑا اور وہ سخت پریشان حال تھا۔ رستہ میں ایک لشکری نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی اور کہا۔" کیا آپ حسین ابن علیؑ کے قتل پر نادم تو نہیں ہیں؟"۔ ابنِ زیاد نے جواب میں کہا۔" انہوں نے سلطانِ وقت کی مخالفت کی تھی اور سلطانِ وقت نے مجھے لکھا اور ان کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ اگر یہ غلطی تھی تو

اس کی ذمہ داری یزید پر ہے مجھ پر نہیں۔" (اخبار الطوال۔ ص ۲۷۸)

ذمہ داری اپنے اوپر نہ لینا ہی عمل کے ناپسندیدہ ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے ورنہ فتح کا سہرا فاتح اپنے سر سے اتار کر دوسرے کے سر پر کیسے باندھ سکتا ہے۔ اب کیفیت یہ تھی کہ ابنِ زیاد کے دل و دماغ سے فتح کا تصور مٹ چکا تھا۔ چاروں طرف خونِ ناحق کے انتقام کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یزید جہنم واصل ہو چکا تھا اموی حکومت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ ملک میں بغاوت و بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ ابنِ زیاد کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اب وہ قتلِ حسینؑ کی ذمہ داری کیسے قبول کر سکتا تھا۔ اب وہ اپنی جان بچانے کے لئے تمامتر ذمہ داری یزید کے سر تھوپ رہا تھا۔ یہ سب کچھ **خونِ ناحق کے ردِّ عمل** کا نتیجہ تھا۔

سانحۂ کربلا کا سب سے **بڑا مجرم** یزید پلید تھا جس کو ابنِ زیاد نے بھی اصلی ذمہ دار قرار دیا اور فی الحقیقت وہی ذمہ دار تھا۔ لیکن جب اس نے اپنے آپ کو اپنی بدکرداریوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا دیکھا تو قتلِ حسینؑ کی تمامتر ذمہ داری ابن زیاد کے سر تھوپنے لگا۔ اپنے بیان کی تائید میں ہم داستانِ کربلا (ص ۱۰۹) سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد یزید کی **زود پشیمانی** کے تحت رقمطراز ہیں:-

"یزید نے اہل بیتؑ کو کچھ دن اپنا مہمان رکھا۔ اپنی مجلسوں میں ان کا ذکر کرتا اور بار بار کہتا۔ کیا حرج تھا اگر میں خود تھوڑی سی تکلیف گوارا کر لیتا۔ حسینؑ کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھتا۔ ان کے مطالبہ پر غور کرتا۔ اگرچہ اس سے میری قوت میں کمی ہی کیوں نہ ہو جاتی لیکن اس سے رسول اللہ صلعم کے حق اور رشتہ داری کی حفاظت تو ہوتی۔ خدا کی لعنت ابنِ مرجانہ (ابنِ زیاد) پر۔ حسینؑ کو جس نے لڑائی پر مجبور کیا......... مگر ابنِ زیاد نے ان کی کوئی بات بھی نہ مانی اور قتل کر دیا۔ ان کے قتل سے تمام مسلمانوں میں مجھے **مبغوض** بنا دیا۔ خدا کی لعنت ابنِ مرجانہ پر۔ خدا کا غضب

ابنِ مرجانہ پر"۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے یزید کی زود پشیمانی کا تذکرہ بھی کر دیا اور یزید کی اپنی زبانی اس کی پشیمانی کی وجہ بھی بتادی وہ یہ ہے کہ ابنِ زیاد نے قتلِ حسینؑ سے تمام مسلمانوں میں مجھے مبغوض بنادیا ۔ حالانکہ :-

"شروع شروع میں یزید نے قتلِ حسینؑ پر انتہائی شادمانی و مسرت کا اظہار کیا تھا۔" (تاریخ الخلفاء ۔ علامہ جلال الدین سیوطی) لیکن بعد میں آنے والے انقلابات نے جو واقعۂ کربلا کے نتائج تھے اسے چونکا دیا ۔ اور حالات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ کفِ افسوس ملتا رہے ۔ اسی بناء پر نہایت حسرت کے ساتھ وہ کہنے لگا :-

" ہائے حسینؑ کو قتل کر دینے سے ابنِ زیاد نے مجھ کو مسلمانوں میں قابلِ نفرت بنا دیا اور ان کے دلوں میں عداوت کا بیج بو دیا اور قتلِ حسینؑ کے جرم کو سنگین سمجھ کر نیکوکار و بدکار سب ہی آدمی مجھ کو دشمن سمجھنے لگے ۔ ہائے ابنِ مرجانہ نے یہ کیا کیا ۔ خدا اس پر لعنت کرے"۔ (طبری جزء ثانی جلد ثانیہ ص ۴۳۶ ۔ طبع لیدن)

اس مقام پر پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فی الحقیقت قتلِ حسینؑ کی ذمہ داری ابنِ زیاد پر تھی یا یزید خود اس کا ذمہ دار تھا ؟ کیا یزید کا یہ اظہار افسوس خلوصِ نیت پر مبنی تھا یا بدکرداری کے نتائج سے خائف ہو کر تاویلیں کرنے اور بہانے ڈھونڈنے کی ایک ناکام کوشش تھی ؟ کیا یزید کی موجودہ پشیمانی و اضطراب جس نے اس کی رات کی نیند کو حرام کر دیا تھا خونِ ناحق کے ردِّ عمل کا نتیجہ تو نہ تھا ؟

۱ــ یہ وہی یزید تھا جس نے ولید بن عتبہ اموی عاملِ مدینہ کو لکھا تھا کہ حسینؑ کو بیعت پر مجبور کرو اور انکارِ بیعت پر قتل کر کے ان کا سر دمشق بھیج دو ۔ (تاریخ کبیر طبری مطبوعہ لیدن)

۲ــ یہ یزید ہی تھا جس کے پے در پے مطالباتِ بیعت سے تنگ آکر جنابِ حسینؑ وطن کو چھوڑنے اور جوارِ روضۂ رسولؐ کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے ۔

۳۔ یہ یزید ہی تو تھا جس نے شیاطین بنی امیہ میں سے تیس افراد کو حاجیوں کے بھیس میں اس غرض سے مکہ بھیجا کہ وہ امام حسینؑ کو جس حال میں پائیں قتل کردیں۔
(مقتل ابومخنف۔ ینابیع المودۃ باب حادی الستون)

۴۔ یہ یزید ہی تھا جس نے نعمان ابن بشیر حاکم کوفہ کو اس بناء پر معزول کردیا تھا کہ اس نے امیر مسلمؑ کے ساتھ تشدد آمیز سلوک نہ کیا اور اس کی جگہ عبیداللہ ابن زیاد جیسے سفاک اور خونخوار گرگ کا تقرر کرکے حکم دیا تھا کہ امیر مسلمؑ اور ان کے حامیوں کو فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ (صلاح النشاتین)

۵۔ یہ یزید ہی تو تھا جس نے امیر مسلمؑ کے قتل پر ابن زیاد کو انعامات و اکرامات سے مالا مال کرکے یہ حکم دیا تھا کہ یہی سلوک جناب حسینؑ سے روا رکھا جائے۔

۶۔ یزید ہی کے حکم سے شہداء کے سروں کو نوکِ سناں پر سوار کرکے عفت مآب مخدرات کی معیت میں کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک تشہیر کیا گیا۔

۷۔ یہ یزید ہی تھا جس نے اپنے بھرے دربار میں اہل بیتؑ رسالت کی مخدرات علیا کو بے مقنع و بے ردا حاضر ہونے پر مجبور کیا اور ان کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک روا رکھا جو ترک و دیلم کے اسیروں کے ساتھ روا رکھنا دستورِ عرب کے خلاف تھا۔

۸۔ یہ یزید ہی تو تھا جس نے قتلِ حسینؑ پر انتہائی شادمانی و مسرت کا اظہار کیا اور اپنی فتح کے جوش سے مشتعل ہوکر یہ اشعار پڑھنے لگا۔

"لیت اشیاخی ببدر شھدوا............الخ"

"کاش آج میرے وہ بزرگوار جو جنگِ بدر میں مارے گئے موجود ہوتے تو خوش ہوکر مجھے داد دیتے کہ میں نے ان کا کیسا انتقام لیا اور سادات بنی ہاشم کو قتل کیا۔ بے شک میں عتبہ کی نسل میں شمار نہ ہوتا اگر آلِ احمدؐ سے ان تمام باتوں کا جو (احمدؐ) کر گئے ہیں بدلہ نہ لیتا۔ درحقیقت بنی ہاشم نے ملک گیری کے ڈھکوسلے نکالے تھے ورنہ

ان کے پاس نہ کوئی فرشتہ آیا نہ وحی نازل ہوئی۔"

(وسیلۃ النجاۃ ملا مبین لکھنوی فرنگی۔ تاریخ احمدی ص ۳۲۴)

مقام حیرت ہے، نہیں بلکہ جائے عبرت ہے کہ آخر اس یزید کو آج کیا ہو گیا ہے کہ وہ سعی تلافیِ مافات میں مصروف ہے۔ قتلِ حسینؑ پر بظاہر افسوس کرتا ہے اور ابنِ زیاد کو قتل کا ذمہ دار قرار دے کر اس پر لعنت کرتا ہے۔ یقیناً یہ اظہارِ ندامت اس کے خلوصِ نیت پر مبنی نہ تھا اور نہ ہی یہ ضمیر کی بیداری کی آواز تھی بلکہ یہ تو اب ایک آنے والے اٹل **خونی انقلاب** کے اثرات تھے جن کے نتائج سے خائف ہو کر یزید جیسا جابر و ظالم ڈکٹیٹر اپنی غیر معمولی شاہانہ جاہ و جبروت کے باوجود لرزہ براندام تھا اور قتلِ حسینؑ کی ذمہ داری قبول کرنے سے **پس و پیش** کر رہا تھا۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ یہ اس لئے کہ خونِ ناحق کا **ردِّ عمل** اب کارفرما تھا جو آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ یہ آغاز ایک بڑے انجام کا پتہ دے رہا تھا کہ امیر معاویہ نے جس قصرِ امارت کی بنیادیں خلیفۂ حق حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کا بیج بو کر اور نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسنؑ المجتبیٰ کو زہر دے کر رکھی تھیں ان میں تنزلزل آ چکا ہے اور اولادِ ابوسفیان کے لئے بفحوائے آیۂ کریمہ "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ" ابتریت، ذلت و مسکنت اور ابدی ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔

سیلاب ردِّ عمل کے روکنے کی ناکامی

یزید مخالفت کے ابھرتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر خائف ہو گیا اور ردِّ عمل کے طوفانِ بلا کا رخ دوسری طرف پھیرنا چاہا۔ لا طائل تاویلوں سے قتلِ حسینؑ کا جرم ابنِ زیاد کے سر تھوپنا شروع کر دیا لیکن بہانہ سازیوں کا یہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا اور اسے بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ خونِ ناحق نے خوابِ خرگوش میں

بیہوش پڑے ہوئے مسلمانوں کو یکایک چونکا دیا۔ ان کی خوابیدہ قوتیں تڑپ اٹھیں اور کمزور ارادوں میں روحِ عمل پیدا ہوگئی۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ یزید کفر و ضلالت کا مجسمہ ہے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ان کے سرمایۂ دین و ایمان کو تاخت و تاراج کرنے پر کمربستہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے یزید کی کھلم کھلا مخالفت شروع کردی۔ یزید محسوس کرنے لگا کہ عوام کو اپنی بے گناہی اور ابن زیاد کی مجرمیت کا یقین دلا کر اس بلائے مبرم کا ٹالنا محال ہے اس لئے اس نے دو حربوں کو بروئے کار لانے کی سعی کی جو اس کو اپنے والدِ بزرگوار امیر شام سے ورثہ میں ملے تھے۔ وہ دو حربے یہ تھے:-

۱۔ مخالفین کو زر و جواہر کی بخشش سے رام کرنا۔ اور سنہری روپہلی سکوں سے ان کا ایمان خرید لینا۔

۲۔ ہر مخالف طاقت کو جبر و تشدد سے کچل دینا۔

یزید نے بھی ان آزمودہ حربوں کا سہارا لینے کی کوشش کی کیونکہ ہر فرعونی حکومت کا شروع سے یہی دستور العمل رہا ہے کہ ہر نازک مرحلہ پر اور ہر آڑے وقت میں ان دو حربوں سے کام لیا جاتا تھا۔ شومئ قسمت، ان ہتھیاروں کا پہلا وار اسلامی مرکز مدینہ منورہ پر ہوا اور یزید کے جور و جفا کا پہلا نزلہ بھی اہلِ مدینہ پر گرا۔ مدینہ میں خاندانِ بنی ہاشم کے علاوہ مقتدر مہاجرین و انصار اور ان کی اولاد میں سے اکثر لوگ بھی تھے جنہیں نواسۂ رسولؐ کی منزلت سے آگاہی بھی تھی اور رسولِ خداؐ کے رشتہ کا کم و بیش احساس بھی تھا۔ بیمارِ کربلا قید و سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے واپس مدینہ پہنچ چکے تھے۔ جمہور مسلمانوں کو ان تمام واقعات کا پورا پورا علم ہو چکا تھا کہ ریگزارِ کربلا میں نواسۂ رسولؐ کے سر پر کیا گزری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوئی ہوئی قوم میں احساسِ حریت پیدا ہوا۔ جذبۂ انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے اور لوگ حکومتِ شام کی بنیادیں اکھاڑنے پر تل گئے۔ یزید کی نگاہیں اٹھتے ہوئے سیلابِ بلا کو روکنے کے لئے مدینہ پر گڑی تھیں۔

کیسۂ زر سے مدینہ کو ہموار کرنے کی سعی

بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانے کے لئے عبداللہ بن حنظلہ و منذر بن زبیر و دیگر شرفاء و اکابرینِ مدینہ پر مشتمل ایک وفد کو فوراً دمشق مدعو کیا اور اس پر شاہانہ الطاف و اکرام کی بارشیں کی گئیں۔ زر و جواہرات کے ڈھیر دے کر ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ حکومتِ شام کے خلاف عوام میں نفرت کا بیج بونے کی بجائے حکومت کی مدح سرائی کریں۔ اس طرح اس متوقع سیلابِ بلا کو روک دیں جو ایوانِ حکومت کی بنیادیں ہلا دینے والا ہے۔ اراکینِ حکومت نے اس وفد کو اپنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن خونِ ناحق کا کچھ ایسا اثر تھا کہ دولت کے انبار صرف کرنے کے باوجود کارپردازانِ حکومت کو اپنے مقصد میں خاطرخواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اگرچہ اس سے پیشتر حکومتِ دمشق کا یہ مجرب نسخہ بارہا کامیاب ثابت ہو چکا تھا۔

علامہ ابنِ اثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن حنظلہ کو یزید نے ایک لاکھ درہم دیئے اور ان کے آٹھ بیٹے تھے۔ ہر ایک کو دس دس ہزار درہم عطا کئے۔ (تاریخ کامل جلد ۴۔ ص ۵۳) مگر اس وفد نے شام سے واپس آکر یزید کے ذاتی عیوب و نقائص کو کھلم کھلا بیان کیا اور کہا ہم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں جس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ شراب پیتا ہے۔ طنبورہ بجاتا ہے۔ گانے والیوں سے گانے سنتا رہتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔ ہم سب اس کی بیعت کا قلادہ اپنی گردن سے اتارتے ہیں۔ (تاریخ کامل۔ جلد ۴، ص ۵۲)

علامہ ممدوح نے اپنی تاریخ میں یہاں تک بیان کیا ہے کہ جب یہ سب مدینہ سے واپس ہوئے تو یزید کے حالاتِ فسق و فجور کو ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ منذر بن زبیر نے اپنی تقریر میں صاف اعلان کر دیا کہ یزید نے مجھے ایک لاکھ روپیہ دیا ہے مگر یہ چیز اس بات سے مجھے مانع نہیں ہو سکتی کہ میں اس کے حالات آپ لوگوں

کے سامنے پیش نہ کروں۔ وہ شراب پیتا ہے اور ایسا مست ہوتا ہے کہ نماز ترک کر دیتا ہے اس کے علاوہ وہ تمام الزامات انہوں نے عائد کئے جو ان کے دوسرے ساتھی عائد کر چکے تھے۔ (تاریخ کامل جلد ۴۔ ص ۵۳)

سیاسی کروٹ

مکّہ والوں نے بھی کروٹ بدلی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جو عرصۂ دراز سے خلافت کے خواب دیکھ رہے تھے اور بیعتِ یزید میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ قتلِ حسینؑ کی خبر سن کر اور عوام میں حکومتِ شام کے خلاف روز افزوں جذبۂ نفرت و حقارت دیکھ کر موقع کو غنیمت سمجھا اور استحکامِ خلافت کی ادھیڑ بن میں مصروف ہو گئے۔ اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے انتقامِ خونِ حسینؑ کا حربہ لے کر اٹھے اور ایک پر جوش تقریر سے یزید و بنی امیّہ کے خلاف اہلِ مکّہ کے جذبات کو ابھارا۔ کوفہ و عراق کے لوگوں کی بے وفائی، بزدلی اور نالائقی کی شدید مذمت کی اور جنابِ حسینؑ کی صداقت و حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے بیان کیا کہ "قسم ہے خدا کی، حسینؑ نے شرافت و کرامت کے مرنے کو ذلیل و مذموم زندگی پر ترجیح دی۔ حسینؑ کے بعد ہم کبھی اس قوم سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ بخدا ان لوگوں نے ایسے بزرگوار کو شہید کیا ہے جو **قلیل النّوم** اور **کثیر الصوم** تھے۔ راتوں کو عبادتِ الٰہی میں طولانی قیام کرنے والے، دنوں کو بکثرت روزہ رکھنے والے، شرف و بزرگی اور دین میں سب سے افضل امرِ خلافت کے لئے سب سے **احق و بہتر** تھے۔ قسم ہے خدا کی کہ انہوں نے کبھی قرآن کو غلط معنی نہیں پہنائے۔ خوفِ الٰہی سے بیحد رونے والے تھے اور بجائے میخواری کے ہمیشہ روزے رکھتے تھے اور بجائے شکاری کتے پالنے کے یادِ الٰہی کے جلسے ان کے گھر میں برپا رہتے تھے۔" (تاریخِ کامل ابن اثیر جلد ۴۔ ص ۵۱۔۵۲)

غرضیکہ مکہ میں اس طرح یزید کے برخلاف دھواں دھار تقریروں کے اثر سے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے اپنی ہوا باندھنا شروع کر دی اور انتقامِ خونِ ناحق کی آڑ میں اپنی خلافت کی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کی ابتدا کی۔ یزید کی شاہانہ قوت کو توڑنے کے لئے ان کے ہاتھ میں اس سے بہتر و مؤثر اور کون سا ہتھیار آ سکتا تھا کہ عوام کو انتقام کے لئے ابھارا جائے۔ وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے میدانِ سیاست کے شہسوار حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ میدانِ عمل میں اتر آئے اور تمام اہلِ حجاز نے ماسوائے حضرت محمد بن حنفیہؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کتبِ تواریخ میں یہاں تک مذکور ہے کہ واقعہ کربلا کا اتنا سخت ردِ عمل ہوا کہ شیعانِ علی کے علاوہ خوارج بھی جن کی اہلبیتِ رسولؐ سے دشمنی و مخالفت مسلمہ تھی حکومتِ شام سے انتقام لینے کے لئے تلے ہوئے تھے۔ اسی سلسلہ میں مستند غیر مسلم مورخ ایڈورڈ براؤن اپنی کتاب ادبیاتِ ایران میں لکھتے ہیں۔

"عبداللہ بن زبیرؓ کی بغاوت جس نے نو سال تک (از ۶۸۳ء تا ۶۹۲ء) خودمختارانہ حیثیت سے بطور خلیفہ ارضِ مقدس پر تسلط رکھا۔ حسینؑ اور ان کے اقربا کے خون کا انتقام لینے پر مبنی تھی جو نہ صرف شیعانِ علیؑ ہی میں بلکہ اکثر خارجی فرقہ کے مسلمانوں میں بھی پائی جاتی تھی۔" (لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ جلد اول۔ ص ۲۲۸)

مدینہ منورہ کی تاخت و تاراج

یزید نے جب یہ محسوس کیا کہ کیسۂ زر کی تقسیم کا حربہ اہلِ مدینہ پر کارگر ثابت نہ ہوا تو اب اس نے دوسرے حربہ کے ذریعے ہر مخالفانہ طاقت کو جبر و تشدد کے زور سے کچلنا چاہا۔ چنانچہ مسلم بن عقبہ کو **وصیّتِ پدری** پر عمل کرتے ہوئے مدینہ میں بغاوت کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کو بجھانے کے لئے ایک لشکرِ کثیر دے کر روانہ کیا۔

(جذب القلوب شیخ عبدالحق محدث دہلوی) مسلم بن عقبہ سفاکی و خون آشامی کے اعتبار سے ابنِ زیاد سے کم نہ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی زبانی سنئے:۔

"یزید کی فوج کے ہاتھوں مدینہ منورہ کی قتل و غارت میں اسّی جلیل القدر اصحابِ رسولؐ اور سات سو حفاظِ قرآنِ مجید تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان شہیدوں کا خون اور خانۂ خدا کی بے حرمتی زبانِ حال سے انتقام کے لئے پکار اٹھی"۔ (لٹریری ہسٹری آف پرشیا)

اسی واقعہ کو مشہور مؤرخ ابوالفدا نے اس طرح لکھا ہے:۔ (تاریخ ابوالفدا)

"حسب حکم یزید مسلم بن عقبہ نے دس ہزار سواروں کی جمعیت سے براہ حرہ مدینہ میں پہنچ کر ہنگامۂ قتال برپا کیا۔ فضل بن عباس مارے گئے اور ایک بڑی جماعت اشراف و انصارِ مدینہ کی قتل ہوئی۔ بالآخر مدینہ والوں نے شکست کھائی۔ مسلم بن عقبہ نے تین دن تک قتلِ عام کرکے لوگوں کا مال و اسباب لوٹ لیا اور عورتوں کے ساتھ حرام کاری کو حلال کر دیا۔ زہری کا قول ہے کہ سات سو مہاجرین و انصار اور دس ہزار عوام اہلِ مدینہ قتل ہوئے اور جو لوگ بچ گئے انہوں نے مجبور ہوکر یزید کی غلامی قبول کرلی"۔

یہی واقعہ جذب القلوب شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور حجج الکرامہ صدیق حسن خان میں اس طرح مذکور ہے:۔

"جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکر دے کر اہلِ مدینہ کے قتل و غارت کے لئے بھیجا تو اس نے بمقام **حرہ** مدینے والوں کو نہایت ذلت کے ساتھ قتل کیا اور تین دن تک **حرم نبوی کی بے حرمتی** کی ...... اس ہنگامۂ ناگفتہ بہ میں ایک ہزار سات سو (۱۷۰۰) اشخاص طبقۂ مہاجرین و انصار و تابعینِ اخیار کے اور دس ہزار عوام الناس مقتول ہوئے عورات و اطفال اس شمار میں داخل نہیں ہیں۔ نیز سات سو حفاظِ قرآن اور قوم قریش کے ستانوے (۹۷) آدمی تہ تیغ بیدریغ ہوئے اور علانیہ طور پر فسق و زنا مباح کر دیا گیا چنانچہ اس واقعہ کے بعد ایک ہزار عورتوں نے حرام کے بچے جنے۔ علاوہ ازیں مسجد نبوی

کے اندر گھوڑے پھرائے گئے اور روضۂ رسولؐ میں گھوڑوں نے بول و براز کیا۔ جو اہلِ مدینہ بچ گئے وہ یزید کی بیعتِ غلامانہ پر اس شرط کے ساتھ مجبور کئے گئے کہ یزید چاہے ان کو بیچ ڈالے چاہے آزاد کر دے۔ چاہے ان سے خدا کی اطاعت کرائے اور چاہے ان کو خدا کی نافرمانی کا حکم دے۔"

اسی واقعہ کو آنریبل جسٹس سید امیر علی ہسٹری آف سارسینز (ص ۸۷ تا ۸۹) میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔ اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:-

"اس خبر نے یزید کو آتشِ غضب میں جھونک دیا۔ اس نے بسرعت تمام مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں جو تاریخِ عرب میں **ملعون قاتل** کے نام سے مشہور ہے ایک فوجِ کثیر جو شامی دولت کے پرستاروں اور اموی بے شعور جانبداروں پر مشتمل تھی، تیزی سے روانہ کی۔ مدینہ والوں کی شامیوں سے حرہ کے مقام پر مڈبھیڑ ہوئی جہاں ایک جنگ نہایت بیباکی سے لڑی گئی۔ مسلمانوں کا مقابلہ زیادہ فوج سے تھا، اس لئے باوصف اپنی شجاعانہ ہمت کے، زبردست نقصان کے ساتھ ہزیمت کھا گئے۔ اس آفت خیز جنگ میں اہلِ مدینہ کی جوانمردی کا پھول مرجھا گیا اور پیمبرؐ کے انتہائی شریف النفس ساتھی، مہاجر و انصار تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ لڑائی اسلام کے لئے مقابلتاً کسی دوسری جنگ کے لحاظ سے مصیبت خیز و ہولناک تھی۔ اس شہر کی تقدیس کو جس نے پیمبرؐ کو اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دی تھی اور جس نے ان کی زندگی اور انتظامی امور سے پاکیزگی پائی تھی، بری طرح سے مجروح کیا گیا۔ ان لوگوں کو جنہوں نے پیمبرؐ کی ضرورت کے وقت حمایت کی تھی باغیانہ وحشت و بربریت کا محکوم بنایا گیا۔ مسجدِ نبوی میں گھوڑے باندھے گئے اور دیگر عبادت گاہیں اپنی بیش قیمت آرائشوں کی بدولت مسمار کی گئیں۔ کفر و الحاد ایک بار پھر کامیاب و کامران ہوا اور اس کا ردِ عمل بقولِ ایک انگریز مورخ کے، اسلام کے خلاف خوفناک، ظالمانہ اور باغیانہ تھا۔ فتح اسلام کے وقت مسلمانوں کے تحمل اور

امویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا یوں حق ادا کیا گیا کہ ممتاز شخصیتیں یا تو تیغ کی نذر ہو گئیں یا حفاظتِ جان کی خاطر دور دراز ممالک میں بھاگ گئیں۔ چند جو بچ گئیں ان کو یزید کی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالنا پڑا۔ جنہوں نے انکار کیا ان کی گردنوں کو داغا گیا۔ دارالعلوم، شفا خانے اور دیگر بڑی بڑی پبلک عمارتیں جو خلفائے راشدین کے عہد میں تعمیر ہوئی تھیں بند کر دی گئیں یا ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور عرب ایک بار پھر بیابان بن گیا۔

کچھ سالوں کے بعد علی ثانیؑ کا پوتا جعفر ملقب بصادقؑ اس دارالعلوم کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنا جس نے ان کی جد خلیفہ علیؑ کی زیرِ سرپرستی فروغ حاصل کیا تھا لیکن فی الحقیقت اس کی حیثیت صحرا میں ایک نخلستان کی سی تھی جس کے چاروں طرف ظلمت و تاریکی کا دور دورہ تھا۔ مدینہ اپنی برباد شدہ خوشحالی کو پھر کبھی نہ پا سکا۔ امویوں کے عہد میں یہ جھ میں آتا ہے کہ مدینہ ایک غیر معروف نامی کا شہر بن چکا ہے۔ کیونکہ جب منصور عباسی خلیفہ ثانی نے اس جگہ (مدینہ) کو دیکھنا چاہا تو اس کو ایک بدرقہ اور دلیلِ راہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جو یہ بتائے کہ کہاں متقدمین بہادر مردوں اور بہادر خواتین نے زندگیاں گزاریں اور کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔"

دورِ حاضرہ کے محقق سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

" بالفرض اہلِ مدینہ کی بغاوت ناجائز ہی تھی مگر کیا کسی باغی مسلمان آبادی، بلکہ غیر مسلم باغیوں اور حربی کافروں کے ساتھ بھی اسلامی قانون کی رُو سے یہ سلوک جائز تھا؟ اور یہاں تو معاملہ کسی اور شہر کا نہیں، خاص مدینۃ الرسولؐ کا تھا۔ جس کے متعلق نبی صلعم کے یہ ارشادات بخاری، مسلم، نسائی اور مسند احمد حنبل میں متعدد صحابہ سے منقول ہوئے ہیں کہ مدینہ کے ساتھ جو شخص بھی برائی کا ارادہ کرے گا اللہ اسے جہنم کی آگ

میں سیسے کی طرح پگھلا دے گا اور جو شخص اہلِ مدینہ کو ظلم سے خوفزدہ کرے گا اس پر اللہ اور ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔" (خلافت و ملوکیت ص ۱۸۲)

خانۂ خدا کی بے حرمتی

مدینۃ النبیؐ کو تباہ کرکے یزیدی افواج نے مکّہ معظمہ کا رخ کیا لیکن مسلم بن عقبہ اپنے گناہوں کی پاداش میں بحالتِ بیماری راستے ہی میں جہنّم واصل ہوگیا اور حصین بن نمیر فوجِ اشقیار کا سالار مقرر ہوا۔ مورّخ ابوالفدا لکھتا ہے :۔

"حصین بن نمیر نے مکّہ معظمہ پہنچ کر عبداللہ بن زبیرؓ کا محاصرہ کیا اور خانۂ کعبہ پر سنگباری کرکے آگ لگادی۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے محاصرے کو چالیس دن گزرے تھے کہ دفعتہً یزید کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔" (تاریخ ابوالفدا)

"جب حصین بن نمیر کو مرگِ یزید کی خبر پہنچی تو اس نے وہاں سے راہِ فرار اختیار کی۔" (جذب القلوب)

اسی سلسلہ میں علامہ مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"حضرت حسن بصری کو ایک مرتبہ یہ طعنہ دیا گیا کہ آپ جو بنی امیہ کے خلاف خروج کی کسی تحریک میں شامل نہیں ہوتے تو کیا آپ اہلِ شام (یعنی بنی امیہ) سے راضی ہیں؟ جواب میں انہوں نے فرمایا۔ میں اور اہلِ شام سے راضی ہوں؟ خدا ان کا ناس کرے، کیا وہی نہیں ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حرم کو حلال کرلیا اور تین دن تک اس کے باشندوں کا قتلِ عام کرتے پھرے۔ اپنے نبطی و قبطی سپاہیوں کو اس میں سب کچھ کر گزرنے کی چھوٹ دے دی اور وہ شریف دیندار خواتین پر حملے کرتے رہے اور کسی حرمت کی ہتک کرنے سے نہ رکے۔ پھر بیت اللہ پر چڑھ دوڑے اس پر سنگباری کی اور اسکو آگ لگائی۔ ان پر خدا کی لعنت ہو اور وہ برا انجام دیکھیں"۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۸۳-۱۸۴)

یزید پلید کا انجام

یزیدی افواج نے اہلِ مکہ پر مظالم توڑنے میں کوئی کمی نہ کی اور خانۂ خدا کی بےحرمتی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ الفخری لکھتا ہے۔ "یزید کا عہدِ حکومت صحیح حساب کی رُو سے تین سال چھ ماہ ہوتا ہے۔ پہلے سال اس نے حسین ابن علیؑ کو شہید کیا، دوسرے سال اس نے مدینہ پر چڑھائی کی اور اسے تین روز تک تاخت و تاراج کیا۔ تیسرے سال خود خانۂ خدا پر فوج کشی کی۔ ان ہر سہ مظالم میں سے کربلا کے حادثہ نے بالخصوص دنیائے اسلام میں ایک خوفناک سنسنی پھیلا دی۔"

اموی دورِ حکومت کے یہ کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے اور صفحاتِ تاریخ سے یہ بدنما دھبے تا قیامِ قیامت نہ مٹ سکیں گے کہ میدانِ کربلا میں نواسۂ رسولؐ کو بےجرم و خطا شہید کیا گیا۔ مدینہ کو تاخت و تاراج کر کے اصحابِ رسولؐ و حفّاظِ قرآن مجید کو تہ تیغ کیا گیا اور مسجدِ نبوی سے یزیدی افواج کے گھوڑوں کے لئے اصطبل کا کام لیا گیا۔ بیت اللہ پر سنگباری کر کے اس کی بےحرمتی کی گئی۔ ابرہہ صرف اسی ایک جرم کے ارتکاب پر عذابِ خداوندی سے بچ نہ سکا تو یزید اس قدر ظلمِ عظیم کے ارتکاب کے بعد کس طرح قدرت کی بےآواز لاٹھی کی زد سے بچ سکتا تھا۔ یزید کو اس منتقمِ حقیقی نے اپنے اسی ازلی قانونِ فطرت کے مطابق مہلت دے رکھی تھی کہ جس کا اعلان دور اندیش امامؑ نے شبِ عاشور قرآن کی زبان میں یوں ارشاد فرمایا تھا:۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝ (آلِ عمران ۱۷۷)

(ترجمہ) کافر (دشمنانِ حسینؑ) یہ خیال نہ کریں کہ ہماری ڈھیل ان کے لئے بھلائی ہے۔ ہم صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ انکے جرائم اور زیادہ ہو جائیں تاکہ وہ اہانت آمیز عذاب کی گرفت میں آنے کے مستحق ہو جائیں۔

یزید کو خونِ ناحق کے جرمِ عظیم کے بعد اس حکیم مطلق نے مختصر عرصہ کے لئے محض اس لئے مہلت دے رکھی تھی تاکہ دوسرے دو جرائم (مدینہ کی تاخت و تاراج اور خانۂ خدا کی بے حرمتی) سے اپنے نامۂ اعمال کو پوری طرح سیاہ کرے اور اس طرح دردناک و ذلت آمیز عذاب کا مستحق ہو سکے تاکہ طرفدارانِ بنی امیہ قیامت تک یزید کی بیگناہی ثابت کرنے کے لئے اپنے تعصب بھرے قلم کو حرکت دینے کی جرأت نہ کرسکیں۔

جب خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی تو یزید نے ردِّ عمل کے روز افزوں طوفان کو جس قدر سختی و تشدد سے روکنا چاہا اسی قدر سیلابِ بلا تیز و تند ہوتا گیا۔ آخر وہ وقت قریب آیا جوکہ منتقمِ ازلی نے ظالم کو کیفرِ کودار تک پہنچانے کے لئے مقدر کر رکھا تھا۔ چاروں طرف ملک میں بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ یزید کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ بیوی متنفر تھی۔ بیٹا ملامت کرتا تھا۔ غم غلط کرنے کے لئے مے نوشی اور شکار و تفریح کا مشغلہ باقی رہ گیا تھا۔ ابھی خانہ خدا کا محاصرہ جاری تھا اور اہلِ مکہ پر پے در پے مظالم توڑے جا رہے تھے کہ یزید ایک دن شکار کی غرض سے ایک ہرن کے تعاقب میں ایک ایسے سنسان و ویران صحرا میں جا نکلا کہ جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ پیاس کے مارے زبان تالو سے چمٹ رہی تھی۔ قدرت نے پیکِ قضا کو ایک راہگیر کی صورت میں وہاں بھیجا۔ یزید نے اپنی پیاس و بے بسی کا اس سے تذکرہ کیا۔ پہلے تو راہگیر کو اس کی پریشان حالی پر رحم آگیا اور اس کو پانی سے سیراب کرنے کے لئے چشمۂ آب تک لے جانے کی فکر ہی میں تھا کہ اس پر یہ راز کھل گیا کہ پیاس کا ستایا ہوا، ہرن کا شکاری، حکومتِ شام کا خودسر و جابر بادشاہ یزید ہے جو امام حسینؑ کا قاتل ہے۔ راہگیر آگ بگولا ہو گیا اور اس پر لعنت و نفرین کرنے لگا۔ اسی پیاس و بیتابی کے عالم میں مہلک ضربات لگا کر اس کو جہنم واصل کر دیا۔

یزید کی موت کے بارے میں بھی مورخین میں کافی اختلاف ہے۔ حبیب السیّر

میں مرقوم ہے کہ یزید کثرتِ شراب نوشی سے مخبوط الحواس ہو کر چھت سے نیچے گر پڑا اور ہلاک ہوگیا۔

" سبب موتِ یزید ایں بود کہ روزے بشرب شراب اقدام نمود و در وقتیکہ مست و مخمور و محض بے شعور بود برخاست و آغاز رقص کرد۔ درآں اثنا بعذاب آجل و عاجل گرفتار شدہ بیفتاد و فرقِ سرش بر زمین خوردہ شد و تارک اسفل در بیچ محل قرار نگرفت۔" (ذبح عظیم ص ۳۷۸)

صاحب طبقات محمود شاہی تحریر فرماتے ہیں:۔

" ایک شب کو یزید نے حسب معمول شراب پی مگر مقدار اس قدر زیادہ ہوگئی کہ کمال مستی کے عالم میں کوٹھے سے گرا اور اس کا سر دوپارہ ہوگیا۔ مغز باہر نکل پڑا۔ اور وہ مرگیا۔"

آثارِ انقلاب واضطرابِ عراق

دنیا کے ہر بڑے سے بڑے انقلاب کا سنگِ بنیاد دو ہی چیزیں ہیں جنہیں حضرت حسینؑ اپنی عظیم الشان قربانی کے ذریعہ نہایت خوبی کے ساتھ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ایک **قوتِ احساس** دوسرے **جرأتِ اظہار**۔ جب یہ دو قسم کے جذبات افرادِ قوم میں پیدا ہو جائیں تو سیلابِ انقلاب ہر بڑے سے بڑے اقتدارِ حکومت و نظامِ سلطنت کو کفِ آب کی طرح بہا لے جا سکتا ہے۔ واقعہ شہادت سے اموی سلطنت کے خلاف آثارِ انقلاب اسی وقت نمایاں ہو گئے تھے جب قافلۂ اہل بیتِ رسالت کو پابہ زنجیر اور بالخصوص پردگیانِ عصمت سرا کو بے مقنع و بے ردا کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جا رہا تھا۔ ان قیدیوں کی مظلومیت کو دیکھ کر، جنہیں خود تو رونے کی اجازت نہ تھی، کوچہ و بازار، کوٹھوں اور برآمدوں سے فریاد و فغاں

کا ایک کہرام برپا ہو رہا تھا۔ حکومت کی طرف سے خوشیوں کے اہتمام کے باوجود چاروں طرف سے چیخ و پکار کی ماتمی صدائیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ یہ رائے عامہ کا وہ **بے ساختہ مظاہرہ** تھا جسے ابنِ زیاد کا جابرانہ تسلط و قاہرانہ تشدد نہ دبا سکا جب ان قیدیوں کی تشہیر کرتے ہوئے انہیں شام کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو رستے میں متعدد شہروں کے دروازے بند کر لئے گئے۔ بہت سے مقامات سے مسلح لوگ باہر نکل آئے اور کئی مقامات پر جنگ کی صورت در پیش ہوئی۔ یہ تمام واقعات ایک انقلابِ عظیم کا پیش خیمہ تھے اور یہ آغاز ایک بڑے انجام کا پتہ دے رہا تھا۔ شہادتِ حسینی کی معجزانہ قوتوں نے کمزوروں کو ابھارا۔ ان میں جرأت پیدا کر دی کہ وہ جابر و ظالم حکومت کے سامنے اپنا سر نہ جھکائیں۔

ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نیست　　پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیر ایں اسرار کرد　　ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد (اقبالؒ)

جب یزید کی ہلاکت کی خبر ابنِ زیاد کو پہنچی تو اس نے اہلِ بصرہ کو زر افشانی اور اپنی متکلمانہ تقریر کے زور سے مسحور کر کے اپنی امارت پر رضامند کر لیا اور اکثریت نے اس کو امیر المسلمین تسلیم کر لیا۔ ابن زیاد نے اپنے ماتحت عمرو بن حریث الخزاعی حاکم کوفہ کو یہ لکھا کہ اہلِ کوفہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اہل بصرہ کی تقلید کرتے ہوئے اس کو اپنا امیر تسلیم کر لیں۔ کوفہ میں جب اس کی تحریک شروع کی گئی تو یزید بن رویم شیبانی نے جو میدانِ کربلا میں یزیدی افواج کا سپہ سالار رہ چکا تھا شدید مخالفت کی اور کہا۔ "اسلامی امارت کے لئے ہم کو بنی امیہ کی حاجت نہیں اور نہ ہمیں ابن مرجانہ کی حکومت کی ضرورت ہے۔ بیعت اہلِ حجاز کی ہونا چاہئے۔" حسینی شہادت کا یہ زندہ معجزہ تھا کہ یزیدی افواج کے سپہ سالار بنی امیہ کی خلافت سے منکر اور اہلِ حجاز یعنی بنی ہاشم کی خلافت کے مؤید بن گئے تھے۔

عمر بن سعد نے کوفہ میں ابن زیاد کی ناکامی دیکھ کر اپنی خلافت کا رنگ جمانا چاہا چنانچہ اہل کوفہ کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہوگئی مگر دفعتہً قبائل ہمدان، کہلان، انصار ربیعہ و نخع کی عورتیں امام حسینؑ پر نوحہ و ماتم اور گریہ و زاری کرتی ہوئی مسجد میں داخل ہوئیں اور یہ کہنے لگیں۔ "کیا عمر بن سعد امام حسینؑ کو شہید کرکے ابھی راضی نہیں ہوا جو اب یہ چاہتا ہے کہ ہمارے اوپر امیر بن جائے؟" یہ سنتا تھا کہ تمام لوگ رونے لگے اور عمر بن سعد کو امیر بنانے سے باز آئے۔ (تاریخ مروج الذہب للمسعودی طبع مصر جلد ۲ ص ۶۷)۔ بقول شاعر اہلبیتؑ نجم آفندی ؎

شہیدِ ظلم! کلیجے ہلا دیئے تو نے حسینؑ! درد کے دریا بہا دیئے تو نے
ہر ایک ذرہ جس میں اک تڑپ بھر دی دماغ وضع کئے دل بنا دیئے تو نے

خونِ ناحق کے انقلابی اثرات سے عوام کا تو کیا ذکر، خود یزید کا اپنا جانشین اور فرزند معاویہ بن یزید متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اسے برسرِ منبر اپنے باپ اور دادا کی بداعمالیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے عمل سے انتہائی بیزاری و نفرت کا اظہار کرنا پڑا۔ یہ تھا **شہادتِ مظلوم کا کمال** کہ باطل نے جلالِ حق کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔ چنانچہ معاویہ بن یزید نے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی اپنے آباء واجداد کی کارستانیوں کا یوں تذکرہ کیا:-

"ایہا الناس! یہ خلافت اللہ کی مستحکم رسی تھی۔ میرے دادا معاویہ نے اس معاملہ میں خلافت کے اصل حقدار حضرت علیؑ ابن ابیطالب سے جھگڑا کیا اور وہ افعال اختیار کئے جو آپ سب کو معلوم ہیں۔ اب وہ اپنے گناہوں میں محبوس ہوکر قبر میں پہنچ گئے ہیں۔ پھر یہ منصب میرے والد کو پہنچا اور وہ اس کے مستحق نہ تھے۔ انہوں نے نواسۂ رسولؐ سے جنگ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی عمر ختم ہوگئی اور وہ بھی اپنی قبر میں گناہوں کی قید میں پہنچ گئے۔" اس کے بعد وہ رونے لگا اور کہا:-

"سب سے بڑا ہمارے لئے اس امر کا احساس ہے کہ ان کا انجام برا ہوا۔ انہوں نے اولادِ رسولؐ کو شہید کیا۔ شراب کو مباح کر دیا اور کعبہ کو برباد کیا۔ میں نے اب تک خلافت کی مٹھاس نہیں چکھی تو میں اس کی تلخی کیوں برداشت کردں۔ تم جانو اور تمہارا کام۔ مجھے خلافت سے کوئی سروکار نہیں۔ دنیا اگر کوئی اچھی نعمت ہے تو اب اس سے بہت کافی حصہ لے چکے اور اگر وہ کوئی بری چیز ہے تو جتنا ہم اب تک اس سے لیتے رہے وہی بہت کافی ہے۔" اس کے بعد وہ گھر کے اندر چلا گیا اور چالیس دن کے بعد دنیا سے رخصت ہوگیا۔ (صواعق محرقہ۔ ص ۱۳۴)

کیا یہ خونِ ناحق کا حیرت انگیز ردِّ عمل نہ تھا؟ جس قصرِ امارت کی بنیادیں خلیفۂ حق حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کرکے اور نواسۂ رسولؐ کو زہر دے کر استوار کی گئی تھیں وہ بلند بام عمارت کس طرح دھڑام سے نیچے آئی۔

معاویہ ثانی کی دست برداری پر طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنی پوزیشن زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ تمام عراق میں اضطراب کا عالم تھا۔ ابن زیاد معاویہ ثانی کی دست برداری کی خبر سن کر اپنی خلافت کو مستحکم کرنے کی غرض سے کوفہ کی طرف بڑھا تاکہ اہلِ بصرہ کی طرح اہلِ کوفہ سے بھی اپنی خلافت تسلیم کرائے۔ لیکن کوفہ میں ابنِ زیاد کی اس شدت سے مخالفت ہوئی کہ کچھ بن نہ پڑی۔ اسی اثنا میں بصرے والے جو موقع کی تلاش میں تھے باغی ہوگئے اور ابنِ زیاد نے عراق سے بھاگ کر شام میں پناہ لی۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے جو اہلِ مدینہ کی امداد سے مدینہ پر مسلط ہو چکے تھے حکم دے کر مروان کو اس کے چیچک زدہ بیٹے عبدالملک کی معیت میں شہر بدر کرا دیا۔ دونوں باپ بیٹا نہایت خستہ حالت میں شام پہنچے۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن زبیرؓ کا اقتدار تمام حجاز و عراق پر چھا گیا اور اس طرح انہوں نے قتلِ حسینؑ کے انتقام کی آڑ لے کر اپنی حکومت

کی بنیاد ڈال دی۔

قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینے کی پہلی کوشش

شہادتِ حسینؑ کے بعد اہلِ کوفہ میں سے وہ افراد جنہوں نے حضرت حسینؑ کو کوفہ تشریف لانے کی دعوت دی تھی اور حضرت امیر مسلمؑ کے ہاتھ پر امامؑ کی بیعت کی تھی لیکن آزمائش کے نازک مرحلہ پر عالی منزلت امامؑ کی عملاً کوئی امداد و نصرت نہ کر سکے ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور اپنی کمزوری پر ندامت کا اظہار کرنے لگے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہم ایک جرمِ عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہم نے امامؑ کو نصرت کے وعدہ پر دعوت دی تھی۔ جب وہ تشریف لائے تو ہم نے ایفائے عہد نہ کیا اور ان کی کوئی امداد و اعانت نہ کی۔ وہ ہمارے پڑوس میں نہایت بیدردی سے قتل کئے گئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بے وفائی و بدعہدی کا یہ عار و ننگ ہم سے اس وقت تک دور نہ ہو سکے گا جب تک ہم قاتلانِ امام عالیمقامؑ کو تلوار کے گھاٹ نہ اتار دیں یا خود اس راہ میں اپنی جانیں نہ نثار کر دیں۔ احساسِ جرم کا اثر یہ ہوا کہ سلیمان بن صرد خزاعیؓ کے مکان پر اہلِ کوفہ کا اجتماع ہوا مسیب بن نجبہ نے نہایت جوشیلے و درد آمیز انداز میں اہلِ کوفہ سے خطاب کیا جس کو تفصیل کے ساتھ مشہور مؤرخ محمد بن جریر الطبری نے لکھا ہے :۔

" مسیب نے کہا۔ ہمیں اپنی سچائی پر بڑا ناز تھا اور اپنی شیعہ جماعت کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے لیکن خدا نے ہمارا امتحان لیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ہمارے دعوے غلط ہیں۔ ہم نے امام حسینؑ کو دعوت دی۔ ان کے پاس پیغام بھیجے کہ آئیے ہم آپ کی مدد کریں گے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے اپنی جانوں کو چھپایا یہاں تک کہ وہ ہمارے پڑوس میں قتل ہو گئے۔ نہ ہم نے اپنے ہاتھوں

سے ان کی نصرت کی، نہ اپنی زبان سے ان کی حمایت کی اور نہ اموال سے ان کو تقویت پہنچائی اور نہ ہی اپنے اپنے قبیلہ کو ان کی امداد پر آمادہ کیا۔ اب ہم خدا و رسولؐ کو کیا جواب دیں گے جب کہ ہمارے ملک میں رسولؐ کا فرزند قتل کر ڈالا گیا۔ بیشک ہمارا کوئی عذر سننے کے قابل نہیں ہے لیکن اب یہ موقع ہے کہ ہم ان کے قاتل کو اور جن لوگوں نے ان کے قتل میں شرکت کی ہے سب کو قتل کریں یا اس سلسلہ میں اپنی جانیں نثار کریں۔" (طبری جلد ۷، ص ۴۸)

سلیمانؓ بن صرد خزاعی

نبی کریمؐ کے جلیل القدر صحابہ میں سے تھے اور جنگ ہائے جمل، صفین اور نہروان میں حضرت علیؑ کی نصرت میں دادِ شجاعت دے چکے تھے اس جماعت کے قائد منتخب ہوئے جو باقاعدہ ہر نماز کے بعد اپنی مؤثر تقادیر کے ذریعہ لوگوں کو خونِ ناحق کے انتقام پر ابھارتے رہے جس کا اثر یہ ہوا کہ چار پانچ ہزار افراد کی جمعیت تیار ہوگئی جنہوں نے اپنی سابقہ بے عملی و نالائقی پر اظہارِ ندامت کیا اور اپنے گناہوں سے تائب ہوئے۔ اسی وجہ سے تاریخ اسلام میں یہ گروہ جماعت **توابین** کے نام سے مشہور ہوا۔ پہلے یہ لوگ امام حسینؑ کے روضہ پر گئے اور رو رو کر اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے دعا مانگی۔ پھر خون آشام تلواریں کھینچ کر شام کا رخ کیا۔ مقام **عین الوردہ** میں اس جماعت کا لشکرِ شام سے مقابلہ ہوا۔ سب سے پہلے ستر سالہ بوڑھے جرنیل سلیمانؓ دادِ شجاعت دیتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے پھر مسیب بن نجبہ فزاری نے جو اصحابِ حضرت علیؑ میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے عَلَم بلند کیا اور اشقیاء کو فی النار کرکے شہید ہوگئے۔ اس کے بعد عَلَم لشکر عبداللہ بن وال نے لے لیا جو طبقۂ تابعین میں سے جلیل القدر شخص

تھے۔ وہ بھی جہاد کرتے ہوئے درجۂ شہادت پر پہنچے۔

یہ لڑائی کا چوتھا روز تھا۔ اب ان چار پانچ ہزار بہادروں میں سے صرف چند سو باقی رہ گئے تھے اور ان میں سے بھی اکثر زخموں کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے اور جنگ کے قابل نہ رہے تھے۔ علمِ فوج اب رفاعہ بن شدّاد بجلی کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب مقابلہ میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ مجبوراً رات کے وقت اپنی قلیل فوج کے ساتھ اپنے خیام میں آگ لگا کر واپس لوٹ آئے۔

اس طرح قاتلانِ حسین سے انتقام لینے کی پہلی کوشش اپنی منزلِ آخر تک پہنچی۔

اس میں شک نہیں کہ جماعتِ توّابین قلّتِ **افراد** و **فقدانِ سامانِ جنگ** کی وجہ سے شام کی منظّم و مسلّح فوج کے مقابل **خاطرخواہ کامیابی حاصل** نہ کرسکی لیکن **توّابین** اپنے خونِ گرم د سرخ سے تاریخِ عالم میں "**تُوبُوا اِلَی اللّٰہِ تَوبَۃً نَّصُوحًا**" (التحریم ۸) کی زندہ یادگار چھوڑ گئے۔ خوشا وہ لوگ جو بلند مقاصد کے لئے اپنی جانِ عزیز نثار کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

جماعتِ توّابین میں سے رفاعہ بن شدّاد بجلی کی معیت میں جو لوگ بچ رہے تھے انہوں نے اپنے نصب العین سے سرِمو انحراف نہ کیا، وقت آنے پر امیر مختار ثقفی کے دستِ راست کی حیثیت سے قاتلانِ امام کے خلاف جہاد میں شرکت کی اور جس مقصد کو جماعت کے سرگروہ سلیمان نے کر اٹھے تھے اس کو رفاعہ بن شدّاد بجلی اور ان کے ساتھیوں نے امیر مختار و ابراہیم نخعی کی نصرت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا کے چھوڑا۔ یہ اس خونِ ناحق کی **زندہ کرامت** تھی جو ریگزارِ کربلا پر گرایا گیا تھا۔ ایک وہ وقت بھی تھا کہ جب مظلوم کربلا کی صدائے استغاثہ "ھَل مِن نَاصِرٍ یَنصُرُنَا" پر لبیک کہنے والا کوئی نہ رہا اور بعدِ شہادت ایک وہ وقت بھی آیا کہ قاتلانِ امام سے انتقام لینے کے لئے ہزاروں فدائی پروانے شمعِ جہاد پر جائیں

نثار کر چکے تھے اور جو باقی بچے تھے وہ صعوبتوں کے صبر آزما مرحلوں سے گزر کر بھی حصول مقاصد کے بلند نصب العین کو نہ کھوئے اور اس وقت تک پیہم جدوجہد میں مصروف رہے۔ جب تک انتقام خون ناحق کے بلند مقصد کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا دیا گیا۔

قاتلانِ امامؑ کا عبرتناک انجام

سلیمانؓ بن صرد خزاعی اور ان کی جماعت توابین نے خلوصِ نیت سے کفارۂ گناہ کے طور پر اپنے ذمہ یہ فرض قرار دے لیا تھا کہ وہ قاتلانِ حسینؑ سے خونِ ناحق کا انتقام لے کے چھوڑیں گے ورنہ اس راہ میں اپنی جانیں نثار کردیں گے چنانچہ سلیمانؓ اور ان کی جماعت کے ہزاروں مجاہدین نے ہزاروں شامیوں کو فی النار کرنے کے بعد جام شہادت نوش کرلیا تھا لیکن وہ براہ راست حکومتِ شام کو جو ان کے زاویۂ نگاہ میں قتلِ حسینؑ کی اصلی مجرم تھی۔ اپنی قلیل تعداد سے خاطر خواہ نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس طرح قاتلانِ حسینؑ وقتی طور پر عذاب کی شدید گرفت سے بچے ہوئے تھے مگر قدرت اس خونِ ناحق کے مجرموں کو طویل عرصہ تک مہلت دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ آخر دعوئ حسینؑ: " سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ " کی عملی تکمیل کا وقت آپہنچا۔ مشیتِ ازلی نے حضرتِ زینبؑ کی فریاد رسی۔ جناب امام زین العابدینؑ کی دعا کی کامیابی اور امام حسینؑ کے اس عظیم الشان استغاثہ " هَلْ مِنْ مُغِيثٍ يُغِيثُنَا " جو آج بھی فضائے نیلگوں میں گونج رہا ہے۔ کی اجابت کے لئے امیر مختارؒ کی شکل میں ایک ذریعہ مقدر کر رکھا تھا۔

امیر مختار ؒ بن ابو عبیدہ ثقفی

امیر مختار ؒ روسائے عرب کے معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جب حضرت مسلم ؑ بن عقیل کوفہ پہنچے تو آپ نے مختار کے گھر قیام کیا لیکن بعد میں مختار کی عدم موجودگی میں ہانی ؒ بن عروہ کے گھر تشریف لے گئے۔ مختار ؒ اس وقت کوفہ میں موجود نہ تھے بلکہ اپنی زمینداری کی غرض سے باہر دیہات میں گئے ہوئے تھے۔ مختار ؒ کی عدم موجودگی میں ابنِ زیاد کوفہ میں وارد ہوا اور حضرت مسلم ؑ اور ہانی ؒ کو شہید کر دیا۔ مختار ؒ کی واپسی پر ابنِ زیاد نے انہیں کوفہ کے جیل خانہ میں بند کر دیا۔ امام ؑ کی شہادت کے موقع پر مختار ؒ قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے وہ غالباً اس کے بعد قتل کر دیئے جاتے مگر قضا و قدر کا منشاء پورا ہو کر رہنا تھا۔ ان کی بہن حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کی بیوی تھی۔ انہوں نے اپنی بیوی کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر یزید کو مختار ؒ کی رہائی کے لئے خط لکھ دیا۔ یزید کو حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کی پاسداری ملحوظِ خاطر تھی۔ فوراً ابن زیاد کو تاکیدی حکم نامہ بھیجا کہ مختار ؒ کو رہا کر دو۔ چنانچہ ابنِ زیاد نے بادلِ ناخواستہ مختار ؒ کو رہا کر دیا۔ رہا ہونے کے بعد مختار ؒ کو قتلِ امام ؑ کی تفصیلات معلوم ہونے لگیں۔ ان کا دل جوشِ انتقام سے بھر گیا مگر وہ تن تنہا اس کارِ عظیم کو سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ لہٰذا وہ مطلوبہ قوت کے مجتمع کرنے کی فکر میں مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ آخر وہ وقت آ پہنچا جس کے انتظار میں مختار ؒ کی آنکھیں چشم براہ تھیں۔ یزید جہنم واصل ہو چکا تھا۔ معاویہ بن یزید نے تختِ خلافت کو لات مار دی تھی۔ کوفہ و بصرہ پر عبداللہ بن زبیر ؓ اپنا تسلط جما چکے تھے اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن، قتلِ حسین ؑ کی تحریک کو ہوا دینے والا، راندۂ درگاہِ نبوی، عہدِ عثمانی کا چیف سیکرٹری اور

وزیرِ اعظم مروان بن الحکم شام کے تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد ، اپنی بیوی امِّ خالد (بیوۂ یزید) کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا اور اس کا چیچک زدہ بیٹا عبدالملک امیرالمومنین کے لقب سے تختِ شام پر متمکن تھا۔

مختارؒ کو اس کارِ عظیم کو سرانجام دینے کے لئے مدّت سے ایک معاون کی جستجو تھی۔ چنانچہ خوش قسمتی سے وہ **ابراہیم بن مالک اشترؒ** کا اشتراکِ عمل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ابراہیمؒ کے والد بزرگوار مالک اشترؓ حضرت علیؑ کی فوج کے قابل جرنیل تھے جن کی زندگی کا نصب العین جناب امیرؑ کی اعانت و نصرت تھا۔ اور جن کے متعلق حضرتِ امیرؑ خیبر گیر بسا اوقات فرمایا کرتے تھے کہ مالکؒ بن اشتر جنگ میں میرے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو میں رسول اللہ صلعم کے لئے رکھتا تھا۔ حضرت علیؑ نے انہیں مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تھا لیکن رستہ ہی میں امیرِ شام معاویہ کی سازش کا شکار ہو کر زہر کے ذریعہ شہید ہو گئے تھے۔ ابراہیمؒ کو شجاعت ورثہ میں ملی تھی لیکن عرصۂ دراز سے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے اور زہد و عبادت میں زندگی گزار رہے تھے۔ ابراہیمؒ کے علاوہ خاندانِ رسولؐ سے محبت رکھنے والے بعض ممتاز و ذی اثر مسلمان مختارؒ کے گرد و پیش جمع ہو گئے جن میں ابوالطفیلؓ بن واثلہ جو صحابۂ رسولؐ میں سے تھے۔ رفاعہؒ بن شداد بجلی جو اس سے پیشتر سلیمانؓ بن صرد خزاعی کی قیادت میں توابین کے جہاد میں شریک ہو چکے تھے اور ورقاؒ بن عاذب نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ اِن لوگوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینے کے لئے دمشق جانے کی ضرورت نہیں۔ بلاواسطہ قاتلانِ حسینؑ کوفہ ہی کے لوگ ہیں اس لئے ان سے بدلہ لینا چاہیئے اور آزادی کے ساتھ اِن سے انتقام لینا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوفہ میں مختارانہ حیثیت حاصل نہ کرلیں۔ اسی بنا پر

عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت سے تصادم ناگزیر تھا۔ چنانچہ ابن زبیرؓ کا نائب عبداللہ بن مطیع ان جانبازوں کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر کوفہ سے فرار ہوگیا اور کوفہ میں مختارؒ کی حکومت قائم ہوگئی۔

انتقام

حکومت پاکر امیر مختارؒ نے اپنے نصب العین کو فراموش نہ کیا اور چن چن کر قاتلانِ حسینؑ کو تہ تیغ کرنا شروع کردیا۔ اب خونِ ناحق کے ردِ عمل کا **تلاطم خیز طوفان** چاروں طرف موجیں مار رہا تھا اور عذابِ خداوندی نے قومِ اشقیاء کا احاطہ کرلیا تھا۔ مجرموں کو سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ مؤرخ ابوالفدا لکھتا ہے :-

"۶۶ھ میں مختار بن ابوعبیدہ ثقفی نے قصاصِ خونِ حسینؑ کے لئے خروج کیا۔ ایک جماعتِ کثیر نے ان کا ساتھ دیا حتیٰ کہ کوفہ پر مختار کا تسلط ہوگیا۔ لوگوں نے اتباعِ کتاب و سنت و طلبِ خونِ حسینؑ کے معاہدے پر امیر مختار کی بیعت کی اور مختار نے محض قاتلانِ امام حسینؑ کو قتل کرنا اپنا عزم قرار دیا چنانچہ شمر بن ذوالجوشن کو تلاش کرکے قتل کیا۔ خولی کو مار کر آگ میں جلا دیا۔ پھر عمر بن سعد کو قتل کیا جس کے حکم سے امام حسینؑ کی لاش گھوڑے کی ٹاپوں سے پامال کی گئی۔ نیز عمر سعد کا لڑکا حفص بھی قتل کیا گیا۔" (تاریخ ابوالفدا)

"امیر مختارؒ نے عمر بن سعد، حفص بن عمر بن سعد، شمر اور دیگر اشقیاء کو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ قتل کیا۔ بالخصوص شمر کو شدید عقوبت کے ساتھ مارا اور اس کی لاش کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا کیونکہ اس نے امام حسینؑ کی لاش کو پامال کرایا تھا۔" (وسیلۃ النجاۃ)

"امیر مختارؒ کے حکم سے قیس بن اشعث کی گردن ماری گئی اور بجدل بن سلیم

کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے چنانچہ وہ تڑپ تڑپ کر جہنم واصل ہوا۔ یہ وہی کمبخت تھا جس نے انگشتری کی طمع میں امام حسینؑ کی انگلیاں کاٹی تھیں۔ پھر امیر مختارؒ کے حکم سے حکیم بن طفیل کو تیر دوز کیا گیا اور یزید بن مالک، عمران بن خالد، عبداللہ بجلی، عبداللہ بن قیس، زرعہ بن شریک، صبیح شامی، سنان بن انس اور حرملہ بن کاہل وغیرہم قتل کئے گئے۔" (حبیب السیر)

"منجملہ قاتلانِ امام حسینؑ عمرو بن الحجاج بھی امیر مختارؒ کے حکم سے گرفتار ہو کر قتل ہوا۔" (روضۃ الصفاء)

"علامہ ابن حجر مکی نے ان لوگوں کی تعداد جنہیں بحیثیتِ قاتلانِ حسینؑ امیر مختارؒ نے قتل کیا ہے چھ ہزار بتائی ہے۔" (صواعق محرقہ مطبوعہ مصر۔ ص ۱۱۸)

"ماہِ محرم میں امیر مختارؒ نے ایک لشکر عبیداللہ بن زیاد سے قتال کرنے کے لئے جانبِ موصل بھیجا جہاں کا وہ والی (گورنر) تھا اور مقدمۃ الجیش ابراہیم بن مالک اشتر نخعیؒ کو کیا۔ ابنِ زیاد اور لشکرِ مختار میں شدید مقاتلہ ہوا۔ بالآخر ابن زیاد کے لوگ بھاگ نکلے اور عبیداللہ بن زیاد ابراہیمؒ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ ابراہیمؒ نے ابن زیاد کا سر کاٹ کر معہ دیگر سروں کے امیر مختار کے پاس روانہ کیا اور ابن زیاد کے دھڑ کو جلا دیا۔" (تاریخ ابوالفدا)

مشیتِ ایزدی نے شقی ازلی عبیداللہ بن زیاد کو کشاں کشاں امیر مختارؒ کی فوج تک پہنچا دیا تھا جو تیس ہزار شامیوں پر مشتمل لشکرِ کثیر کے ساتھ، عین دریائے فرات کے کنارے، ابراہیمؒ کی فوج سے متصادم ہوا۔ بقولِ علامہ ابن حجر مکی یہ عاشورِ محرم کا دن تھا جب شامی افواج کو شکستِ فاش ہوئی اور ایک بہت بڑی اکثریت جہنم واصل ہوئی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ابنِ زیاد عین معرکۂ کارزار میں ابراہیمؒ کے ہاتھ سے جہنم رسید ہوا۔ ملعونِ ابدی کا سر قلم کر

کے اس کے دیگر دفقائے کار کے سروں کی معیت میں امیر مختارؒ کے پاس بھیجا گیا اور وہ تمام سرہائے مجرمین اسی جگہ نصب کئے گئے جہاں کبھی اسی ملعون کے حکم سے فرزندِ رسولؐ عالی مرتبت امامؑ عالی مقام کا سرِ اقدس نصب کیا گیا تھا۔ یہ تھا خونِ ناحق کا **ردِّ عمل** اور یہ تھی قرآنِ ناطق حضرت امام حسینؑ کے ارشاد گرامی "سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ منقلب ینقلبون" کی جیتی جاگتی تصویر اور عملی تفسیر جب دربارِ یزید میں اہلِ بیتؑ کی تحقیر و تذلیل کو دیکھ کر غیرتِ حسینی جوش میں آگئی تھی تو کٹے ہوئے سرِ حسینؑ نے یزید ملعون کو تہدید کرتے ہوئے قرآن کی زبان میں متنبہ کیا تھا کہ "عنقریب وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہے یہ جان لیں گے کہ کس کروٹ وہ پلٹتے ہیں۔" (الشعراء ۲۲۷)

امیر مختارؒ اپنا مقصدِ حیات پورا کر چکے تھے۔ اب وہ چکی کے دو پاٹوں کے اندر تھے۔ ایک طرف حکومتِ شام یلغار کر رہی تھی۔ دوسری طرف سے عبداللہ ابن زبیرؓ حاکمِ ارضِ مقدس درپے آزار تھے۔ چنانچہ ابن زبیرؓ کا بھائی مصعب ایک فوجِ گراں لے کر بصرہ سے امیر مختارؒ کے مقابلہ کے لئے آیا۔ اس موقع پر اتفاق سے امیر مختارؒ کے پاس ان کی فوج کے روحِ رواں ابراہیمؒ بن مالک اشتر موجود نہ تھے اور ان کی فوج بھی متفرق تھی۔ مجبوراً باقی ماندہ فوج لے کر مقابلہ کے لئے نکلے۔ قاتلانِ حسینؑ میں سے ایک شخص محمد بن اشعث بھاگ کر مصعب کے پاس چلا گیا تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہی کمبخت ازلی تھا جس نے قتلِ امامؑ کے بعد جسمِ مقدس سے تمام کپڑے اتار کر اسے یوں ہی ننگا چھوڑ دیا تھا۔ اب امیر مختارؒ کے مقابلہ میں جو لشکرِ گراں آیا تھا اس میں یہ شقی بھی موجود تھا۔ یہی ایک شخص ایسا رہ گیا تھا جس کی امیر مختارؒ کو فکر تھی۔ قضاو قدر نے اس کی گرفت کے لئے بھی وقت معین کر رکھا تھا چنانچہ اس لڑائی میں امیر مختارؒ کی فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

امیر مختارؒ نے محمد بن اشعث کے قتل کے بعد یہ سمجھ لیا کہ زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اب داعیٔ اجل کو لبیک کہنا ضروری ہے۔ اپنے قلیل ساتھیوں کو لے کر انتہائی جرأت و بہادری سے جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ مختارؒ جنگ میں شہید ہو گئے مگر اس طرح سے کہ خونِ حسینؑ کا انتقام لے کر خود بھی **زندۂ جاوید** ہو گئے۔ **خوش نصیب تھے مختارؒ** جو مشیتِ ایزدی کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ قدرت نے ان کی ذاتِ گرامی کے ساتھ اپنا ایک پروگرام وابستہ کر رکھا تھا۔ اسی پروگرام کی تکمیل کے ساتھ ان کی زندگی بھی اختتام پذیر ہوئی۔ دنیوی سلسلۂ حیات تو کٹ لیکن اہلبیتِ اطہارؑ کے دامانِ عاطفت میں پہنچ کر دائمی امن و سکون تو حاصل ہو گیا۔

امیر مختارؒ کی دینداری اور مخالفین کا بے بنیاد پراپیگنڈا

بالعموم کتب تواریخ میں مختار علیہ الرحمۃ کی نہایت بھیانک تصویر پیش کی گئی ہے اور ان کو کاذب، مفتری، خود غرض اور فاسد عقیدہ کا آدمی ظاہر کیا گیا ہے اس کی وجہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ امیر مختارؒ کی لڑائیاں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے ہوئیں جن کو وہ تمام مؤرخین جن کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں خلیفۂ برحق مانتے تھے۔ خلیفۂ برحق کے خلاف بغاوت کرنے والے شخص کی جو تصویر اس قسم کے متعصب مؤرخین پیش کریں گے عقلِ سلیم اس کا بخوبی اندازہ کر سکتی ہے۔ امیر معاویہ تو خلیفۂ برحق حضرت علیؑ کے خلاف صفین کی جنگیں لڑتے رہے لیکن پھر بھی وہ امیر المومنین حضرت امیر معاویہ ہیں اور "رضی اللہ عنہ" کی ردائے مغفرت اوڑھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ تو اموی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور انہوں نے شاطرانہ عیاری سے حکومتِ شام کا استمراری پٹہ اپنے نام لکھوا لیا

تھا لہٰذا مرکزی حکومت و خلافتِ راشدہ کے خلاف ان کی بغاوت اجتہادی غلطی سے تعبیر کرکے ان کو قابلِ مواخذہ نہ سمجھا گیا۔ برعکس اس کے امیر مختارؒ بیچارہ تو شیعہ تھا اور خونِ حسینؑ کا بدلے رہا تھا۔ اس کو اجتہادی غلطی کا فائدہ نہ مل سکتا تھا لہٰذا اس کے لئے ملعون و کذّاب کے الفاظ وضع کئے گئے اور اس کے حالات و واقعات اسی متعصبانہ و غیر مورخانہ ذہنیت کے تحت لکھے گئے۔ بقول آغا سلطان مرزا" اس کے اقوال و افعال کی تعبیریں اسی نہج سے کی گئیں۔ اوّل تو شیعہ مورخین ہی بہت کم ہوئے۔ ان کی تاریخ کو کون قبول کرتا۔ اگر اس میں کچھ حکومت کے مزاج کے خلاف ہوتا تو جان اور آبرو دونوں گئی تھیں۔ اندریں صورت شیعوں کی تاریخ تو سینہ بسینہ ہی آئی ہے اور جس نے کوئی تاریخ لکھی ہے اس نے بعینہٖ سنی تواریخ کی روایتوں کو نقل کردیا شیعہ مصنفین نے بغیر کسی تنقید و جرح کے سنیوں کی تواریخ کی روایتوں کو قبول کرلیا۔ اسی کا اثر ہم بہت کچھ ناسخ التواریخ اور موجودہ زمانہ کی اعیانِ شیعہ میں دیکھتے ہیں۔" (نور المشرقین آغا محمد سلطان مرزا۔ ریٹائرڈ سیشن جج۔ ص ۱۱۰)

ہم روضۃ الاحباب جمال الدین محدّث سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ اس کو مُلّا نورالدین عبدالرحمٰن جامی نے بھی شواہد النبوۃ میں بیان کیا ہے۔ یہ روایت امام زین العابدینؑ کی دعا کی قبولیت اور امیر مختارؒ کی خلوص نیت و سعیٔ عمل، حُبِّ اہلبیتؑ اور دینداری پر کافی روشنی ڈالتی ہے:-

" عمرو بن منہال سے مروی ہے کہ میں کوفہ سے مکّہ معظمہ بغرض حج گیا تھا۔ امام زین العابدینؑ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے حُرملہ بن کاہل اسدی کا حال دریافت کیا۔ میں نے کہا۔ حُرملہ کوفہ میں موجود ہے۔ یہ سن کر امام زین العابدینؑ نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے اور کہا" بارالہٰا! حرملہ کو گرمیٔ تیغ کا مزا چکھا۔ خدایا!

اس کو آتشِ جہنم کا مزا چکھا۔" جب میں کوفہ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ امیر مختارؒ نے خروج کیا ہے۔ چونکہ مجھ سے امیر مختارؒ کی پرانی دوستی تھی میں ان سے ملنے گیا مختار اس وقت کہیں کے قصد سے سوار ہو رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ اتنے میں لوگ حرملہ بن کاہل کو گرفتار کر کے لائے۔ مختارؒ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ جس نے مجھ کو تجھ پر غلبہ عطا فرمایا۔ بعد ازاں حکم دیا کہ حرملہ کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اس کو آگ میں جلا دیں۔ چنانچہ وہ اسی وقت ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا دیا گیا۔ یہ حال دیکھ کر میں نے تعجب سے کہا۔ "سبحان اللہ!" امیر مختارؒ نے مجھ سے سبحان اللہ کہنے کا سبب پوچھا۔ میں نے امام زین العابدینؑ کی ملاقات اور ان کی دعا کا مفصل ذکر کیا۔ امیر مختارؒ نے قسم دے کر دریافت کیا کہ کیا تم نے واقعی امام زین العابدینؑ کی زبان سے یہ دعا سنی۔ میں نے کہا۔ "ہاں!" یہ سن کر امیر مختارؒ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے۔ دو رکعت نماز پڑھی اور سجدۂ شکر ادا کیا۔

(تاریخ احمدی۔ص ۳۲۷)

مذکورہ روایت سے یہ صاف عیاں ہے کہ جب امیر مختارؒ نے عمرو بن منہال سے بذریعہ سوگند اس کے بیان کی صحت کی تصدیق کر لی تو فوراً گھوڑے سے اتر کر دو رکعت نماز گزاری اور سجدۂ شکر ادا کیا۔ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ مختارؒ نے اپنے خدا کے حضور یقیناً یہ کہتے ہوئے شکریہ ادا کیا کہ بارالہا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھ ناچیز کو یہ توفیق مرحمت فرمائی کہ میں قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینے میں کامیاب ہوا اور امامؑ ابنِ امامؑ جناب زین العابدینؑ کی دعا کو مستجاب کرنے اور شرفِ قبولیت عطا فرمانے کے لئے مجھ جیسے حقیر کو ذریعہ بنا دیا۔ فی الحقیقت امیر مختارؒ کے دل و دماغ میں تشکر آمیز مسرت کی لہر دوڑ گئی ہوگی جب اس نے یہ سوچا ہوگا کہ حرملہ کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اس کو جلا دینا عین دعائے امامؑ اور منشا ئے

خداوندی کے مطابق ہوا۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جن کو خدا کی رضا حاصل ہو اور قدرت کا کوئی پروگرام ان کی ذات سے وابستہ ہو۔

ایسی روایت کی موجودگی میں امیر مختارؒ کی نسبت بدگمانی و سوئے ظن کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ آئمۃ الطاہرینؑ کی جانب سے ان کی نسبت حسنِ ظن کی ہدایت کی گئی ہو۔ چنانچہ حضرت شہیدِ ثالث رحمہ مجالس المومنین میں مختار علیہ الرحمۃ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"علامہ حلّی او را از جملہ مقبولان شمردہ۔ در حسنِ عقیدہ او شیعہ را سخنے نیست۔ غایۃ الامر جوں در بعضے از اعمالِ او اعتراض داشتہ اند و او را بذم و شتم وا نمودہ اند۔ حضرت امام محمد باقرؑ بہ ایں معنی اطلاع یافتہ شیعہ را از تعرضِ مختارؒ منع نمودند و فرمودند کہ او کشندگانِ ما را کُشت و زنانِ بیوہ شیعہ ما را تجہیز کردہ بشوہر داد و در ایّامِ عسرت از مالِ بیت المال کہ در تصرفِ او بود مبلغہائے کلی بسلسلہ ما فرستاد ومنقول است کہ حضرت امام جعفر صادقؑ بر او رحمت فرستاد۔" (مجالس المومنین۔ مطبوعہ بمبئی۔ ص ۳۴۶)

(ترجمہ) "علامہ حلّی نے مختارؒ کو مقبولینِ خدا میں شمار کیا ہے۔ شیعوں کو ان کے حسنِ عقیدہ پر بدگمانی نہ کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ جب شیعوں نے ان کے بعض اعمال پر نکتہ چینی کی اور ان کو برا بھلا کہا اور اس کی خبر امام محمد الباقرؑ کو ہوئی تو آپ نے شیعوں کو اس سے روکا اور فرمایا کہ مختارؒ ہمارے قاتلوں کو قتل کرنے والا ہے۔ اس نے ہمارے شیعوں کی بیوگان کو مال دے کر اُن کو شوہر دلائے اور زمانۂ تنگی میں اپنے بیت المال سے ہمارے پاس مال بھجوایا اور یہ بھی منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ مختارؒ کے لئے دعائے خیر فرمایا کرتے تھے۔"

مبارک ہے وہ ہستی جو قاتلانِ حسینؑ کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر اہلبیتِ رسالت

کے دلوں کو ٹھنڈا کرے۔ کتنی خوش نصیب اور بلند مرتبت ہے وہ ذاتِ گرامی جس کے لئے صادقِ آلِ محمدؐ ہمیشہ دست بدعا رہیں۔

انقلابِ ناگزیر اور بنی امیہ کی دائمی ہلاکت

قتلِ حسینؑ میں براہِ راست شرکت کرنے والے اشرار موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے اور اس طرح عوام کے دلوں میں جذبۂ انتقام کی شعلہ زن آگ قدرے سرد پڑ گئی تھی لیکن مکمل طور پر بجھی نہ تھی۔ ان کے دل و دماغ میں ابھی تک یہ خیال جاگزیں تھا کہ خونِ ناحق کی اصل مجرم حکومتِ شام ہے جس نے اپنے قاہرانہ استبداد سے مظلومیت اور حق و انصاف کی ہر آواز کو دبانے کی کوشش کی ہے اور خاندانِ رسالت کو کچلنے میں انتہائی بہیمیت و بربریت کا ثبوت دیا ہے۔ جب تک حکومتِ شام کا تختہ نہ الٹ دیا جائے نہ تو انتقامِ خونِ حسینؑ کا مقصد پورا ہوتا ہے اور نہ ہی اموی مظالم کا لامتناہی سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ عوام کے اس قسم کے خیالات و جذبات سے استفادہ کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اموی حکومت کے مقابلہ میں آ کھڑے ہوئے تھے اور ارضِ مقدس میں اپنی خلافت کا سنگِ بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بنی عباس نے بھی سیاسی کروٹ لی اور انتقامِ خونِ حسینؑ کی آڑ لے کر بنی امیہ کے خلاف اپنی سیاسی تدابیر کو بروئے کار لانے کی سعی کی۔ اس طرح سے حکومتِ شام کے خلاف نفرت کا طوفان برابر بڑھتا چلا گیا۔

عبدالملک اموی نے اپنی سیاسی تدابیر، ولید نے اپنی جابرانہ قوت و شوکت اور ہشام نے اپنی منتقمانہ حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہو کر اس سیلابِ بلا کو روکنا چاہا لیکن یہ نہ رکا بلکہ جوں جوں اس کے روکنے کے لئے تشدد بڑھتا گیا اسی قدر

نفرت کا جو بیج اموی حکومت کے خلاف کربلا میں بویا گیا تھا، زمین کی زیادہ سے زیادہ گہرائیوں تک پہنچتا گیا۔ آخر وہ بڑھتے بڑھتے ایک ایسے تناور درخت کی صورت میں رونما ہوا جس کو اموی تشدد کے بلاخیز طوفانوں کے مہیب اور تیز و تند جھونکے بھی نہ ہلا سکے۔ اسی حقیقت کی طرف جناب رسالتمآبؐ کی اس حدیث کا اشارہ ہے جس میں قتلِ حسینؑ کی پاداش میں قتل ہونے والے مجرموں کی تعداد کو "سبعین الفاً" کے تکرار سے ظاہر کیا گیا ہے۔

لفظ "سَبْعِیْن" عربی لغت میں ستر (۷۰) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن محاورہ کے طور پر اس کا اطلاق کثرتِ تعداد پر ہوتا ہے۔ قاتلانِ حسینؑ کے سلسلہ میں "**سَبْعِیْنَ اَلْفاً**" (ستر ہزار) کا تکرار صرف ایک لاکھ چالیس ہزار کی کثرتِ تعداد پر دلالت نہیں کرتا بلکہ دو مختلف تاریخی واقعات کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ پہلا تاریخی واقعہ وہ ہے کہ جب قتلِ حسینؑ میں براہِ راست شرکت کرنے والے لوگ امیر مختارؒ کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچے جس پر ہم بالتفصیل بحث کر چکے ہیں۔ اور دوسرا تاریخی واقعہ وہ ہے کہ جب خونِ حسینؑ کے انتقام کی آڑ لے کر سفاح عباسی اور ابو مسلم خراسانی نے خاندانِ امیہ کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا اور عباسی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اب ہم بنی امیہ کی اس عبرتناک تباہی و دائمی ہلاکت کو تاریخی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

اموی تباہی کا پس منظر

بنی امیہ کے خلاف ہر اٹھنے والی تحریک کا مرکز وہی کوفہ تھا جہاں سرِ حسینؑ کو نوکِ سناں پر سوار کر کے اس غرض سے تشہیر کیا گیا تھا کہ عوام شاہانہ جاہ و جبروت دیکھ کر خائف ہو جائیں اور پھر کبھی حکومتِ شام کے خلاف بغاوت کی جرأت نہ کریں اور یہ سمجھ لیں کہ اگر ہم نے بغاوت کی تو ہمارے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جائے گا

جو نواسۂ رسولؐ کی علوِ مرتبت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ کی ذاتِ قدسی صفات کے ساتھ روا رکھا گیا۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ حامیانِ حکومت کی یہ بھول تھی۔ اسی کوفہ سے جماعتِ توّابین اٹھی۔ امیر مختارؓ نے اسی کوفہ میں قاتلانِ حسینؑ کے خلاف تحریک شروع کی تھی اور اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کے چھوڑا۔ بنی امیّہ کے نت نئے مظالم سے تنگ آکر زید بن علی بن حسین علیہم السلام نے کوفیوں کے بھروسے پر اسی کوفہ میں حکومتِ شام کے خلاف خروج کیا۔ یہی کوفہ عباسی دعوت کا مرکز بنا اور اموی حکومت کی تباہی پر اسی کوفہ میں سفاح عباسی کی خلافت کا اعلان ہوا۔ اموی مظالم کے سلسلہ میں رائٹ آنریبل سید امیر علی لکھتے ہیں :-

"زید اور ان کے لڑکے یحییٰ کو بنی امیّہ کے مظالم نے تلوار سے اپنی حفاظت کرنے پر آمادہ کیا۔ بنو حسنؑ اور بنو حسینؑ مدینہ میں نہایت قلیل آمدنی پر گوشۂ تنہائی میں گزارہ کرتے تھے۔ سیاسیات میں مطلقاً حصہ نہیں لیتے تھے لیکن ان کے علم و فضل اور زہد و عبادت کی وجہ سے لوگ ان کی بہت عزّت کرتے تھے جس وجہ سے بنو عباس و بنوامیّہ انکے مخالف تھے اور انہیں طرح طرح سے اذیّت دیتے تھے اور قتل کرتے تھے۔ اس طرح بعض ان میں سے محض حفاظتِ خود اختیاری کے اصول پر تلوار بھی اٹھا لیتے تھے۔"

مؤرخ ابوالفدا لکھتا ہے کہ ۱۲۲ھ میں زید بن علی بن حسینؑ نے کوفہ میں خروج کرکے لوگوں کو اپنی طرف بلایا اور ایک جماعتِ کثیر نے ان کی بیعت کی۔ اس وقت منجانب ہشام، یوسف بن عمر ثقفی حاکمِ کوفہ تھا۔ اس نے لشکر جمع کرکے زید بن علیؑ سے مقاتلہ کیا۔ زید بن علیؑ کی پیشانی پر تیر لگا۔ لوگ ان کو ایک گھر میں اٹھا لے گئے اور انہوں نے وفات پائی۔ (تاریخ ابوالفدا)

یوسف بن عمر ثقفی نے زید شہید کا دھڑ سولی پر چڑھا دیا اور سر ہشام بن عبدالملک

کے پاس بھیج دیا۔ (تاریخ ابن الوردی)

جب زید شہید کا برہنہ جسم دار پر چڑھایا گیا تو مکڑی نے جالا لگا کر ان کی شرمگاہ کو چھپا دیا۔ (تاریخ خمیس)

آپ کے سر اقدس کو ہشام نے دمشق کے دروازے پر لٹکوا دیا تھا اور جسم مقدس کو کناسہ کے مقام پر صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ تا آنکہ ۱۲۵ھ میں (قریباً دو تین سال بعد) ہشام دار الجہنم پہنچا اور ولید نے تخت نشین ہوتے ہی جسم کو اتروا کر آگ میں جلوا دیا تھا۔ حضرت زید شہید کے بیٹے حضرت یحییٰ اپنے باپ کی شہادت کے بعد خراسان میں پناہ گزین ہوئے لیکن حکومت کے کارندوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر وہ اپنے اصحاب کی معیت میں حکومتِ شام کی افواج سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی لاش جوزجان میں لٹکائی گئی اور یہ لاش وہاں اسی طرح کئی سال لٹکتی رہی تا آنکہ خراسان میں ابو مسلم کا غلبہ ہوا اس نے اس کو اتار کر اس پر نمازِ جنازہ پڑھی اور دفن کر دیا۔

(ملخص از اردو ترجمہ تاریخ کامل۔ حصہ دوم۔ خلافت بنی امیہ۔ ص ۱۱۴)

یحییٰ کے قتل نے خراسانیوں کو بہت مشتعل کر دیا تھا۔ تمام ملک نے اس کا ماتم کیا۔ ہر نرینہ بچے کا نام جو یحییٰ کے قتل والے دن پیدا ہوا تھا، یحییٰ رکھا گیا یحییٰ کے قتل نے بنو امیہ کے سقوط میں بہت سرعت پیدا کر دی۔

(ہسٹری آف سارسینز۔ سید امیر علی۔ ص ۱۹۵)

سلطنتِ اموی کے چاروں کونوں میں پہلے ہی خونِ حسینؑ کا غلغلہ تھا اور آتشِ انتقام شعلہ زن تھی۔ اب زید بن علیؑ اور ان کے بیٹے یحییٰ کی مظلومانہ شہادت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تمام لوگوں کے جذبات بنو امیہ کے خلاف بھڑک اٹھے اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ حکومتِ شام کی بیخ کنی کرنی چاہیے اور بنو فاطمہ

کو ان کا حق ہر قیمت پر ملنا چاہیئے۔ امام حسینؑ کی دردناک شہادت سے عوام کے دلوں میں جو ہمدردی و محبت خاندانِ رسولؐ سے پیدا ہو چکی تھی اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے بنو عباس آگے بڑھے۔ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کی ابتدا اس قول سے کی کہ ہم تو سب کچھ بنی فاطمہ کے لئے کر رہے ہیں۔ وہی اس کے اہل ہیں، اور ان ہی پر ظلم ہوا ہے۔ یہ حق ان ہی کا ہے۔ یہاں تک کہ جب بنو امیہ کے پیر لرزنے لگے اور ان کا چراغ گل ہوتا ہوا نظر آیا تو بنو ہاشم نے جن میں بنو عباس بھی شامل تھے مدینہ میں ایک جلسہ کیا۔ اس میں سب نے **محمد نفس الزکیہ** کو خلیفہ منتخب کر لیا اور سب نے، یہاں تک کہ ابو جعفر عبداللہ نے بھی جو بعد میں منصور عباسی کے لقب سے خلیفہ ہوا ان کی بیعت کر لی اور اس طرح انہوں نے بھی اولادِ رسولؐ کو آخری وقت تک فریب میں مبتلا رکھا حتیٰ کہ مسجد کوفہ میں ابو سلمہ نے عبداللہ ابو العباس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔

عباسی تحریک

حضرت امام حسینؑ کی شہادت سے فائدہ اٹھانے کا خیال سب سے پہلے **محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ** کو پیدا ہوا۔ اس نے لوگوں کے مشتعل جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ایلچیوں کا جال تمام مملکت میں پھیلا دیا۔ کوفہ و خراسان عباسی دعوت کے مرکز بن گئے۔ محمد عباسی نے خراسان کو اپنی دعوت کا مرکز قرار دینے میں انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ اموی سلطنت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے کئی اعتبار سے یہ نہایت ہی بہترین مقام تھا۔ اہلِ خراسان نومسلم تھے اور انہیں اہلبیتِ رسالتؐ سے انتہائی محبت تھی اور ان کی امداد و نصرت اپنا دینی و اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ یحییٰ کے قتل سے ان کے جذبات انتہائی مشتعل تھے۔ دارالسلطنت سے دور ہونے کی بناء

پر حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کامیابی سے چلایا جا سکتا تھا۔ عربوں کے ناروا سلوک سے وہ انتہائی طور پر نالاں تھے۔ خوبیِ قسمت سے عباسی دعوت کے پھیلانے کے لئے **ابو مسلم خراسانی** سا ہوشیار و مدبر اور زمانہ شناس شخص مل گیا۔ محمد عباسی تو ۱۲۵ھ میں فوت ہوگیا لیکن اپنی موت سے پہلے اپنے بیٹوں ابراہیم، عبداللہ ابوالعباس اور عبداللہ ابوجعفر کو یکے بعد دیگرے اپنا جانشین اور اس تحریک کا سردار مقرر کر دیا۔ ابراہیم عباسی اور اس کے دستِ راست نے اس تحریک کو نہایت کامیابی سے چلایا۔ جب ابو مسلم خراسانی کے خونِ ناحق کا انتقام لینے کے لئے **مرو** میں **سیاہ جھنڈا** کھولا تو ہزاروں آدمی امویوں کی بیخ کنی کے لئے اس کے لئے نیچے جمع ہو گئے۔ حکومت امیّہ کا داخلی نظام عیش پرستیوں اور بدمستیوں کی وجہ سے پہلے ہی متزلزل ہو رہا تھا شہادتِ عظمٰی کے ردّ عمل کے طوفانی سیلاب کے ایک ہی ریلے سے درہم برہم ہو کر رہ گیا حکومتِ شام کا آخری اموی بادشاہ **مروان ثانی جنگِ زاب** میں مارا گیا۔ اس کی موت پر اموی حکومت اور اس کی شان و شوکت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ تمام نسلِ امیہ کے حصے میں ہلاکت و ذلّت اور جلاوطنی اس طرح آئی کہ تاریخِ عالم میں شاید ڈھونڈے سے بھی اس کی نظیر نہ مل سکے۔

سفّاح

ابوالعباس عبداللہ بن محمد عباسی نے جو تاریخ کے صفحات پر سفاح (خونخوار) کے ہیبت ناک نام سے مشہور ہے تختِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی بنی امیہ کو چن چن کر تہ تیغ کیا اور ان کا ایک ایک بچہ بھی زندہ نہ چھوڑا۔ خاص دمشق میں جہاں کبھی اہلِ بیت اطہارؑ کو در بدر تشہیر کیا گیا تھا ستر (۷۰)

سرکردہ بنی امیہ کو ضیافت کے بہانے دعوت دی گئی۔ لاٹھیوں اور گرزوں سے ان کے سر پاش پاش کئے گئے۔ ان لاشوں پر دسترخوان بچھا کر سب نے کھانا کھایا۔ ان میں سے اگر کسی کے سسکنے یا کراہنے کی آواز آتی تو اس پر خوب قہقہہ لگایا جاتا تھا۔ ماسوائے عمر بن عبدالعزیز تمام خلفائے بنی امیہ کی قبریں اکھڑوائی گئیں۔ اگر ایک ہڈی بھی دستیاب ہوئی تو اس کو آگ میں جلا کر اس کی خاک کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ صرف ہشام کی لاش صحیح و سالم نکلی۔ اس کو سولی پر لٹکایا گیا۔ یہ شاید زید شہید کی لاش کو سولی پر لٹکوانے کی سزا قضا و قدر نے مقدر کر رکھی تھی۔

بنی امیہ کی تباہی کے حالات جناب سید الاعلیٰ مودودی یوں تحریر فرماتے ہیں:-

"بنی امیہ کے دارالسلطنت دمشق کو فتح کر کے عباسی فوجوں نے وہاں قتل عام کیا جس میں پچاس ہزار آدمی مارے گئے۔ ستر دن تک جامع بنی امیہ گھوڑوں کا اصطبل بنی رہی۔ حضرت معاویہؓ سمیت تمام بنی امیہ کی قبریں کھود ڈالی گئیں ہشام بن عبدالملک کی لاش قبر میں صحیح سلامت مل گئی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا۔ چند روز تک اسے منظر عام پر لٹکائے رکھا گیا اور پھر جلا کر اس کی راکھ اڑا دی گئی بنی امیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھایا گیا۔ بصرے میں بنی امیہ کو قتل کر کے ان کی لاشیں ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹی گئیں اور انہیں سڑکوں پر ڈال دیا گیا جہاں کتے انہیں بھنجھوڑتے رہے۔ یہی کچھ مکہ اور مدینہ میں بھی ان کے ساتھ کیا گیا۔" (خلافت و ملوکیت ص ۱۹۲-۱۹۳ بحوالہ ابن الاثیر جلد ۴۔ البدایہ۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۵۔ ابن خلدون۔ جلد ۳۔ ص ۱۳۲-۱۳۳)

حسینی نوحہ خواں سدیف بن میمون شاعر انقلاب کی حیثیت سے سفاح کے دربار میں عوام کے ذہنی تصورات و قلبی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے سفاح کو دعوت

کے پاس بھیج دیا۔ (تاریخ ابن الوردی)

جب زید شہید کا برہنہ جسم دار پر چڑھایا گیا تو مکڑی نے جالا لگا کر ان کی سترگاہ کو چھپا دیا۔ (تاریخ خمیس)

آپ کے سرِ اقدس کو ہشام نے دمشق کے دروازے پر لٹکوا دیا تھا اور جسم مقدس کو کناسہ کے مقام پر صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ تا آنکہ ۱۲۵ھ میں (قریباً دو تین سال بعد) ہشام دار الجہنم پہنچا اور ولید نے تخت نشین ہوتے ہی جسم کو اتروا کر آگ میں جلوا دیا تھا۔ حضرت زید شہید کے بیٹے حضرت یحییٰ اپنے باپ کی شہادت کے بعد خراسان میں پناہ گزین ہوئے لیکن حکومت کے کارندوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر وہ اپنے اصحاب کی معیت میں حکومتِ شام کی افواج سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی لاش جوزجان میں لٹکائی گئی اور یہ لاش وہاں اسی طرح کئی سال لٹکتی رہی تا آنکہ خراسان میں ابومسلم کا غلبہ ہوا اس نے اس کو اتار کر اس پر نمازِ جنازہ پڑھی اور دفن کر دیا۔

(ملخص از اردو ترجمہ تاریخ کامل۔ حصہ دوم۔ خلافت بنی امیہ۔ ص ۱۸۱م)

یحییٰ کے قتل نے خراسانیوں کو بہت مشتعل کر دیا تھا۔ تمام ملک نے اس کا ماتم کیا۔ ہر نرینہ بچے کا نام جو یحییٰ کے قتل والے دن پیدا ہوا تھا، یحییٰ رکھا گیا یحییٰ کے قتل نے بنو امیہ کے سقوط میں بہت سرعت پیدا کر دی۔

(ہسٹری آف سارسینز۔ سید امیر علی۔ ص ۱۶۵)

سلطنتِ اموی کے چاروں کونوں میں پہلے ہی خونِ حسینؑ کا غلغلہ تھا اور آتشِ انتقام شعلہ زن تھی۔ اب زید بن علیؑ اور ان کے بیٹے یحییٰ کی مظلومانہ شہادت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تمام لوگوں کے جذبات بنو امیہ کے خلاف بھڑک اُٹھے اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ حکومتِ شام کی بیخ کنی کرنی چاہیے اور بنو فاطمہ

اجڑے ہوئے ہیں۔ یہ نالائق اسی لائق ہیں کہ ان سے وہ سلوک کیا جائے جس کے یہ مستحق ہیں"۔

یہ اشارہ کافی تھا۔ شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ خاوند شاہ لکھتا ہے:

"دمشق را از پیر و جواں، قوی و ناتواں، شیوخ و اطفال، نساء و رجال باسیری گزفتند"۔ (خلافت اسلامیہ۔ حصہ دوم۔ ص ۸۱)

یہ تھا خونِ ناحق کا ردِ عمل اور یہ تھا انقلابِ ناگزیر جس کو شہادتِ عظمیٰ وجود میں لائی اور جو بنی امیہ کی دائمی ہلاکت پر منتج ہوا۔ سفاح و مختارؒ کے ہاتھوں بنی امیہ اور ان کے ہواخواہوں کا قتل خونِ ناحق کا شرعی قصاص نہ تھا بلکہ خدا کی طرف سے مقدر کردہ عذاب تھا جو مجرموں کو ان کے جرائم کی پاداش میں ملنا چاہیئے تھا۔ یہ تھی خونِ ناحق کی فتح مندی و کامرانی کہ جس نے انقلابات و تغیرات کے سیلاب بہا دیئے، اور باطل کے پرچم کو ہمیشہ کے لئے سرنگوں کر دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس حقیقت کی بہترین ترجمانی کی ہے:۔

"تاہم فتح اس کی تھی اور فیروزمندی و کامرانی کا تاج اسی زخم خوردہ کے سر پر رکھا جاچکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خوں میں لوٹا پر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالمِ اضطراب میں اس کے زخموں سے ریگ و سنگ پر بہتا تھا۔ انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دیئے جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی نہ حجاج کی بے امان خونخواری اور نہ عبدالملک کی تدبیر و سیاست۔ وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان کے شعلوں کی پرورش کرتا رہا اور حکومت و تسلط کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک ایک چنگاری کو آتشکدۂ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آگیا اور جو کچھ سنہ ۶۱ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا وہ سب کچھ سنہ ۱۳۲ھ میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالم

اسلامی کے اندر ہوا۔ صاحبانِ تخت و تاج خاک و خوں میں تڑپے۔ ان کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں۔ فتحمندوں نے قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور مُردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا اور اس طرح "وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ" کا پورا پورا ظہور ہوا۔ پھر کیا یہ سب کچھ جو ہوا وہ محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابو مسلم کی خفیہ ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا؟ کیا یہ اسی خون کا اعجاز نہ تھا جو فرات کے کنارے بہایا گیا؟ پھر یہ فتح مندی تو ظاہر ہے جس کے نتائج کے لئے ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ ورنہ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے اسی وقت اپنی معنوی فتح مندی حاصل کر لیتا ہے۔" (داستانِ کربلا۔ نفیس اکیڈمی۔ حیدرآباد دکن۔ ص ۱۳۹ - ۱۴۰)

آلِ ابوسفیان و آلِ مروان کی عبرت خیز و حیرت انگیز تباہی و ہلاکت کی پیشین گوئی خود قرآنِ حکیم میں موجود ہے لیکن بصارت رکھنے والی آنکھیں چاہئیں جو اسے دیکھ سکیں اور عقلِ سلیم چاہئے جو اس کا جائزہ لے سکے۔

تفسیر سورۂ کوثر

حضرت رسالتمآبؐ کے بیٹے عبداللہ المعروف بہ طیب و طاہر کے انتقال فرمانے پر مشرکینِ مکہ جن کے راس و رئیس ابوسفیان اموی تھے۔ طنزاً کہنے لگے کہ آنحضرتؐ (العیاذ باللہ) ابتر یعنی بے نسل ہو چکے ہیں اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے **مشن** کے چلانے والا ناپید ہوگا۔ اس طرح آپؐ کا کام ادھورا رہ جائے گا اور اسلام کی نشر و اشاعت کا خود بخود خاتمہ ہو جائیگا۔ حضرت رسالتمآبؐ کفار کے طعن و تشنیع سن کر ملول و کبیدہ خاطر ہوئے تو فوراً غیرتِ خداوندی جوش میں آئی اور اپنے محبوب کی تشفی کے لئے سورۂ کوثر نازل فرمائی۔

إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَٱنْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ ٱلْأَبْتَرُ ۝

(ترجمہ) یقیناً (اے رسولؐ) ہم نے تم کو کوثر (خیرالکثیر و کثرتِ اولاد) عطا کی ہے پس تم اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ یقیناً تمہارا دشمن دُم بریدہ و منقطع النسل ہو گا۔

پھر مدنی زندگی کے دوران آنحضرتؐ کے بیٹے ابراہیم کے فوت ہونے پر کعب بن اشرف یہودی کی شر انگیزی سے متأثر ہو کر ابو سفیان اموی و دیگر منافقین نے اظہارِ مسرت کیا اور دیرینہ پروپیگنڈا پھر شروع کر دیا کہ آنحضرتؐ تو منقطع النسل ہو چکے ہیں اور اس طرح تبلیغِ دینِ حق کا کام جو ان کی زندگی سے وابستہ ہے ان کی موت کے بعد خود بخود درہم برہم ہو کر رہ جائیگا اور اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اس پر پروردگارِ عالم نے سورۂ کوثر کا مکرر نزول فرما کر اپنے حبیبؐ کی تشفی و دلجمعی فرمائی کہ آپؐ رنجیدہ نہ ہوں۔ آپ کو خیرِ کثیر عطا کی گئی ہے آپؐ کی ذریتِ طیبہ بکثرت پھیلے گی۔ اسلام تو ادیانِ باطلہ پر غالب آکر رہے گا البتہ طعنہ زن دشمن ابتر اور منقطع النسل ہو جائے گا۔

جب ہم **شَانِئَكَ** (تیرا دشمن) کے لفظ پر غور کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے تمام تاریخی حقائق پھر جاتے ہیں کہ کس طرح ابو سفیان اموی نے اپنی تمام مادی قوتوں کو جمع کر کے اور تمام مادی وسائل کو بروئے کار لاکر اسلام کی بیخ کنی کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور خود بانئ اسلام کے قتل کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ واقعۂ ہجرت، جنگِ بدر، جنگِ اُحد اور جنگِ احزاب ابو سفیان ہی کی طاغوتی کوششوں کا عملی مظاہرہ تھا کیونکہ عہدِ نبوی میں مخالفینِ اسلام نے جتنی جنگیں اسلام و بانئ اسلام کے مٹانے

کے لئے گیں ان میں سب سے **اہم پارٹ** ابوسفیان ہی کا تھا۔ اگر ابوسفیان کا وجود نہ ہوتا تو نہ معرکۂ بدر ہوتا، نہ جنگِ احد پیش آتی، نہ محاصرۂ احزاب ہوتا اور شاید حضرت رسالتمآبؐ ہجرت کرنے پر بھی مجبور نہ ہوتے۔ اب، جبکہ اموی تلوار کی قوت اور تیر و کمان کی طاقت اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تو ابوسفیان نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا اور دائرۂ اسلام کے اندر داخل ہو کر اپنی چرب زبانی کے پُرفریب حربوں سے اسلام کو نقصان پہنچانا جاری رکھا۔ خاندانِ امیہ پہلے جو کام آہنی تیغ و سنان سے لیتا رہا اب وہی کام زبان کی تلوار سے لینے لگا اور بانئ اسلام کے خلاف زہریلا پروپگنڈا پھیلانے میں ہمہ تن معروف عمل رہا۔ بعد رسولؐ، اولادِ ابوسفیان نے جو چیز ورثہ میں پائی وہ اقربا و اولادِ رسولؐ سے بُغض و عداوت اور دشمنی و کینہ پروری تھی۔ کسی بزرگ نے فارسی اشعار میں اس خاندان کے کارناموں کی کیسی صحیح عکاسی کی ہے :-

داستانِ **پسرِ ہندہ** مگر نہ شنیدی ۔ کہ چہا ستم ازو بہ پیمبرؐ برسید

پدرِ او دُرِ دندانِ پیمبرؐ بشکست ۔ مادرِ او جگرِ عمِ پیمبرؐ بمکید

او بناحق حقِ دامادِ پیمبرؐ بگرفت ۔ پسرِ او سرِ فرزندِ پیمبرؐ ببرید

برچنیں قوم کہ لعنت نکند لعنت باد ۔ لعنت اللہ یزیداً و علیٰ قومِ یزید

"شانئک" کی مذکورہ بالا تشریح و توضیح کے بعد دوسرا سوال جو آیۂ زیر بحث کے متعلق پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ اس آیۂ مبارکہ کے نزول سے قبل نمازِ خدا بھی ادا کرتے تھے اور قربانیاں بھی دیتے رہتے تھے پھر اب ایسی کون سی مخصوص نماز کے ساتھ مخصوص قربانی تھی جو دشمن کے منقطع النسل ہونے پر منتج ہوئی۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ میدانِ کربلا میں مخصوص نماز کے ساتھ مخصوص قربانی بیک وقت جمع ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنِ رسولؐ ابوسفیان اموی

ہمیشہ کے لئے منقطع النسل ہوگیا۔ کیا یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت نہیں کہ جناب حسینؑ کی اس عظیم الشان قربانی ہی کا یہ اثر تھا جو آپ نے یوم عاشور میدان کربلا میں، سر کو سجدہ میں کٹوا کر، اور مذبوح من القفا ہو کر پیش کی تھی کہ لوگوں کے دل یزید سے پھر گئے یہاں تک کہ اس کی زبردست سلطنت تھوڑے ہی عرصہ میں صفحۂ ہستی سے مٹ کر تاریخ کے دامن کا بدنما داغ بن کر رہ گئی اور آلِ ابوسفیان کا نام ایسا مٹا کہ آج ایک شخص بھی ان کی اولاد میں سے باقی نہیں یا یوں کہئے کہ اس واقعہ سے وہ ایسے ذلیل ہوئے کہ ساری دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو اپنا انتساب ان کی طرف پسند کرے۔ یہی انجام تمام قاتلانِ حسینؑ کا ہوا۔ دوسری طرف وہی حسینؑ ہیں جن کے ساتھ کربلا کی جنگ میں گنتی کے چند آدمی تھے۔ آج ان کے نام پر جان نثار کرنے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور جن کی اولاد میں صرف ایک سید سجادؑ باقی رہ گئے تھے۔ آج لاکھوں سادات ان کی نسل سے ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں یزیدی طرفدار اب بھی ایسے موجود ہیں جو شیطان کے پرفریب وساوس میں مبتلا ہو کر یزید کی بیگناہی کو تحریر و تقریر کے زور سے ثابت کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں لیکن ان میں بھی کوئی فرد ایسا نہیں جو خاندانِ یزید سے سلسلۂ انتساب پیدا کرنے کا متمنی ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ قرآنِ حکیم نے ابوسفیان کو **إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ** کی تیغ بے نیام سے دائمی طور پر دُم بریدہ اور منقطع النسل کر دیا ہے۔

معترض ایک یہ اعتراض ضرور کرسکتا ہے کہ " فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ " کے تحت حکم خداوندی تو رسولؐ کو تھا حالانکہ بقولِ مؤلف اس کے تعمیل کنندہ حضرت حسینؑ ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم کے ارشاد

" الحسین منی و انا من الحسین " کی روشنی میں حسینؑ نے وہ فرائض سرانجام دیئے ہیں جو جناب رسالتمآبؐ کے ذمہ تھے اور ان احکام کی تعمیل کی ہے جن کی بجاآوری رسولِ خدا پر واجب تھی جس کو بالفاظِ دگر شرکتِ کارِ رسالت کہا جاتا ہے اور جس پر گذشتہ باب میں مفصل بحث سپردِ قلم کی جا چکی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا ہے کہ شہادتِ مظلوم کا ردِعمل اس قدر شدت سے ہوا کہ آلِ ابوسفیان ہمیشہ کے لئے دنیا سے نیست و نابود ہوگئی اور ان کی ہلاکت کے بعد ان ناموں سے اس قدر تنفر پیدا ہوا کہ آج کوئی مسلمان اپنے بیٹے کا نام معاویہ یا یزید رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے لفظ یزید کی نحوست کو اعلیٰ اسلوب سے بیان کیا ہے:۔

طاقت سی شے کو خاک میں جس نے ملا دیا — تختہ الٹ کے قصرِ حکومت کو ڈھا دیا

جس نے ہوا پہ رعبِ امارت اڑا دیا — ٹھوکر سے جس نے افسرِ شاہی گرا دیا

اس طرح جس سے ظلم سیاہ فام ہوگیا — لفظِ یزید **داخلِ دشنام** ہوگیا

آلِ مروان کو بھی نہایت برے دن دیکھنے نصیب ہوئے کیونکہ انکے جدِ امجد حکم بن العاص (مروان کا باپ) نبیِ کریمؐ پر طعن کرنے والے مشرکین کا سرتاج تھا۔ علاوہ ازیں یہ لوگ آلِ ابوسفیان کے قریب تر وارث تھے اور اسی تختِ خلافت پر قابض ہوئے تھے جس کو امیر معاویہ نے خلیفۂ حق حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کر کے اور جناب حسن المجتبیٰؑ کو زہر دیکر حاصل کیا تھا اور پھر آلِ مروان نے دینی و دنیوی معاملات میں بھی آلِ ابوسفیان کی پوری پوری تتبع کی تھی اس لئے **فحق علیھا القول فدمرناھا تدمیرا** کی رو سے انکی تباہی و ہلاکت اٹل تھی اور اس طرح سے دربارِ شام میں کٹے ہوئے سرِ حسینؑ کے الفاظ " **وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون** " کی عملی تفسیر ایک زندہ حقیقت بن کر منظرِ عام پر آنا ناگزیر تھی۔

باب نہم

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۝

نہ ہمت ہارو اور نہ رنجیدہ ہو، تم ہی غالب سرفراز و سربلند رہوگے اگر تم دولتِ ایمان سے مالامال اور نہال رہے

(آلِ عمران ۱۳۹)

فتح و شکست

فتح و شکست

نسلِ انسانی کی تاریخ معرکۂ حق و باطل، جدالِ نور و ظلمت اور کشمکشِ عدل و جور کی تاریخ ہے۔ الوہیّت و شیطنت کی زور آزمائی کی داستان، جھوٹ اور سچ کے مقابلہ و مجادلہ کی کہانی ہے۔ یہ تاریخی حقائق نسلِ انسانی کے لئے نہ صرف موجبِ عبرت ہیں بلکہ ان سے فکر و نظر کی وہ راہیں کھلتی ہیں جو پند و نصائح کا عظیم سرمایہ اور ہدایت و موعظت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔ حق و باطل کی اس طویل و عبرت خیز اور حیرت انگیز معرکہ آرائی میں ایک چیز ہمیشہ نمایاں رہی ہے اور وہ یہ کہ حق پرست ہمیشہ مادی وسائل کے اعتبار سے کمزور، بے بس، افتادہ، پس ماندہ اور ناچار نظر آئے۔ ان کو صبر آزما تکالیف اور ہمت شکن مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر نوائب کی خشت باری ہوئی۔ مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹے، مظالم کی آندھیاں چلیں، جور و ستم کے طوفان اٹھے۔ انہیں مسلسل قربانیاں پیش کرنا پڑیں لیکن وہ ان ناساعد حالات کا بھی جرأت مندی، بلند حوصلگی اور انتھک جدوجہد سے مقابلہ کرتے رہے۔ برعکس اس کے باطل پرستوں کو سلطنت کا طمطراق، تاج شاہی کی چمک دمک، خدم و حشم کا دبدبہ، عساکر کی ہیبت و سطوت، برق تاب شمشیروں کی آتشیں قوت، سیم و زر کے انبار اور اکثریت کا فخر و ناز حاصل رہا۔ خالص مادی اعتبار سے ان دونوں متحارب قوتوں میں ایک عظیم فرق موجود رہا۔ ظاہر بین نگاہیں حق کی بے بسی اور باطل کے دبدبہ اور شان و شکوہ سے مرعوب ہوگئیں فتح و شکست کا فیصلہ محض مادی وسائل کو دیکھ کر کرتی رہیں جو سراسر غلطی پر مبنی رہا۔

ذرا دورِ حاضرہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ مٹھی بھر انسانوں کے عزم و استقلال نے شاہانہ جاہ و جبروت اور طاقت و سطوت کے دیوتاؤں کو سربسجود ہونے پر مجبور کر دیا۔ غریب مزدوروں اور دہقانوں نے قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت قدموں تلے روند ڈالے نہتے ہندوستانیوں نے برصغیر میں برطانوی سامراج کا چراغ گل کر دیا۔ ہندچینی اور

الجزائر کے مجاہدینِ حریت نے فرانس کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ انڈونیشیا کے کمزور سرفروشوں نے ولندیزیوں کا طنطنۂ حکومت ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ کوریا اور ویت نام کے نہتے سپاہیوں نے امریکہ کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا۔ گراں خواب چینی عوام نے بیدار ہو کر کم ہمتی کسی اور مغربی سامراج کے دانت کھٹے کر دیئے۔ خود جنگِ بدر میں تین سو تیرہ سرفروش مجاہدینِ اسلام نے قریش کی عسکری قوت کو توڑ کر رکھ دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کی شان و شوکت کو نیست و نابود کر دیا۔ عصائے موسیٰؑ کی ضرب سے طلسمِ سامری پاش پاش ہوا اور فرعون کا جاہ و حشم قلزمِ ہلاکت کی اتھاہ گہرائیوں میں غرقاب ہو کر رہ گیا۔ حق میدانِ عمل میں ہمیشہ نہتا اترا لیکن نصرتِ خداوندی و تائیدِ ایزدی سے **فتح مبین** نے اس کے قدم چومے۔ یہی منشائے خداوندی ہے اور یہی قرآنِ حکیم کی تعلیم ہے :-

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

(ترجمہ) "نہ ہمت ہارو اور نہ رنجیدہ ہو۔ تم ہی غالب، سرفراز و سربلند رہوگے۔ اگر تم دولتِ ایمان سے مالا مال و نہال رہے۔" (آلِ عمران : ۱۳۹)

پس حق و باطل کی کشمکش میں محض مادی وسائل کی فراوانی دیکھ کر کامرانی و فتح مندی کا تاج باطل کے سر پر رکھ دینا کوتاہ نظری و کوتاہ اندیشی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ باطل کو دندان شکن شکست دینے کے لئے مسلسل قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ آگ و خون کے دریا سے پار اترنا ہوتا ہے۔ مصائب و آلام کی بے پناہ یورش کا غیر متزلزل ثباتِ قدم سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لائحہ عمل کو اپنا کر عالی منزلت امامؑ نے کربلا کے تپتے ہوئے ریگ زار پر باطل سے ٹکر لی اور ایک بے مثال قربانی پیش کی جس کے نتیجہ میں ابوسفیان و معاویہ کی فریب کاری اور باغیانہ کوشش سے قائم ہونے والی عظیم سلطنت واقعۂ کربلا کے بعد تین سال تک بھی قائم نہ رہ سکی۔ اسلام کو ختم کرنے

کرنے کی یزیدی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اسلام پنپتا رہا۔ ترقی کی منازل طے کرتا رہا لیکن نسلِ یزید ناپید ہو کر رہ گئی۔

ہمارا دینی فریضہ

یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم محض ذاکری نقطۂ نظر سے اہلِ بیتؑ کو مظلوم، ستم رسیدہ، مقہور، پامال، بے دست و پا، مجبور، بے بس اور ناکام ظاہر کرتے ہیں تاکہ مجلس میں گریہ و زاری خوب ہو۔ ہم یہ بھولتے ہیں کہ اس طرح سے عوام میں یہ احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ آلِ رسولؐ کی زندگی حسرت و نامرادی اور اشک و آہ کی ایک طولانی داستان، مظلومی و پامالی کی درد انگیز اور الم آفرین کہانی ہے۔ ایک افسانۂ ماتم، ایک تاریخ درد و غم ہے۔ اس سے لازماً عوام کے اندر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جب آلِ رسولؐ جہادِ حق میں عظیم ترین قربانیاں پیش کرتے رہنے کے باوجود حسرت و نامرادی کا شکار رہی تو پھر عوام الناس اس مجاہدہ میں شمولیت اختیار کر کے کون سی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آلِ رسولؐ کے مصائب کا ذکر، صبر و تحمل، ایثار و فداکاری، خلوص و للہیت، شرافت و عزتِ نفس اور حقیقی حق پرستی پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اس سے حقیقتِ اسلام جلوہ فگن اور رسالتمآبؐ کے پیغام کی اشاعت ہوتی ہے۔ آنسوؤں کے سیلاب گناہوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جاتے ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود ہمارا **دینی فریضہ** ہے کہ ہمیں آلِ رسولؐ کی کامرانیوں و فتح مندیوں کا ذکر زیادہ زور دار رنگ میں پیش کرنا چاہیئے اور ان کے مجاہدۂ دینی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہیئے جن سے ان کی سیرت و کردار کے وہ نقوش ابھرتے ہیں جو ہمیں ایک نیا عزم، ایک نئی ہمت، ایک نیا ولولہ جہاد اور استقامت علی الحق کا ایک نیا درس دیتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آئمہ اہلِ بیتؑ اسی حکمتِ ربانی کے امین اور اسی تدبیرِ الٰہی کے حامل تھے جو انبیاءؑ کی ذواتِ مقدسہ میں جلوہ گر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح انبیاءؑ نے حق و باطل کے ہر معرکہ میں فتح مبین حاصل فرمائی اسی طرح آئمہ آلِ رسولؐ نے بھی ہر ٹکراؤ میں مکمل فتح و کامرانی حاصل کی۔ وہ حق کے جیتے جاگتے پیکر تھے بلکہ مجسم حق تھے۔ انہوں حق کی جنگ صرف قیامِ حق کی خاطر، حق کے اصولوں پر لڑی اور حق کو بہ نصِ قرآنی (قُلْ جَآءَ الحق وَ زَھَقَ البَاطل اِنَّ البَاطِل کَانَ زَھُوقًا) ہمیشہ فتح نصیب ہوتی ہے اس لئے ان کو بھی ہمیشہ فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کامیابیوں اور فتح مندیوں کی کی مفصل روئیداد دنیا کے سامنے پیش کی جائے اور ان حق پرست، حق نما حضرات کی سعی و جہد کی ایک مکمل تصویر عوام کے سامنے لائی جائے۔ لہٰذا ان ہی حقائق کی روشنی میں واقعہ کربلا کا جائزہ لیتے ہیں کہ فتح مبین کس کو حاصل ہوئی؟ بوریہ نشین امامِ حق نما حضرت حسینؑ کو یا کفرِ مجسم، باطل پرست، استعمار پسند، ڈکٹیٹر یزید ملعون کو۔

حقیقی فتح کا تصوّر

انسان میں بلاشبہ دو قسم کی قوتیں کارفرما ہیں۔ قوتِ حیوانی اور قوتِ روحانی۔ بسا اوقات انسان اپنی روحانی قوت کو برقرار رکھتے ہوئے سطحی نگاہوں میں مادی اعتبار سے شکست کھا جاتا ہے لیکن اس کی ظاہری شکست میں فتح و ظفر کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ مادیت کے مقابلہ میں مادی حیثیت سے وقتی طور پر مغلوب ہو جانا قوتِ حیوانی کی شکست ضرور ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ مادی شکست روحانی

شکست کا بھی پیش خیمہ ہو۔ اگر روحانی انسان اپنے بلند مقاصد کے پیش نظر، ابتدا سے انتہا تک حق و صداقت کی راہ کسی تزلزل و تذبذب کے بغیر طے کرتا ہوا چلا جائے اور انجام کار اس کوشش میں اس کی تمام مادی قوتیں برباد بھی ہو جائیں تو بھی اپنے روحانی ارتقاء کی وجہ سے حقیقی فاتح وہی ہوتا ہے اور اس کی ظاہری و وقتی شکست اپنے اندر دائمی فتح و ابدی کامرانی کا راز مستتر رکھتی ہے۔ جب ہی تو کہا جاتا ہے کہ شہید راہِ خدا سے سب کچھ چھینا جا سکتا ہے لیکن اس سے کامیابی نہیں چھینی جا سکتی۔ آیاتِ قرآنی وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ○ .... الخ (آلِ عمران ۱۶۹-۱۷۱) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شہدائے راہِ خدا کی موت کو حسرت و ناکامی کی موت نہ سمجھو بلکہ انہیں ایک غیر فانی زندگی حاصل ہے جو تمہارے شعور و ادراک سے بلند و بالا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کے حضور سے رزق پاتے ہیں۔ فضلِ خداوندی کے باعث بذاتِ خود فرحت محسوس کر رہے ہیں اور پیچھے آنے والے راہ نوردانِ حق کے لئے نعماتِ خداوندی کی بشارت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ چنانچہ واقعہ ہائلہ کربلا اسی فلسفہ حیات کا ایک بہترین عملی کرشمہ تھا۔ امام حسینؑ مادی حیثیت سے طاغوتی طاقتوں کے سامنے گو بظاہر مغلوب نظر آتے ہیں لیکن دائمی ظفر یابی اور حقیقی غلبہ یزیدیت پر حسینیت ہی کو حاصل ہو کر رہا۔

مادی غلبہ حقیقی فتح نہیں

یہود نے حضرت عیسیٰؑ کو دار پر کھینچ کر اپنے زعمِ ناقص میں یہ سمجھ لیا تھا کہ انہوں نے ایک فتح عظیم حاصل کر لی ہے لیکن آج دنیا کا ہر مفکر یہی کہے گا کہ حضرت عیسیٰؑ کو حقیقی و دائمی فتح نصیب ہوئی جس کی بدولت عیسائیت کو آج

صفحۂ روزگار پر ایک عظیم الشان غلبہ حاصل ہے۔ برعکس اس کے یہود مغضوب و ملعون ہو کر صدیوں سے کرۂ ارض پر ذلیل و رسوا پھر رہے ہیں اور اب تک کوئی مستقل ٹھکانہ نصیب نہیں ہوا۔ حال ہی میں دورِ حاضرہ کی بعض سیاسی قوتوں نے مجتمع ہو کر یہود کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور ارضِ مقدس کا کچھ حصہ عربوں سے چھین کر حکومتِ اسرائیل کا محدود وطن مقرر تو ضرور کر دیا لیکن مستقبل کی تاریخ ہی بتا سکے گی کہ ابلیس کا یہ نظر فریب افسوں کے روز تک چل سکے گا ؟ یونانیوں نے سقراط کو زہرِ ہلاہل کا چھلکتا ہوا پیالہ پلا کر یہ گمان تو ضرور کر لیا تھا کہ اب فتح و ظفر ان کی زر خرید غلام بن چکی ہے لیکن آج علم و حکمت کے جواہرات کا ہر جوہری سقراط کی مستقل فتح کا قائل ہے۔ ابوسفیان اموی نے جنگِ احد کے المناک حادثہ اور حضرت حمزہؓ و دیگر شہدائے اسلام کی لاشوں کا مثلہ کرنے کے بعد یہ تصور ضرور کر لیا تھا کہ محمد عربیؐ اس کے مقابلہ میں مات کھا گئے ہیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کی امید افزا داستانیں یاس و حرماں کا افسانہ بن کر رہ گئی ہیں اور اسلام کے پنپنے کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی ہیں لیکن دنیا نے بہت جلد دیکھ لیا کہ ابوسفیان کو ذلت و رسوائی سے کس طرح دو چار ہونا پڑا۔ محمد عربی صلعم کے مقدس نام اور بلند مقاصد کو وہ عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی کہ آج کرۂ ارض کے ایک بہت بڑے حصے میں انسانی قلوب کی مقدس دنیا حضورِ انور صلعم کے نامِ نامی کی بدولت روشن و منور ہے اور کروڑوں انسان آپ کے نامِ گرامی پر مر مٹنا ہی سعادتِ دارین سمجھتے ہیں۔

فتح و شکست کا حقیقی مفہوم

فتح کے معنی کسی لغت میں قتل کرنا اور شکست کے معنی مقتول ہونا نہیں

بلکہ حصولِ مقصد میں کامیابی کا نام فتح اور ناکامی کو شکست سے تعبیر کیا جاتا ہے معرکۂ کربلا کی فتح و شکست کو اس اعتبار سے جانچنے کے لئے **طرفین کے مقاصد** کو سمجھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ جب تک ہم حضرت حسینؑ و یزید کے مقاصد کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں، ہم فتح و شکست کا صحیح نتیجہ تعین کرنے میں قاصر رہیں گے لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا حسینِ مظلومؑ کو یزیدِ ملعون سے کوئی ذاتی عناد و رنجش تھی؟ اگر تھی تو کس بناء پر، اگر نہ تھی تو تصادم کی وجوہات کیا تھیں؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ و یزید کی مخالفت کوئی ذاتی شخصی حیثیت نہ رکھتی تھی جس میں یزید یہ چاہتا کہ حضرت حسینؑ کو قتل کر ڈالے یا امام حسینؑ کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ یزید کی زندگی کا خاتمہ کر دیں یا کم از کم اس کے دستِ جفا سے اپنے تئیں محفوظ و مصئون رکھیں۔ اگر یزید بحیثیت ایک عام انسان زندہ رہتا اور اس طرح حسینؑ بھی بحیثیت ایک فرد زندگی بسر کرنا چاہتے تو دونوں میں کسی قسم کی چپقلش و آویزش کا کوئی امکان ہی نہ تھا ایک حجازِ مقدس کے شہر مدینہ، محلہ بنی ہاشم میں گوشہ گیر تھا اور دوسرا ملکِ شام کے شہر دمشق میں تخت نشین۔ اس امر کی کہاں ضرورت تھی کہ یزید امام حسینؑ کے درپے آزار ہوتا یا حضرت حسینؑ یزید سے برسرِ پیکار ہوتے کیونکہ دونوں کے مابین کسی جائداد کی تقسیم کا سوال، تجارتی نفع اندوزی کا مسئلہ یا دیگر دنیوی مفاد کا قضیہ جو بالعموم بنائے فساد ہوتا ہے ناپید تھا۔ لہٰذا تصادم کا کوئی احتمال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر یہاں حالات ہی جداگانہ تھے۔ یزید عالمِ اسلام میں ایک خود سرانہ و مطلق العنان شہنشاہیت کا مالک و مختار بن کر اپنے آپ کو پیغمبرِ اسلامؐ کا نائب منوانا چاہتا تھا۔ جنابِ حسینؑ اس کی بدکرداریوں اور بداعمالیوں کی بنا پر اس کے مقصد میں سدِّ راہ تھے لہٰذا دونوں کے مقاصد کا اختلاف و تضاد باہمی تصادم کا داعی ہوا۔

یزید اپنے آبائی جاہلیت کے مادی دور کو پلٹانے کے لئے کوشاں، اور امام حسینؑ اپنے جدِ عالیمقدارؐ کے دین کو زندہ رکھنے کی فکر میں غلطاں، یزید باطل کا علمبردار اور امامؑ قیامِ حقانیت و روحانیت کے ذمہ دار، یزید استبداد و اقتدار کی حکومت کا دلدادہ اور فرزندِ رسولؐ حق و راستی کا عَلَم بلند کرنے پر آمادہ، یزید حدودِ الٰہی کے معطّل کرنے پر تلا ہوا اور نواسۂ رسولؐ اسلامی حدود و امتیازات کو باقی رکھنے پر کمربستہ تھے۔ ایک طرف جَور و تشدّد، جبر و استبداد، آمریت و قاہریت اپنے شباب کا پرجوش مظاہرہ کر رہی تھی تو دوسری طرف صدق و صفا، ایمان و عمل صداقت و حق پرستی کا غیر متزلزل جذبہ کارفرما تھا۔ غیر ممکن تھا کہ دو متضاد افکار و خیالات کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہوتی۔ اس لئے امام ہمامؑ کے سامنے اب صرف دو ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ یا اپنے لائحۂ عمل کو ترک کر کے باطل کی اعانت یا ثباتِ حق کے لئے باطل سے تصادم۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص جس کے رگ و ریشہ میں خونِ رسولِ دوسراؐ موجیں مار رہا ہو، اسد اللہ الغالبؑ کی شجاعت جس کی سرشت میں داخل ہو، ہاشمی احساسِ خود داری جس کی گھٹی میں پڑا ہو اور مخدومۂ عالمؑ کی گود کا پالا ہو کیونکر باطل سے وابستگی کا عزم کر سکتا تھا۔ لہٰذا جناب حسینؑ نے وہی راہ اختیار کی جو انہیں کرنا چاہئے تھی یعنی **انکارِ بیعت** جو یزید کی طاغوتی قوتوں کے لئے کھلی دعوتِ مبارزت تھا اس لئے جناب حسینؑ اور یزید ملعون کا باہمی تصادم جو اختلافِ مقاصد پر مبنی تھا اٹل ثابت ہوا۔

یزیدی مقاصد

ہر خود سر شہنشاہیت و ظالم حکومت یہ چاہتی ہے کہ اوّلاً افرادِ قوم سے قوتِ احساس سلب کرے اور ثانیاً جرأتِ اظہار ختم کر دے۔ حکومتِ شام نے بہ ا...

وقت کہیں جبر و تشدد کے بل بوتے پر اور کہیں چمکتے ہوئے روپہلی اور سنہری سکوں کی بارش سے ان ہر دو مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اوّل تو عوام نے مطلقاً حکومت کے افعال و اعمال پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا تھا اور اگر سینکڑوں میں کوئی ایسا شخص نکل بھی آیا جس نے سوچا اور یہ سمجھ لیا کہ حکومت کے فلاں کام حق و عدل کی بجائے ظلم و تعدی پر مبنی ہیں تو اس میں یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار کر سکے۔ اگر کوئی شخص جرأتِ اظہار کر بھی بیٹھتا تو سنگدل حکومت اس پر اس قدر غضب ڈھاتی اور مظالم توڑتی تھی کہ عوام میں غیر معمولی دہشت و ہراس پھیل جاتا تھا جس کی بنا پر آئندہ کوئی فرد اس قسم کے اقدام کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا۔ اسی لائحہ عمل کے پیش نظر امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں پر انتہائی مظالم توڑے گئے تاکہ عوام یہ دردانگیز انجام دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائیں، حکومتِ شام کے خلاف پھر کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکے اور اس طرح یزید دنیوی حکومت کے ساتھ ساتھ روحانیت و مذہبیت کی قلمرو پر بھی حکمرانی کر سکے۔ بالفاظ دگر یزید کو اسلام کی ماتحتی قبول نہ تھی بلکہ وہ اسلام کا حاکم بننے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ یزید نے اپنے سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر کو اس طرح بے نقاب کیا کہ "حسینؑ نے (عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کر کے) ہماری بلند عمارتوں اور آرائش و آسائش کے سامانوں کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے ہمیں اپنے اقتدار اور دولت کو قائم رکھنے کے لئے جنگ کرنا پڑی۔"

حسینی مقاصد

ا۔ حضرت حسینؑ اپنی شہادت سے ایک عام بیداری چاہتے تھے اور انہیں ایک ایسی فضا پیدا کرنا مقصود تھی کہ مظلوم ظالم کے پے در پے مظالم سے گھبرا کر جذبۂ

حریت کی گراں بہا نعمت کو کھو نہ بیٹھے اور طاقت و اقتدار کے دباؤ میں آکر باطل کو حق کا جانشین نہ سمجھ لے۔ فی الحقیقت حسینؑ حق و باطل کی مسلسل جنگ میں اربابِ حق کے لئے ایسا مقدس نظامِ عمل چھوڑنا چاہتے تھے کہ وہ حق کی جنگ کو صرف حق کے لئے حق کے اصولوں پر لڑیں۔

۲۔ عالی منزلت امامؑ مسلمانوں کے فکر و عمل میں ہلچل پیدا کرکے غفلت و جمود کی نیند میں سوئی ہوئی اسلامی دنیا کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے اور اچانک ایک غیر معمولی اور مؤثر ترین حادثہ پیش کرکے قوم کی قوتِ عمل و قوتِ فاعلی کو جو عدم استعمال کی وجہ سے بیکار ہو چکی تھی حرکت میں لانا چاہتے تھے۔

۳۔ امام حسینؑ میدانِ کربلا میں اپنے ساتھ بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کو موت کا کھیل کھلا کر دیکھنے اور سننے والوں کی نگاہ میں موت کی ہولناکی ختم کرنا چاہتے تھے تاکہ انسان بلند مقاصد کے تحفظ کے لئے شہادت کی موت کھیل سمجھے اور اعلیٰ اصول کے مقابلہ میں جان و مال اور اولاد کی قربانی کو ارزاں تصور کرے۔

۴۔ حسینؑ شر کے مقابل خیر کی حمایت میں مسلسل جدوجہد کا سنگِ بنیاد رکھنا چاہتے تھے کیونکہ اس دنیائے دُنی میں شر کی مکمل بیخ کنی تو ناممکن ہے البتہ حسینؑ یہ سکھانا چاہتے تھے کہ شر کی عنان ڈھیلی نہ ہونے پائے۔ جب کبھی خباثت خیر پر غلبہ پائے یا اس کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو جائے کہ خیر و شر کے مابین امتیاز دشوار ہو تو فی الفور برائی کے چہرے کو بے نقاب کر دیا جائے تاکہ حق و باطل، کفر و ایمان، نیکی و بدی میں امتیاز دقت طلب نہ ہو۔

۵۔ یزید جبر و تشدد کے ہتھیار سے مخالفت کی ہر آواز کو ہمیشہ کے لئے کچل دینا چاہتا تھا۔ دشمن کے تشدد کا ہر قدم ایک مورچہ تھا جسے حسینؑ صبر و ثباتِ قدم سے فتح کرنا چاہتے تھے۔ یزید کی طاغوتی طاقتیں جنابِ حسینؑ پر اس غرض و

غایت کے تحت انتہائی ظلم و ستم ڈھا رہی تھیں کہ اس عبرتناک انجام کو دیکھ کر پھر کسی میں کبھی مخالفت کی جرأت ہی پیدا نہ ہو اور امامؑ اپنے اوپر اس غرض سے مظالم کا موقع دے رہے تھے کہ یہ بے پناہ مظالم انسانی فطرت کو چیخ اٹھنے پر مجبور کر دیں۔ حضرت حسینؑ نے اس مقصد کے لئے ایسے سامان مہیا کئے کہ ظلم اپنی تمام حدوں سے آگے بڑھ جائے اور حکومت ذوقِ ستم رانی میں یہ تمیز نہ کر سکے کہ مظالم کی کون سی وہ حدیں ہیں جنہیں جبر کے دباؤ سے انسانی فطرت برداشت کر سکتی ہے اور کہاں سے وہ حدود شروع ہو جاتی ہیں جہاں انسانی فطرت شکنجۂ جور و جبر کے اندر اس شدت سے پھڑپھڑاتی ہے کہ خود شکنجہ پاش پاش ہو کر رہ جاتا ہے۔ حکومتِ شام نے لاشِ مظلوم کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند کر انتہائی ذوقِ ستم رانی کا ثبوت دیا جس کا نتیجہ ۱۳۲ھ میں یہ ہوا کہ تاجدارانِ حکومت خاک و خون میں تڑپے۔ معاویہ، یزید و دیگر خلفائے بنی امیہ کی قبریں تک اکھاڑی گئیں ایک ہڈی کے سالم نکلنے پر بھی اسے گھوڑوں کے پاؤں تلے روندا گیا اور اس کی خاک کو ہوا میں اڑایا گیا۔ کیا ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں کوئی ذی فہم و ذی شعور شخص حضرت حسینؑ کی فتح اور یزید کی شکست سے انکار کر سکتا ہے؟

۶۔ امام حسینؑ اپنے عملی اقدام سے عوام میں قوتِ احساس و جرأتِ اظہار پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جب افرادِ قوم میں یہ دو صفات پیدا ہو جائیں تو پھر بڑے سے بڑے سرمایہ دارانہ نظام کو الٹنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ حسینؑ کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور یہی حسینؑ کے فاتح اور یزید کے مفتوح ہونے کی دلیل ہے۔

جب طرفین کے مقاصد کا تعین ہو چکا تو فتح و شکست کا نتیجہ مرتب کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیا حضرت حسینؑ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے یا یزید؟ کیونکہ مقاصد کی کامیابی ہی فاتح اور مفتوح کے درمیان امتیازی نشان ہے۔

مقاصد کا موازنہ : قوتِ احساس و جرأتِ اظہار

۱۔ حکومتِ شام نے پسماندگانِ حسینؑ کا لٹا ہوا قافلہ اس غرض سے شہر بہ شہر پھرایا تاکہ لوگوں میں مخالفتِ یزید کا انجام دیکھ کر دہشت پیدا ہو اور پھر انہیں اختلاف رائے کی جرأت نہ ہو مگر یہ زعمِ حکومت تھوڑی دیر تک بھی قائم نہ رہ سکا۔

عین موقع جنگ پر حُرؑ بن یزید کی لشکرِ شام سے علیحدگی اس امر کی کھلی دلیل تھی کہ حکومتِ شام اپنے جور و تشدد کے بل بوتے پر لوگوں کے دلوں سے قوتِ احساس و جرأتِ اظہار کے بے پناہ جذبہ کو مٹا دینے میں بری طرح ناکام ہوئی۔ حسینی قربانی صرف تیاری کی منزل میں تھی، پیش نہ ہوئی تھی لیکن حالات بتلا رہے تھے کہ نتیجہ کا رخ کس طرف ہے؟

۲۔ واقعۂ شہادت کے تیسرے ہی دن بعد جب فرزندِ رسولؐ کا سرِ اقدس ابن زیاد کے روبرو رکھا گیا تو ملعون نے ہاتھ میں چھڑی لے کر لبہائے مبارک کو چھیڑنا شروع کیا۔ سنگدل و جابر حاکم کوفہ کی یہ گستاخی دیکھ کر بوڑھے صحابی زیدؓ بن ارقم کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور بیتاب ہو کر بول اٹھا۔ "ہٹا لے اس چھڑی کو، قسم بخدا، میں نے بچشمِ خود دیکھا ہے کہ رسولِ خداؐ ان لبوں کے بوسے لیتے تھے۔" ابن زیاد طیش میں آکر کہنے لگا۔ "خدا تیری آنکھوں کو رلائے۔ واللہ، اگر تو بوڑھا ہو کر سٹھیا نہ گیا ہوتا تو ابھی تیری گردن مار دیتا۔" زید بن ارقم یہ کہتے ہوئے مجلس سے اٹھے۔ "اے عرب کے لوگو! آج کے بعد تم غلام ہو۔ تم نے ابن فاطمہؑ کو قتل کیا۔ ابن مرجانہ کو حاکم بنایا۔ وہ تمہارے نیک انسان قتل کرتا ہے اور شریفوں کو غلام بناتا ہے۔ تم نے ذلت قبول کر لی۔ خدا انہیں مارے جو ذلت قبول کرتے ہیں۔ (داستانِ کربلا۔ ابوالکلام آزاد۔ ص ۹۷)

کرنے کی یزیدی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اسلام پنپتا رہا۔ ترقی کی منازل طے کرتا رہا لیکن نسلِ یزید ناپید ہو کر رہ گئی۔

ہمارا دینی فریضہ

یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم محض ذاکری نقطۂ نظر سے اہلِ بیتؑ کو مظلوم، ستم رسیدہ، مقہور، پامال، بے دست و پا، مجبور، بے بس اور ناکام ظاہر کرتے ہیں تاکہ مجلس میں گریہ و زاری خوب ہو۔ ہم یہ بھولتے ہیں کہ اس طرح سے عوام میں یہ احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ آلِ رسولؐ کی زندگی حسرت و نامرادی اور اشک و آہ کی ایک طولانی داستان، مظلومی و پامالی کی درد انگیز اور الم آفرین کہانی ہے۔ ایک افسانۂ ماتم، ایک تاریخ درد و غم ہے۔ اس سے لازماً عوام کے اندر یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ جب آلِ رسولؐ جہادِ حق میں عظیم ترین قربانیاں پیش کرتے رہنے کے باوجود حسرت و نامرادی کا شکار رہی تو پھر عوام الناس اس مجاہدہ میں شمولیت اختیار کر کے کون سی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آلِ رسولؐ کے مصائب کا ذکر، صبر و تحمل، ایثار و فداکاری، خلوص و للہیت، شرافت و عزتِ نفس اور حقیقی حق پرستی پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اس سے حقیقتِ اسلام جلوہ فگن اور رسالتمآبؐ کے پیغام کی اشاعت ہوتی ہے۔ آنسوؤں کے سیلاب گناہوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتے ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود ہمارا **دینی فریضہ** ہے کہ ہمیں آلِ رسولؐ کی کامرانیوں و فتح مندیوں کا ذکر زیادہ زور دار رنگ میں پیش کرنا چاہئے اور ان کے مجاہدۂ دینی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہئے جن سے ان کی سیرت و کردار کے وہ نقوش ابھرتے ہیں جو ہمیں ایک نیا عزم، ایک نئی ہمت، ایک نیا ولولۂ جہاد اور استقامت علی الحق کا ایک نیا درس دیتے ہیں۔

ان کے اہلِ بیت ہیں جو کفار ترک و دیلم کی طرح مقید و محبوس ہیں۔ اہل بیت کی اس طرح کی تشہیر سے حسینی مقصد کو زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہو رہی تھی کیونکہ لوگ جب حقیقتِ حال سے آگاہ ہوتے تھے تو اموی حکومت کے خلاف بغاوت پر تُل جاتے تھے۔ چنانچہ اہلِ موصل نے اتنی شدید مزاحمت کی کہ فوجِ یزید کو دوسری راہ تلاش کرنا پڑی۔ تکریت میں یزیدی پروپیگنڈا کی بنا پر لوگ پہلے فوجِ یزید کے پرجوش استقبال میں مصروف تھے لیکن جب ایک عیسائی نے عوام کو بروقت حقیقتِ حال سے آگاہ کیا تو عیسائیوں اور مسلمانوں نے متفقہ طور پر یزیدیوں کے خلاف محاذِ جنگ قائم کر دیا۔ یزیدی فوج مقابلہ کی تاب نہ لا کر رستہ بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ مقام شیرز، قلعہ کفرطاب، مقام سیلور، حماۃ پر اسی نوع کے حالات درپیش ہوئے۔ اہلِ حمص نے یزیدی فوج سے باقاعدہ جنگ کر کے چھبیس (۲۶) یزیدیوں کو جہنم واصل کیا۔ مقام حران میں ایک عیسائی راہب یحییٰ حرانی نے یزیدیوں سے جنگ کر کے شہادت پائی۔ (روضۃ الاحباب)

یہ وہ رائے عامہ کا بیساختہ مظاہرہ تھا جس کو حکومتِ شام اپنی تمام فتح مندیوں کے باوجود جبر و تشدد سے نہ دبا سکی اور یہ تھا اظہارِ جرأت کا بے پناہ جذبہ جو خونِ ناحق نے پیدا کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائی بھی حسینی احتجاج میں شریک ہو کر حسینی مشن کے لئے اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔ پس کون یہ کہہ سکتا ہے کہ کربلا کا خونیں منظر حسینؑ کی دائمی فتح پر منتج نہیں ہوا؟

۵۔ کوفہ کے متعلق تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؑ کا پایۂ تخت رہ چکا تھا وہاں اس امر کا امکان تھا کہ کوئی محبِ اہلِ بیتؑ کھڑا ہو کر بے باکانہ طور پر حسینی احتجاج میں شریک ہو جائے لیکن دمشق میں ایسے امکان کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں شہنشاہیت پورے جاہ و جلال اور جبروت و اقتدار کے ساتھ

جلوہ گر تھی جہاں علانیہ مساجد میں حضرت علیؑ و اولادِ علیؑ پر سبّ و شتم اور تبرّا ہوتا تھا اور خونِ عثمانؓ کی بنا پر ہاشمیوں کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ پورے شباب پر تھا۔ یزید زیدؓ بن ارقم کی تنبیہہ سن چکا تھا۔ اسے گمان تھا کہ دمشق میں کسے جرأت ہو سکتی ہے کہ حکومت کے خلاف لب کشائی کرے۔ چنانچہ ابن زیاد کی خفت مٹانے کے لئے دیدہ و دانستہ اس نے بھی وہی طرزِ عمل اختیار کیا اور چوبِ خیزراں لے کر سرِ حسینؑ سے بے ادبی شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر سمرہؓ بن جندب تڑپ گئے۔ یزید کو برسرِ دربار ٹوک دیا اور لعن طعن کی۔

قیصرِ روم کے سفیر کو تاب نہ رہی اور بول اٹھا۔ "ہم عیسائی تو گرجا کے اندر رکھے ہوئے اس گھوڑے کے سُم کی بھی تعظیم کرتے ہیں جو مسیح ناصری کی طرف منسوب ہے۔ تم کیسے مسلمان ہو کہ اپنے نبیؐ کے نواسہ کو قتل کیا ہے اور اب اس کے سر کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہو؟" اس کے بعد ایک دوسرا عیسائی کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ "میرا سلسلۂ نسب ستر (۷۰) واسطوں سے حضرت داؤدؑ تک پہنچتا ہے مگر یہود اب تک میری عزت کرتے ہیں اور حسینؑ تو بلا واسطہ پیغمبرؐ کے نواسہ ہیں۔ تم نے ان کو قتل کر دیا۔" (صواعق محرقہ۔ ص ۱۱۹)

حسینی فتح ملاحظہ کیجئے۔ استبدادِ مجسم کے روبرو لوگ حسینؑ کی طرف سے احتجاج کر رہے تھے اور پنجۂ اقتدار کی گرفت سے مطلقاً خائف نہ تھے۔ مسلمانوں کا تو کیا ذکر غیر مسلم بھی اس واقعہ سے متأثر ہو کر بیباکی اور حق گوئی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی حسینی مقصد کی کامیابی میں کوئی شک و شبہ باقی ہے؟

حسینی فتح کے روشن نشانات

۱۔ **باطل کی سپراندا ختگی:**۔ یزید کی ناکامی کا سب سے بڑا نشان یہ ہے کہ خود

ولیعہد حکومت ، یزید کے جانشین و فرزند معاویہ ثانی نے برسرِ منبر اپنے باپ اور
دادا کے طرزِ عمل پر انتہائی نفرین کی اور اس تختِ خلافت کو پائے استحقار سے
ٹھکرا دیا جس کو پر فریب حیلہ سازیوں سے بغاوت کا بیج بو کر معاویہ نے حاصل
کیا تھا۔ یہ تھا جلالِ حق کے مقابل باطل کی سپر اندازی کا مجسم صورت میں رونما ہونا۔
کیا اس کے بعد بھی یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ حسینؑ فاتح اور یزید مفتوح ہے؟

۲۔ حسینی کارنامہ سرمایۂ افتخار ہے :۔ فتح و شکست کا امتیازی نشان
یہ ہے کہ فاتح اپنے کارنامہ پر نازاں اور مفتوح اپنے طرزِ عمل پر پشیمان ہوتا
ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ حسینؑ جس راہ پر چلے اس پر چٹان کی
طرح ڈٹے رہے۔ نہ وہ خود پشیمان ہوئے نہ ان کے ساتھی اور نہ ہی ان کے
پسماندگان۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے
رہے لیکن لاتحہ عمل پر مطلقاً پشیمان نہ ہوئے۔ آج حسینؑ کی نسل اور ان کے
نام لیواؤں میں سے کوئی بھی فعلِ حسینؑ پر پشیمان نہیں۔ ایک فرد بھی یہ نہیں کہتا کہ
کہ امامؑ نے ایسا طرزِ عمل کیوں اختیار کیا جس کا نتیجہ بربادی میں ظاہر ہوا لیکن ان
کے قتل کرنے والے، قتل میں شرکت کرنے والے، نہیں نہیں، بلکہ ان کی امداد
و نصرت کرنے والے بھی پشیمان ہوئے۔ کہ اے کاش! ہم ایسا نہ کرتے۔ خود یزید
اپنی بداعمالیوں کے نتائج سے خائف ہو کر پشیمانی و ندامت محسوس کرنے لگا۔
یزید کے ظالمانہ و احمقانہ طرزِ عمل پر خود یزید کا بیٹا اور بیوی انتہائی پشیمان ہوئے
جس کا مفصل تذکرہ ہم مجرموں کی پشیمانی کے تحت کر چکے ہیں۔ آج دنیا میں شاید
ہی کوئی ایسا قسی القلب ہو جو یزید کے کارناموں پر نازاں ہو۔ کیا اس کے بعد
بھی یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ حضرت حسینؑ کو دائمی فتح ہوئی اور یزید
بری طرح شکست کھا گیا؟

۳۔ مطالبۂ بیعت سے انحراف:۔ پشیمانی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجرم کی شکست خوردہ ذہنیت اس کو اپنے نصب العین سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یزید و امام حسینؑ کے درمیان تصادم کی وجہ یہ تھی کہ یزید کو بیعت پر شدت سے اصرار تھا اور امامؑ کو سختی سے انکار۔ حسینؑ اپنے انکار سے نہ ہٹے اگر ہٹ گئے ہوتے تو سر نوکِ سناں پر نظر نہ آتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یزید اپنے مطالبۂ بیعت پر برقرار رہا یا اس سے ہٹ گیا۔ حضرت حسینؑ سے یزید کا مطالبۂ بیعت ایک عام مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ خاندانِ رسالت کے ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت سے تھا کیونکہ نواسۂ رسولؐ کی بیعت فی نفسہٖ یزید کے لئے خلیفۂ حق ہونے کی سند تھی۔ اس لئے یزید کو اس پر شدت سے اصرار تھا۔ لہٰذا اس نظریہ کی رُو سے خاندانِ رسالت میں جو ذمہ دارانہ حیثیت خود جناب حسینؑ کو اپنی زندگی میں حاصل تھی لازماً وہی حیثیت ان کے بعد ان کے فرزند حضرت زین العابدینؑ کی تھی۔ خود تو امام حسینؑ اپنی زندگی میں یزید کی گرفت سے آزاد رہے کیونکہ یزید دمشق میں براجمان تھا اور حسینؑ مدینہ، مکّہ اور پھر کربلا میں اقامت پذیر ہوئے۔ بعدِ شہادت پسماندگانِ حسینؑ پر وہ نازک وقت بھی آیا جب کہ سید سجادؑ کو مخدراتِ عفت و عصمت کی معیت میں، دارالسلطنتِ دمشق میں، اقتدارِ حکومت کے شکنجہ میں، کھچی تلواروں کے سامنے، جابر و قاہر بادشاہ کے حضور، پابندِ سلاسل قیدی کی صورت میں حاضر کیا گیا۔ ہوسکتا تھا کہ یزید مطالبۂ بیعت کو دہرائے اور سید سجادؑ سے بیعت طلب کرے مگر تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اہلِ بیتِ نبوی کے کسی متنفس سے بھی مطالبۂ بیعت کیا گیا ہو جس سے صاف ظاہر ہے کہ یزید اپنے مطالبۂ بیعت سے ہٹ گیا دنیا میں کمزور فریق کو مرعوب کرنے کے لئے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ امید کی جاسکتی تھی کہ قتلِ حسینؑ

کے دردانگیز و المناک واقعات دیکھ کر اور قید و سفر کے مصائب برداشت کر کے عورتیں، بچے اور خود بیمارِ کربلا ضرور خوفزدہ ہو چکے ہونگے۔ مگر غرورِ ظلم پامال ہوگیا اور جبروت سلطنت کے اس پندار کو شکست ہوگئی جب دربارِ کوفہ میں ایسا موقع پیش آیا اور ابنِ زیاد نے جناب زین العابدین ؑ کے قتل کا حکم دے دیا تو فرزندِ حسین ؑ نے تور بدل کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اما علمت ان القتل لنا عادة و کرامتنا الشهادة۔" کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہمارے لئے باعثِ کرامت ہے۔ یہ سننا تھا کہ خود ظلم کا سر نگوں اور تشدد کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ معلوم ہوا کہ ظلم اٹھانے والے جور و جفا کی شدّت اور ظلم کی سنگینی سے خوفزدہ نہیں ہوئے بلکہ ظلم کرنے والے مظلومِ کربلا حضرت حسین ؑ کے صبر و استقلال اور غیر متزلزل ثباتِ قدم کو دیکھ کر سہم گئے۔ یزید اپنی جاہ و جبروت کے باوجود یہ جرأت نہ کر سکا کہ کسی کے سامنے سوالِ بیعت پیش کرے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کٹا ہوا سرِ حسین ؑ موجود تھا اور رزمگاہِ کربلا کے دل ہلا دینے والے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب اگر سوالِ بیعت کا تکرار کیا جائیگا تو دمشق کا دربار، کربلا کا لالہ زار بن جائیگا۔ اہلبیتِ رسالت پر غیر مختتم مظالم توڑے گئے۔ دل آزاریاں کی گئیں۔ بزعمِ خود ذلتیں دی گئیں مگر پھر بھی سوالِ بیعت کا حوصلہ نہ پڑا۔ یہ یزید کی ایک کھلی شکست تھی جس کو خود یزید نے مطالبہ بیعت سے انحراف کر کے تسلیم کر لیا۔

یہ حسینی لائحہ عمل کی ایسی بے نظیر فتح تھی کہ یزید تو درکنار، قتلِ حسین ؑ کے بعد کسی اموی یا عباسی، خودسر، مطلق العنان، باجبروت بادشاہ کو یہ ہمت نہ پڑی کہ وہ آئمۃ الطاہرین ؑ سے علانیہ مطالبۂ بیعت کی جرأت کرے بلکہ ہر وقت یہ خوف دامنگیر رہا کہ مبادا مطالبۂ بیعت سے دوسری کربلا رونما ہو جائے۔ لہذا ظالم مگر بزدل اموی

و عباسی خلفاء زہر کے ذلیل ہتھیار سے آئمۃ الطاہرینؑ کو اپنے رستے سے ہٹاتے رہے۔ جس طرح حضرت حسینؑ نے بعد میں آنے والے نو آئمۃ الطاہرینؑ کے لئے سانحۂ کربلا کے اعادہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اسی طرح سالقہ امامینؑ کی پوزیشن بھی واضح کر دی کہ اگر ان سے بھی مطالبۂ بیعت کیا جاتا تو وہاں بھی کربلا کا نقشہ پیش آتا۔

۴۔ ابنِ زبیرؓ کی خلافت :۔ جنگِ جمل کے بانی، ماہرِ سیاسیات، حضرت علیؑ کے مشہور مخالف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جو عرصہ سے خلافت کے آرزو مند و متمنی چلے آتے تھے اور اسی غرض سے بیعتِ یزید میں داخل نہیں ہوئے تھے قتلِ حسینؑ کے بعد سیاسی کروٹ لیکر اٹھے۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر خونِ ناحق کی آڑ میں لوگوں کے مشتعل جذبات کو ہوا دینے لگے۔ اہلِ مکہ کے ایک بہت بڑے مجمع میں اہلِ کوفہ کی نالائقی و بزدلی کی مذمت کی حضرت حسینؑ کی صداقت و حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی بےحد مدح سرائی کی اور ایک پُرزور تقریر کے ذریعہ یزید و بنی امیہ کے خلاف عوام کے جذبات کو اُبھارا اور اپنی خلافت کی داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ لوگوں نے یزید کی بیعت کا قلادہ گردن سے اتار پھینکا اور ابن زبیرؓ کو ارضِ مقدس کا خلیفہ تسلیم کر لیا۔ مگر آئندہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد ماہرِ سیاسیات نے دوسرا چولا بدلا اور قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینے کی بجائے انہیں پناہ دینا شروع کر دیا۔ قتلِ حسینؑ میں شرکت کرنے والا جو شخص امیر مختار ثقفیؒ کی گرفت سے بچ نکلتا وہ بصرہ پہنچ کر ابنِ زبیرؓ کے بھائی مصعب گورنر بصرہ کے پاس پناہ گزین ہو جاتا تھا۔ اسی پر اکتفا نہ ہوا بلکہ اولادِ علیؑ کو قید خانے کی تاریک کوٹھڑیوں میں ڈال دیا گیا اور محمد بن حنفیہ کو زندہ جلا دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ بہرکیف جس خلافت کی بنیادیں خود غرضی، خود فریبی، کوتاہ بینی اور ناعاقبت اندیشی پر استوار کی گئی تھیں کب تک قائم رہ سکتی تھی۔ چنانچہ عبداللہ ابن زبیرؓ کی سیاسی قلابازیوں سے آگاہ ہو کر عوام نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا حتیٰ کہ ان کے اپنے دو لڑکے

حمزہ اور جبیب بھی فوجِ مخالف میں شامل ہوگئے۔ بالآخر وہ نہایت بیدردی کے ساتھ خود بیت اللہ کے اندر اموی حکومت کے ہاتھوں قتل ہوگئے اور کئی روز تک ان کی لاش لٹکتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ صرف محدود عرصہ کے لئے ارضِ مقدس میں اپنی حکومت کا رنگ جما سکے اور ایک مستقل نظامِ حکومت قائم کرنے میں قاصر رہے لیکن یہ بھی شہادتِ عظمٰے کا کمال تھا اور حسینِ مظلومؑ کی فتح تھی کہ عبداللہ ابن زبیرؓ ایسے مخالفِ علیؑ انتقامِ خونِ ناحق کی آڑ لے کر یزیدیت کے کھنڈرات پر بنائے حکومت استوار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

۵۔ مجرمین کا عبرتناک انجام:۔ ایک عبداللہ ابن زبیرؓ تو درکنار لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہر اس شخص کے گرد و پیش جمع ہوگیا جس نے بھی انتقامِ حسینؑ کے لئے علمِ جہاد بلند کیا۔ سلیمانؓ بن صرد خزاعی کی جماعتِ توابین جو چار پانچ ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ جب امیر مختار ثقفیؒ اور ابراہیمؒ بن مالک اشتر خونِ ناحق کے انتقام کے لئے اٹھے تو ہزاروں لوگ قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینے کے لئے تلواریں سونت کر نکل آئے اور مجرموں کو چن چن کر تیغ بے دریغ کیا اور طرح طرح کی عقوبتوں سے انہیں قتل کیا۔ سفاح عباسی کے ہاتھوں اموی نسل و اموی سلطنت کی تباہی و بربادی تاریخ عالم کا ایک انتہائی المناک و عبرت خیز واقعہ ہے۔ خونِ ناحق کا انتقام اس وقت انتہائی عروج پر پہنچا جب سات سو سال گزر جانے کے بعد امیر تیمور نے دمشق پر حملہ کرکے اس کو خاک و خاکستر بنا کر رکھ دیا تھا اور اموی دورِ اقتدار کی تاریخی عمارات اور دیگر تاریخی آثار کا نام و نشان بھی مٹا دیا تھا۔

یہ حسینیت کا یزیدیت پر ظاہری مادی غلبہ تھا۔

۶۔ خلافتِ عباسیہ:۔ بنی عباس نے دیکھا کہ جب عبداللہ بن زبیرؓ ایسے

مخالفِ علیؑ انتقامِ خونِ ناحق کی آڑ لے کر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم حسینؑ کی نسبی قرابت کا استفادہ کرتے ہوئے عباسی سلطنت کے قیام میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ بن زبیرؓ کی طرح ایک سیاسی کروٹ لی۔ غمِ حسینؑ میں سیاہ ماتمی لباس کو شعارِ زندگی بنالیا اور خونِ ناحق کا بدلہ لینے کے لئے بنی امیہ کے مقابلے میں آ ڈٹے اور اطراف و جوانب میں اپنے داعی پھیلا دیئے۔ سفاح اور منصور عباسی دونوں بھائیوں نے اس سیاسی تحریک میں قوت پیدا کرنے کے لئے نفسِ زکیہ فاطمی کے ہاتھ پر محکومانہ بیعت کر لی کیونکہ سیاسی تحریک جب مذہب کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے تو کامیابی کے امکان روشن تر ہو جاتے ہیں۔ عوام کو ہمخیال بنانے کے لئے یہ پروپیگنڈا نہایت کارگر تھا کہ بنی امیہ سے خونِ ناحق کا انتقام لے کر اولادِ فاطمہؑ کو ان کا غصب کردہ حق واپس دلایا جائے گا۔ اس خیال کی نشر و اشاعت کا یہ اثر ہوا کہ عوام جو بذاتِ خود مختار بالرائے نہیں ہوتے دماغ کی بجائے زیادہ تر دل کی قیادت میں قدم اٹھاتے ہیں اور عقل کی رہنمائی کو ترک کر کے جذبات کی رو میں فوراً بہ جاتے ہیں فوج در فوج اس تحریک میں شامل ہونے لگے۔ بالآخر جب ابو مسلم خراسانی نے **مرو** میں **سیاہ جھنڈا** کھولا تو ہزاروں آدمی امویوں کی بیخ کنی کے لئے اس کے نیچے جمع ہو گئے۔ جنگِ زاب میں آخری خلیفہ مروان ثانی شکست کھا کر بھاگا مگر خدائی گرفت سے نہ بچ سکا اور مارا گیا گو بنی عباس نے بھی عبداللہ بن زبیرؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہ وعدہ وفا نہ کیا جس کے ذریعہ عوام کو فریب میں مبتلا کر رکھا تھا اور حکومت کی باگ ڈور نفس ذکیہ فاطمی کے سپرد کرنے کی بجائے اپنے قبضۂ اقتدار میں رکھی لیکن یہ بھی حسینی فتح کا ایک بین نشان تھا کہ عباسیوں نے حسینی خون کی قرابت کا واسطہ دے کر اپنی سیاسی اغراض کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور ایک ایسی عظیم الشان حکومت کی بنیاد قائم کر لی جو کئی صدیوں

تک دنیا کے ایک وسیع حصہ پر مسلط رہی۔ ہم اپنے دعویٰ کی تائید میں چند تاریخی اقتباسات نقل کرتے ہیں :۔

سفاح عباسی کی تخت نشینی کے وقت ان کے چچا داؤد نے عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہم نے روپیہ پیسہ جمع کرنے، نہر بنانے اور قصر تعمیر کرنے کے لئے خروج نہیں کیا بلکہ بنی امیہ نے ہمارا اور ہمارے بنی اعمام (بنو فاطمہ) کا حق غصب کرلیا ہے اس وجہ سے ہم مقابلہ پر مجبور ہوگئے ہیں۔" (مختصر اخبار الخلفاء ابن الساعی۔ ص ۷)

بنی عباس کے مشہور شاعر نے ایک درد انگیز نظم پڑھی جس کے ایک شعر کا اردو ترجمہ یہ ہے :۔

"حسینؑ اور زید کا قتل یاد کرو اور یاد کرو مقام مہراس میں جنگ احد کے موقع پر ابوسفیان نے حمزہؓ کو قتل کیونکر کرایا تھا اور ہندہ نے کیونکر ان کا جگر چبایا تھا۔"

عبداللہ بن معتز عباسی خلیفہ کی ایک نظم میں یہ اشعار بھی موجود ہیں :۔

"سب سے زیادہ حیرت خیز امر حسینؑ کا قتل ہونا پیاس کے عالم میں جب کہ نہر سے ان کو روکا جارہا تھا۔ ہم نے ان کے غم میں سیاہ لباس پہنے اور سر کے بالوں کو بڑھایا ہے۔"

حسینی قربانی کی معنوی فتح کا تو کیا کہنا۔ اس نے تو اسلام کو زندگی جاوید عطا کردی البتہ امامؑ کی قربانی کی مادی فتح بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ معاویہ نے جس اموی سلطنت کی بنیادیں فریب کارانہ عیاری اور مکارانہ غداری پر رکھی تھیں اس کو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی، حجاج کی بے اماں خونخواری، عبدالملک کی تدبیر و سیاست، ولید کی فاتحانہ شان و شوکت اور ہشام کا ظالمانہ جبر و تشدد پون صدی تک بھی نہ سنبھال سکا۔ انتقامِ خونِ حسینؑ کے سیلاب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک ہی ریلا اسے ہمیشہ کیلئے بہا کرلے گیا۔

ناز ہے تمہیں کہ بدلا ہے زمانہ نے تمہیں ۔۔۔ مرد تو وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

صرف اسی پر اکتفا نہ ہوا کہ بنی امیہ کی سلطنت تباہ ہوگئی، دمشق کے اموی قصر

منہدم ہوگئے اور ان کی بجائے بغداد کے رفیع الشان قصر پر سیاہ پھریرے لہرانے لگے بلکہ فتحندوں نے اموی خون کے دریا بہا دیئے۔ معاویہ، یزید و دیگر خلفائے بنی امیہ کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ ایک ہڈی بھی دستیاب ہونے پر اس کو آگ میں جلایا گیا اور پھر اس کی خاک کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔

یہ تھی انتقام خونِ ناحق کی شدت اور یہ تھا اموی استعمار پسند خلفا، کا عبرتناک انجام۔

۷۔ انقطاع نسلِ یزید:۔ حسینؑ کی دائمی فتح اور یزید کی ابدی شکست کا کیا یہ کچھ کم عبرت انگیز نشان ہے کہ امیہ کی زبردست سلطنت تھوڑے ہی عرصہ میں صفحۂ ہستی سے مٹ کر تاریخ کے دامن پر بدنما داغ بن کر رہ گئی اور قاتلانِ حسینؑ کا نام ایسا مٹا کہ آج ایک شخص بھی ان کی اولاد میں سے باقی نہیں۔ یا یوں کہئے کہ اس واقعہ سے وہ ایسے ذلیل ہوئے کہ ساری دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو اپنا انتساب ان کی طرف پسند کرے۔ دوسری طرف وہی حسینؑ ہیں جن کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ میدانِ کربلا میں امامؑ پر ایک وہ نازک گھڑی بھی آئی جبکہ صدائے استغاثہ "هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا" پر لبیک کہنے والا کوئی فرد نہ رہا۔ آج اسی بیکس مظلوم کے نام پر جانیں نثار کرنے والے ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ جن میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم افراد بھی شامل ہیں۔

۸۔ نخلستانِ کربلا:۔ حسینی فوج کے کشتے میدانِ جنگ میں بغیر تدفین و تکفین چھوڑ دیئے گئے تھے۔ آج ان کی قبروں پر سربفلک رفیع الشان عمارات کھڑی ہیں۔ ان مزاروں کو مسمار کرنے کی بھی پیہم کوششیں کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقبروں کو مسمار کرنے والے متوکل عباسی ایسے مدتیں ہوئیں فنا ہو گئے اور گوشۂ گمنامی میں جا پڑے لیکن حسینؑ اور ان کے رفقائے کار کے پُر وقار مقبرے

پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔ ان پر احترام و عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہیں اور آج کروڑوں انسانوں کے دل ان پر نثار ہو رہے ہیں۔ ریگ زارِ کربلا جو پہلے سنسان و ویران صحرا تھا، آج جسمانی، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے پھولا پھلا نخلستان ہے ۔

جاں نثاروں نے تیرے کر دیئے جنگل آباد
خاک اڑتی تھی شہیدانِ وفا سے پہلے

دشتِ کربلا کے بے جان ذرّے آج بھی امام عالیمقامؑ کی لافانی کامیابی اور ابدی فتح پر زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں لیکن اگر آج باجبروت امیر شام معاویہ اور خود سر استعمار پسند ڈکٹیٹر یزید کی قبروں کی تلاش کی جائے تو شاید "جستجوئے بسیار" کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکے کہ وہ کہاں مدفون ہیں؟ یا کم از کم مدفون کئے گئے تھے۔ یقیناً "وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَام" اللہ سخت انتقام لینے والا ہے۔

۹۔ تذلیلِ مجرمین:۔ شہادتِ حسینؑ نے تمام عالمِ اسلام میں تہلکہ مچا دیا تھا اور عوام کے دلوں میں قاتلانِ حسینؑ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جو لوگ اس جرمِ قبیح کے ارتکاب کے ذمہ دار سمجھے گئے تھے عوام کے طعن و تشنیع کا نشانہ بن چکے تھے یہاں تک کہ قتلِ حسینؑ ان کی رسوائی و ذلّت کی ایک سند بن گیا تھا۔ یزید کی رسوائی کا یہ عالم تھا کہ خود اس کا اپنا ضمیر اس پر لعنت کرتا تھا اور بسا اوقات اعمالِ بد کے نتائج سے خائف ہو کر پکار اٹھتا تھا:۔

"ہائے! حسینؑ کے قتل کر دینے سے ابن زیاد نے مجھ کو مسلمانوں میں قابلِ نفرت بنا دیا اور ان کے دلوں میں عداوت کا بیج بو دیا۔ قتلِ حسینؑ کے جرم کو سنگین سمجھ کر نیکو کار و بدکار سب ہی آدمی مجھ کو دشمن تصوّر کرنے لگے۔ ہائے ابنِ مرجانہ نے کیا کیا؟ خدا اس پر لعنت کرے۔" (الطبری جزو ثانی جلد ثانیہ ص ۴۰۹ طبع لیڈن)

نہ صرف یہ کہ یزید کے اہلِ زمانہ اس پر لعنت کرتے تھے بلکہ اس کے بعد کی نسلوں میں بھی اس کے خلاف غم و غصہ کے جذبات بدستور طوفانی ہوتے رہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ خود سلاطینِ بنی امیہ اس کے روادار نہ تھے کہ دربارِ خلافت میں کوئی شخص یزید کا ذکر تعظیم و تکریم کے ساتھ کرے۔ خود ولی عہدِ حکومت فرزندِ یزید معاویہ ثانی نے بر سرِ منبر اپنے آبار و اجداد کی بداعمالیوں کا اقرار کرتے ہوئے ان پر اظہارِ نفرین کیا اور اسی بناء پر سلطنت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینے سے انکار کر دیا۔ تنفر کا یہ جذبہ جو شہادتِ حسینؑ نے یزید کے خلاف پیدا کر دیا تھا بُعدِ زمانی و بُعدِ مکانی کے باعث کم نہ ہوا بلکہ دن بدن ابھرتا رہا۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اموی کے دربار میں ایک شخص نے یزید کا ذکر کرتے ہوئے غلطی سے امیرالمومنین یزید کہہ دیا جس پر خلیفہ عمر کی پیشانی پر فوراً شکن پڑ گئے اور وہ اپنی فطری نرم مزاجی کے باوجود غضبناک ہو گئے اور کہنے لگے۔ "تم یزید کو امیرالمومنین کہتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ اس نے فرزندِ رسولؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" چنانچہ خلیفہ عمرؒ نے حکم دیا کہ اس شخص کو بیس تازیانے لگائے جائیں جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔

(تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۱ - خلافت و ملوکیت علامہ مودودی ص ۱۸۳)

اتنا ہی نہیں بلکہ یزید کی حکومت ملّتِ اسلامیہ کے دامن پر ایک بدنما دھبہ بن گئی یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری میں مشہور فلسفی شاعر ابوالعلامعری نے اپنے خیالات کا اظہار دو اشعار میں اس طرح کیا ہے ؎

ارى الايام تفعل كل نكر　　فما انا بالعجائب مستزيد

اليس قريشكم قتلت حسيناً　　وكان على خلافتكم يزيد

(ترجمہ) "زمانہ کی نیرنگیاں ہر روز میرے سامنے عجیب نقشے پیش کرتی رہی ہیں یہاں تک کہ اب ان بوقلموں عجائب کے مزید دیکھنے کی مجھے ہوس باقی نہیں

رہی۔کیا تمہارے قریش نے حسینؑ کو قتل نہیں کیا اور کیا تمہاری خلافت کے تخت پر یزید ایسا شخص متمکن نہیں ہوا؟"

کیا اتنا وسیع اور دیرپا جذبۂ نفرت جو یزید کے خلاف پیدا ہوا یزید کی دائمی شکست اور حسینؑ کی دائمی فتح پر برہانِ قاطع نہیں؟ پس بقول مناظر احسن گیلانی "امامؑ کی عظمت کون پیدا کر سکتا ہے۔ایسی ہمہ گیر ہر دلعزیزی کس کے حصہ میں آ سکتی ہے جس کا انتقام دنیا صدیوں سے لے رہی ہے لیکن اب تک آتشِ انتقام کے شعلے بدستور بھڑک رہے ہیں اور قرنوں سے نفرت کی موسلا دھار بارش یزید اور اس کے ساتھیوں پر ہو رہی ہے لیکن تشنگی نہیں بجھتی۔جس طرح پہلی صدی ہجری میں لوگوں نے اعمالِ یزید سے اظہارِ تنفر کیا تھا آج تک وہی تنفر اور وہی بیزاری اسی آن بان کے ساتھ قائم ہے۔"

کیا یہ قرآنی آیہ: "اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ" کی عملی تفسیر تو نہیں؟ (ترجمہ) یقیناً انہی پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔(البقرۃ ۱۵۹) پس فاتح کون ہوا حسین مظلومؑ یا یزید ملعون؟

۱۰۔خلافتِ فاطمیہ ادریسیہ:۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے خونِ ناحق کی آڑ لے کر ارضِ مقدس میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور تختِ خلافت پر قابض ہونے کے بعد خاندانِ رسولؐ کو ایذا پہنچانا شروع کر دیا ایک عبداللہ بن زبیرؓ پر ہی کیا منحصر تھا۔ہر وہ شخص جو جنابِ رسالتمآبؐ کی پیدا کی ہوئی حکومت پر قابض ہو کر مسندِ خلافت پر براجمان ہوا وہ اس یقین کے ساتھ مسند نشین ہوا کہ اس کی حکومت کا اصلی حقدار میں نہیں ہوں بلکہ خاندانِ رسالت اس کا اصل حقدار و قانونی وارث ہے۔چونکہ وہ اصل حقدار تھے لہٰذا وہ حکومتِ

وقت کے خلاف کچھ اقدام کریں یا نہ کریں ، ان کی طرف سے کارکنانِ حکومت کے دلوں میں کینہ و بغض پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ان کے درپے آزار رہتے تھے۔ یہ تاریخ عالم کے مشاہدات میں سے ایک مشاہدہ ہے کہ غاصبانِ حکومت ہمیشہ اصل حق دار اور اس کے خاندان کے خلاف رہتے ہیں۔ کم وبیش ہر مسلمان حکومت کی یہی سنت تھی اور اسی پر حکومتِ بنی امیہ اور حکومتِ بنی عباس عمل پیرا رہی ورنہ کیا وجہ ہے کہ یازدہ آئمۃ الطاہرین پشت در پشت اور نسل در نسل یکے بعد دیگرے تلوار یا زہر سے شہید ہوتے رہے حالانکہ کسی ایک نے بھی حکومتِ وقت کے خلاف کسی باغیانہ تحریک میں کبھی کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے کہ ہم آبائی تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر ٹھنڈے دل و دماغ سے حقائق کا مطالعہ کریں شاید حق کی طرف ہماری رہنمائی ہو جائے۔

ابن زبیرؓ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے عباسیوں نے بھی خونِ مظلومؑ کا بدلہ لینے کا سیاسی ڈھونگ کھڑا کر کے عباسی حکومت کی بنا رکھی۔ حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے بعد خلیفۂ ثانی ابوجعفر منصور عباسی نے حضرت حسن المجتبیٰؑ کے پڑپوتے حضرت محمد نفس زکیہ فاطمی کو جن کی پہلے دونوں بھائی محکومانہ بیعت کر چکے تھے شہید کر دیا ، لیکن ان کے دوسرے بھائی **ادریس بن عبداللہ فاطمی** منصور کے دستِ جفا سے بچ نکلے اور عباسی مظالم سے تنگ آکر ہجرت کر کے مراکو جا پہنچے وہاں بربری اقوام نے ان کے تقویٰ و طہارت کی بنا پر ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی اور ۱۶۵ھ میں خاندانِ ادریسیہ کے نام سے پہلی **فاطمی خلافت** قائم ہوئی۔ اس خاندان نے قریباً ڈیڑھ سو برس حکومت کی اور مراکو کے شہر **فیض** کی بنیاد ڈالی جو فاطمی عہدِ خلافت میں اسلامی دنیا کی روحانی و اخلاقی تعلیم کا مرکز بن گیا اسے اس قدر عروج حاصل ہوا کہ بغداد اور دمشق اس سے رشک کھانے لگے۔

یکے بعد دیگرے خاندانِ فاطمیہ ادریسیہ کے آٹھ نامور خلیفہ گزرے۔ اگرچہ آخری خلیفہ یحییٰ ثالث کی خلافت کا حریف طاقت نے جو خلافتِ فاطمیہ اسمٰعیلیہ کے نام سے مشہور ہے خاتمہ کر دیا تاہم اس خاندان کے ایک فرد **حمود بن میمون فاطمی** نے ہسپانیہ میں اپنی سلطنت قائم کر لی تھی۔ یہ سب کچھ حسینی قربانی کا کمال تھا۔

۱۱۔ خلافتِ فاطمیہ اسمٰعیلیہ:۔ اولادِ فاطمہ طاہرہ؏ کی دوسری شاخ میں سے عبیداللہ المہدی فاطمی نے جو حضرت امام جعفر صادق؏ کی نسل میں سے تھے ۲۹۷ھ میں مصر میں اپنی خلافت قائم کی جو قوت و شوکت اور عظمت و شہرت میں خلافت ادریسیہ سے بھی بڑھ گئی۔ یہ سلطنت انتہائی عروج تک پہنچی اور اس کے چودہ خلفاء یکے بعد دیگرے مسندنشین ہوئے جنہوں نے دو سو باسٹھ ۲۶۲ برس تک حکومت کی۔ اسی خاندان نے قاہرہ کی بنیاد ڈالی اور اس میں عالی شان مساجد اور رفیع الشان علمی درس گاہیں تعمیر کرائیں۔ دورِ حاضرہ کی ازہر یونیورسٹی ان ہی خلفاء کی دینی و علمی خدمات کی یادگار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فاطمی خلفاء بھی دنیا میں خلافتِ الٰہیہ کی بنیاد ڈالنے میں ناکام رہے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے امویوں و عباسیوں کی نسبت اسلام کی زیادہ بہتر خدمات سرانجام دی ہیں مگر بدقسمتی یہ ہے کہ بعض سنّی مؤرخین نے آبائی تعصبات و موروثی کینہ پروری سے کام لے کر ان کو خوب بدنام کیا ہے۔ مشہور مؤرخ علامہ جلال الدین سیوطی کی نازک طبع نے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں اس خاندان کا تاریخی حیثیت سے ذکر کر دیتے کیونکہ یہ خلفا عقیدہ کے لحاظ سے شیعہ تھے اور حضرت علی؏ کی خلافتِ بلافصل کے قائل تھے۔ شیعہ کا ذکر کرنا اگرچہ تاریخی حیثیت ہی سے کیوں نہ ہو علامہ جلال الدین کی نگاہ میں معیوب تھا۔ جن لوگوں کی تنگ نظری و تنگ ظرفی کا یہ عالم ہو بھلا ان سے کب اس امر کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ تاریخی واقعات کو تعصب

کی عینک اتار کر ضبطِ تحریر میں لائیں گے۔

خلفائے فاطمیہ ادرلیسیہ یا اسمعیلیہ مصریہ کی ملی، دینی اور علمی خدمات کا تذکرہ کرنا ہمارے موجودہ موضوعِ بحث سے خارج ہے۔ ہمیں تو یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ بعض سرکردہ مسلمانوں نے اس امر کے لئے انتہائی جدوجہد کی کہ نبوت و خلافت ایک ہی خاندان میں جمع نہ ہو اور ابتدأ وہ بروز سقیفہ حضرت علیؑ کو حقِ خلافت سے محروم کرنے میں کامیاب ضرور ہو گئے لیکن یہ تدبیر ہمیشہ کے لئے کامیاب و کارگر ثابت نہ ہوئی۔ خلافت کو ملوکیت کی گیند بنا کر جو ابتدا میں ہر خاص و عام میں اچھالنے کی کوشش کی گئی وہ بالآخر امویوں کے ہاتھ سے نکل کر ہاشمیوں یعنی بنو عباس کے ہاتھ آگئی اور انجام کار فاطمیوں تک جا پہنچی۔ یہ سب **شہادتِ عظمیٰ** کا کارنامہ تھا اور حسینؑ کی مظلومیت کی دائمی فتح تھی جو شخص بھی خونِ حسینؑ کی آڑ لے کر کھڑا ہو جاتا تھا عوام اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ خلافت بنی فاطمہ حسنی و حسینی دونوں شاخوں میں جا پہنچی لیکن ایک خرابی جو مسلمانوں نے کفرانِ نعمت کی وجہ سے پیدا کر لی تھی اس کا کوئی علاج نہ ہو سکا۔ وہ خرابی یہ تھی کہ جس خلافتِ الٰہیہ کو جناب رسالتمآبؐ دنیا میں قائم کرنا چاہتے تھے وہ محدود عرصہ کے لئے دنیا میں قائم رہ کر ہمیشہ کے لئے دنیا سے اٹھ گئی کیونکہ کفرانِ نعمت سے نعمت چھن جاتی ہے اور شکر گزاری سے نعمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ " لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝ (ابراہیم ۷)

(ترجمہ) " اگر تم شکر کرو گے تو میں اضافہ کر دوں گا۔ اگر تم کفرانِ نعمت کرو گے تو میرا عذاب بھی نہایت ہی شدید ہے۔"

مسلمانوں کو دنیا میں عدل و انصاف سے معمور خلافتِ الٰہیہ کے قیام کا موقع

دیا گیا مگر مسلمانوں نے کفرانِ نعمت کے باعث وہ موقع کھو کر اپنے آپ کو نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم کر لیا۔ اب اسلام کی پستی و نکبت کا رونا بے سود ہے جب تک حق اپنے مرکز پر نہیں لوٹے گا اس وقت تک اس مہلک مرض کا نہ تو علاج ممکن ہے اور نہ ملّتِ اسلامیہ کے آئے دن کے مصائب اختتام پذیر ہوں گے۔

اس میں شک نہیں کہ سینکڑوں برس گزر چکے ہیں کہ فاطمیوں کی حکومت مصر میں ختم ہو چکی ہے لیکن امامت کا مسئلہ آج بھی اسمٰعیلیوں میں پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم و دائم ہے۔ ہز ہائی نس سر سلطان محمدؐ شاہ آغا خان اسی سلسلۂ شیعہ امامیہ اسمٰعیلیہ کے اڑتالیسویں ۴۸ امام تھے۔ کراچی میں آغا خان کو ستر سالہ امامت کے جشنِ جوبلی کے سلسلہ میں پلاٹینم ایسی قیمتی دھات سے تولا گیا۔ اس سے پیشتر آغا خان ممدوح سلور جوبلی، گولڈن جوبلی اور ڈائمنڈ جوبلی کے دور سے گزر چکے تھے۔ پلاٹینم جوبلی کے موقع پر گورنر جنرل، وزیراعظم پاکستان، وزرائے حکومت، اعلیٰ فوجی و سول حکّام اور غیر ملکی سفرا کے علاوہ لاکھوں لوگوں نے شرکت کی۔ آغا خان نے اپنے ایک بیان کے دوران یہ بات بھی واضح کی کہ "آج بھی دنیا کے دو کروڑ اشخاص مجھے اپنا امام و پیشوا سمجھ کر میرے قدموں میں سرِ عقیدت خم کرتے ہیں کیونکہ میری رگوں میں آج بھی رسولِ عربیؐ کا خون دوڑ رہا ہے۔" اس موقع پر دنیا بھر کے اخبارات نے جلی عنوانات سے اس عظیم الشّان تقریب کا ذکر کیا۔ ریڈیائی لہروں پر جشنِ جوبلی کی کاروائی کو نشر کیا گیا اور بعض اخبارات نے "**مشرق کا امام**" اور "**مغرب کا شہزادہ**" کے عنوان سے کئی مضامین شائع کئے۔

ہمیں اس مقام پر نہ تو آغا خان کی دنیوی وجاہت کا تذکرہ مطلوب ہے نہ اس کی بے پناہ مال و دولت کا، کیونکہ مادی شان و شوکت درخورِ اعتنا نہیں۔

مگر ایک چیز جو دورِ حاضرہ میں سر آغاخان نے سرانجام دی دنیا میں شاید ہی کسی دوسرے شخص کو وہی شاندار کارنامہ سرانجام دینے کی توفیق عطا ہوئی ہو۔ وہ یہ ہے کہ آغاخان ہر سال گرہ خود سے لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے قومی تعمیر و ترقی، تنظیم و تبلیغ اور تعلیم و تربیت پر صرف کرتے رہے۔ میں بذاتِ خود ۱۹۳۲-۳۴ء میں یوگنڈا ایسٹ افریقہ میں آغاخان کے ایک تعلیمی ادارے سے منسلک رہا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مشرقی افریقہ میں آغاخان کے خزانہ سے جو رقم ہر سال تعلیمی و مذہبی اداروں میں صرف ہوتی رہی وہ اس وقت کے چھوٹے چھوٹے ترقی پسند افریقی ممالک کے سالانہ بجٹ سے زیادہ ہوتی تھی۔

برّصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی کے لئے جس قدر بھی مذہبی اور سیاسی تحریکیں چلائی گئیں سر آغاخان ان میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۰۶ء میں قیام مسلم لیگ کے موقع پر وہ اس سیاسی تنظیم کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ جب علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کی سطح تک لانے کے لئے تحریک شروع کی گئی تو حکومت کی طرف سے عائد کردہ شرط (بیس لاکھ روپے کی فراہمی) محض آغاخان کی ذاتی تگ و دو سے پوری ہوئی۔ آغاخان نے دیگر زعمائے اسلام کی معیت میں لنڈن کی گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر محمد اقبال کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے انتھک جدوجہد کی۔

آمدم برسرِ مطلب۔ امام حسینؑ کی اولاد میں آج بھی ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں جو روحانی نقطۂ خیال سے تو کروڑوں کے رہنما ہیں اور دنیوی زاویۂ نگاہ سے بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ کیا اولادِ یزید میں آج کوئی ایسا

شخص موجود ہے جو مادی اعتبار سے ہز ہائی نس سر سلطان سید محمد شاہ آغا خان مرحوم یا پرنس کریم آغا خان چہارم کا ہم پلہ ہو؟ رہا دینی تقابل سو یزید اور اولادِ یزید کو دین سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟

کیا یہ تمام کچھ سورۂ کوثر کی عملی تفسیر نہیں؟ کیا "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ" کی حقیقت ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ گر نہیں؟ یقیناً اولادِ رسولؐ کو تو کثرت اور خیرِ کثیر حاصل ہے لیکن دشمنِ رسولؐ ابوسفیان اموی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابتر اور منقطع النسل ہو چکا ہے۔

۱۲۔ عثمانین کا خاتمہ :- شہادتِ عظمٰی کا عظیم الشان کارنامہ اپنے اثر و پائیداری کے اعتبار سے یقیناً ناقص اور ناتمام ہوتا اگر اس کا نتیجہ صرف اموی سلطنت کی مادی طور پر تباہی اور نسلِ امیہ کی ہلاکت ہی ہوتا اور بس۔ اگرچہ امیہ کی جابرانہ و ظالمانہ شہنشاہیت مادی طور پر خود بخود حسینی شہادت کے اثر سے ختم ہو گئی تاہم امام حسینؑ کا ذاتی مقصد اموی حکومت کو مادی طور پر ختم کرنا نہ تھا۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو آپ یقیناً فوج و لشکر فراہم کرتے۔ لیکن امام حسینؑ تو درحقیقت ذہنی انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے جو عسکری قوت سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ فوج کی طاقت اور تلوار کی قوت انسانوں کو مادی طور پر قتل کر سکتی ہے مگر ذہنیت کو فنا نہیں کر سکتی۔ کیا یزید کی گردن اڑا دینے سے یزید کی روح فنا ہو سکتی تھی جس کا وزن امت کے دل و دماغ اور عقل پر پڑ رہا تھا؟ کیا قتلِ یزید سے مسلمانوں کے مسخر قلوب، ان کی مسحور عقلیں اور ان کا سویا ہوا دماغ یزیدیت کے عقلی و ذہنی دباؤ سے آزاد ہو سکتا تھا؟ یقیناً امام حسینؑ کا مقابلہ اس جماعت سے تھا جس کا مسلک اسلام سے بالکل مختلف تھا۔ وہ خلفائے ثلاثہ کے بعد حضرت علیؑ کی خلافتِ حقہ کو تسلیم نہیں کرتی تھی بلکہ حضرت عثمانؓ کے بعد امیر معاویہ و یزید کو ذہنی و عملی طور پر خلیفہ

جانتی و مانتی تھی۔ متبعینِ بنی امیہ کی یہ جماعت جو امیرِ شام کو چوتھا اسلامی خلیفہ تصوّر کرتی تھی اور قتلِ عثمانؓ کے انتقام کی آڑ میں حضرت علیؑ کے خلاف معرکہ آرا تھی **عثمانین** کہلاتی تھی۔ دوسری جماعت میں وہ لوگ تھے جو حضرت علیؑ کی خلافت کو خلافتِ الٰہیہ تسلیم کرتے تھے اور امیرِ شام کو خلافتِ حقّہ و اسلامی مرکزی حکومت کا باغی سمجھتے تھے اور حامیانِ حضرت علیؑ کی حیثیت سے **علویین** کہلاتے تھے۔ صفین کی تمام معرکہ آرائیاں ان ہی دو جماعتوں کے مابین ہوئیں علویین کے اندر محدود سی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو اصولی طور پر پہلی تین خلافتوں سے اختلاف رکھتے تھے اور حضرت علیؑ کو خلیفۂ بلا فصل مانتے تھے اور اصطلاحی طور پر مذہبِ حقّہ شیعہ کے مقلّدین کہلاتے تھے لیکن علویین میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو پہلی خلافتوں کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت علیؑ کو خلیفۂ رابع کی حیثیت سے مانتے تھے۔ یہی لوگ بعد میں سوادِ اعظم یا اہلِ سنّت والجماعت کے نام سے موسوم ہوئے۔ ابتداً یہ سب کے سب لفظ "شیعہ" کے وسیع لغوی معنوں میں شیعانِ علیؑ کہلانا فخر سمجھتے تھے۔ فریقِ ثانی یا حکومتِ شام اور اس کے ہواخواہ خلفائے ثلاثہ کے بعد امیر معاویہ کو خلیفۂ برحق تسلیم کرتے تھے اور حضرت علیؑ کو کسی درجہ پر ماننے کو تیار نہ تھے۔ اگر وہ حضرت علیؑ کو چوتھے درجہ پر خلیفہ تسلیم کر لیتے تو پھر نہ صفین کی معرکہ آرائی ہوتی اور نہ سانحۂ کربلا پیش آتا۔ مسلمانوں کے موجودہ دونوں فرقے سنّی و شیعہ درحقیقت اسی ایک گروہ یعنی علویین کی دو شاخیں ہیں جو بنی امیہ کے مقابل اپنے آپ کو شیعانِ علیؑ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں فرقے اب بھی حضرت علیؑ کی خلافت پر کسی نہ کسی منزل پر جا کر متفق ہیں۔ خوارج بھی علویین ہی کی ایک شاخ ہے جو تحکیم کے معاملہ میں حضرت علیؑ سے منحرف ہو گئی تھی۔ سنّی، شیعہ اور خوارج

تینوں کا وجود اب تک دنیا میں باقی ہے لیکن عثمانین یعنی وہ گروہ جو حضرت عثمانؓ کے بعد امیر معاویہ و یزید کی خلافت کا داعی تھا اور اہل بیت رسولؐ کے ساتھ کوئی تعلق ہی قائم نہ کرتا تھا آج صفحۂ ہستی سے ناپید ہے۔ یہی وہ مذہب تھا جو میدانِ کربلا میں حضرت حسینؑ سے برسرپیکار ہوا اور دنیا سے اس طرح مٹا کہ آج اس کا نام لیوا ایک بھی باقی نہیں کیا اس سے بڑھ کر کوئی کھلی فتح ہوسکتی ہے؟ کیا یہ قرآنی پیشین گوئی "اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ" کی عملی تفسیر نہیں ہے؟

واہ رے شانِ حسینؑ! آپ نے سر کیا کٹایا کہ انسانی ذہنیت میں انقلاب بپا کر دیا اور فریقِ مخالف کا مسلک صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا کہ جس طرح آفتابِ عالمتاب کی ضیا پاشیوں سے تاریکیوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔

۱۳۔ خلافتِ راشدہ وغیر راشدہ میں حدِّ فاصل :۔ سوادِ اعظم نے خلفائے اسلام کو "اولی الامر" مانا ہے اور ان کی اطاعت کو اطاعتِ خدا و رسولؐ کی طرح واجب قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے لئے کسی درجہ تک حدِّ تشریع بھی تسلیم کیا ہے اس اقتضا کے تحت خلفاء کا راستہ ہی صراطِ مستقیم مانا گیا ہے اور اس سے انحراف کو گمراہی، ضلالت اور بدعت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ شہادتِ عظمیٰ نے بعض لوگوں کے چہروں پر سے نقابِ اسلام اتار کر پھینک دیا ہے اور دنیا کو دکھلا دیا کہ اس نقاب کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں جنہیں اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں لہٰذا سوادِ اعظم کو مجبوراً خلافت کو دو صورتوں میں منقسم کرنا پڑا۔ ایک خلافتِ راشدہ اور دوسری غیر راشدہ یا **ملک عضوض**۔ عام طور پر حضرت علیؑ اور حضرت حسنؑ کی خلافت جو معاویہ سے صلح سے قبل تک رہی خلافتِ راشدہ کی آخری حد مانی جاتی ہے۔ یہی

تیس سالہ خلافت ، خلافتِ راشدہ کہلاتی ہے ۔ امیر معاویہ اور پھر یزید و دیگر خلفائے بنی امیہ و بنی عباس سب خلفاء مانے جاتے ہیں مگر غیر راشدین ۔ یہ تفریق اور یہ امتیاز آخر کس نے پیدا کر دیا ؟ یہ تھا امام حسینؑ کے بے پناہ احتجاج اور مخصوص رنگِ جہاد کا نتیجہ ۔ یہ تھا امام حسینؑ کا منتہائے مقصود اور یہ تھا ذہنی انقلاب جس کا بپا کرنا مقصدِ حسینؑ تھا اور اسی مقصد کی کامیابی کا نام فتحِ عظیم ہے اور قرآنی اصطلاح میں یہی فتح مبین ہے ۔

اگر امام حسینؑ اپنی عظیم الشان قربانی سے یہ امتیاز پیدا کر دیتے تو آج دنیائے اسلام یقیناً یزید کو خلیفۃ الرسولؐ و امیر المومنین کے القاب سے یاد کرتی ۔ معصیت و تقویٰ کا معیار ہی کچھ اور ہو جاتا ۔ حق و باطل اور ایمان و کفر میں کوئی تمیز ہی باقی نہ رہتی ۔ خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال تصور کیا جاتا اس طرح باطل حق اور حق باطل ہو جاتا ۔ لیکن فرزندِ رسولؐ نے اسلام پر یہ احسانِ عظیم کیا کہ مصیبت کے وقت اس کے کام آیا اور اپنے مقدس خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی ۔ قصرِ اسلام کی گرتی ہوئی دیواروں کو اگر حسینؑ سنبھالا نہ دیتے تو پھر کس کا زہرہ تھا کہ اس میدان میں اترتا اور خود اپنے خون سے متزلزل بنیادوں کو چٹان کی طرح مضبوطی سے جما دیتا ؟ کیا حسینؑ نے اس حقیقت کو اجاگر نہیں کیا ؟

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید تھی اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

۱۴- حسینی صبر و استقلال کی دائمی مثال :-

حسینی صبر و استقلال ایک ایسی دائمی مثال بن گیا جو ہر کٹھن مرحلہ پر متزلزل دلوں میں استقلال پیدا کرتا رہا چنانچہ جب مصعب بن زبیر جو مشہور دشمن

اہلبیتؑ اور امیر مختار ثقفیؒ کا قاتل تھا۔ خلیفہ عبدالملک اموی کی فوجوں میں محصور ہوگیا اور فوجِ مخالف کی کثرت سے مصعب کی فوجیں کچھ ایسی مرعوب ہوگئیں کہ تمام کی تمام فوج میں انتشار و ابتری کا عالم تھا تو مصعب نے نہایت مایوسی کی حالت میں عروہ بن مغیرہ کو پکار کر کہا کہ جب حسینؑ پر یہ نازک دور آیا تھا تو حسینؑ نے کیا کیا تھا ؟ عروہ نے امام عالی مقامؑ کی شجاعت و ثباتِ قدم کا مفصل ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح امام حسینؑ نے حاکم کی اطاعت کے سوال پر شہادت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ واقعاتِ کربلا کے شجاعانہ تذکرہ نے مصعب میں شجاعت و استقلال کی ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے جوش میں آکر گھوڑے کو تازیانہ لگایا اور ذیل کے اشعار پڑھتے ہوئے، بہادروں کی طرح میدانِ کارزار میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا :-

" وہ جو کربلا میں ہاشمی گھرانے کی فردیں تھیں ایک ایسی مثال قائم کرگئیں ہیں جو شریفوں کے لئے ہمیشہ کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے۔"

(اخبار الطوال ص ۳۰۱-۳۰۲)

جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کی فوجوں کو محاصرہ میں لے لیا تھا۔ ان میں سخت ابتری و بدنظمی پھیل چکی تھی اور ابن زبیرؓ کے ساتھیوں اور مددگاروں نے حتیٰ کہ ان کے اپنے بیٹوں اور عزیزوں نے بھی ان کی نُصرت ترک کرکے فوجِ مخالف کا ساتھ دینا شروع کردیا تھا تو تنہائی و بے بسی کے باعث مجبور ہوکر ابنِ زبیرؓ کے پاؤں ڈگمگانے لگے، صبر و استقلال چلتا بنا اور غیر مشروط اطاعت کے طور پر امیرِ شام کی امان کو منظور کرنے پر مائل ہوگئے ان کی غیور والدۂ گرامی حضرت اسماء بنتِ ابوبکرؓ نے جب یہ کیفیت دیکھی تو کہنے لگیں :- " اے بیٹے ! اگر تم اب تک ناحق ان سے لڑے تھے اور اپنے آپ

کو برحق نہیں سمجھتے تھے تو تم نے بہت برا کیا کہ ہزاروں مسلمانوں کو ناحق کٹوا دیا اور اگر تم اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے تو بس **حسینؑ کی طرح حق پر لڑو اور جان دے دو۔** "ماں کی اس حوصلہ افزا و جرأت آمیز نصیحت سے عبداللہ بن زبیرؓ میں جوشِ شجاعت پیدا ہوا اور وہ دادِ شجاعت دیتے ہوئے موت کی آغوش میں جا پہنچے۔

امام حسینؑ نے جو قوتِ برداشت اور جرأتِ اظہار پیدا کر دی تھی وہ ہمیشہ ظلم و جور کی طاقتوں کو چیلنج کرتی رہی اور تمام اقوامِ عالم کے لئے حسینی شہادت مشعلِ راہ بن گئی۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی و قیامِ پاکستان کے سلسلہ میں مقررین آپ ہی کی شاندار قربانی کی مثال پیش کر کے عوام میں آزادی کی تڑپ، جوشِ شجاعت، ثباتِ قدم اور جرأتِ اظہار کا جذبہ پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ معمارِ پاکستان حضرتِ اقدس قائدِاعظم **محمد علی جناح** رح فرمایا کرتے تھے۔ "امام حسینؑ سے بہتر اور روشن مثال دنیا میں نہیں پیش کی جا سکتی۔ اس لئے کہ وہ مجسمہ تھے محبت اور بہادری کا، اور پیکر تھے قربانی اور ایثار کا۔ ہر مسلمان کو بالخصوص ان کی زندگی سے سبق لینا چاہئے اور ان کی پیروی کرنا چاہئے۔"

مہاتما گاندھی نے احمد آباد کے مقام پر اپنی تقریر کے دوران ارشاد فرمایا۔ "میں اہلِ ہند کے لئے کوئی نئی بات پیش نہیں کرتا۔ میں نے کربلا کے ہیرو کی زندگی کا مطالعہ بخوبی کیا ہے۔ اس سے مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی اگر نجات ہو سکتی تو ہم کو حسینی اصول پر عمل کرنا چاہئے۔"

(ٹائمز آف انڈیا۔ حسینی دنیا)

مسٹر بی جی کھیر سابق وزیراعظم بمبئی کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

"امام حسینؑ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی ہیں اور ہندو

دمسلمان دونوں ان کے نقشِ قدم پر چل کر ظلم وستم کے خلاف سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔" (حسینی دنیا)

صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے، مفلسی وتنگدستی کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے، خوابِ غفلت میں مدہوش پڑے ہوئے، جہالت کی تاریکیوں میں کھوئے ہوئے، گم گشتہ ہندی مسلمان بالآخر اٹھے اور حسینی اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے، دولتِ خداداد یعنی مملکتِ پاکستان کے وارث بن گئے۔ پس جب حسینی صبر و استقلال کی مثال غلام کو آزاد اور مفتوح کو فاتح بنا دیتی ہے تو حسینؑ کی عظیم الشان فتح میں کیا شک ہو سکتا ہے ؎

ریگِ عراق منتظر ، کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ و شام خویش را

(اقبالؒ)

باب دہم

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝

جو لوگ راہِ خدا میں قتل کئے گئے ہیں ان
کو ہرگز ہرگز مردہ نہ گمان کرنا بلکہ وہ زندہ ہیں
اور اپنے رب کے پاس سے رزق پاتے ہیں

(آل عمران ۱۶۹)

حسینؑ زندہ جاوید ہیں

شہادت کی حقیقت

حق و باطل کی ستیزہ کاری، نور و ظلمت کا تصادم اور اسلام و کفر کی چپقلش عالمِ امکان کا قدیم ترین دستور رہا ہے لیکن ہر تاریخی دور میں ایک خصوصیت نمایاں رہی۔ وہ یہ کہ باطل ساز و ساماں سے آراستہ، اپنے جلو میں طاقت و جبروت کی فوجیں لے کر میدانِ کارزار میں بڑھا اور حق ہمیشہ نہتا، غیر مسلح، مظلومانہ رنگ میں مدِمقابل ہوا۔ خواہ حق و باطل کی یہ کشمکش حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے درمیان، یا نور و ظلمت کی یہ نبرد آزمائی حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے مابین، یا اسلام و کفر کا یہ معرکۂ کارزار جنابِ ختمی مرتبت حضرت محمد عربیؐ اور ابوسفیان اموی کے درمیان گرم ہوا ہو۔ مردانِ حق کی سب سے بڑی طاقت ان کی لازوال استقامت اور غیر متزلزل ثباتِ قدم تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ داعیانِ حق اہلِ عالم کی نگاہ میں شکست خوردہ و ناکام ہوئے لیکن ان کی ہر شکست میں ایک تعمیر اور ان کی ہر ناکامی میں ایک کامیابی مضمر تھی۔ وہ خود مٹ گئے لیکن اس اصول کو جس کے تحفظ میں انہوں نے جانِ عزیز نثار کر دی زندۂ جاوید بنا گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہادت کی موت حقیقت شناس نگاہوں میں حیاتِ ابدی سے تعبیر کی گئی۔ حضرت زکریاؑ و حضرت یحیٰؑ کی مظلومانہ شہادت ہمارے اس دعوے کی پرزور تائید کرتی ہے۔ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر کھینچنے والے یہود کے لئے خدا کی وسیع سرزمین میں کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں۔ ان پر ذلت و نکبت کا نزول ہوا۔ وہ "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ" کے مصداق ٹھہرے اور قرآنی اصطلاح میں مَغْضُوب و مَلْعُون قرار دیئے گئے لیکن حضرت عیسیٰؑ کے نام لیوا آج تمام دنیا پر مسلّط ہیں۔ پس کیا دائمی فتح نے مسیح ناصریؑ کی قدمبوسی کی یا اس جابر یہودی حکومت

کی جس نے خدا کے راستباز نبیؑ کو تختۂ دار پر کھینچنے کی سعی کی۔ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ نے آیۂ کریمہ " وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ " کی تفسیر میں اس حقیقت کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے:۔

راہِ حق میں مرنے والے کو شہید اس لئے کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی دنیوی سعی و عمل میں ناکام ہو جاتا ہے اور فقدانِ اسبابِ دنیوی کے باعث اہلِ باطل سے اپنے آپ کو نہیں منوا سکتا اور زمانہ کو اپنے لئے ناسازگار پاتا ہے تو رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہونے والا حق پرست امروز کو چھوڑ کر فردا کی فکر کرنے لگتا ہے اور جب اس کے قدم حدود اللہ کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں تو باطل کی سرحدیں پاؤں رکھنے کی بجائے وہ اپنے خونِ سرخ و گرم کی ایک واضح و نمایاں اور نہ مٹنے والی لکیر حق و باطل کے دوراہے پر کھینچ دیتا ہے تاکہ پیچھے آنے والے رہ نوردانِ حق اس کو دیکھ کر منزل کا پتہ لگالیں اور اس کا چمکتا ہوا خون اور باطل کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا خون، نظر نہ آنے مگر محسوس ہونے والا خون قیامت تک باطل سے انکار اور حق کی اتباع میں شہادت دیتا رہے۔ ان کی یہی شہادت و گواہی وہ حیاتِ جاوید ہے جو جریدۂ عالم پر ان کے دوام کو ثبت کر دیتی ہے۔ دنیا مٹ جاتی ہے لیکن وہ نہیں مٹتے۔" (داستانِ کربلا۔ ص ۲۱۶ - ۲۱۷)

نواب صاحب کے مذکورہ استدلال سے معلوم ہوا کہ حق و باطل کے ہنگامۂ کارزار میں قلتِ انصار و فقدانِ آلاتِ حرب و ضرب کی فکر اور تردد سے بے نیاز ہو کر، تحفظِ حق و اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے سرفروشی و فداکاری کا نام شہادت ہے اسی حیرت انگیز کارنامہ کو سرانجام دے کر حسینؑ ابن علیؑ نے حیاتِ جاودانی حاصل کر لی ہے۔

مومن و منافق میں امتیاز

اعلائے کلمۃ الحق اور دینِ خدا کی سربلندی و سرفرازی کے لئے جہاد فی سبیل اللہ ہر مومن پر واجب کیا گیا ہے۔ اسی سے مومن و منافق کی شناخت ہوتی ہے کہ کون امانتِ خدا کے ادا کرنے میں سبقت کرتا ہے اور کون میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر جان بچانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ ہر وہ شخص جو خدا کی عطا کردہ جان کو اس کے دین کے تحفظ میں، اس کے حکم کے تحت قربان کرنے سے دریغ کرتا ہے، فی الحقیقت، خائن، آثم، کاذب، بدعہد اور غدّار ہے اور جو اس امانتِ خداوندی کو اطاعتِ کاملہ و اخلاصِ عمل سے قربان گاہ کی بھینٹ چڑھاتا ہے خدا کا مخلص بندہ و مومن کامل کہلانے کا مستحق ہے۔ مومن تو یہ کہتے ہوئے جان دیتا ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مومن و منافق کے اسی امتیاز کو نمایاں کرنے کے لئے زبانِ قدرت سے ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ
وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا۔ (آلِ عمران - ۱۶۵-۱۶۶)

(ترجمہ) "دونوں گروہوں کے مڈبھیڑ کے وقت جو مصیبت تم کو پہنچی تھی وہ باذنِ الٰہی تھی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ تمہارے ایمان کا امتحان کرے۔ مومنین و منافقین میں تمیز کرا دے۔"

جو ثابت قدم رہا وہ مومن ہے جو بھاگ گیا وہ منافق ہوا اگر کسی موقع پر قدرت بھاگنے والوں کو "عَفَا اللّٰهُ عَنْكُمْ" کہہ کر کے معاف فرما دے تاکہ دوسرے مسلمان خائف و مایوس نہ ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ آزمائش میں پورے اترے ہیں۔ اور امتحان میں کامیاب ہو گئے ہیں لہٰذا وہ مومنین کامل ہیں۔ یہ معافی امتحان میں کامیابی کی دلیل نہیں۔ ان کے ایمان کی صحت و سقم کا امتحان ہوا۔ انہوں نے

جان دینے سے گریز کیا لہٰذا معانی **عدم ایمان** یا **ضعفِ ایمان کو ایمانِ کامل** نہیں بنا سکتی کیونکہ مومنِ کامل میدانِ جنگ میں راہِ فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ جان، سپردِ جان آفرین کر دیتا ہے۔ میدانِ جہاد میں صبر و استقامت ہی ایمانِ کامل کی دلیل ہے اور بھاگنا کفر کے مترادف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (آلِ عمران ۱۴۲)

(ترجمہ) کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم بہشت میں داخل ہو جاؤ گے جب تک خدا (بذریعہ امتحان) یہ نہ معلوم کرے کہ کون اس کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور کون ثابت قدم رہتا ہے۔"

پس ظاہر ہے کہ صرف جہاد میں شرکت ہی ایمانِ کامل کی دلیل نہیں بلکہ اس میں صابر و ثابت قدم رہنا ہی شرطِ ایمان ہے اور جس سے یہ شرط فوت ہو گئی تو مشروط (ایمان) بھی خود بخود فوت ہو گیا۔

خریدارِ جنّت کی نو خصوصیات

ایمانِ کامل و منتہائے اطاعت یہی ہے کہ اس کی راہ میں جان ہی دے دی جائے کیونکہ یہ اسی کا مال ہے اور وہ اس کا طالب ہے۔ اسی نے حکم دیا ہے کہ میری راہ میں قربانی دو اور میرے دین کی نُصرت میں عروسِ موت سے ہمکنار ہو کر شہادت کے بلند مراتب پر فائز ہو، یہی اصلِ ایمان ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝
اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ
الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ
وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبہ : ۱۱۱-۱۱۲)

(ترجمہ) "بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین کی جان و مال کو جنّت کے معاوضہ میں ان سے خرید لیا ہے وہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ دشمنانِ خدا کو قتل کرتے ہیں اور شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ توریت، انجیل اور قرآن میں خدا کا سچا وعدہ ہے اور خدا سے بڑھ کر کون شخص بہتر ایفائے عہد کر سکتا ہے پس تم اس خرید و فروخت پر خوش ہو جو تم نے خدا کے ساتھ اس کے ہاتھ پر کی ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ (وہ فائز المرام مومنین) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمدِ خدا بجا لانے والے، راہِ خدا میں سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی اور بھلائی کا حکم کرنے والے، منکرات سے منع کرنے والے، تمام احکامِ خداوندی و حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اے محمدؐ! ایسے مومنین کو ہماری نعمات کی بشارت دے دیجئے۔"

اب ہم ان آیاتِ کریمہ پر غور کر کے دیکھتے ہیں کہ کیا عالی مرتبت امامؑ کی ذاتِ قدسی صفات ان نو خصوصیات کی حامل تھی جو اس مقام پر بیان کی گئی ہیں اور کیا ان اوصاف کا مکمل اطلاق امامؑ کی زندگی پر ہو سکتا ہے؟

۱۔ **اَلتَّآئِبُوْنَ** (توبہ کرنے والے) :۔ شوقِ عبادت کے ساتھ خوفِ خدا کا یہ عالم تھا کہ حضرت امامؑ ادائے صلوات کے مخصوص اوقات میں تجدید وضو فرماتے رہتے تھے اور نماز کے لئے جب کھڑے ہوتے تو رخسارِ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ جسم کے تمام جوڑوں میں خوفِ الٰہی کی وجہ سے

رعشہ پڑ جاتا تھا اور آپ زور زور سے کانپنے لگتے تھے۔ جب آپ سے اس حالت کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "جس شخص کو دنیا میں خوفِ خدا ہوتا ہے وہی قیامت میں چین سے رہے گا" (شہید الاسلام۔ ص ۹۷)

توبہ و استغفار کی یہ کیفیت تھی کہ شبِ عاشور قوم اشقیا سے یہ کہہ کر ایک رات کی مہلت مانگی کہ آج رات ہم اپنے پروردگار کی خوب عبادت کرلیں اور دعا و استغفار میں مصروف رہیں کیونکہ پروردگارِ عالم خوب جانتا ہے کہ میں ہمیشہ اس کی عبادت، تلاوتِ قرآن اور کثرتِ دعا و استغفار کو محبوب سمجھتا رہا ہوں"

(طبری جلد ۶ مطبوعہ مصر۔ ص ۲۳۸)

۲۔ **اَلْعَابِدُوْن** (عبادت گزار) :۔ جناب امام زین العابدینؑ سے مروی ہے کہ امامؑ ہر شب کو ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اس سے بڑھ کر عبادت گذاری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آپ نے یومِ عاشور اپنے اصحاب کی معیّت میں نمازِ ظہر تیروں کی بارش میں ادا کی حالانکہ کیفیت یہ تھی کہ نصف سے زائد اصحاب شہید ہو چکے تھے اور جو باقی تھے وہ زخموں سے چور چور تھے لیکن پھر بھی نمازِ خدا ادا کر کے دادِ مردانگی دے رہے تھے۔ تیروں کی بے پناہ بارش میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ نماز تمام ہوتے ہوتے سعید بن عبداللہؓ تمام ہو گئے۔ (مقتل ابو مخنف)

۳۔ **اَلْحَامِدُوْن** (حمد بجا لانے والے) :۔ شبِ عاشور حضرت حسینؑ و اصحابِ حسینؑ نے رکوع، سجود، قیام و قعود میں گزار دی۔ تسبیح و حمد کی آوازیں ایسی بلند ہو رہی تھیں جیسے شہد کی مکھیوں کی آوازیں اڑنے کے وقت پیدا ہوتی ہیں (صواعق محرقہ، مقتل ابو مخنف۔ ینابیع المودۃ۔ ضیاء العینین فی مقتل الحسینؑ روضۃ الصفا)

۴۔ **السَّائِحُوْن** (راہِ خدا میں سفر کرنے والے)۔ حضرت حسینؑ نے حج بیت اللہ کی غرض سے پچیس بار مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک پیدل سفر کیا۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں :۔

"جس نے پچپن سال کی عمر رضا و تسلیم، خاموشی اور خلوت میں گزار دی جس نے باوجود عمدہ گھوڑوں اور پر شوکت سواریوں کے ایک دفعہ نہیں، دس دفعہ نہیں بلکہ پچیس دفعہ ڈھائی سو میل کی مسافت (پا پیادہ) طے کر کے اللہ کے گھر کا حج کیا۔ جس نے تین دفعہ اپنی ساری مملوکات سے دست بردار ہو کر، بے خانماں ہو کر، سب کچھ لٹا دیا، تم اس کے متعلق ایسے برے خیالات پکاتے ہو۔ فرات کے کنارے تو (العیاذ باللہ) وہ یزید کی دولت دیکھ کر آیا تھا لیکن مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ پچیس دفعہ پیادہ پا کس غرض کو سامنے رکھ کر آتا رہا۔ اس کا کیا منصوبہ تھا جب اس نے اپنی ساری جائداد کو تین دفعہ اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ (داستانِ کربلا ص ۱۹۴-۱۹۵- طبقات علامہ شعرانی)

حرم مدینہ کے احترام کے پیشِ نظر امام حسینؑ نے جوارِ روضۂ رسولؐ چھوڑا حرم کعبہ کے احترام کی غرض سے حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا۔ حدود اللہ کے تحفظ و بقائے اسلام کے لئے ریگ زار کربلا میں تشریف لا کر جام شہادت نوش فرمایا۔ اس سے بڑھ کر **سَائِحُوْن کی عملی تفسیر** اور کیا ہو سکتی ہے ؟

بعض مفسرین نے سَائِحُوْن کے معنی روزہ دار کے لئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ قائمہ باللیل و صائمہ بالنہار رہنا آلِ محمدؐ کا خاصہ تھا۔ یعنی اہلبیت نبوی کا دن روزہ داری اور رات عبادت گذاری میں کٹتی تھی۔ تفصیل کے لئے آیۂ کریمہ: " و یطعمو ن

الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْناً وَّ یَتِیْماً وَّ اَسِیْراً (الدہر ۸) کا شانِ نزول ملاحظہ کیجئے کہ کس طرح حضرت علی مرتضیٰؑ، حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؑ حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت فضہؓ ایک منت کے پورا کرنے کے لئے مسلسل تین دن روزہ رکھتے رہے اور بوقتِ افطار اپنا اپنا کھانا مسکین، یتیم اور قیدی کو عطا کرتے رہے۔ (تفسیر کشاف زمخشری الجزء الثانی ص ۵۱۱-۵۱۲۔ اسباب النزول واحدی۔ ارجح المطالب باب دوم ص ۴۲)

۵-۶- اَلرَّاکِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ (رکوع اور سجدہ کرنے والے):-

رکوع و سجود کے بارے میں مختصر سا حوالہ امرِ سوم کے تحت تحریر کیا جا چکا ہے لیکن تاریخ عالم کا یہ حیرت انگیز واقعہ ابدالآباد تک بے نظیر رہے گا کہ امام حسینؑ نے خنجرِ قاتل کے نیچے سر بسجود فریضۂ عصر سرانجام دیا ؎

کر گیا سجدہ کے قابل کربلا کی خاک کو ایک سجدہ کربلا کا زیرِ خنجر دیکھئے

۷-۸- اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ:-

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض کو کماحقہٗ وہی ذاتِ گرامی سرانجام دے سکتی ہے جو اوّلاً خود معصوم عن الخطا والنسیان ہو تاکہ اس کا اسوۂ حسنہ دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہو۔ ثانیاً باریک سے باریک گناہ کی ماہیت کو خوب جانتی ہو تاکہ مقلدین کی صحیح معنوں میں رہنمائی کر سکے۔ آں کہ خود گم است کرا رہبری کند۔ جو خود گناہ کے چنگل سے آزاد نہ ہو وہ دوسروں کو کس طرح راہِ ہدایت دکھا سکتا ہے۔ پس اس نقطۂ نظر کی رُو سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ صرف وہ مقدس ہستی ہی سرانجام دے سکتی ہے جو یا تو حاملِ بارِ نبوّت ہو یا زینت افزائے تاجِ امامت۔ قوموں کی قیادت اور ملّت کی امامت کسی زید و بکر کا کام نہیں بلکہ یہ تو ان کا کام ہے جو ثقلین میں سے ایک عظیم القدر ثقل یعنی

یعنی عترتِ رسولؐ ہو جس سے بقولِ رسولؐ سبقت کرنا بھی موجبِ ہلاکت ہے اور جس کی پیروی میں کوتاہی کرنا بھی باعث ہلاکت ہے۔

"فَلَا تقدموھما فتھلکوا ولا تقصروا عنھما فتھلکوا ولا تعلموھم فَاِنَّھُمْ اعلم منکم"۔ (صواعق محرقہ ابن حجر مکی الباب الحادی عشر۔ ص ۸۹)

(ترجمہ) آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم ان دونوں (کتاب اللہ و عترتِ رسولؐ) سے پیش قدمی نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور نہ ان کی پیروی میں کوتاہی کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے، اور میرے اہلِ بیتؑ کو تم سکھانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں۔

غالباً یہی احساسِ فرض تھا جس نے حضرت امام حسینؑ کو احباب و انصار کی ممانعت کے باوجود مجبور کر دیا تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض جو ہادیٔ دین و امامِ امت کے ذمہ ہیں سرانجام دیں حالانکہ آپ کے دوستوں و عزیزوں نے اہلِ کوفہ کی بے وفائی متلون مزاجی اور زمانہ سازی کا تذکرہ کر کے آپ کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کی لیکن آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"میں نے عزم کر لیا ہے۔ آج کل ہی میں روانہ ہوتا ہوں"۔

جب کوفہ کی جانب روانہ ہونے کی گھڑی نزدیک آئی تو عبداللہ بن عباس نے آپ کو روکنے کی بے حد کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ حضرت حسینؑ چٹان کی طرح مضبوطی کے ساتھ اپنے ارادہ پر ڈٹے ہوئے ہیں تو جوش میں آکر عرض کرنے لگے:۔

"اگر مجھے یقین ہوتا کہ آپ کے بال پکڑ لینے سے اور لوگوں کے جمع ہونے سے رک جائیں گے تو واللہ میں ابھی آپ کی پیشانی کے بال پکڑ لوں"۔ لیکن

حضرت حسینؑ نے جواب دیا۔ "اے ابن عم! میں جانتا ہوں تم میرے خیر خواہ ہو لیکن میں اب عزم کر چکا ہوں۔" (داستانِ کربلا۔ ص ۳۷) ابن جریر۔

آخر یہ کونسی چیز تھی کہ عزیزوں کا اظہارِ ہمدردی، اہلِ عراق کی فریب کاری و زمانہ سازی کا تخیل، اہلِ کوفہ کی بدعہدی و بے وفائی کا تجربۂ سابقہ، بنی امیہ کی تشدد آمیز پالیسی اور پردگیانِ عصمت سرا کی تشہیر کا تصور، غرضیکہ کوئی چیز آپ کے عزمِ سفر کے مزاحم نہ ہو سکی، وہ صرف ایک چیز تھی (SENSE OF RESPONSIBILITY) یعنی **احساسِ فرض** جس کو کوفیوں کے آخری خط نے مشتعل کر دیا تھا۔ نفسِ مضمون کا مطالعہ کرتے ہی آپ تڑپ اٹھے اور بحیثیتِ امام رفعِ حجت کے لئے جانے پر مجبور ہو گئے۔ درآنحالیکہ آپ خوب جانتے تھے کہ **"الکوفی لایوفی"** یعنی وفاشعاری کوفیوں کا شیوہ نہیں۔ پیشتر ازیں آپ اپنے والد بزرگوار حضرت علیؑ اور اپنے بھائی حضرت حسن المجتبیٰؑ کے ساتھ کوفیوں کی بے وفائی، غداری، بزدلی اور زمانہ سازی کا مظاہرہ بخوبی دیکھ چکے تھے۔ اس آخری خط کو امام المحدثین اہلِ سنت والجماعت علامہ ابواسحاق ابراہیم بن محمد اسفرائنی نے اپنی کتاب نور العینین فی مقتل الحسینؑ میں نقل کیا ہے اور اس کے اردو ترجمہ (ضیاء العینین فی مقتل الحسینؑ) سے ہم خط مذکور کے چند آخری فقرات نقل کرتے ہیں:۔

"اگر آپ تشریف نہ لائیں گے تو کل بروز قیامت خدا کے حضور ہم آپ کے خلاف فریاد کریں گے اور حق تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ اے پروردگار! ہم پر حسینؑ نے ظلم کیا ہے اور ہمارے اوپر ظلم ہونے سے وہ راضی ہوئے۔ تمام خلائق بھی فریاد کریں گی کہ اے پروردگار! حسینؑ سے ہمارا حق دلوایئے اس وقت آپ کیا کہیں گے اور کیا جواب دیں گے۔ حق تعالیٰ آپ سے کہے گا کہ تم ان کا حق ادا کرو۔"

"راوی کہتا ہے کہ جب اس خط کو حسینؑ نے پڑھا تو خوفِ الٰہی سے آپ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جسم مبارک تھرّا گیا اور قلب کانپ اٹھا اس واسطے کہ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ اس قسم کی فریاد کرتے ہیں کہ ہم پر ظلم ہوتا ہے اور نانا کی قسمیں دلاتے ہیں۔ پس اس وقت آپ اٹھ بیٹھے اور آپکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔"

مذکورہ بالا خط کے مضمون نے آپ کو تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض کی انجام دہی کے لئے کوفہ کی روانگی پر مجبور کر دیا ورنہ اس سے پیشتر کئی خطوط آ چکے تھے اور آپ نے انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔

۹۔ الحافظونَ لحدود الله (حدود اللہ کی محافظت کرنے والے) :-

یہ محض حدود اللہ کی محافظت مطلوب تھی کہ آپ نے ایک جابر و قاہر سلطنت کے مقابل حق و حریت کا علم بلند کیا اور سرفروشی و فداکاری کے ذریعہ اسلام کو تباہی و ہلاکت کی طوفان خیز موجوں کی لپیٹ سے بچالیا۔ چنانچہ اثنا ءِ سفرِ کوفہ میں مقام بیضہ پر دوستوں اور دشمنوں کو مخاطب کرکے آپ نے اسی مقصد کو بے نقاب کر دیا تھا اور واشگاف الفاظ میں بیان فرما دیا تھا کہ حدود اللہ کی نگہداشت کا میں سب سے زیادہ حقدار ہوں۔ ارشادِ گرامی ملاحظہ فرمائیے :-

" اے لوگو ! رسول اللہؐ نے فرمایا ہے۔ جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے جو ظلم کرتا ہے، خدا کی قائم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے، عہدِ الٰہی شکست کرتا ہے، سنّتِ نبوی کی مخالفت کرتا ہے، خدا کے بندوں پر گناہ اور سرکشی سے حکومت کرتا ہے اور دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے فعل سے اس کی مخالفت کرتا ہے نہ اپنے قول سے تو خدا ایسے آدمی کو اچھا ٹھکانہ نہ بخشے گا۔ دیکھو یہ لوگ شیطان کے پیرو بن

گئے ہیں۔ رحمان سے سرکش ہو گئے ہیں، فساد ظاہر ہے۔ حدود الٰہی معطل ہیں۔ مالِ غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھیرایا جا رہا ہے۔ ان کی سرکشی کو حق و عدل سے بدل دینے کا میں سب سے زیادہ حقدار ہوں۔"
(داستانِ کربلا مولانا ابوالکلام آزاد ص ۴۵-۴۶ - تاریخ کامل - ابن جریر - تاریخ ابن اثیر - ج ۴ - ص ۴۵-۴۶)

ایک دوسرے موقع پر امامؑ ارشاد فرماتے ہیں۔ " افسوس! دیکھتے نہیں - حق پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے - باطل پر علانیہ عمل کیا جا رہا ہے - کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے - وقت آگیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقاء الٰہی کی خواہش کرے لیکن میں **شہادت ہی کی موت** چاہتا ہوں - ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔" (داستانِ کربلا - مولانا ابوالکلام آزاد - ص ۴۷)

کیا تاریخِ عالم میں حدود اللہ کی نگہداشت و تحفّظ کی اس سے بہتر کوئی مثال مل سکتی ہے؟ حضرت حسینؑ نے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے، یار و انصار اور اپنی ذاتِ قدسی صفات کو راہِ حق میں محض اس خیال سے قربان کر دیا کہ ایک عدیم المثال قربانی کے ذریعے حدود اللہ کی محافظت کی جائے - اہلِ دنیا دیکھ رہے تھے کہ بنی امیہ نے حدود اللہ کو معطل کر دیا ہے - خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے رکھا ہے - کوئی اور ایسا مسلمان نہیں جو اس آڑے وقت میں اپنے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کرے - آخر حضرت حسینؑ اٹھے اور اپنی عدیم المثال قربانی اور حیرت انگیز فداکاری سے اسلام کو زندۂ جاوید بنا گئے ؎

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت　　حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سرجلوۂ خیر الامم　　چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت　　لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت (اقبالؒ)

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہے کہ آیۂ زیرِ بحث میں جن نو صفاتِ حسنہ کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب کی سب نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کی ذاتِ بابرکات میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

جنّت کی خریداری

میدانِ وغا میں پائے استقامت کا لغزش کھا جانا ضعفِ ایمان یا فقدانِ ایمان کی دلیل ہے۔ جو شخص تیروں کی بارش میں زخم پر زخم کھا کر نہ مسکرائے اور سینہ پر پے در پے ضربات کھا کر قدم آگے نہ بڑھائے وہ نہ تو دادِ شجاعت دے سکتا ہے اور نہ ہی جان و مال کے معاوضہ میں خریدارِ جنت بن سکتا ہے۔ قدرت کو اس شرئی و بیع کا معاملہ طے کرنے کے لئے کسی ایسے مردِ مومن کی ضرورت ہے جو ایمان میں کامل ہو اور جس نے کسی میدانِ جنگ میں پیٹھ نہ پھیری ہو بلکہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار (بنیانِ مرصوص) کی طرح صف بستہ ہو کر دشمنانِ دین کے خلاف نبرد آزما رہا ہو۔ اسی لئے تو قدرتِ کاملہ نے اس خرید و فروخت کے لئے چند شرائط عائد کر رکھی ہیں جن کو آیۂ زیرِ بحث میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے :-

شرائط :- اوّلاً خریدارِ جنت مومن کامل الایمان ہو۔ کیونکہ یہ عہدِ خداوندی خالصتاً مومن سے ہے نہ کہ ہر مسلمان سے۔ مسلمان ہونا درحقیقت ایمان کی ابتدائی منازل میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ بقولِ جناب صادقِ آلِ محمدؑ: "جس نے خدا کے دین (اسلام) کا اقرار زبان سے کیا وہ صرف مسلم ہے اور جس نے خدا کے اوامر و نواہی پر عمل کیا وہ مومن ہے۔" (کافی۔ ص ۲۸۴)

خود قرآنِ حکیم نے مومن کی یوں تعریف کی ہے۔" اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحجرات ۱۵)

(ترجمہ) یقیناً مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انہوں نے کبھی شک وشبہ نہ کیا اور راہِ خدا میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا۔ ایسے ہی لوگ تو سچے ہیں۔

ثانیاً:۔ وہ ان نو صفاتِ حسنہ سے متصف ہو جن کا تفصیلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔

ثالثاً:۔ راہِ خدا میں وہ صرف جہاد ہی نہیں بلکہ قتال کر کے دشمنانِ دین کو موت کے گھاٹ اتارے۔

رابعاً:۔ وہ خود بھی اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد میں شہادت کے درجہ پر فائز ہو۔

خمساً:۔ اس رفیع الشان عہد و پیمان اور اس بلند مرتبت سرفروشی و ایثار کو قرآنِ حکیم کے علاوہ توریت و انجیلِ مقدس کی تائید بھی حاصل ہو۔

جب ان شرائط پر غور وخوض کیا جاتا ہے تو مومنین میں ایسی بزرگ ہستیاں بہت قلیل تعداد میں نظر آتی ہیں جو ہر اعتبار سے اس معیار پر پوری اترتی ہوں۔ اوّل تو مومن کامل الایمان ہونا محال ہے اور پھر مذکورہ نو صفات کا ملنا محال تر ہے۔ مزید براں دشمنانِ دین کے خلاف کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونا اور ان کو قتل کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہونا اس سے بھی دشوار تر ہے لہٰذا ہر مدعی ایمان آیۂ مبارکہ کا موصوف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ جنگِ بدر، جنگِ احد، جنگِ موتہ اور خود معرکۂ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے علاوہ متعدد ایسی بزرگ ہستیاں تھیں مثلاً حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت زیدؓ بن حارث، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت عباسؑ، حضرت قاسمؑ، حضرت علی اکبرؑ، حضرت بریر بن حضیرؓ ہمدانی حضرت حبیب ابن مظاہرؓ وغیرہ جو دشمنانِ خدا کو قتل کر کے خود بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوئی ہیں لیکن انہیں بھی مذکورہ بالا نو صفاتِ حسنہ میں وہ کمال حاصل نہ تھا جو خود جناب امام حسینؑ کی ذاتِ گرامی کو تھا۔ کیونکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

کے فرائض کو کما حقہٗ سرانجام دینا صرف انبیائے کرامؑ کا کام ہے یا آئمۃ الطاہرینؑ کا۔ بالخصوص حدود اللہ کی محافظت جس خوبی سے حضرت امام حسینؑ نے سرانجام دی تاریخ عالم میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اس لئے اگر دوسرے شہداء آیۂ کریمہ کے **مصداقِ عمومی** ہیں تو حضرتِ امامؑ **مصداقِ خصوصی**۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جناب حسنین علیہم السلام کو جوانانِ جنت کی سرداری مرحمت کی گئی ہے۔

ہر اس مردِ مجاہد کو جو میدانِ جہاد میں دشمنانِ دین کے ساتھ قتال کرے اور ان کو فی النار کرے لیکن خود درجۂ شہادت پر فائز نہ ہو تو اس کمال سے محرومی کی بنا پر آیۂ زیر بحث کا جزوی طور پر مصداق قرار دیا جا سکتا ہے۔ خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، سلطان محمود غزنوی اسلامی دنیا میں بہت بڑے مجاہد جرنیل مانے جاتے ہیں لیکن وہ بھی اس آیۂ مبارکہ کے جزوی طور پر مصداق ٹھیرتے ہیں کیونکہ نہ تو وہ ان نو صفاتِ فاضلہ سے کما حقہ متصف تھے جن کا ذکر آیہ وافی ہدایہ میں کیا گیا ہے، نہ وہ میدانِ جنگ میں دشمنانِ دین سے قتال کرتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور نہ ہی وہ آئمۃ الطاہرینؑ کے زمرے میں شامل تھے کہ معصوم عن الخطاء والنسیان ہونے کی حیثیت سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض کو کما حقہٗ سرانجام دے سکتے۔ یہ خوبی صرف اہلبیتِ رسولؐ سے وابستہ ہے۔

عجیب نقطہ:۔ اس آیۂ کریمہ میں عجیب ترین نکتہ جو بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مردِ مومن جنت کی خریداری کے لئے "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ" کی روشنی میں پہلے جان نذرانہ کرتا ہے بعد ازاں مالی قربانی پیش کرتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ حکیم کا عمومی بیان کردہ قاعدہ کلیہ اس کے برعکس ہے یعنی مال کی قربانی پہلے ہونا چاہئے اور جان

کی بعد میں۔ اقتضائے عقل اور قرین قیاس تو یہی ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ کو پہلے مال پیش کرنا چاہیئے تاکہ اس مال سے ضروریات جنگ کی فراہمی، آلات حرب و ضرب کا اہتمام، اشاعت دین کی سلسلہ جنبانی اور قوم کے مفلس، نادار، مسکین اور یتیم افراد کی خبر گیری کی جاسکے تاکہ قوم دشمنان دین کے ساتھ قتال کرنے کے لئے تیار ہو سکے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اسی مقصد کے پیش نظر جہاں بھی خدا نے جہاد کا تذکرہ فرمایا ہے وہاں مال کی قربانی کو جان کی قربانی سے مقدم رکھا ہے۔ مثلاً :-

۱۔ لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهٗ جٰهَدُوا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (توبہ)
(و لیکن رسول خدا و مومنین نے اپنے مالوں و جانوں کے ساتھ جہاد کیا) اسی طرح متعدد مقامات پر جہاد کا تذکرہ کرتے ہوئے مال کی قربانی کو جان کی قربانی سے پہلے بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

۲۔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُولِ اللّٰهِ وَكَرِهُوٓا اَنْ يُّجَاهِدُوا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۔ (التوبہ۔۸۱)

۳۔ اِنْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۔ (التوبہ۔۴۱)

۴۔ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ۔ (التوبہ۔۴۴)

۵۔ اَلَّذِينَ اٰمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (التوبہ۔ ۲۰)

۶۔ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِينَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِينَ دَرَجَةً (النسا ۹۵)

۷۔ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (النسا ۹۵)

۸۔ اِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجٰهَدُوا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (انفال)

۹۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجٰهَدُوا بِاَمْوَالِهِمْ

وَ اَنْفُسِهِمْ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ (الحجرات ۱۵)

۱۰ ۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ (الصف ۱۱)

مذکورہ بالا دس مقامات پر ذکرِ جہاد کے سلسلہ میں مالی قربانی کو جان کی کی قربانی سے پیشتر ہی بیان کیا گیا ہے ۔ تمام قرآنِ مجید میں تلاش و تفحص کے باوجود شاید ایک مقام بھی ایسا نہ مل سکے جہاں جان کی قربانی کا ذکر مال کی قربانی پر مقدم رکھا گیا ہو۔ صرف یہی ایک ایسا مخصوص مقام ہے جہاں خلافِ قاعدہ مجاہد فی سبیل اللہ جنّت کی خریداری کیلئے پہلے جان پیش کرتا ہے اور پھر مال کی قربانی دیتا ہے ۔

• کیا یہ اس حیرت انگیز تاریخی حقیقت و عدیم المثال قربانی کی طرف اشارہ تو نہیں جو میدانِ کربلا میں منصۂ شہود پر آئی ؟ امام حسینؑ نے تحفظِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے پہلے سر کی قربانی پیش کی اور بعد ازاں مال نذر کیا ۔ وہ اس طرح سے کہ قتلِ حسینؑ کے بعد قومِ اشقیاء نے لوٹ مار شروع کر دی ۔ اہلبیت اطہارؑ کے خیام کو تاراج کیا گیا مخدراتِ عصمت کے سروں کی چادروں اور کانوں کے گوشوارے بھی اسی لوٹ مار کی نذر ہوئے ۔ جناب زینبؑ کو بے مقنع و بے ردا کیا گیا ۔ جناب سکینہؑ کے دُرہائے گرانمایہ اس سفاکی کے ساتھ چھینے گئے کہ گوشہائے مبارک سے سیلابِ خون بہ نکلا ۔ قومِ اشقیا کا ظلم و ستم یہاں تک منتہی نہ ہوا بلکہ لاشِ حسینؑ مظلوم بھی اس غارتگری سے نہ بچ سکی عمر بن سعد آپ کا عمامہ لے گیا ۔ یزید بن سہل نے ردا اتاری ۔ نعلینِ مبارک پر اسود بن خالد الازدی نے قبضہ جمایا ۔ قمیصِ مبارک پر اسحاق بن حوبہ نے دستِ تصرف دراز کیا ۔ کسی نے پیراہن اتارا اور کوئی زرہ لے کر چلتا ہوا ۔ شقی ازلی محمد بن اشعث نے جسم مقدّس سے باقی کپڑے اتار کر اس کو یونہی برہنہ چھوڑ دیا ۔ بجدل بن مسلم کلبی نے انگوٹھی کی حرص میں انگشتِ

مبارک کو قلم کرلیا۔ یہ تھی مال کی قربانی جو جان کی قربانی کے بعد معرضِ ظہور میں آئی۔ جس کی طرف آیۂ مبارکہ اشارہ کر رہی ہے۔

عہدِ نبوی کی تمام جنگوں میں ماسوائے جنگِ موتہ بہت کچھ مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ جنگِ خیبر کی فتح کے بعد تو مسلمان دولت کی فراوانی سے اقتصادی طور پر کافی مضبوط ہو گئے لیکن مسلمانوں پر دو مرحلے نہایت نازک صورت میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ وہ دو مرحلے جنگِ احد و جنگِ موتہ کے تھے۔ مسلمانوں کے اکثر بہادر جانباز راہِ حق میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے لیکن کسی موقع پر بھی ایسا نہ ہوا کہ شہیدوں کی لاش لوٹی گئی ہو اور کفار نے ان کے مال و متاع کو اپنے تصرف میں لے لیا ہو۔ کفار میں بھی اتنی نسبی شرافت اور بین الاقوامی آئین کی پابندی تو تھی کہ انہوں نے مقتولین کے پھٹے ہوئے خون آلودہ کپڑے نہ اتارے اور لاشوں کو ننگا چھوڑ کر ستم بالائے ستم نہ کیا۔ دورِ حاضرہ کی ہر دو عالمگیر جنگوں میں بھی یہ گھناؤنا جرم کہیں بھی نہیں کیا گیا۔ تمام اسلامی تاریخ میں حق و باطل کا یہ ہنگامۂ کارزار صرف میدانِ کربلا میں ہی پیش آیا کہ جہاں قتلِ شہدا کے بعد ان کی لاشوں کو نہایت سفاکی و بے جرمتی سے لوٹا گیا۔ پس یہ کھلی دلیل اس امر کی ہے کہ جان کی قربانی کو خلاف قاعدہ مال کی قربانی پر مقدم کر کے سانحۂ کربلا کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور اس طرح اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ ہر دو ثقلین (قرآنِ حکیم اور عترتِ رسولؐ) نبی کریمؐ کا زندہ معجزہ ہیں کیونکہ قرآنِ حکیم کا ہر محیر العقول کارنامہ اہلِ بیتِ اطہارؑ کی عملی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ کتابِ خدا خواہ کس قدر بلند ترین محاسن و اخلاق کا تذکرہ کرے وہ فضائل و محاسن عترتِ رسولؐ میں ضرور موجود ہیں۔ حقیقت شناس نگاہوں میں یہ " وَلَنْ یَتفرقا حتیٰ یرد علی الحوض " کی کیا عمدہ تفسیر ہے؟ اگر اسلامی تاریخ نے عترتِ رسولؐ کے بلند پایہ کردار وہ

حیرت انگیز کارناموں کو علیحدہ کرلیا جائے تو تمام تاریخ اسلام جنگ و جدل، قتل و غارت، ہوسِ حکمرانی و توسیعِ سلطنت، خانہ جنگی، خود غرضی، کنبہ پروری، محسن کشی اور احسان فراموشی سے بھرپور نظر آئے گی ؎

اسلام کے دامن میں بس دو ہی تو چیزیں ہیں
اک ضربِ یداللٰہی اک سجدۂ شبّیری

توریت و انجیل میں عہدِ خداوندی :۔ جان و مال کے معاوضہ میں جنت کی خریداری ایک ایسی عظیم القدر چیز ہے کہ جس کا وعدہ نہ صرف قرآن حکیم کی معرفت کیا گیا ہے بلکہ آیۂ زیرِ بحث کی رو سے یہ عہدِ خداوندی توریت و انجیل میں بھی مذکور ہے جیسا کہ "وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ" سے ظاہر ہے۔ توریت میں یہ عہدِ خداوندی حضرت موسیٰؑ کی معرفت یوں درج ہے :۔

"تم نہایت فراواں ہو جاؤ اس زمین میں جس میں شیر اور شہد بہتا ہے (بشرطیکہ) تو اپنے سارے دل، اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھے۔" (استثنا ۶: ۳-۵)

کیا جناب حسینؑ نے اپنے سارے دل، اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند کی بے پایاں محبت کا عملی ثبوت نہیں دیا۔ کیا تن، من اور دھن سب کچھ اس کی راہ میں نثار نہیں کیا؟ یقیناً ہر ذی شعور اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا۔ پس جناب حسینؑ اس زمین کے وارث ہیں جس میں شیر اور شہد بہتا ہے۔ لہٰذا توریت مقدس کی روشنی میں بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت حسینؑ نے جان و مال کی قربانی سے جنت کی وہ پاکیزہ سرزمین خریدی ہے جہاں شیر و شہد کی نہریں بہتی ہیں۔

انجیل میں یسوع مسیحؑ کی معرفت وعدہ خداوندی ان الفاظ میں درج ہے :۔

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے

تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔" (متی ۱۹ : ۲۲)

کیا یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت نہیں کہ امام حسینؑ نے تین دفعہ اپنی ساری مملوکات سے دست بردار ہوکر، بے خانماں ہوکر، اپنا سب کچھ غریبوں کو لٹا دیا۔ (داستانِ کربلا۔ص ۱۹۵)

تو پھر کیا انجیل کی رُو سے امام حسینؑ آسمانی خزانوں کے مالک نہیں ؟

انجیلِ مقدس کا ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمائیے :-

"جس کسی نے گھروں، بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا"

(متی ۱۹ : ۲۹)

کیا امام عالیمقامؑ نے خدا کی راہ میں جوارِ روضۂ رسولؐ کو نہ چھوڑا ؟ کیا حج کو عمرہ میں تبدیل کرکے مکہ معظمہ کی قیام گاہ نہ چھوڑی ؟ کیا گھربار، مال و دولت، مکان و زمین چھوڑ کر راہِ خدا میں ترکِ سکونت نہ کی ؟ امرِ واقعہ تو یہ ہے کہ امام حسینؑ نے نہ صرف اہل و عیال کے چھوڑنے پر اکتفا کیا بلکہ بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں، بھانجوں اور یار و انصار کو راہِ حق میں نثار کر دیا اور اپنی جانِ عزیز کو قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا کر انجیلِ مقدس کی رو سے ہمیشہ کی زندگی کے وارث ہوگئے اور آیۂ کریمہ "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحیا ......الخ" کی رُو سے حسینؑ زندہ جاوید ٹھہرے۔

اس مقام پر اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض کم فہم یہ نہ سمجھیں کہ حضرت موسےٰؑ تو بنی اسرائیل سے اور حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں سے یہ وعدہ فرما رہے تھے پھر اس وعدہ کا حضرت امام حسینؑ پر کیونکر اطلاق ہو سکتا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیوی زندگی میں ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ قانون کسی ایک

آدمی کے فعل کے حسن و قبح کی وجہ سے معرضِ وجود میں آتا ہے لیکن جب اس قانون کا نفاذ ہوتا ہے تو کسی کو بھی اس کی پابندی سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح احکامِ خداوندی جب کسی نبی کی معرفت کسی خاص موقع و محل پر نافذ ہوتے ہیں تو ان کا اطلاق ہر خاص و عام پر ہوتا ہے اور وہ احکام و قوانین اس وقت تک نافذ العمل رہتے ہیں جب تک انہیں منسوخ نہ کر دیا جائے۔ اس مقام پر توریت و انجیل کا یہ وعدۂ خداوندی منسوخ نہیں ہوا بلکہ قرآنِ حکیم کے ذریعے اس کے دوام پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی گئی ہے۔ اس قسم کے احکامِ خداوندی کا ابدالآباد تک جاری و ساری رہنا عین اقتضائے عقل اور لوازمات و ضروریات فطرت کے مطابق ہے۔ یہ تو خود محالِ عقلی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے عہدِ نبوت میں تو دولتمند مال و اسباب کو غربا میں تقسیم کر کے کامل بن سکتا تھا لیکن آج مال کی قربانی سے وہ کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ اس کی عظیم قربانی سے آج بھی وہی مراتب و مدارج حاصل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ یہ سرفروشی و فداکاری منشائے خداوندی کے عین مطابق ہو۔ البتہ یہ بات اپنے مقام پر سو فیصدی درست ہے کہ اس قسم کی عظیم الشان قربانی پیش کرنے والی بلند مرتبت ہستی صدیوں کے بعد دنیا میں تشریف لاتی ہے لیکن پھر بھی امام حسینؑ کا بدل قیامت تک ناممکن ہے۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات ... تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

فی الواقع کربلا کی دردناک "ٹریجڈی" صداقت و حق پرستی، صبر و استقامت، ایمان و عمل، ایثار و قربانی کا ایک نہ مٹنے والا خدائی نشان ہے جو قیامت تک راہ نوردانِ حق کے لئے کفر و باطل کی تاریک راتوں میں مشعلِ ہدایت کا کام دیتا رہے گا۔ چنانچہ تمام کتبِ مقدسہ بالخصوص توریت، انجیل، یسعیاہ اور یرمیاہ کے اوراق واقعاتِ شہادت کی تفصیل سے مزین ہیں۔ ہم نے اسی سلسلہ میں دو ابواب میں

مفصل بحث سپرد قلم کی ہے۔ یہاں اپنے بیان کی تائید میں زبورِ مقدس کے صرف ایک ہی اقتباس کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ صحیفۂ متشابہات یعنی زبورِ داؤدؑ میں ایک مظلوم کا بیان اس طرح نقل کیا گیا ہے :-

"جب میں شیرخوار ہی تھا تو نے مجھے توکل کرنا سکھایا۔ میں پیدائش ہی سے تجھ پر چھوڑا گیا۔ میری ماں کے پیٹ ہی سے تو میرا خدا ہے۔ مجھ سے دور نہ رہ۔ کیونکہ مصیبت قریب ہے اس لئے کہ کوئی مددگار نہیں۔ بہت سے بیلوں نے مجھے آگھیرا ہے۔ بشن کے مضبوط بیلوں نے مجھ پر ہجوم کیا ہے۔ وہ پھاڑنے اور گرجنے والے شیر کی طرح مجھ پر اپنا منہ پسارے ہوئے ہیں۔ میں پانی کی طرح بہا جاتا ہوں۔ میرے بند بند الگ ہو چلے ہیں۔ میرا دل موم کی طرح میرے سینہ میں پگھل گیا ہے۔ میری قوت ٹھیکرے کی طرح خشک ہو گئی ہے۔ میری زبان تالو سے لگی جاتی ہے اور تو مجھے موت کی خاک پر بٹھاتا ہے کیونکہ کتوں نے مجھے گھیر لیا ہے بدکاروں کا گروہ مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ میرے ہاتھ اور پاؤں چھیدتے ہیں۔ میں اپنی سب ہڈیاں گن سکتا ہوں۔ وہ مجھے تاکتے اور گھورتے ہیں۔ وہ میرے کپڑے آپس میں بانٹتے ہیں اور میرے لباس پر قرعہ ڈالتے ہیں۔ لیکن تو اے خداوند دور نہ رہ۔ اے میری توانائی، جلدی میری مدد کو آ۔ میری جان کو تلوار سے بچا میری جان کو کتے کے ہاتھ سے، ببر کے منہ سے مجھے رہائی دے اور سانڈوں (UNICORNS) کے سینگوں سے تو نے میری سنی۔" (زبور ۲۲:۹-۲۱)

تاریخ عالم میں وہ کونسا ایسا برگزیدہ طفلِ شیرخوار ہے جس کو ماں کی گود میں توکل کرنا سکھایا گیا اور جو پیدائش سے قبل ہی اللہ والا تھا۔ وہ کونسا ایسا بیکس مظلوم ہے جس کے استغاثہ هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا پر لبیک کہنے والا کوئی نہ رہا۔ وہ کون ایسا ستم رسیدہ ہے جس کا شریروں کے ایک ایسے گروہ نے احاطہ کر لیا

تھا جو بلحاظ جہالت و گمراہی "**کَالْاَنْعَامْ**" یعنی بیلوں کے مصداق تھے، خونخواری و درندگی کی بنا پر پھاڑنے والے شیر سے مشابہ تھے اور احسان فراموشی غدّاری اور کمینگی میں کتے سے بدتر تھے؟ وہ کون ایسا مظلوم ہے جس کے ہاتھ اور پاؤں نیزوں سے چھیدے گئے اور جس کا جسم مقدّس تیروں سے چھلنی ہوگیا تھا؟ وہ کون سا ایسا مصیبت زدہ ہے جس کی زبان پیاس کے مارے تالو سے جا لگی تھی اور جس کے قوائے جسمانی شدتِ گرسنگی و تشنگی سے ٹھیکرے کی طرح خشک ہو چکے تھے؟ وہ کون سا ایسا غم دیدہ ہے جس کے جسمِ اطہر کے بند بند کو جدا کر دیا گیا تھا اور جس کی ہڈیوں کو چوُر چوُر کر دیا گیا تھا؟ وہ ایسا ستم رسیدہ کون تھا جس کے لباس پر قرعہ ڈالا گیا اور جس کے کپڑے اشقیا نے آپس میں بانٹ لئے۔ کوئی عمامہ لے گیا تو کوئی ردائے کر چلتا بنا، کسی نے نعلین پر ہاتھ صاف کئے تو کوئی زرہ بکتر اٹھا کر چلتا ہوا۔ کسی ملعون کی آنکھوں پر حرص و آز نے اس طرح پٹی باندھی کہ انگوٹھی کی لالچ میں انگشتِ مقدّس ہی کو قلم کر لیا؟ وہ کون ہے جو مظلومیت و بیکسی کے عالم میں ذبح ہوا اور جس کے سرِ اقدس کو ایک "**چتکبرے مبروص کتے**" (شمر ملعون) نے جسمِ اطہر سے جدا کیا؟ تاریخِ عالم میں وہ مظلوم، امام عالیمقام جناب حسینؑ تھے جو تین روز کے بھوکے پیاسے ریگ زارِ کربلا پر شمر ملعون کے ہاتھوں جو بقولِ رسولؐ ایک مبروص کتا تھا، مذبوح من القفا ہوئے اور بعدِ شہادت جن کا لباس مبارک گروہِ اشرار کی لوٹ مار کی نذر ہوا۔

مبروص کتے شمر ملعون کے متعلق آنحضرت کا قول ملاحظہ فرمائیے:۔

بوقتِ شہادت امام حسینؑ نے شمر ملعون کے پیٹ پر ابلق کتے کے پیٹ کی طرح سپید داغ اور سؤر کے سے بال دیکھ کر فرمایا۔ "اللہ اکبر۔ لقد صدق جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والٖہ وسلم فی قولہٖ لابی یا علی انّ ولدک

الحسین یقتل بارض یقال لہ کربلا یقتلہ رجل ابرص اشبہ بالکلاب والخنازیر"

(ترجمہ) "اللہ اکبر! میرے جد بزرگوار نے سچ فرمایا کہ یا علیؑ! تیرا فرزند حسینؑ اس سرزمین پر قتل کیا جائیگا جس کو کربلا کہتے ہیں۔ اس کو ایک ایسا شخص قتل کرے گا جو **مثل کتے کے مبروص ہوگا** اور اس کے بال سوّر کے سے ہونگے"۔ (مقتل ابومخنف)

ہم اپنے سلسلۂ بیان کے دوران مندرجہ ذیل امور قطعی طور پر ثابت کرچکے ہیں:

۱۔ حضرت امام حسینؑ ان نو صفات فاضلہ سے بدرجہ اتم متصف تھے جن کا حامل ہونا اس کامل الایمان مومن کے لئے لازم ہے جو جنّت کا خریدار ہو۔

۲۔ امام عالی مقامؑ نے آیۂ کریمہ کے مقررہ اصول کے بموجب جنّت کی خریداری کے لئے پہلے جان نذر کی اور بعد میں مال کی قربانی پیش کی جو تاریخ اسلام میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

۳۔ عالی مرتبت امامؑ نے راہِ حق میں نہ صرف قتال ہی کیا بلکہ دشمنانِ خدا کی ایک کثیر تعداد کو جہنّم واصل کرنے کے بعد خود بھی درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

۴۔ حضرت حسینؑ توریت کے معیار کے مطابق اس سرزمین کے وارث ہوئے جس میں شیر اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ (استثنا ۶: ۳، ۵) انجیل کی رُو سے آسمانی خزانوں کے مالک اور ہمیشہ کی زندگی کے وارث ہوئے (متی ۱۹: ۲۲، ۲۹) اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں زندہ جاوید ٹھیرے۔ (آلِ عمران ۷۰)

۵۔ سبطِ رسولؐ وہ ذبیحِ موعود و شہیدِ معہود ہیں جن کا واقعۂ شہادت بموجب عہدِ خداوندی توریت، انجیل و قرآن میں مذکور ہے۔

۶۔ کتبِ سماویہ کی واقعۂ شہادت سے متعلقہ پیشین گوئیاں بجز امام حسینؑ کسی دوسری ہستی پر مکمل طور پر چسپاں نہیں ہوسکتیں خواہ وہ ہستی کتنی ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو۔

پس ان ٹھوس حقائق کی موجودگی میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کی ذاتِ مقدس وہ واحد ہستی ہے جو قرآنِ مجید کی تمام پیش کردہ شرائط کے بموجب آیۂ زیرِ بحث "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی .... الخ" کی مصداقِ خصوصی ہے اور آپؑ کی ذاتِ گرامی پر پیشین گوئی کی تمام جزئیات مکمل طور پر چسپاں ہو سکتی ہے دیگر شہدائے اسلام میں یہ امتیازی خصوصیت نہیں جو فرزندِ رسولؐ کو حاصل ہے۔ لہٰذا جہاں دیگر شہدائے اسلام اس آیہ دانی ہدایہ کے مصداق عمومی ہیں وہاں سبطِ پیغمبرؐ حضرت حسینؑ اس کے **مصداقِ خصوصی** ہیں اور اسی بنا پر آپ کو جوانانِ جنت کی سرداری کا شرف عطا ہوا۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی "حسینؑ جنت نواسیوں کے سردار ہونگے اور یہ سرداری کوئی "عطیہ" یا نوازش نہ ہوگی بلکہ ان کی صلاحیت اور ان کی قربانی کی قیمت ہوگی۔ حسینؑ نے اپنے خون سے جنت کی سرداری خریدی ہے۔ یہ ان کا حق ہے اور وہ اس کے اہل ہیں اور مجھے یقین ہے کہ دنیا کے تمام مجاہدینِ حق ان کی سرداری کو اپنے لئے موجبِ فخر اور سرمایۂ امتیاز تصور کرتے ہوئے بخوشی اسے قبول فرمائیں گے۔" (شہیدِ اعظم۔ ص ۱۳۵)

شہداء کی خصوصیات

شہداء کو تین ایسی خصوصیات حاصل ہیں جو ہر طبعی موت سے مرنے والے کو حاصل نہیں ہوتیں :-

۱۔ موت سے روح وجسم کا باہمی تعلق منقطع نہیں ہوتا۔
۲۔ معیت قیومیہ ان کے اجسامِ ترکیبی کے ساتھ باقی رہتی ہے اور بعدِ موت ان سے افعال صادر ہوتے ہیں۔
۳۔ قدرت ان کے ذکرِ خیر و اوصافِ حمیدہ کو دوام بخشتی ہے۔

۱۔ روح و جسم کا دائمی تعلق :۔ عام انسان جب مرجاتے ہیں تو انقطاعِ تعلقِ روح و جسم کی بنا پر کوئی کام نہیں کر سکتے، تصرفاتِ زندگی سے محروم ہوجاتے ہیں اور عمل میں حجاب حائل ہوجاتا ہے۔ "مِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ" (اور ان کے پیچھے قیامت تک حجاب حائل ہے) شہیدِ راہِ خدا کو یہ حجاب حائل نہیں ہوتا۔ وہ قتل و شہادت کے بعد بھی اسی طرح متصرف رہتا ہے جس طرح کہ عالمِ اجسام میں تھا۔ اس لئے وہ ہماری ہدایت و نصرت فرما سکتا ہے اور ہر کٹھن مرحلہ پر ہمارے کام آسکتا ہے۔ ہر ایک شہید کے تصرفات میں اس کی روحانیت کے اعتبار سے نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ جو شہداء اس عالمِ کون و فساد میں متصرفِ کل اور ولیِ مطلق تھے، انسانیتِ کاملہ و روحانیتِ تامہ رکھتے تھے اور اطاعتِ خداوندی میں درجۂ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی قوتِ تصرف بھی عام شہداء کی نسبت بلند و بالا ہوگی۔ پس نہ عام شہداء کو شہدائے کربلا جیسے تصرفات حیاتِ جاودانی حاصل ہیں اور نہ خود باقی شہدائے کربلا کو تصرفاتِ حیاتِ حسینی حاصل ہیں کیونکہ حسینؑ خود حجتِ خدا، امام ہدیٰ اور ولیِ مطلق تھے۔ اس لئے حضرت امامؑ کو تصرفاتِ کلی حاصل ہیں۔ لہٰذا وہ ہر مشکل میں کام آسکتے ہیں اور آتے ہیں۔ یہی **حیاتِ جاودانی** ہے۔ پس بروئے آیۂ کریمہ۔ "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ"۔ بلا شک حسینِ مظلومؑ **زندہ جاوید** ہیں۔

۲۔ اجسامِ ترکیبی کے ساتھ معیتِ قیومیہ کی بقا :۔

شہداء کے اجسامِ ترکیبی کے ساتھ معیتِ قیومیہ باقی رہتی ہے اور اجسام کی اصل توانائی (ENERGY) قائم رہتی ہے۔ اس لئے ان کے جسم قتل و شہادت کے بعد قبروں میں فنا نہیں ہوتے۔ ترکیب اسی طرح باقی رہتی

ہے۔ زمین ان کے اجسام پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ آج بھی اگر شہدا کی قبروں کو کھودا جائے تو ان کے اجسام اسی حالت میں ملیں گے کہ جس حالت میں ان کو دفن کیا گیا تھا۔ ایسی باتیں مشاہدہ میں آچکی ہیں اور آئندہ بھی شاید آتی رہیں گی۔ تاریخی شہادت ملاحظہ کیجئے :۔

"ابن سعد نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ جب معاویہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں بمقام احد نہر جاری کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے عمال نے لکھا کہ نہر کا نکالنا غیر ممکن ہے جب تک کہ شہداء کی قبور پر سے نہ نکالی جائے۔ اس کے جواب میں معاویہ نے لکھا کہ اچھا قبروں کو کھود ڈالو۔ اس حکم سے یہ حالت دیکھی گئی کہ لوگ مُردوں کو قبروں سے نکال کر اپنے کندھوں پر لادے لئے جاتے تھے اور وہ مُردے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گویا سو رہے ہیں پس اسی اثنا میں جب قبریں کھودی جارہی تھیں ایک کدال حضرت حمزہؓ کے پائے مبارک میں لگی جس سے تازہ خون جاری ہوا" (طبقات ابن سعد۔ تاریخ احمدی۔ ص ۳۴۹)

ابھی چند سال ہوئے ہیں کہ لاکھوں مسلمانوں نے بغداد میں ایسی دو زندۂ جاوید لاشوں کا مشاہدہ کیا ہے وہ حضرت عبداللہ الانصاریؓ و حضرت حذیفہ یمانیؓ کی لاشیں تھیں جو آنحضرتؐ کے دو بزرگ و جلیل القدر صحابی تھے۔ ان لاشوں کی تصاویر مختلف اخبارات نے بھی شائع کی تھیں۔ شہدائے کربلا اپنے درجۂ شہادت میں ان سے بڑھ کر ہیں اور امام مظلومؑ بوجۂ درجۂ امامت و ولایت اور کمالِ شہادت ان تمام شہداء سے ہزار درجہ بلند حیاتِ جاودانی رکھتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ کے وجودِ اقدس سے بروزِ شہادت کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک سینکڑوں آثارِ حیاتِ جاودانی ظاہر ہوئے۔ عام موت کے معنی یہی ہیں کہ مرنے کے بعد انسانی بدن سے فعل و عمل صادر نہیں ہو سکتا اور انسان پر عدم تکلم غالب آجاتا ہے یعنی

انسان مرتا ہے تو بولنا بند ہو جاتا ہے مگر حسینؑ کے بال بال، ذرہ ذرہ اور ہر قطرۂ خون سے افعال صادر ہوئے۔ سرِ اقدس جسمِ حسینؑ سے قطع اور جدا ہو جانے کے بعد بھی تکلم فرماتا رہا اور مناسب موقع و محل پر تبلیغِ اسلام و ہدایت کرتا رہا۔ آنکھوں سے دیکھتا اور سارے مناظر کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اپنے اس بیان کی تائید میں ہم چند تاریخی شواہد پیش کرتے ہیں۔

حسینی حیات جاودانی کی مثالیں:۔

شامِ عاشور شامِ غریباں کی صورت میں نمایاں ہوئی جو خانۂ رسالت میں قیامت کی شام تھی۔ ایک شامی لوٹ کی تلاش میں لاشِ حسینؑ کے پاس آیا اور ایک نہایت قیمتی پٹکا حضرتؑ کی کمر میں دیکھا۔ طمع نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اس نے اس کے کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ شہید مظلومؑ نے اپنا دستِ مبارک اٹھا کر پٹکے کی گرہ پر رکھ دیا۔ اس ملعون نے دستِ مبارک قطع کر دیا۔ حسینؑ کے زخمی ہاتھ کی حرکت اپنا کام کر رہی تھی اور حیاتِ شہدا کا ثبوت دے رہی تھی۔ کیا مردہ ہاتھ ہلا سکتا ہے؟ کیا مردہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے؟ یقیناً نہیں پس حسینؑ مردہ نہیں بلکہ زندہ جاوید ہیں۔ آپ کے زخمی ہاتھ کی حرکت قرآن کی حقانیت کی شہادت دے رہی تھی اور "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ .... الخ" کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر رہی تھی۔ اگر امامِ شہیدؑ کے ہاتھ کی حرکت حیاتِ جاودانی کا ثبوت نہ دیتی تو تاریخِ اسلام میں قرآن کے اس دعویٰ کی سچائی کا کیا ثبوت تھا کہ شہیدِ راہِ خدا مردہ نہیں بلکہ زندۂ جاوید ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ قرآنِ حکیم اہلبیتِ رسولؐ کی طہارت کی شہادت دیتا ہے تاہم یہ بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ عترتِ رسولؐ قرآن کے دعویٰ کی صداقت میں دلیل بن کر آئی ہے۔ غالباً یہی مقصود تھا جناب رسالتمآبؐ کے ارشادِ گرامی کا جب آنحضرتؐ نے ثقلین

کے بارے میں فرمایا کہ " وَلَنْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ " کتاب اللہ اور میری عترت ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچ جائیں۔ پس عیاں ہے کہ اگر عترتِ رسولؐ نہ ہوتی تو قرآنِ حکیم کے بے شمار دعوے بلا دلیل رہ جاتے اور حَسْبُنَا اللّٰه کے مشہور فقرہ کا بودا پن طشت از بام ہو کر رہ جاتا۔

۲۔ شمر ملعون جب امامؑ کے پاک سر کو تنِ اطہر سے جدا کر کے زلفِ معنبر پکڑے روانہ ہوا تو سرِ اقدس سے آواز آئی۔ " قَطَعَ اللّٰهُ رَحِمَكَ كَمَا قَطَعْتَنِيْ " " او شمر! خدا تیرے رحم کو قطع کرے جسطرح تو نے مجھے میرے تن سے جدا کیا ہے "۔ تین مرتبہ اس طرح آواز آئی۔ تب وہ ملعون بے ادبی پر آمادہ ہوا اور دستِ نجس میں تازیانہ اٹھا کر کہا " خاموش ہو۔ کب تک مجھے ذلیل و رسوا کرے گا۔ " مگر کیا شہید کی زبان بند ہو سکتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہ بروئے آیہ کریمہ : لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا .... " زندہ جاوید ہے۔

۳۔ جب کوفہ میں سرہائے شہدا کا جلوس نکلا تو زید بن ارقم صحابی کو بالاخانہ پر بیٹھا دیکھ کر سرِ اقدس نے قاریوں کی طرح قرآن کی تلاوت کی اور رشد و ہدایت کے لئے مناسبِ حال موقع و محل سے آیات شروع کیں ۔ " اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ لا كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ (الکہف ۹) ارے کیا تو گمان کرتا ہے کہ اصحابِ کہف و رقیم ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے کہ خوف سے جانیں بچا کر، وطن اور اہل و عیال کو چھوڑ کر، کوہ رقیم کی غار میں جا چھپے اور دولتِ ایمان پر جانِ عزیز کو نثار نہ کیا، ہمیں دیکھو کہ ہم نے اہل و عیال اور وطن سب کچھ ترک کیا اور سب کو راہِ خدا میں لٹا کر خود قربان ہو گئے۔ زید کو بعد ختم کہنا پڑا۔ " لَا رَيْبَ يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَحْوَالُكَ اَعْجَبُ وَ اَعْجَبُ "۔ بیشک اے فرزندِ رسول!

آپ کے حالات ان سے کہیں عجیب تر ہیں"۔ پس ثابت ہوا کہ سرِاقدس موقع کو سمجھتا تھا اور منظر کو دیکھتا تھا۔ مناسب محل و مقام آیات کا انتخاب کر کے پڑھتا تھا۔ یہ مُردوں کے کام نہیں بلکہ زندوں کے ہیں۔ پس بلاشبہ حسینؑ کا ہر عضوِ بدن حیاتِ کاملہ کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے بروئے آیۂ کریمہ۔ "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا"

حسین زندۂ جاوید ہیں۔

۴۔ دربارِ یزیدِ پلید میں جب سرہائے شہداء کے ساتھ اسیرانِ حرم کی پیشی ہوئی اور مخدراتِ عصمت و طہارت کا جائزہ لیا جانے لگا اور ایک ایک معظمہ کی طرف اشارہ کر کے یزید شمرِ ملعون سے پوچھتا تھا "مَنْ هٰذِهٖ، مَنْ هٰذِهٖ" یہ بی بی کون ہے اور یہ کون ہے؟ تو مخدرات پر نہایت ہی حزن و ملال اور گریہ و بکا طاری ہوا۔ غیرتِ حسینی جوش میں آئی اور سرِاقدس پکار اٹھا "وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ" (الشعراء ۲۲۷) "عنقریب ان ظالموں کو اپنے کرتوتوں کا پتہ لگ جائیگا اور کیفرِ کردار تک پہنچ کر رہیں گے"۔ چونکہ سرِحسینؑ دربارِ یزید میں زینتِ لگن ہو کر بھی یزید کو تہدید کرتے ہوئے تبلیغِ حق فرماتا تھا۔ اس لئے بلاشبہ **حسینؑ زندہ جاوید ہیں۔**

۵۔ جب مسیّب کے شب خون کے خوف سے سرہائے شہدا کو شمر نے دیرانی کی تحویل میں دے کر صندوق کے اندر مقفل کر دیا تھا تو سرِاقدس سے کئی معجزات ظہور پذیر ہوئے جن کو دیکھ کر دیرانی مع ستر افراد کے مشرف بہ اسلام ہوا۔ سرِاقدس کے تکلم نے حیاتِ جاودانی کا بیّن ثبوت پیش کر کے غیر مسلم اشخاص کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا تھا۔ کیا یہ زندہ جاوید کا معجزہ نہ تھا؟

پس اس قبیل کے سینکڑوں نشانات معرضِ وجود میں آئے جو حسینِ شہیدؑ کی حیاتِ جاودانی پر دال ہیں۔ لیکن بخوفِ طوالت ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

۳۔ ذکرِ خیر کا دوام:۔ قدرت شہدا کے ذکرِ خیر، نامِ روشن، اوصاف حمیدہ، اور بلند پایہ کردار کو ان کے درجۂ ولایت و اطاعت اور مرتبۂ شہادت کے موافق دوام عطا فرماتی ہے۔ آنے والی نسلیں ان کے کارناموں سے اخلاقِ حسنہ کا سبق سیکھتی ہیں۔ اور ان کے اسوۂ حسنہ کی اتباع و تقلید کرکے منزلِ فلاح تک پہنچتی ہیں۔ جس قدر بلند مقاصد کے تحفظ و بقا کے لئے شہیدِ راہِ خدا نے جتنی عظیم الشان قربانی پیش کی ہو اسی اعتبار سے اس کے نامِ نامی کو شہرتِ عام دی جاتی ہے اور اسی انداز سے اس کے کارناموں کو وسعتِ زمانی اور وسعتِ مکانی حاصل ہوتی ہے چونکہ تاریخ عالم میں شہادتِ حسینؑ کو بے مثل عظمت حاصل ہے اس لئے حسینؑ کی حیاتِ جاودانی تمام کائنات سے بڑھی ہوئی ہے اور امامِ عالیمقامؑ کے نامِ نامی و اسمِ گرامی کو عالمگیر شہرت و ہمہ گیر ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ بحر و بر، کوہ و جبل، دشت و صحرا میں "ہائے حسینؑ! ہائے حسینؑ!!" کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ مسلمانانِ عالم کا تو کیا ذکر، وہ تو ان کے محسنِ اعظمؐ کے نواسہ تھے جنہوں نے اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو گردابِ انحطاط و ذلت سے نکال کر کنارۂ عافیت تک پہنچا دیا۔ اغیار بھی حسینؑ کے ذکر میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ عاشورِ محرم کے دن عقیدت کے پھول بارگاہِ حسینی میں پیش کرتا ہے۔ حسینی مشن کی تبلیغ ہر وقت ہر مقام پر جاری و ساری ہے۔ زبانِ قدرت بھی ذکرِ حسینؑ کرتی ہے۔ فی الحقیقت حسین شہیدؑ "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوا ......" کی جیتی جاگتی تصویر اور عملی تفسیر ہیں۔ اپنے بیان کی تائید میں ہم چند غیر مسلم حضرات کے اقوال پیش کرتے ہیں جنہوں نے حسینی کارنامہ کی مدح سرائی کی ہے۔ اور بارگاہِ حسینی میں گلہائے عقیدت پیش کئے ہیں۔

بارگاہِ حسینی میں غیر مسلم مشاہیرِ عالم کا خراجِ عقیدت

مشہور مورخ گبن اپنی تاریخ " زوالِ سلطنتِ روم " میں لکھتا ہے:

"In a distant age and climate the tragic scene of the death of Hussain will awaken the sympathy of coldest reader."

" بعید ترین زمانوں اور بعید ترین اقلیموں میں بھی حسینؑ کی موت کے اندوہناک مناظر ٹھنڈی سے ٹھنڈی طبیعت کے آدمی میں بھی، ہمدردی کے شعلے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

مسٹر **براؤن** اپنی مشہور کتاب " تاریخ ادبیاتِ ایران " میں لکھتے ہیں کہ :-

" حسینؑ کا قتل ، مدینہ کی تاراجی اور مکہ کا محاصرہ ، ان تین تاریخی چیرہ دستیوں میں پہلی چیرہ دستی ایسی تھی جس نے تمام اسلامی دنیا کو لرزہ براندام کر دیا اور ایک شخص بھی جس کے سینے میں جذبات تھے اس دردناک کہانی کو سن کر بے چین ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔"

فریڈرک جے گولڈ نے لکھا ہے :-

" اگر میں نوجوانانِ ایشیا ، افریقہ ، آسٹریلیا ، امریکہ اور یورپ کو عراق کے میدان میں جمع کر سکوں اور اگر میں حسینؑ اور عباسؑ کے روضوں کے رو برو کربلا میں کھڑا ہو سکوں ، اور اگر میری زبان اور لب ولہجہ سب لوگ سمجھ سکیں تو میں حسینؑ کی زندگی اور موت کے اندرونی اور روحانی پیغام کے متعلق گفتگو کروں گا حسینؑ انسانیتِ کاملہ کے بہترین نمونہ تھے جبکہ وہ ریگستانوں میں ، نفرت اور بے رحمی کی تاریک گھاٹیوں میں امن اور ہمدردی کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کی عملی زندگی میرے نزدیک ایسی ضرب المثل ہے جو عالمگیر معنی رکھتی ہے۔"

مسٹر جان یونگ نے چار سو اشعار میں حسین مظلومؑ کا دردناک مرثیہ لکھا ہے اور کربلا کا خونیں منظر دکھلا کر آخر میں حسینؑ کی تعریف کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے :-

"حسینؑ دیندار ، خداپرست ، فروتن ، خلیق اور بے مثل بہادر تھے۔ حسینؑ سلطنت و حکومت کے لئے نہیں لڑے بلکہ خدا پرستی کے جوش میں" (رسالہ نظام المشائخ - دہلی - محرم نمبر ۱۳۲۸ھ)

مہاتما گاندھی شہادتِ حسینؑ کی عظیم الشان نوعیت کا اعتراف (۸ / اپریل ۱۹۳۴ء) میں یوں کرتے ہیں :-

" میں نے کربلا کی المناک داستان اس وقت پڑھی جب کہ میں نوجوان ہی تھا ۔ اس نے مجھ کو دم بخود اور مسحور کر دیا "

سوامی شنکراچاریہ فرماتے ہیں :-

" میں نے حسینؑ سے بڑھ کر کوئی شہید نہیں دیکھا اور حسینؑ کی شہادت کے اثر سے زیادہ کسی شہید کی قربانی کا اثر نہیں ہوا "

ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کرشن پرشاد سابق دستورِ اعظم حیدرآباد دکن فرماتے ہیں :-

" نہ فقط دنیائے اسلام ، بلکہ از آغاز تا انجام کوئی مثال دنیا میں واقعۂ روح فرسائے ارضِ نینویٰ کے مثل ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی ۔ یہ سانحہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال خود ہی ہو سکتا ہے ۔ واقعۂ کربلا ہی ایک ایسا واقعہ ہے کہ اسکے جزئیات پر نظر ڈالنے سے انسان کو تہذیبِ اخلاق کا پورا پورا میدان ہاتھ آتا ہے ۔ مظلوم حسینؑ نے جس استقلال اور مضبوط ارادے کے ساتھ دنیا میں صداقت اور حق کا علم گاڑا وہ صرف اسی کی ذات سے ہو سکتا تھا جس کو خدا نے ایسا بہادر دل دیا تھا "

منشی پریم چند ورما کی رائے ہے :۔

"معرکہ کربلا دنیا کی تاریخ میں پہلی آواز ہے اور شاید آخری بھی، جو مظلوموں کی حمایت میں بلند ہوئی اور جس کی صدا آج تک فضائے عالم میں گونج رہی ہے"۔

ریورینڈ فادر پیلاشس ایس۔ جے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔

سابق اسسٹنٹ ایکسوپرس کالج بمبئی نے لکھا ہے :۔

"امام حسینؑ کی قربانی یقیناً تاریخ عالم کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے جس نے صداقت کو کذب پر فتح حاصل کرنے میں مدد پہنچائی ہے"۔

دستور کیخسرو مہیار کتور پیشوائے اعظم فرقہ پارسی بمبئی نے ارشاد فرمایا ہے :۔

"اگر شہدائے اعظم کی قربانیاں نہ ہوتیں تو دنیا اخلاق، مذہب اور صداقت سے ناآشنا رہتی۔ دنیا ان شہدا کی ممنون ہے جنہوں نے موت کو ذلت پر ترجیح دی"۔

پنڈت جواہر لال نہرو (وزیراعظم انڈین یونین) نے اپنے ایک پیغام میں جو ۱۳۶۱ھ میں حسینؑ ڈے کمیٹی بمبئی کو بھیجا تھا لکھا ہے :۔

"اس شہادت میں ایک عالمگیر پیغام ہے۔ حضرت حسینؑ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا مگر ایک ظالم کی حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ہماری مادی قوت دشمنوں کی قوت کے مقابلہ میں کم ہے۔ ایمان کی قوت ان کے نزدیک سب سے بڑی قوت تھی جو ہر مادی قوت کو ہیچ سمجھتی ہے۔ ہر فرقہ اور قوم کے لئے یہ قربانی شمع راہِ ہدایت ہے"۔

۱۳۶۱ھ کے موقع پر بمبئی کے عظیم الشان بین الاقوامی جلسہ میں **سر بہرام جی جیجی بھائی** نے بحیثیت صدر یوم الحسینؑ کمیٹی تقریر فرماتے ہوئے فرمایا :۔

"یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ ایک خالص اسلامی جلسہ کی صدارت ایک ہندو کرے اور اس کا استقبال ایک پارسی کے سپرد کیا جائے کیونکہ یہ جلسہ اس

مجسمۂ ایثار و قربانی کی یادگار منانے کیلئے منعقد کیا گیا ہے جس نے اپنی بےنظیر قربانی اور ایثار سے دنیائے انسانیت پر زبردست احسان کیا ہے۔"

بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر رادھا کرشنن نے اس جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا:۔

"امام حسینؑ نے اپنی قربانیوں اور ایثار سے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں حق و صداقت کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے ہتھیاروں اور فوجوں کی بجائے جانوں کی قربانی پیش کر کے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ انہوں نے دنیا کے سامنے ایک بےنظیر مثال پیش کی ہے۔ آج ہم اس بہادر، جان فدا کرنے والے اور انسانیت کو زندہ کرنے والے عظیم الشان انسان کی یادگار مناتے ہوئے اپنے دلوں میں فخر و مباہات کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ امام حسینؑ نے ہمیں بتا دیا ہے۔ کہ حق و صداقت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔"

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے حسین ڈے کمیٹی کے نام ارسال کردہ پیغام میں لکھا ہے:۔

"کربلا کا دردناک سانحہ آج بھی ویسا ہی تازہ، ویسا ہی دردانگیز اور ویسا ہی اثرخیز ہے جیسا کہ اس روز تھا جب اسلام کا یہ بہترین رہبر شہید کیا گیا تھا۔ تیرہ سو سال کے بعد بھی امام حسینؑ کی مثال حق و حریّت کی تلاش رکھنے والوں کی رہنمائی کے لئے روشنی کا مینار بنی ہوئی ہے۔ ان کی ذات تمام اختلافات سے بالاتر ہے۔ وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد ہے اور برائیوں کے مقابلہ میں صداقت کی فتح کا لافانی نشان ہے۔"

ہز ہائی نس مہاراجہ جیواجی سندھیا آف گوالیار محرم ۱۳۶۱ھ کے پیغام میں فرماتے ہیں:۔

"رسولِ اسلام کے پیارے حضرت امام حسینؑ نے ظالم کے مقابلہ کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ وہ جور و تعدّی کے سامنے سر جھکانے پر تیار نہ تھے۔ ان میں عقیدہ اور ضمیر کی پختگی تھی۔ اعلیٰ ترین مقاصد اور بلند ترین نصب العین ان کے سامنے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک بڑی اور طاقت ور فوج کا دندان شکن مقابلہ کیا۔ وہ اور ان کے ساتھی اس جنگ میں مارے گئے۔ دشمن کے ظلم اور تعدی کا مقابلہ آپ نے خدا کے انصاف پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنے اٹل ارادہ، اپنی بلند ہمت اور مستحکم عقیدہ سے کیا کہ چاہے اس وقت جو کچھ بھی ہو مگر آخر میں حق و صداقت ہی کو فتح نصیب ہوگی۔ تاریخِ اسلام کا یہ یادگار واقعہ عقائد کے اختلاف اور نسل و رنگ اور مذہب کے تنگ نظریات سے بالاتر ہے اور اس قابل ہے کہ نسلِ انسانی اس کو اپنے اپنے دلوں میں جاگزیں کرے۔ اور قربانیوں کی پرواہ کئے بغیر ادائے فرض کی اہمیت کو سمجھ لے۔"

اندور میں حسینؑ ڈے کانفرنس منعقد ہوئی۔ **ہز ہائی نس مہاراجہ ہلکر آف اندور** نے پیغام بھیجا جس میں فرماتے ہیں :-

"آج اس جلسہ کو تمام اقوام و مذاہب کے لوگ مشترکہ طریقے سے کر رہے ہیں جس میں امام حسینؑ کے اس کارنامہ سے سبق حاصل کریں گے جو آپ نے آزادی کے لئے وحشیانہ طاقت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگا کر وہ عظیم الشان قربانی دکھائی جس سے حق و انصاف کو دنیا میں قائم کر دیا۔ اگر تمام ملک میں اس قسم کے جلسے ہونے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ تمام قوموں اور مذہبوں میں اتحاد و اتفاق ہو جائے۔"

بابو راجندر پرشاد ایم اے۔ ایل ایل ڈی (صدر انڈین یونین) لکھتے ہیں :-

"کربلا کا واقعۂ شہادت، انسانی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور جو دنیا کے کروڑوں مردوں اور عورتوں کی زندگی پر اثر ڈالتا رہے گا۔ ہندوستان میں اس واقعہ کی یادگار بڑی سنجیدگی سے منائی جاتی ہے جس میں نہ صرف مسلمان حصہ لیتے ہیں بلکہ غیر مسلم افراد بھی مساویانہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔"

ہمارے اس دعویٰ کی تائید میں کہ شہداء کے ذکرِ خیر کو قدرت دوام عطا فرماتی ہے۔ چند غیر مسلم مشاہیرِ عالم کے پیش کردہ اقوال ہی بمصداق "مشتے از خروارے" کافی ہیں ورنہ اس سلسلۂ بیان کے لئے دفاتر درکار ہیں اور ہماری موجودہ تالیف اس بارِ گراں کی متحمل نہیں ہوسکتی تاہم یہ بیان کردینا خلافِ واقعیت نہ ہوگا کہ متمدن دنیا کے مصنّفین اور اہلِ قلم حضرات نے اپنی تصانیف میں جو تاریخِ اسلام یا تاریخِ عالم یا کسی ایسے موضوع پر لکھی ہیں جس کا کسی حیثیت سے واقعۂ ہائلہ کربلا سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے اپنی عقیدت کا خراج بارگاہِ حسینی میں ضرور پیش کیا ہے اور بقول سر سید سلطان احمد "اس حادثہ پر مورخین کا قلم خون کے آنسو روتا رہا ہے۔" اسی طرح مشاہیرِ عالم نے ان تقاریر و پیغامات میں بھی جو محرم کے موقع پر نشر کئے گئے ہیں انتہائی خلوص و محبت کے ساتھ حسینی کارنامہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کو اقوامِ عالم کی تقلید کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔

شہدائے عالم میں حسینؑ مظلوم کی امتیازی خصوصیت

عام شہداء کی نسبت جناب امام حسینؑ کو ایک خصوصی امتیاز حاصل ہے۔

جو خدائے قدوس نے اپنے عاشقِ جانباز کو ان کی عدیم المثال قربانی و شہادت کے صلہ میں تحفۃً عطا فرمایا ہے۔ "الشفاء فی تربتہٖ وَ اِجَابۃ الدُّعَا تحتَ قُبَّتِہٖ والاِمامۃِ فِی ذُرِّیّتِہٖ"

۱۔ خاکِ شہادت گاہ کو خاک شفا بنا دیا۔

۲۔ ان کے قبۂ مزار کے نیچے ہر داعی کی دعا قبول قرار دی۔

۳۔ قیامت تک امامت و ہدایت ان کی ذات میں قائم کر دی۔ قیامت تک جو ہادی ہو گا وہ اولادِ حسینؑ سے ہو گا۔ اور مسلمہ حکمت ہے:۔
"خَلَفَہٗ مِثْلَہٗ مَا مَاتَ" کہ جو اپنے جیسا جانشین چھوڑ جائے وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ حسینؑ ہادیٔ دین تھے۔ ان کے جانشین بھی قیامت تک ہادیٔ دین ہیں۔ اس اعتبار سے بھی حسینؑ زندہ جاوید ہیں۔

باب یازدہم

هَٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝

یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں اور یقین
رکھنے والوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے

(الجاثیہ - ۲۰)

سانحۂ کربلا میں پوشیدہ بصیرتیں

پوشیدہ بصیرتیں

کربلا کی جنگ ایک اصولی جنگ تھی۔ حق و باطل کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم میں ایک مضبوط، مستحکم، منفرد مقام حاصل ہے۔ نہ یہ خواب ہے، نہ افسانہ اور نہ ہی دل بہلانے والی کہانی، بلکہ حق پسندی، ثابت قدمی اور باطل شکنی کی ایک ایسی روئداد ہے جس میں ایک دو نہیں بلکہ بے شمار اخلاقی قدریں چمکتی نظر آتی ہیں اور اس سانحۂ عظیم میں سینکڑوں بصیرتیں پوشیدہ ہیں جن کو آج بھی ہم خضرِ راہ بنا کر منزلِ فلاح و نجات تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر عملِ صالح و فعلِ مستحسن میں اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور موجود ہوتا ہے۔ اور ہونا بھی چاہیے۔ لیکن روحی لک الفداء اے حسین ابن علی علیہما السلام! آپ نے سانحہ کربلا کو اس کی مختصر مدت کے باوجود تمام اہم اخلاقی و تمدنی تعلیمات کا مرکز بنا دیا ہے اور اس کی تعلیمی ہمہ گیری کا سکہ تمام دنیا میں بٹھا دیا ہے۔ مرحوم **چوہدری سلطان خان۔ ایم ایل اے۔ رئیس آف چکری** بسا اوقات فرمایا کرتے تھے۔ "میرے عالی منزلت امام نے بروزِ عاشورۂ محرم دو تین گھنٹے کے قلیل عرصہ میں ہر معترض کے اعتراض کا نہ صرف عملاً جواب ہی دیا بلکہ آنے والے دور کے ہر ذی شعور کے لئے راہِ عمل متعین کر دی۔"

حرّیت

۱۔ سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثۂ عظیم ہمارے سامنے پیش کرتا ہے دعوۃ الی الحق اور حق و حرّیت میں اپنے تئیں قربان کرنا ہے۔ کوئی حکومت

بھی جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو کبھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی ۔ حضرت سید الشہدا ؑ نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے اموی مظالم کے خلاف جہادِ حق کی بنیاد رکھی ۔ پس یہ نمونہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر ظالم و جابر حکومت کا علانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارت گر ہو اور جس کے احکام کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پر ہو۔

۲۔ مقابلہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان کے پاس مادی قوت و شوکت اور سامانِ حرب و ضرب کی فراوانی بھی ہو جس سے ظالم و جابر حکومت لیس ہوتی ہے ۔ حسین ؑ نے چند ضعیف مگر حق پرست افراد کی جمعیت قلیلہ کے ساتھ حق و صداقت کی راہ نتائج و عواقب کی فکر سے بے پرواہ ہو کر انتہائی صبر و استقلال سے طے کر کے دکھا دیا کہ حق ، ضعف و فقدانِ انصار کے باوجود کامیاب و کامگار اور ظلم دنیوی جمعیت و عظمت کے باوجود نامراد و نگونسار ہوتا ہے ۔ پیکرِ ایثار و قربانی امام حسین ؑ اقوامِ عالم کو یہ سبق دیتے ہیں کہ اقلیت اپنی لازوال قوتِ روحانی کے بل بوتے پر جبار و مستبد اکثریتوں کو مغلوب کر سکتی ہے اس لئے نفسِ خادع کی حیلہ تراشیوں کے فریب میں نہ آؤ جو یہ کہتا ہے کہ توپ و تفنگ اور تخت و سلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں ۔ عالی منزلت امام ؑ نے اپنے عمل سے دکھا دیا کہ صرف بہتر (۷۲) بھوکے پیاسے انسان اس قاہر و جابر حکومت کا جس کی حدود سلطنت ملتان اور سرحدِ فرانس تک پھیلنے والی تھیں ۔ نہ صرف مقابلہ ہی کر سکتے ہیں بلکہ ریگ و سنگ پر بہتے ہوئے اپنے خون کے ہر قطرہ سے انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں بہا سکتے ہیں جن کے سامنے حکومت کا جبر و تشدد آتشکدۂ سوزاں بن کر رہ جاتا ہے ۔

۳۔ نواسۂ رسولؐ نے اس عالمگیر حریت کے لئے جنگ لڑی جس کا مقصد مادی آزادی نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی آزادی تھا۔ جو افتراق کی بجائے تنظیم کی تعلیم دے جو عیش پرستی کی طرف مائل کرنے کی بجائے ضبطِ نفس سکھائے جو بہیمی جذبات کو برانگیختہ کرنے کی بجائے انسانی ضمیروں میں پختگی اور صدائے حق پر لبیک کہنے کی صلاحیت پیدا کرے، جو اعمالِ حسنہ کے بجالانے میں تو آزادی دے لیکن افعالِ مذموم کے ارتکاب کے لئے سدِ راہ ہو، جو حق کی نصرت کے لئے قوتِ برداشت میں اضافہ تو کرے لیکن جبر و ظلم کی حمایت سے مانع ہو۔

۴۔ حضرت حسینؑ امن پسندی و رواداری کے اصول پر عمل پیرا ہو کر ایک معاویہ کو تو اس کی تمام برائیوں کے باوجود برداشت کر سکتے تھے لیکن ایک ایسے یزید کو برداشت نہ کر سکتے تھے جو انتہائی حدود سے گزر کر آزادی کا گلا گھونٹ دے حسینؑ کی قربانی بزدلوں و کم ہمتوں پر ایک طنز ہے جن کے دل کی گہرائیوں میں باطل کے خلاف نفرت و حقارت کی موجیں اٹھتی ہیں لیکن فقدانِ جرأت کے باعث بیٹھ جاتی ہیں۔ حسینؑ نے انسانیت کے دبے ہوئے جذبات کو ابھارنے کا سلیقہ سکھا کر عسکری شان و شوکت، مال و زر کی قوت، مکر و فریب کی سازش اور حکومت کے جاہ و جلال کو بے اثر بنا کر رکھ دیا۔

عزم و استقلال

سب سے بڑا اسوۂ حسنہ جو یہ سانحۂ عظیم ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ راہِ مصائب اور جہادِ حق میں صبر و استقامت اور عزم و استقلال ہے۔ امامؑ نے اپنی قوتِ ارادی کا جائزہ لے کر اور وقت کی نزاکت پر غور کر کے، بیعتِ یزید سے انکار کا عزم کر لیا۔ شدائد امکانات کی آخری حد تک پہنچ گئے لیکن وقت نے بتلایا کہ امامؑ

کے عزم انکار کا کیا وزن تھا کہ پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آئی ظلم کرنے والے تھک گئے لیکن ظلم سہنے والے نہ تھکے۔ شدائد کی انتہا معلوم ہوسکی مگر حسینؑ کے صبر و ثبات کی حد متعین نہ ہوسکی۔ میدانِ جنگ میں مصائب کے ہزاروں سیلاب ابھرے اور جور و تشدد کے سینکڑوں طوفان اٹھے۔ اس کوہِ عزم اور پیکرِ استقلال سے ٹکرا ٹکرا کر ناکام واپس پلٹ گئے۔ فرزندِ رسولؐ ان حوادث و مصائب کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے لیکن بقول شخصے ؎

نعرہ زن موجِ حوادث میں بھی رہتا ہے دلیر
گھر کے بادل میں بھی بجلی کی کڑک جاتی نہیں

آپ کی زبانِ مبارک پر یہ شعر رواں تھا:۔

اِنْ کَانَ دِیْنُ مُحَمَّدٍ لَمْ یَسْتَقِمْ   اِلَّا بِقَتْلِیْ یَا سُیُوْفُ خُذِیْنِیْ

(ترجمہ) "اگر میرے نانا کا دین اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک میری رگِ حیات قطع نہ ہوجائے۔ تو اے خون آشام تلوارو! آؤ یہ جسم حاضر ہے"

جب امامِ مظلومؑ یکہ و تنہا تھے۔ تمام یار و انصار دادِ شجاعت دے کر آغوشِ شہادت میں ابدی نیند سو چکے تھے، خود آپ کی ذاتِ قدسی صفات پر چاروں طرف سے پے در پے حملے ہو رہے تھے، تیروں کی بوچھاڑ تھی اور آپؑ زخموں سے چور چور تھے لیکن اس وقت بھی ابرو پر شکن نہ تھی۔ کیا تاریخِ عالم اس عزم و استقلال اور صبر و استقامت کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟ خود فوجِ یزید کا ایک راوی بیان کرتا ہے:۔

"خدا کی قسم، میں نے کوئی شکستہ دل و زخم رسیدہ آدمی جس کی اولاد، بھائی، اعزہ و انصار سب قتل ہوگئے ہوں ایسا نہیں دیکھا جو حسینؑ سے زیادہ مطمئن، مستقل مزاج، ثابت قدم اور باہمت ہو۔ خدا کی قسم! ان سے زیادہ کیا میں نے

ان کے بعد بھی ان کے مثل کوئی نہیں دیکھا۔" (طبری جلد ۶۔ص ۲۵۹)

فی الحقیقت اس شہادتِ عظیمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے تمام عزیز و اقارب، اہل و عیال اور فرزند و احباب کے ساتھ دشتِ غربت و مصائب میں محصورِ اعدا ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے جگر گوشوں کو شدتِ عطش و جوع سے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھنا، پھر ان میں ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانا، حتیٰ کہ اپنے طفلِ شیر خوار کو بھی تیرِ ظلم و بربریت سے نخچیر پانا، مگر بایں ہمہ راہِ عشق و صداقت میں جو پیمانِ صبر و استقامت باندھا تھا، اس کا ایک لمحہ بلکہ ایک عشرِ دقیقہ کے لئے متزلزل نہ ہونا اور حق کی راہ میں جس قدر مصائب و اندوہ پیش آئیں سب کو شکر و منت کے ساتھ برداشت کرنا کہ رَضِیْنَا بِقَضَاءِ اللّٰہِ وَصَبَرْنَا عَلٰی بَلَائِہٖ۔

آج بھی اگر گوشِ حقیقت نیوش باز ہو تو خاکِ کربلا کا ایک ایک ذرّہ توصیہ فرمائے صبر و استقامت ہے ؎

شدیم خاک ولیکن بوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردے خیزد

کیا امام عالیمقامؑ کے اس عدیم المثال عزم و استقلال میں بصیرت کی ایک دنیا پوشیدہ نہیں؟

جوشِ عمل

امام عالی مقامؑ کے غیر متزلزل عزم و استقلال، عدیم المثال جماعتی تنظیم، عظیم الشان صبر و استقامت اور بلند پایہ نصب العین کا اثر یہ ہوا کہ اصحابِ حسینؑ میں جوشِ عمل کا جذبہ انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ ہر مرد و زن اور ہر پیر و جواں بلا امتیاز تشنۂ شوقِ شہادت میں سرشار نظر آتا تھا۔ بچے قربانی کو

کھیل سمجھتے تھے۔ جدھر نظر اٹھائیے ارادوں کو بروئے کار لانے کا جذبہ دل و دماغ پر مستولی تھا۔ جسے دیکھئے قوتِ ایمان کے مظاہرے پر تلا ہوا اور شوقِ شہادت میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے پر آمادہ تھا۔ تپتے ہوئے ریگزارِ کربلا کی حرارت، دھوپ کی تیزی اور پیاس کی شدت حصولِ مقاصد میں حائل نہ ہو سکی۔

کیا اپنی بے نظیر قیادت سے اپنے مقلدین میں اس طرح کا بے مثال جوشِ عمل پیدا کر دینا ایک بہترین حسینی اسوہ نہیں ہے جو ہر قائد کے لئے مشعلِ ہدایت اور ہر مقلد کے لئے خضرِ راہ ہے۔؟

صبر و استقامت

مصیبت کے ہنگامی طور پر آجانے کے بعد اس کو بادلِ ناخواستہ برداشت کر لینا ایک مجبوری کا سوال سمجھا جا سکتا ہے مگر کربلا میں مصائب و آلام کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا گیا۔ احباب کی موجودگی میں جناب حسینؑ کا خود تلوار نہ اٹھانا اور اپنے یار و انصار اور عزیز و اقارب کو ایک ایک کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہونے کے لئے رخصت کرنا ایک بے مثل صبر و استقامت اور بے نظیر قوتِ برداشت کا عملی مظاہرہ تھا۔ تاریخ میں اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ کسی عظیم مصیبت کے ہنگامی طور پر وارد ہونے پر شجاعانِ روزگار دماغی توازن کھو کر معرکہ میں چل پڑے اور حصولِ مقصد کے بغیر ہلاک ہو گئے یا فقدانِ قوتِ برداشت کی بنا پر میدانِ وغا سے راہِ فرار اختیار کر گئے۔ کارزارِ کربلا میں ان دونوں صورتوں میں سے کسی کا وجود بھی نہیں تھا۔ قائد صبر و استقامت کا مجسمہ تھے۔ ان کا دماغی توازن برقرار تھا اس لئے ہر نئی آفت اور ہر نئی مصیبت آنے پر پند و

نصائح کے ذریعہ نہ صرف اتمامِ حجت کیا جاتا تھا بلکہ ساتھیوں کو ایک ایک کرکے دادِ شجاعت دینے کا موقع بھی دیا جاتا تھا تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے انتہائی قوتِ برداشت کا عملی مظاہرہ اسوۂ حسنہ کا کام دے سکے۔

امام ہنگامۂ ظہر کے وقت فریضہ نماز کو نہ بھولے اور اتمامِ حجت کے لئے تیروں کی بارش میں بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوئے۔ اگرچہ نماز کے تمام ہونے تک سعید بن عبداللہ حنفی امام پر آنے والے تیرہ [۱۳] زہر آلود تیروں کا اپنے سینہ سے استقبال کرتے ہوئے تمام ہو گئے لیکن پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آئی۔

عابس کا شیوۂ جاں نثاری کچھ کم حیرت انگیز نہیں جب انہوں نے اپنے غلام شوذب سے کہا۔ "شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔ آگے بڑھو اور فرزندِ رسولؐ پر اپنی جان نثار کردو تاکہ میں تمہارے غم کو برداشت کرکے اپنے خدا سے ملاقات کروں۔ آج تو دن ایسا ہے کہ جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اتنا اجر و ثواب حاصل کرے کیونکہ آج کے دن کے بعد عمل کا دفتر ختم ہے اور حساب کے سوا کچھ نہیں۔ (طبری ج۶ ص۲۵۶)

اسی طرح جناب ابوالفضل العباسؑ اپنے بھائیوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "آگے بڑھو اور نواسۂ رسولؐ پر اپنی جانیں نثار کردو تاکہ میں تمہیں اپنی آنکھوں سے قتل ہوتا دیکھ کر، تمہارے غم کو برداشت کرکے ثوابِ عظیم کا حقدار بن سکوں۔"

یہی روح آپ کے تمام ساتھیوں میں کارفرما تھی۔ کیا اس سے بڑھ کر صبر و استقامت کا کوئی اسوۂ حسنہ ہو سکتا ہے؟ کیا اصحابِ حسینؑ کا ولولۂ شہادت اور جذبۂ ایمان تاریخ عالم میں بے نظیر حیثیت کا حامل نہیں؟ خود حضرت امام حسینؑ کا تو ذکر ہی کیا؟ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس کی مثال ناپید ہے ؎

خندہ زن توحید ہے بدر و حنین پر
پیمبری کو ناز ہے تیرے حسینؑ پر

دنیا میں شاید ہی ایک امتحان کے بعد دوسرا امتحان اور ایک ابتلا کے بعد دوسری ابتلا اس سرعت کے ساتھ پیش آئی ہو جس عجلت کے ساتھ کربلا میں ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت وارد ہوتی رہی۔ دوسری پر تیسری اور تیسری پر چوتھی جتیٰ کہ ہر آنے والی مصیبت ایک دوسری نئی مصیبت و آفت کا پیش خیمہ بنی ہوئی تھی مصائب کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا ایک محیر العقول و ناقابلِ ادراک واقعیت ہے مزید براں یہ اندازہ کرنا کہ ہر آنے والی آفت اپنی مصیبتِ ماسبق کے کتنے وقفہ بعد نازل ہوئی محال ترین ہے۔ اتنی ان گنت مصیبتیں اتنی عجلت کے ساتھ وارد ہو رہی تھیں کہ ان کی تعداد اور وقفہ کا اندازہ کرنا انسانی دماغ کو مختل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ بقول صادق حسین صاحب بی اے مصائب کا شمار کر لینا جس قدر آسان ہے کاش ان کا احساس بھی اسی قدر آسان ہوتا اور احساس جس قدر سہل فرض کیا جا سکے کاش ان کا برداشت کرنا بھی اتنا ہی آسان ہو سکتا۔

حضرت امام حسینؑ کے سامنے خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصانِ مال و متاع اور قتلِ نفس و اولاد کے تمام مراحل ایک ایک کر کے پیش آتے رہے مگر آپ راہِ مصائب و جہادِ حق میں اپنے صبر و استقامت اور عزم و ثبات کی بناء پر "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کی جیتی جاگتی تصویر بنے رہے۔

آیئے۔ آج ہم بھی اپنے کردار کا محاسبہ کریں کہ ہم میں سے کتنے حسینیت کے علمبردار اور محبت کے دعوے دار نکلتے ہیں جو اپنے عمل سے حسینی اسوۂ حسنہ کی تقلید کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ؎

ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ و شام خویش را

(علامہ اقبال)

جماعتی تنظیم

جمعیت کے تمام افراد جن پر جماعت مشتمل ہوتی ہے ایک ہی زاویۂ نگاہ سے سوچیں، سوچنے کے بعد ایک ہی قسم کا ارادہ کریں، پھر ارادہ کرنے کے بعد ایک ہی طریقِ کار اختیار کرکے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنائیں تو دیکھنے والے کہیں گے کہ فی الحقیقت اس جماعت کی ہیئتِ اجتماعی ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ بالفاظِ دگر جمعیت کی وحدتِ فکر، وحدتِ عزم اور وحدتِ عمل کا نام اجتماعی تنظیم ہے۔ تاریخِ عالم میں ایسی مکمل تنظیم شاید لشکرِ حسینؑ کے سوا کہیں اور نہ مل سکے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جمعیت کا قائد اگر ایک خیال پر ڈٹا ہوا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اس کے تمام ساتھی بلا استثناء اسی عزم و استقلال کے ساتھ اس کے ہمنوا بھی ہوں اور مصروفِ عمل بھی۔ مقلدین کا غیر متزلزل ثباتِ قدم ایک مختلف حیثیت رکھتا ہے جو شاید دنیا کے کسی عظیم قائد کو بھی اپنی انتہائی عظمت کے باوجود حاصل نہ ہو۔ اولوالعزم انبیاءؑ کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ہم حضرت موسیٰؑ کے اصحاب، حضرت مسیحؑ ناصری کے حواریوں اور حضرتِ محمد عربی صلعم کے صحابہ کرامؓ کے کردار پر بحث کر چکے ہیں کہ احباب کی اکثریت نے اپنے قائد و ہادیٔ دین کو انتہائی مصائب کے وقت دشمن کے نرغہ میں محصور چھوڑ کر، نہ صرف حقِ نصرت کی بجا آوری میں کوتاہی کی بلکہ راہِ فرار اختیار کرلی۔ تاریخ عالم میں یہ نمایاں خصوصیت صرف اصحابِ حسینؑ ہی کو حاصل ہے کہ ہر ایک شخص آخری وقت تک جاں نثاری و فداکاری میں ثابت قدم رہا۔ ان میں سے ہر ایک فرد ایسا تھا جو "فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا" کی منزل میں عملاً اسی طرح گامزن رہا کہ وحی آسمانی کو قبل از وقت کہنا پڑا کہ سفرِ آخرت اختیار کرنے والوں میں بعض نے تو اس عہدِ وفا کو جو استوار کر رکھا تھا

الفا کر دکھایا کچھ منتظر ہیں لیکن کسی ایک نے بھی معین راستے سے قدم نہیں ہٹائے۔

ہزارہا مسلح و مطمئن دشمنوں کے مقابلہ میں چند بوڑھے، نوجوان اور بچے اس طرح صف بستہ رہے کہ نہ تو شدتِ گرسنگی و تشنگی ان کو دل شکستہ کر سکی اور نہ شب بیداری اور عبادت گزاری انہیں مضمحل کر سکی تا اینکہ مصائب کی بے پناہ یورش بھی ان کے عزائم میں تزلزل پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ تیروں کی بے پناہ بارش میں وہ اپنے امامؑ کے پیچھے نمازِ ظہر کے لئے اس طرح کمر خمیدہ رہے گویا وہ امن و سکون کی چٹان تھے جن کے ساتھ تلاطم خیز لہریں ٹکرا کر ناکام واپس لوٹ جاتی تھیں۔ وہ عزم و استقلال کا ایک پہاڑ تھے جسے تیز و تند ہوائیں متحرک نہ کر سکیں۔ ان کے قلوب میں تسکین و اطمینان تھا اور انہیں کوئی حزن و ملال نہ تھا۔ ان کے خاموش چہروں میں آنکھیں تھیں جو امامؑ کی حرکت پر حرکت کرتی تھیں۔ ان کے دل تھے جن میں یہ تمنا بسا اوقات چٹکیاں لیتی تھی کہ کس طرح امامؑ پر جان نثار کرنے میں سبقت کریں۔ انہیں اس کی فکر نہ تھی کہ ہم نہ رہیں گے۔ البتہ اس کا غم ضرور تھا کہ ہمارے بعد کون ہوگا جو امامؑ پر اپنی جان قربان کر کے ان پر آنچ نہ آنے دے گا۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مختصر لشکر گزرا ہو جتنا مختصر لشکر رفقائے حسینؑ کا تھا اور شاید ہی کسی سپاہی کو اپنے قتل کا ایسا یقین ہو جیسا کہ حسینی سپاہ کو تھا اور شاید ہی کوئی لشکر اس یقین کے بعد اسی عزم و استقلال کے ساتھ، ثابت قدم رہ کر موت کا منتظر رہا ہو جس طرح لشکرِ حسینؑ نے خندہ پیشانی کے ساتھ موت کو خوش آمدید کہا۔ اصحابِ حسینؑ کی یہ بے خوفی اور جانِ عزیز سے یہ لاپرواہی ہرگز نہ ہوتی اگر مقصد عظیم نہ ہوتا۔ اگر مقصد عظیم بھی ہوتا تو شاید یہ ثابت قدمی نہ رہتی اگر اجتماعی تنظیم نہ ہوتی۔ اگر اجتماعی تنظیم بھی ہوتی تو پھر بھی شاید کربلا کا حیرت انگیز

واقعہ اس رنگ میں جلوہ گر نہ ہوتا اگر حسینؑ اس تنظیم کے ناظمِ اعلیٰ نہ ہوتے۔ مظلوم کربلاؑ اسلامی تنظیم کے ایک ایسے نورانی مرکز تھے کہ جس کے گرد اصحابِ حسینؑ پروانہ وار طواف کر رہے تھے اور شمعِ امامت پر اپنی جانیں نچھاور کر رہے تھے۔

آج تیرہ سو سال کی دوری پر بھی اجتماعی تنظیم کی مرکزی جاذبیت جو امام عالیمقامؑ کی رہینِ منت ہے اور اطاعتِ امیر کا حیرت انگیز جذبہ جس کا مظاہرہ اصحابِ حسینؑ نے کیا ہماری تقلید کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

عزتِ نفس و خود داری

حضرت حسینؑ نے دنیوی اسباب کی عدم فراہمی، انصار کی قلت اور وقت کی نامساعدت کے باوجود عزتِ نفس و خود داری کے اوصاف کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔ امام عالی مقامؑ عزلت نشینی کی زندگی بسر کر سکتے تھے بلکہ کر رہے تھے۔ حسینؑ سیاسیاتِ وقت سے لاتعلقی کا اظہار کر سکتے تھے بلکہ عملاً کر رہے تھے۔ حسینؑ اپنے جائز مالی حقوق کے مطالبہ سے مستغنی ہو کر فاقہ کشی کے دن گزار سکتے تھے بلکہ گزار رہے تھے۔ حسینؑ یہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن ذلتِ نفس کبھی قبول نہ کر سکتے تھے۔ امام عالی مقامؑ نے ذلت سے بچنے، سوئی ہوئی قوم کی شرافتِ نفس کو پھر سے زندہ کرنے اور مسلمانوں کی پست ذہنیت کو کلیۃً بدلنے کے لئے مظلومیت کی شہادت قبول کی اور ملتِ اسلامیہ کو عزت و ذلت کی حقیقت سے روشناس کر دیا۔ مسلمانوں کا امیر انتہائی پست ذہنیت کا آدمی تھا جس کے در پر اشرف المخلوقات کے معزز لقب کا وارث انسان عزتِ نفس سے محروم ہو کر جبیں سائی کر رہا تھا۔ مسلمان معبودِ حقیقی کی درگاہِ بے نیاز میں جھکنے کی بجائے یزید کا بندۂ بے زر بن چکا تھا۔ امام حسینؑ کی خود داری یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ مسلمان "اسفل السافلین" کے

درجہ میں گر کر پیغمبرؐ کی بدنامی اور اسلام کی رسوائی کا باعث بنے۔ چنانچہ حضرت حسینؑ حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے مکہ مکرمہ کی سکونت ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے اور مجمع عام کو مخاطب کر کے فرمانے لگے :-

" کم ظرف سلطانِ وقت نے مجھے موت اور ذلت کی درمیانی منزل پر ٹھیرا دیا ہے حاشا و کلّا خدا و رسولؐ اور پاک وجلیل القدر آباء واجداد کا خون اس بات سے انکار کرتا ہے کہ ہم ذلت کو قبول کریں۔ جو شخص ہماری امداد کے سلسلے میں جان دینے کے لئے تیار ہو اور خدائے پاک کی بارگاہ میں جانے پر آمادہ ہو وہ ہمارے ساتھ سفر کرے۔ میں صبح کو انشاءاللہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

عالی منزلت امامؑ ایک دوسرے موقع پر نظریۂ حیات ان اشعار میں بیان فرماتے ہیں :

۱۔ " میں روانہ ہوتا ہوں۔ مرد کے لئے موت ذلت نہیں جب کہ اس کی نیت نیک ہو اور اسلام کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔"

۲۔ " اور جب کہ وہ اپنی جان دے کر صالحین کا مددگار ہو اور دغاباز، ظالم، ہلاک ہونے والے سے جدا ہو رہا ہو۔"

۳۔ " میں اپنے نفس کو آگے بڑھاتا ہوں اور اس کی بقا نہیں چاہتا تاکہ وہ میدانِ جنگ میں لشکرِ کثیر کا مقابلہ کرے۔"

۴۔ " اس کے بعد میں اگر زندہ رہ گیا تو پشیمان نہیں ہوں گا اور اگر مر گیا تو کوئی مجھے ملامت نہ کر سکے گا۔ تیری ذلت کے لئے کافی ہے کہ تو (اے انسان) خواری کی زندگی بسر کرے۔" (ابن جریر، کامل)

میدانِ کربلا میں آپ نے اسی بلند نظریہ کا ان الفاظ میں تکرار فرمایا :-

" خدا کی قسم! نہ تو ذلیل انسانوں کی طرح اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح ڈر کر، چھپ کر بھاگوں گا کہ جان بچاؤں۔"

امامؑ ذلیشان نے نوعِ انسانی کو ظلم سے اجتناب کرنے اور ذلت سے اپنے نفس کو بچانے کے لئے صرف قولاً ہی سبق نہیں دیا بلکہ عملاً کر دکھایا۔

الموت خیر من رکوب العار والعار خیر من دخول النّار

واللّٰہ ما ھٰذا وھٰذا جاری

"ننگ وعار اور ذلتِ نفس اختیار کرنے سے مرجانا بہتر ہے۔ کافر وجہنمی بننے سے دنیا کی ذلت وخواری برداشت کرلینا آسان ہے۔ خدا کی قسم! ہمارے لئے یہ دونوں باتیں ممکن نہ ہونگی۔ ہم نہ عار اختیار کریں گے نہ نار۔"

اس میں شک نہیں کہ زندگی متاعِ عزیز ہے اور فطرتِ انسانی میں اس کی محبت ودلیعت کی گئی ہے۔ مزید برآں انسان کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ گرم وسردِ روزگار کے مقابل سینہ سپر ہوکر اور تمام ممکن ذرائع کو عمل میں لاکر ہستی کی بقاء اور اور زندگی کے تحفظ کے لئے کوشاں رہے۔ حکم دیا گیا ہے کہ "لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ پس اس حکیمانہ حکم سے حفاظتِ نفس کو ایک لازمی فریضہ قرار دیا گیا ہے لیکن گردشِ روزگار سے ایسے نازک مواقع بھی پیش آجایا کرتے ہیں۔ کہ زندگی اپنی تمامتر دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان اس سے بیزار ہوجاتا ہے اور وہ اسی محبوب و دلفریب زندگی سے، جس پر وہ سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا تھا ہاتھ دھو بیٹھنے میں ایک کیف آور لذت محسوس کرتا ہے۔ ایسے حالات جب کہ زندگی موت سے بدتر اور موت ہر حالت میں زندگی سے بہتر ہوتی ہے مجاہدِ راہِ خدا ایمان کی بقاء اور اسلام کے تحفظ کی خاطر جانِ عزیز نثار کرکے خوشی خوشی موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ دنیوی سلسلۂ حیات تو کٹ جاتا ہے۔ لیکن دائمی زندگی کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔ امامِ ذلیشانؑ نے کربلا میں جو راستہ اپنے لئے معین کیا

تھا وہ اسی اصول پر منتہی ہوتا تھا کہ ننگ و عار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔ حسینِ مظلومؑ نے عربی مقولہ "اَلْمَوْتُ فِیْ عِزٍّ خَیْرٌ مِنْ حَیٰوۃٍ فِیْ ذُلٍّ" (عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے) پر عمل کرکے اس کو اپنی دائمی ملکیت بنالیا ہے۔

حسینی نظام ضعیف سے ضعیف، بالکل بےکس اور بےنوا انسان کو بھی متحرک، فعّال اور بیباک مخلوق بناتا ہے۔ حسینؑ نے میدانِ کربلا میں عزتِ نفس و ضبطِ نفس کے دھندلے نقوش کو جو انسانی ذہن میں مُرتسم تھے۔ دائمی جلا بخش دی۔ اور آخری سانس تک شرافت بھری زندگی کی آن بان کو قائم رکھا۔

کیا حسینؑ کے بےلوث طرزِ عمل میں بصیرتوں کی ایک دنیا مخفی نہیں ؟

شجاعت

علمِ اخلاق کی رُو سے شجاعت کی صحیح تعریف یہ ہے کہ جب اقدام ضروری ہو تو اس وقت انسان پُرجگری کے ساتھ آگے بڑھ کر وہ سب کچھ کرے جو اس کے فرائض میں شامل ہے خواہ اس سلسلہ میں اسے جان بھی نذر کرنی پڑے۔ ایسے مقام پر پائے استقامت میں لغزش آنا شجاعت نہیں بلکہ جُبن و بزدلی کی علامت ہے اور جس موقع پر اقدام غیر مناسب ہو بلکہ سکوت و چشم پوشی کی ضرورت ہو اس وقت تحمّل و بردباری سے کام لے کر قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا جائے۔ اگرچہ ایسا کرنے میں اسے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے کیونکہ دماغی توازن کھو کر مہلکہ میں پل پڑنا شجاعت نہیں بلکہ تہوّر ہے۔ انسانی قویٰ کا اعتدال و میانہ روی سے استعمال کرنا ہی فضائل کا سنگِ بنیاد ہے۔ افراط و تفریط تو گناہ کا سرچشمہ ہیں امامِ ذیشانؑ نے اپنی زندگی میں شجاعت کے دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرکے چھوڑا ہے۔

حسینؑ وہی تھے جنہوں نے اپنے والد بزرگوار کی معیت میں جنگِ جمل و صفین کی لڑائیوں میں شریک رہ کر حیرت انگیز بہادری وجرأت کا مظاہرہ کیا تھا ایک دوسرے موقع پر وہی حسینؑ تھے جبکہ ان کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑ رہا تھا اور ان کے بزرگوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ ہوتا رہا۔ بھائی کے جنازے پر تیر برسائے گئے۔ باپ اور بھائی کو مسجد کے منبروں پر اور گلی کوچوں میں علانیہ گالیاں دی جاتی تھیں۔ آپ یہ سب کچھ دیکھ کر اپنے فطری غصہ کو محض اس وجہ سے قابو میں رکھے ہوئے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ذاتی جذبات جنگ و خونریزی کا سبب بن جائیں۔ اب وہی حسینؑ ضعیف العمری کے عالم میں میدانِ کربلا میں اپنے دوستوں کی صف کے اندر کھڑے ہیں۔ احباب مشورہ دیتے ہیں کہ دشمن کی تعداد ابھی زیادہ نہیں آپ حُر کے حکم کی پرواہ نہ کریں اور دریا کے کنارے سے خیمے نہ ہٹائیں اور اس تپتی ہوئی ریت پر خیمے برپا نہ کیجئے۔ زہیرابن القین نے عرض کیا "ان لوگوں سے لڑنا اس فوجِ گراں سے لڑنے کے مقابلے میں کہیں آسان ہے جو بعد میں آئے گی"۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "میں اپنی طرف سے لڑائی میں پہل نہیں کرنا چاہتا"۔

امام عالیمقامؑ نے زہیر بن القین جیسے نبرد آزما و آزمودہ کار جرنیل کے دخلصانہ مشورہ کو جو یقیناً حریف کی موجودہ قوت کو توڑنے اور ان کو دندان شکن شکست دینے پر منتج ہوتا محض اس خیال سے فوراً مسترد کر دیا کہ بنی امیہ لوگوں کو اپنی پرفریب و شاطرانہ سیاسی مکاریوں سے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ حسینؑ نے ہوسِ ملک گیری کی بناء پر خروج کیا تھا اور امن و رواداری کے اصول کو ٹھکرا کر ملّتِ اسلامیہ میں تفرقہ اندازی اور خونریزی کی بنیاد ڈالی تھی۔ امام حسینؑ یہ نہ چاہتے تھے کہ دشمن کا غلط پروپیگنڈا غلط بنیادوں پر بھی قائم ہو کر ان کی عظیم الشان قربانی کے بلند مقاصد کو فوت کر دے حالانکہ اس موقع پر زہیر بن القین

کے مشورہ پر عمل کر کے دشمن کا صفایا کر دیا جاتا تو بھی اسلام کی رُو سے یہ مدافعانہ جنگ تھی لہٰذا جائز تھی۔ دشمن کی فوج آپ کو محصور کر چکی تھی اس لئے آپ کا حملہ کبھی جارحانہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ حفظ ما تقدم میں جنگ کرنا مدافعانہ اقدام ہی کہلاتا ہے۔ خود جناب رسالتمآبؐ نے جنگ خیبر اسی اصول پر لڑی تھی۔

اگر حسینؑ، امام حسینؑ نہ ہوتے اور اس موقع پر آپ کی بجائے کوئی اموی مکار ہوتا تو حُر کے پیاسے لشکر کو قصر مقاتل کی منزل پر پانی سے سیراب کرنے کی بجائے آبِ شمشیر سے سیراب کیا جاتا۔ دشمن کے ساتھ داعیٔ حق کے اس فیاضانہ برتاؤ کا یہ اثر ہوا کہ حُر بن یزید ریاحی فوجِ یزید سے کٹ کر امام عالیمقامؑ کی نصرت میں جاں بحق تسلیم ہوا۔

عالی منزلت امامؑ کی ذہنیت اس سے بہت بلند تھی کہ دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے۔ حسینؑ نے دریا کا کنارہ دشمنوں کے حوالہ کر دیا اور تپتے ہوئے ریگزارِ کربلا میں خیمے گاڑ دیئے۔ فرزندِ رسولؐ کا شعار اس سے بہت بلند و بالا تھا کہ مخالفین کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر سیاسی منفعت حاصل کریں یا ذاتی مفاد اور جسمانی راحت کی خاطر جنگ کر بیٹھیں۔ لیکن جب شمشیر زنی کا وقت آیا تو امامؑ، باطل کی طاغوتی طاقتوں کے ساتھ اس عزم و استقلال اور صبر و استقامت سے ٹکرائے کہ پہاڑوں کا استحکام آپ کے سامنے ہیچ تھا۔ حسینی شجاعتِ عظیم کا وہ منظر کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا جب یکہ و تنہا ستاون۵۷ سالہ، کمر خمیدہ انسان کے سامنے سے ہزاروں سپاہی بھاگتے نظر آتے تھے۔ بقول علامہ ابن ابی الحدید امامؑ ساحلِ فرات پر شیرِ غراں کی طرح اس دلیری و جرأت سے لڑ رہے تھے کہ مخالفین ان کی بہادری کو دیکھ کر حواس باختہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ عالم حضرت علیؑ جیسا بہادر پیدا نہ کر سکی لیکن ان کے

فرزندِ ارجمند جناب حسینؑ نے یوم عاشور بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کی بہادری امیرِ خیبر گیرؑ کی شجاعت سے ایک نہیں، بلکہ کئی اعتبار سے اگر بڑھی نہیں ہے تو کچھ کم حیرت انگیز بھی نہیں۔ دنیا میں کوئی بہادر ایسی بے سرو سامانی کے ساتھ، غم والم کے ہجوم میں، بھوک اور پیاس کی شدت سے بیتاب ہوکر، پھر اتنی فوج کثیر سے عرب کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور شدت کی گرمی میں، جوانی نہیں بلکہ بڑھاپے کے عالم میں، اعزہ و اقربا کی شہادت کے سینکڑوں داغ سینے پر کھا کر، یکہ و تنہا اس جرأت و ثابت قدمی سے نہیں لڑا اور نہ لڑ سکتا ہے جس طرح حسینؑ لڑے۔

حضرت امام حسینؑ کا مافوق البشر صبر و استقلال اور اخلاقی کمالات خود اس امر کی دلیل ہیں کہ حسینِ شہیدؑ کی ذاتِ قدسی صفات بجائے خود ایک معجزہ تھی۔

کیا امامِ ذی شانؑ کے ہر عمل میں بصیرت کی ایک دنیا پنہاں نہیں؟

ایثار

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے نفس پر ترجیح دینا ایثار کہلاتا ہے

میدانِ کربلا میں ہر فرد نے امام عالیمقامؑ کے نفس کی حفاظت کو اپنے نفس و بدن پر مقدم جان کر ایثار و ہمدردی کا بہترین مظاہرہ کیا۔ نمازِ ظہر کے وقت سعید بن عبداللہ حنفی کا امامؑ کے مصلےٰ کے سامنے سینہ سپر بن کر کھڑا ہونا اور تیرہ[۱۳] زہر آلود تیروں کو اپنے سینہ پر روک کر امامؑ کی حفاظت کرنا ایک ناقابلِ فراموش ایثار اور قربانی کا مرقع ہے۔

حملۂ اولیٰ کے ہنگامہ میں ایسی خونریز لڑائی ہوئی کہ پچاس اصحاب درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ گھوڑے سب پے ہو گئے۔ میدانِ کربلا خونِ شہداء سے لالہ زار بن گیا۔ شمعِ امامت کے فدائی پروانے جانبازی و فداکاری کا عملی ثبوت پیش کر چکے تھے

مگر ابھی تک کسی ہاشمی فرد کو معمولی زخم نہ پہنچا تھا۔ کیا یہ اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ اصحابِ حسینؑ کسی ایسے نرالے انداز سے فوجِ اشقیاء کا مقابلہ کر کے اپنی جانیں دے رہے تھے کہ جس کا واحد مقصد خاندانِ رسولؐ کی کامیاب حفاظت تھا۔ ایسے فداکارانہ عزم اور وفادارانہ ایثار کی مثالیں صرف واقعہ کربلا ہی میں مل سکتی ہیں۔

جابری لڑکوں کی بے نظیر فداکاری اور ایثار کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ جب انہوں نے خدمتِ امامؑ میں حاضر ہو کر اپنے رونے کا سبب یوں عرض کیا۔ "ہم اپنی جان پر نہیں روتے۔ ہمیں تو آپ کی بیکسی پر رونا آرہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دشمن نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور ہم آپ کے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔" کیا ان دردبھرے الفاظ سے یہ حقیقت مترشح نہیں ہوتی کہ اصحابِ حسینؑ کو اپنا غم نہ تھا اور اپنی فکر نہ تھی غم تھا تو حسینؑ کا، فکر تھی تو ان کی تنہائی کی۔

حضرت ابوالفضل العباسؑ کا شمر کے امان نامہ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دینا ایثار و وفاداری کی ایک حیران کن مثال تھی۔ اپنے سامنے زندگی کی راہ صاف ہونے کے باوجود دوسرے کی خاطر موت اختیار کرنا معمولی ایثار کا مظاہرہ نہیں۔

مواسات

مصیبت کے وقت دوسرے کا شریکِ غم ہو کر ہمدردی کا اظہار کرنا مواسات کہلاتا ہے۔ امامؑ کی مواسات کا یہ عالم تھا کہ کوئی مصیبت انصار و اصحاب پر نہ پڑی جس میں امامؑ نے ساتھ نہ دیا ہو۔ ہر ایک کی شہادت امامؑ کے سینہ کے بے شمار داغوں میں ایک نئے داغ کا اضافہ کر رہی تھی۔ اصحابِ حسینؑ کی مواسات اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھی۔ حضرت نوحؑ کا فرزند باپ کا ساتھ نہ دے سکا حالانکہ اس میں اس کی اپنی حفاظت مضمر تھی۔ برادرانِ یوسفؑ کی بے وفائی کا قصہ

بائیبل و قرآن میں مذکور ہے۔ جناب موسیٰؑ کے اصحاب نے اپنے پیشوا کے تمام احسانات کو پس پشت ڈال کر ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ وہاں کے قدآور آدمیوں کو دیکھ کر اس قدر خائف ہوئے کہ نہایت دل شکن اور گستاخ لہجے میں حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے "اے موسیٰؑ! تم اور تمہارا پروردگار دونوں جا کر جنگ کرو۔ ہم تو یہیں بیٹھ کر تماشہ دیکھ لیں گے"۔ حضرت مسیح ناصریؑ کے حواریوں کا کیا کہنا سب سے بڑے مخصوص شاگرد پطرس نے مرغ کی اذان سے پہلے نہ صرف تین بار اپنے آقا کا انکار ہی کیا بلکہ مسیحؑ کی شان میں نازیبا کلمات بھی استعمال کئے۔ مہاتما گوتم بدھ راجدھانی میں دوستوں کے مجمع میں رہتے تھے۔ لیکن جب جنگل کی راہ لی تو دوست تو درکنار، بیوی نے بھی ساتھ نہ دیا۔ رامچندر جی اجودھیا کے پایۂ تخت میں حکومت کے بہی خواہوں کے جھرمٹ میں رہتے تھے لیکن چودہ سالہ بن باس میں سیتا و لکشمن کے علاوہ کوئی خیرخواہ ساتھ نہ تھا۔ خود خواجہ کائنات حضور سرورِ دو عالمؐ کو مسلمانوں کی اکثریت احد و حنین کے نازک موقعوں پر دشمن کے نرغہ میں چھوڑ کر بھاگ گئی۔ مصیبت کے وقت عبداللہ بن زبیرؓ کے دونوں بیٹے باپ کے مخالف ہو کر حجاج بن یوسف کی فوج میں جا ملے۔ تاریخ عالم اس قسم کی مثالوں سے بھرپور ہے لیکن اصحابِ حسینؑ کا اندازِ وفا کچھ نرالا ہی تھا۔ حسینؑ ترکِ رفاقت کا بار بار مشورہ دیتے رہے مگر وہ وفا کے پیکر، ایثار کے مجسمے، شجاعت کے نشہ سے چور، موت سے بےخوف، جان دینے پر تلے رہے۔ تاریخ عالم میں ایثار و مواسات، صبر و استقلال اور وفا و شجاعت کے نئے باب کا اضافہ کر گئے اور نوعِ انسانی کے لئے لافانی نمونہ چھوڑ گئے۔

حسنِ معاشرت

اشہر کے دن مصائب کے ہجوم میں یگانوں و بیگانوں کے ساتھ معاشرتی

حقوق کے لحاظ سے حضرت امام حسینؑ کا مساویانہ طرزِ عمل اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ جب کوئی مجاہد زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتا اور آواز دیتا تھا " **یا اباعبداللہ ادرکنی** " اے امامؑ! میری خبر لیجئے۔" آپ ہر ایک کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دھوپ کی تیزی اور گرمی کی شدت میں فوراً ہر شہید کی لاش پر پہنچتے اور اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی کا سر اس کے تن سے جدا نہ ہو۔ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی واقعیت ہے کہ امامؑ کی زندگی میں سوائے حبیبؓ ابن مظاہر کے جنہیں پکارنے کا موقع ہی نہ ملا کسی کا سر اس کے جسم سے جدا نہ ہوا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امامؑ اپنے بوڑھے ساتھی کی اتنی بھی امداد نہ کر سکے جتنی کہ وہ ہر ایک کی کرتے رہے۔ حبیبؓ کی شہادت کے بعد ایک خاص شکستگی آپ کے چہرۂ اقدس پر نمایاں ہو گئی۔ اصحاب کی شہادت کے وقت تو اکثر ساتھی موجود تھے جو لاش کی حفاظت کا سامان کر لیتے تھے۔ جب اصحاب نہ رہے اور عزیزوں کی باری آئی تو جناب کی ذاتِ قدسی صفات کو خود لاش میدان سے اٹھوا کر خیمہ تک لانے کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ حضرت علی اکبرؑ کی لاش تو جوانانِ بنی ہاشم اٹھا کر خیمہ گاہ تک لے آئے لیکن حضرت قاسمؑ کی لاش کو جو ان گنت ضربات کی وجہ سے پارہ پارہ ہو چکی تھی امامؑ خود اٹھا کر لائے اور حضرت علی اکبرؑ کی لاش کے پاس رکھ دیا۔ پھر بھی یہ تمنا دل ہی دل میں رہ گئی کہ کاش! ان سب کو اپنے ہاتھ سے دفن کر سکتے۔ اگرچہ وقت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ آپ بڑی لاشوں کو دفن کر دیتے تاہم کمسن شہید حضرت علی اصغرؑ کی چھوٹی سی لاش کو قبر کھود کر دفن کر کے یہ دکھا دیا کہ آپ کسی فرض کو بھی تشنۂ تکمیل نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس طرح آپ نے عملاً ثابت کر دیا کہ مصائب کے سخت ترین ہنگامہ میں بھی کوئی اخلاقی فرض داعیِ حق و امام ناطق کی دوررس نظر سے اوجھل نہ تھا اگر کسی پر عمل نہ ہو سکا تو وہ مجبوری کا نتیجہ تھا نہ غفلت کا۔

حسنِ معاشرت کی ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے ۔ روزِ عاشور جب بشیر بن عمرو کو اپنے فرزند کی سرحدِ رے پر قید ہونے کی خبر پہنچی تو امامؑ نے اسے بلا کر کہا۔ "جاؤ تم میری بیعت سے آزاد ہو۔ اپنے بیٹے کی رہائی کی فکر کرو"۔ لیکن مجاہد نے حقِ وفاداری ادا کرنے کے لئے ترکِ رفاقت سے انکار کر دیا تو قدردان امامؑ نے نقدی نہ ہونے کی صورت میں پانچ قیمتی کپڑے جن کی مالیت ایک ہزار اشرفی کے قریب تھی دے کر فرمایا :"اگر تم نہیں جاتے ہو تو اپنے فرزند محمد کو بھیج دو کہ ان کپڑوں کو بیچ کر اپنے بھائی کی رہائی کا سامان کرے"۔ امامؑ وطن سے دور، مصائب میں محصور، حالات سے مجبور اور نقد روپے دینے سے معذور تھے پھر بھی امامؑ نے ساتھی کی مصیبت میں محض لفظی اظہارِ افسوس پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان ہوش رُبا پریشانیوں کے عالم میں جو امکانی صورت نظر آئی اس سے دریغ نہ کیا۔

کیا تاریخِ عالم حسنِ معاشرت کی کوئی اس سے بہتر مثال پیش کر سکتی ہے ؟

مساوات و اخوّت

مساوات اسلامی تعلیمات میں خاص اہمیّت رکھتی ہے۔ جگر گوشۂ رسولؐ نے میدانِ کربلا میں یگانوں و بیگانوں سے یکساں سلوک کر کے مساوات و اخوّت کا بہترین درس دیا ہے۔ اس معرکہ میں خاندانِ رسولؐ بھی تھا۔ وہ جلیل القدر بزرگ بھی تھے جنہیں رسولِ خداؐ کی ہم نشینی کا شرف بھی حاصل تھا۔ حضرت علیؑ کے صحابی اور شاگرد بھی تھے۔ حسینؑ کے بچپنے کے دوست بھی تھے بلکہ بیرونی لوگ اور غلام بھی موجود تھے۔ لیکن حسینؑ نے انسانی حقوق میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا اور ہر ایک کی لاش پر پہنچے اور اس کو خیمہ گاہ تک لانے کا اہتمام کرایا۔ جب ترکی غلام زخمی ہو کر گرا تو نواسۂ رسولؐ نے یہ قدر فرمائی کہ آپ اس کے سرہانے تشریف

لائے۔ اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے اور اپنے رخسار اس کے رخسار پر رکھے خوش بخت غلام نے جو حافظِ قرآن بھی تھا آنکھیں کھولیں اور امامؑ کی عزت افزائی کا مشاہدہ کیا۔ لبوں پر مسکراہٹ طاری ہوئی اور روح جسم سے مفارقت کر گئی۔ امامؑ کہہ رہے تھے۔ "فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔"

انسانی ہمدردی

دوستوں کے ساتھ مراعات و احسان کرنا فطرت کا خاصہ ہے لیکن دشمن کے ساتھ حسنِ سلوک و خیر خواہی سے پیش آنا ہر زید و بکر کا کام نہیں۔ کہنے کو تو انجیلِ مقدس کے یہ الفاظ کہ "اپنے دشمن سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو" (متی ۵ : ۴۴) بڑے خوشنما اور بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ بظاہر آسان بھی ہیں اور قابلِ عمل بھی، لیکن دنیا میں کتنے عیسائی ہیں جو مسیح ناصری کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ یورپ کی ایک عیسائی حکومت، ہوسِ ملک گیری کا شکار ہو کر دوسری عیسائی قوم کا گلا کاٹ رہی ہے۔" گزشتہ دونوں عالمگیر جنگوں میں دشمن کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ کیا گیا ہے وہ شاید رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ غالباً ہیروشیما و ناگاساکی کی تباہی اسی فیاضی کا ایک منظر تھا۔

مخالفین تعصب کی بناء پر خواہ کچھ ہی سمجھیں مگر یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک روا رکھنا صرف حضرت محمد عربیؐ اور آلِ محمدؑ علیہم السلام ہی کا شیوہ تھا۔ فتح مکہ کے بعد فوجِ مخالف کے سردار ابو سفیان اموی اور عمِ رسولؐ حضرت حمزہؓ کا کچا جگر چبانے والی ہندہ کو معاف کر دینا اسی بے پایاں فیاضی کا نمونہ تھا جو جناب رسالتمآبؐ "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ

اَلْیَوْم" کہہ کر خون کے پیاسے دشمنوں سے روا رکھی۔ اپنے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کی تشنگی دور کرنے کے لئے اسے شربتِ شیریں سے سیراب کرنا دشمن سے فیاضی و حسنِ سلوک کی دوسری مثال تھی جو حضرت علی مرتضیٰؑ نے روا رکھی۔ زہر کھلانے والے دشمن کے نام کو پردۂ اخفا میں رکھ کر اپنے قاتل کو قتل کی سزا سے بچا دینا حضرت حسن المجتبیٰؑ کے حسنِ سلوک کی تیسری مثال تھی۔ رہا دشمن سے شہیدِ کربلاؑ کا سلوک۔ آپ نے قربانی کے ہر مرحلہ پر یہ کوشش کی کہ دشمن آپ کی خیرخواہانہ نصیحتوں سے استفادہ کرکے جرمِ عظیم کے عذاب سے بچ جائے۔ صرف ایک امام عالیمقامؑ پر کیا منحصر تھا۔ اصحابِ امامؑ سے ہر ایک شخص نے امامؑ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی اور ہر ایک نے نصیحت و دعوت کا حق ادا کیا۔ زہیر بن القین کی تقریر اسی جذبۂ ہمدردی کی ترجمان تھی۔ وہ کہہ رہے تھے :۔

دیکھو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے برادرِ مسلم کو خیرخواہی کے ساتھ نصیحت کرے اور سچا مشورہ دے۔ ہم تم ابھی تک بھائی بھائی ہیں، اور ایک ہی دین اور ایک ہی ملت پر ہیں۔ جب تک ہمارے درمیان تلوار نہ چلنے لگے اس وقت تم اس کے مستحق ہو کہ ہم تم کو نصیحت کریں اور نیک صلاح دیں۔"

حضرت حسینؑ نے منزلِ شراف یا مقام ذُوحسم پر حُر کے رسالے کو جو پیاس سے جاں بلب ہو رہا تھا اور بیابان میں کوسوں پانی کا پتہ نہ تھا، پانی سے سیراب کر کے دشمن سے فیاضی و ہمدردی کا بہترین ثبوت دیا۔ امامؑ کے ساتھ اہل و عیال کے علاوہ اعزہ و احباب بھی تھے اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی جن کے لئے پانی

ذخیرہ کر رکھا تھا مگر انسانی ہمدردی سے بے چین ہو کر وہ پانی نہ صرف دشمن فوج کو پلا دیا بلکہ ان کے گھوڑوں کو بھی اس بے پایاں فیاضی سے محروم نہ رکھا۔ اموی سیاست کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسی پیاس اور مجبوری کے عالم میں ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، لیکن اس وقت حسینؑ، امام حسینؑ نہ رہتے کیونکہ اشقیاء اور اتقیاء میں بس یہی فرق تو تھا۔ وہ جفا کرتے رہے اور یہ دعا کرتے رہے۔

حق گوئی و صاف بیانی

دنیا کے سیاست داں و قیادت پسند افراد جب کسی تحریک کے داعی ہوتے ہیں تو عوام کو طرح طرح کے مواعید سے ہمخیال بنا کر اپنی نصرت و حمایت پر آمادہ کرتے ہیں، طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اور فتح و ظفر کی کہانیاں سنا کر ان کو اپنی تائید پر ابھارتے ہیں۔ یہاں تک کہ مال و دولت اور جاہ و ثروت کا لالچ دے کر لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھا جاتا ہے۔ اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو پردۂ اخفا میں رکھ کر مطلب برآری کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح سے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے قلیل عرصہ کے لئے سیاسی مداری اپنی ہوا باندھ لیتے ہیں لیکن حقیقت کا پردہ چاک ہوتا ہے تو انہیں دائمی حسرت و ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حضرت حسینؑ کا مسلک اس قسم کے قیادت پسند حضرات سے بالکل مختلف بلکہ ان کے متضاد تھا۔ آپ کسی کو غلط توقعات کی بناء پر غلط فہمی میں مبتلا رکھ کر اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہ تھے۔ مکّہ سے روانگی کے قبل کچھ لوگ آپ کے گرد و پیش محض اس خیال سے جمع ہو گئے کہ آپ کوفہ کی جانب تشریف لے جا رہے ہیں جو حضرت علیؑ کا دارالسلطنت رہ چکا ہے۔ اٹھارہ ہزار کوفی مسلم بن عقیلؑ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ امام حسینؑ وہاں پہنچ کر تخت و تاج

کے مالک ہونگے اور ہم بھی ان کی معیت میں ایک زرخیز مقام پر پہنچ کر خوب مالی منافع حاصل کریں گے اور مالِ غنیمت سے خوب متمتع ہوں گے۔ لیکن امام عالیمقامؑ کو یہ منظور نہ تھا کہ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھا جائے۔ چنانچہ آپ نے مکّہ معظمہ سے روانگی کے ایک دن قبل اپنے مشہور تاریخی خطبہ کے ذریعہ لوگوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا اور انہیں بتلا دیا کہ ان کے خوش آیند توقعات سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ آپ نے بعد حمد و ثنا ارشاد فرمایا:۔

"موت اولادِ آدمؑ کے گلے کا ہار ہے۔ میں کتنا اپنے اسلاف کی ملاقات کا مشتاق ہوں؟ اتنا جتنا یعقوبؑ یوسفؑ کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ میرے لئے بہتر ہے وہ جگہ جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں گا، میرے پیش نظر وہ منظر ہے جب میرے جوڑ و بند وحشی درندے قطع کر رہے ہونگے، اور مجھ سے اپنی پیاس بجھا رہے ہونگے اور اپنی حسرتیں میرے قتل سے نکال رہے ہوں گے۔ کوئی چارۂ کار نہیں ہے، کوئی مفر نہیں ہے۔ اس دن سے جو قلمِ تقدیر نے لکھ دیا ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو اسی میں ہم اہلِ بیتؑ کی مرضی ہے۔ ہم اس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور جو صابرین کا اجر ہے اس کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں۔ رسولِ خداؐ سے ان کے جگر کے ٹکڑے دور تھوڑے ہی ہو سکتے ہیں بلکہ وہ بارگاہِ قدس میں، جنّتِ اعلیٰ میں، ان کے پاس جمع ہونے والے ہیں جن سے ان کی آنکھیں خنک ہوں گی اور ان کا وعدہ پورا ہو گا۔ جو اپنی جان میرے ساتھ فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر باندھے ہوئے ہو وہ میرے ساتھ چلے۔ میں صبح کو انشاءاللہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

اس سے بڑھ کر دنیا میں حق گوئی اور صاف بیانی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ صاف گوئی اور طہارتِ ضمیر کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے؟ اس حقیقت

پردر تقریر کے بعد صرف وہی لوگ آپ کے ساتھ ہو سکتے تھے اور ہوئے جو دنیوی مال و دولت کو خاکِ سیاہ اور جاہ و حشم کو پر کاہ تصور کرتے تھے اور جو حقیقی زندگی کے طالب تھے اور اسے محض موتِ شہادت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد راستے کے اعراب و بادیہ نشین قبائل اور بے خبر اشخاص امامؑ کو دیکھتے ہیں کہ امامؑ ایک جمعیت کے ساتھ قافلہ کی صورت میں عازمِ عراق ہیں اور کوفہ کے اٹھارہ ہزار آدمی بیعت میں شامل ہو چکے ہیں، مالِ غنیمت کی ہوس اور خوش آئند توقعات کے تصور میں امامؑ کی رفاقت میں ساتھ ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ معظمہ سے ساتھ آنے والی مختصر جماعت ایک بہت بڑی جمعیت بلکہ ایک لشکرِ کثیر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے کوئی اور ہوتا تو اسی فوج کو غنیمت سمجھتا اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر انہیں اپنا گرویدہ بنا کر اپنی گرفت سے نہ نکلنے دیتا مگر حسینؑ کی راستبازی و راست کرداری کب یہ گوارا کر سکتی تھی کہ لوگوں کو طویل عرصہ تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیا جائے۔ آپ حقیقت کے پردوں کو چاک کرنے کے لئے مناسب وقت و مناسب موقع کے انتظار میں تھے۔ **زرود** نامی مقام پر پہنچ کر جب آپ کو مسلم بن عقیلؑ کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ نے اہلِ قافلہ کو جمع کر کے خطبہ دیا :-

"اے لوگو! ہمیں نہایت دہشتناک خبریں پہنچی ہیں۔ مسلم بن عقیلؑ، ہانی بن عروہؓ و عبداللہ بن یقطرؓ قتل کر ڈالے گئے۔ ہمارے طرفداروں نے بیوفائی کی۔ کوفہ میں ہمارا کوئی مددگار نہیں، جو ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہے چھوڑ دے ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔"

یہ سن کر بھیڑ دائیں بائیں کٹنا شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کے گرد وہی آدمی رہ گئے جو مکہ سے ساتھ چلے تھے۔ (ابن جریر)

شبِ عاشور حقیقی خطرہ کے بالکل سامنے آجانے کے بعد آپ نے مجمع کو پھر چھانٹنے کی کوشش کی اور حقیقتِ حال کو بالکل بے نقاب کر دیا تاکہ کوئی شخص کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے اور بہتر ہے کہ وہ خود ہی ترکِ رفاقت کر دے مبادا نازک مرحلہ پر کمزوری دکھا کر، قربانی کے عظیم الشان مقصد کو نقصان پہنچائے مظلومِ کربلاؑ کے اس طرزِ عمل نے یہ سبق دیا کہ دنیا میں ہمیشہ حقانیت، طہارتِ ضمیر اور امانت کا لحاظ رکھا جائے۔ کسی کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے نہ تو مطلب برآری کی جائے اور نہ کسی کی غلط اندیشی و فریب خوردگی سے فائدہ اٹھایا جائے ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (علامہ اقبالؒ)

امن پسندی و رواداری

امام علیہ السلام امن پسندی و رواداری کے بہت بڑے حامی تھے اور آپ نے اسلام کے اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ مدت العمر صلح و امن قائم رکھنے میں اس حد تک کوشش کی کہ جتنی ان کے جسم و روح میں امکانی طاقت تھی لیکن اس کے باوجود وہ کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کر سکتے تھے جس میں حمایتِ باطل کا پہلو پیدا ہوتا ہو۔ یہی سبق انہیں اپنے نانا، باپ اور بھائی سے ورثہ میں ملا تھا۔ امامؑ کا نصب العین ہمیشہ یہی رہا کہ باطل کی حمایت سے علٰحدہ رہ کر ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ آپ پر امن سوزی اور خونریزی کی ذمہ داری عائد نہ ہو اور نہ ہی کسی غیر آئینی اقدام کی بنا پر آپ کو ملک میں انتشار و بدنظمی کو فروغ دینے کا ذمہ دار گردانا جائے۔

یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے خود امیر معاویہ سیاسی تدبیروں

و مکارانہ چالوں سے غافل نہ تھے اور نہ ہی امام حسینؑ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات سے بے خبر تھے۔ حجر کندی و عمرو بن الحمق الخزاعی ایسے صالح و عبادت گزار صحابۂ رسولؐ کا قتل جو محض اہل بیتِ رسولؐ کی محبت کے جرم میں امان دیئے جانے کے بعد مقتول ہوئے اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ امیر معاویہ کے نام جناب حسینؑ کا احتجاجی مراسلہ خود اس امر کی دلالت کر رہا تھا کہ امیر شام یزید کو مسندِ خلافت تک پہنچانے کے لئے راہ میں الجھنے والے تمام کانٹوں کو صاف کر دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ ذہنی طور پر امیر معاویہ یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی طرف سے عملی طور پر تشدد میں پہل کر کے، عوام کی نگاہ میں اپنے آپ کو معتوب نہ بنائیں بلکہ ایسے حالات و مواقع پیدا کئے جائیں کہ حسینؑ جوش میں آکر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھیں کہ بغاوت کی ذمہ داری ان پر عائد کر کے ان کے قتل کا جواز پیدا کیا جا سکے اور بفرضِ محال حسینؑ اپنی غیر معمولی ذہانت، حسنِ بصیرت اور حسن تدبّر سے ایسا موقع پیدا ہونے نہ دیں تو زہر کے خاموش ہتھیار سے کام نکالا جائے جس کا پیشتر ازیں سبطِ اکبر امام حسنؑ المجتبیٰ کی ذاتِ مقدس پر کامیابی سے تجربہ کیا جا چکا تھا۔ امامؑ حریف کی ان تمام سازشوں سے غافل و بے خبر نہ تھے مگر آپ کا منشاء یہ تھا کہ آپ خاموش رہیں اور حکومتِ شام خود بخود تشدد پر اتر آئے تاکہ قربانی کی تدریجی سکیم کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یزید کی تخت نشینی سے بہت پہلے کربلا کی جنگ کی ابتدا خود امیر معاویہ کر چکے تھے اور یہ صبر آزما نفسیاتی کشمکش نامعلوم کتنے عرصہ تک جاری رہتی اگر امیر معاویہ کا رشتۂ عمر جلد تر قطع نہ ہو جاتا اور نوعمر، ناتجربہ کار، غرورِ سلطنت سے بدمست، جاہل اور اوباش شخص تختِ حکومت پر متمکن نہ ہو جاتا۔

بہر کیف حضرت امام حسنؑ کی خلع خلافت سے آپ کی شہادت تک دس سالہ

طویل عرصہ، اور پھر شہادت سے لے کر معاویہ کی ہلاکت تک کی دس سالہ مدت جو مجموعی طور پر بیس سال ہوتی ہے امامؑ کا نہایت خاموشی اور صبر وسکون سے گزار دینا آپ کی مدبرانہ رواداری کی بیّن دلیل ہے حالانکہ اس طویل مدت میں متعدد صبر آزما مراحل پیش آئے تھے۔ امامؑ کسی حالت میں بھی حریف کو یہ موقع دینے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ آپ کے خلاف بغاوت کا جرم عائد کر کے آپ کے قتل کی پُر فریب سازش کو عملی جامہ پہنا سکے۔

امام حسنؑ کی وفات پر مردان اموی کی شرانگیزی وبعض دیگر سرکردہ اشخاص کی ممانعت ومزاحمت کے باعث حضرت حسینؑ اپنے بھائی کو روضۂ رسولؐ میں دفن نہ کر سکے۔ یہ معاملہ صرف ممانعت تک محدود نہ رہا بلکہ جناب سبط اکبر حضرت حسن المجتبیٰؑ کے جنازے پر تیر برسائے گئے اور چند تیر تابوت کو چیر کر جسمِ اطہر میں پیوست ہو گئے۔ یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ایک طرف اموی شرارت پر تلے ہوئے تھے اور دوسری طرف ہاشمی تلواریں نیام سے باہر آچکی تھیں لیکن امام عالی مقامؑ نے اپنے مسموم بھائی کی وصیت پر عمل کر کے تابوتِ اقدس کو پلٹا لیا اور انہیں بقیع میں دفن کر دیا۔ امام حسینؑ نے جن کی شجاعت وقوت اور ہمت وجراُت کا واقعہ کربلا نے کلمہ پڑھوا دیا ہے۔ اس موقع پر بھی خاموش رہ کر امن پسندی و رواداری کا کتنا بہترین ثبوت پیش کیا؟

یزید کی غیر آئینی وغیر اسلامی تقرر پر آپ نے حکومت کے خلاف کوئی عملی اقدام نہ کیا۔ حالانکہ بلادِ اسلامی میں خطوط و وفود بھیج کر اور احتجاجی جلسے برپا کر کے یزید کی غلط وغیر آئینی ولیعہدی کے خلاف منظم و مؤثر تحریک چلائی جا سکتی تھی لیکن اس موقع پر بھی اپنی حق تلفی کو صبر وسکون سے برداشت کر کے خاموشی اختیار کی گئی۔ کیا یہ رواداری نہ تھی؟ یزید نے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی

بیعتِ بالجبر کا مطالبہ شروع کر دیا۔ آپ نے یزید کے خلاف مدینہ میں منظم جماعت پیدا کرنے کی بجائے وطن و قرب روضہ رسول ؐ چھوڑ کر مکہ معظمہ کی راہ لی۔ کیا یہ امن پسندی کی دلیل نہیں ؟

مکہ مکرمہ کی جانب ہجرت کرنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپ جائے امن میں پناہ گزین ہونا چاہتے تھے لیکن جب وہاں بھی آپ کا رہنا دوبھر ہو گیا تو آپ نے حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے عراق کو روانگی اختیار کی۔ کیا آپ حج کے موقع پر وہاں ٹھہر کر یزیدی حکومت کے خلاف عوام کے جذبات کو مشتعل نہ کر سکتے تھے ؟ یقیناً اس طرح باطل کے خلاف علانیہ محاذ کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ آپ کا اثر و رسوخ عبداللہ بن زبیرؓ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ابن زبیرؓ نے بھی تو حکومت شام کے خلاف کامیابی کے ساتھ نو سال تک ارضِ مقدس پر اپنا تسلط قائم رکھ کر یہ دکھا دیا کہ حسینؑ مکہ یا یمن میں قیام فرما کر حکومتِ شام کے خلاف محاذ کھڑا کر لیتے تو کئی سال تک یقیناً کامیابی کے ساتھ مقابلہ جاری رہ سکتا تھا جس کے نتیجہ میں یہ بھی ضروری نہ ہوتا کہ حکومتِ شام ہی فاتح ہوتی کیونکہ جنگ میں بعض اوقات کسی فریق کی معمولی سی سیاسی غلطی فتح کو شکست میں بدل دیتی ہے جیسا کہ صفین کی لڑائی میں ہوا۔ جب عمرو بن العاص کے ایما پر شامیوں نے قرآن حکیم کو نیزوں پر بلند کیا تو کوفی فریب میں آ گئے اور معاویہ کی شکست خوردہ فوج فاتح بن گئی عبداللہ بن زبیرؓ کی سیاسی بے تدبیریوں کا نتیجہ تھا کہ مروان و عبدالملک مدینہ سے صحیح و سلامت نکل کر شام میں پہنچ گئے تھے اور ابن زبیرؓ کے حامیوں کی سیاسی غلطی و بزدلی سے دمشق میں آلِ مروان کی حکومت قائم ہو گئی ورنہ معاویہ ثانی کی تخت سے دست برداری پر اموی حکومت کا آفتابِ اقبال و عروج غروب ہو چکا تھا بفرضِ محال یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ جنابِ حسینؑ کے مقابلہ میں حکومتِ شام ہی غالب آتی

تو بھی واقعہ کربلا سے زیادہ دردناک المیہ تاریخِ عالم میں پیش نہ آتا لیکن امامؑ کا مقصد مادی حکومت کا قیام نہ تھا بلکہ خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی مدہوش قوم کو جھنجوڑ کر اس میں حق و باطل کے امتیاز کی صلاحیت پیدا کرنا مقصود تھی۔ کیا یہ تمام کچھ رواداری و امن پسندی کی راہ نہ تھی جس پہ امامؑ ذلیشان سالک تھے؟

کربلائے معلیٰ پہنچ کر آپ نے دریا کے کنارے خیمے گاڑ دیئے لیکن حُر کے اصرار پر دریا کا کنارہ چھوڑ کر تپتی ہوئی ریت پر خیمے برپا کئے۔ اگر آپ دریا کا کنارہ نہ چھوڑتے تو اوّلاً آپ کے لشکر کو پیاس کی وہ ناقابلِ برداشت مصیبت پیش نہ آتی جو بعد میں آئی اور ثانیاً پس پشت دریا کی موجودگی قدرتی حصار کا کام دیتی اور دشمن کے حملہ سے ایک طرف قطعی طور پر محفوظ رہتی اور غالباً اس طرح کربلا کی جنگ زیادہ کامیابی کے ساتھ زیادہ عرصہ تک لڑی جا سکتی تھی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حُر اس وقت شدید مزاحمت کرتا اور لڑائی کی نوبت آتی تو زہیر بن القین کے مشورہ کے مطابق حُر کی فوج کے ساتھ بدرجہا بہتر طریق سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا بہ نسبت اس فوجِ گراں کے جو بعد میں پہنچ گئی اور جس کی یقینی آمد کا پہلے قطعی علم ہو چکا تھا۔ امامؑ نے زہیرؓ کے مدبرانہ مشورہ کو محض یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ میں اپنی طرف سے جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ کیا دنیا کا کوئی مادہ پرست، سیاسی مدبر ایسا نادر موقع ہاتھ سے کھوتا ہے جب کہ خطرہ عین سر پر منڈلا رہا ہو؟ مگر یہاں روحانیت کے بادشاہ، کشتیٔ حق کے ناخدا، تاجدارِ دو عالمؐ کے نواسے حسینؑ تھے جو مادی جنگ لڑنے کی بجائے اسلامی روحانیت کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور اپنے عمل و کردار سے امت مسلمہ کو امن پسندی و رواداری کا درس دینا چاہتے تھے۔

کیا اس سے بڑھ کر امن پسندی و رواداری کا کوئی ثبوت ہو سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے اپنے سیاسی و جنگی مفاد کے خلاف عمل کیا حالانکہ احباب اس اقدام

کے خلاف مشورہ دے چکے تھے۔ لیکن حسینؑ، حسینؑ تھے وہ اپنے دماغ میں ایک سکیم مرتب کر چکے تھے جس پر عمل پیرا ہو کر، جذبات کی رو میں نہ بہتے ہوئے، دماغی توازن کو برقرار رکھ کر بتدریج ایک عظیم الشّان سوچی سمجھی قربانی پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ احکام الٰہی و سنّتِ رسالت پناہی کے اجراء سے ہدایتِ خلق ہو سکے۔

یوم عاشور فوجِ اشقیاء کے سامنے آپ کا مشہور تاریخی خطبہ امن پسندی و رواداری کے علاوہ انسانی ہمدردی اور حق گوئی کا ایک مکمل مظاہرہ تھا۔ آپ کے اس مصالحانہ رویّہ کا یہ اثر ہوا کہ حر بن یزید ریاحی کے علاوہ کچھ اور ایسے لوگ بھی تھے جو یومِ عاشور فوجِ اشقیاء سے کٹ کر امامت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے چنانچہ اس سلسلہ میں جوبن بن مالک تیمی، حارث بن امرأ القیس کندی، حلاس بن عمر اندی، زہیر بن سلیم ازدی، نعمان بن عمر ازدی اور بکر بن حی تیمی کے نامہائے نامی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔

"دنیا میں جنگ کا قاعدہ تھا کہ بڑے بڑے بہادر بھی جنگ میں زرہ و خود پہنتے تھے مگر حسینؑ کربلا میں خز کا جو نہایت باریک کپڑا ہوتا ہے ایک کرتہ پہنے ہوئے سر پر عمامہ باندھے تھے۔" (طبری جلد ۶۔ ص ۲۵۹)

ان حقائق کی موجودگی میں کوئی شقی القلب ہی یہ سمجھے گا کہ حضرت امام حسینؑ نے حکومتِ شام کے خلاف خروج کیا۔ حسینؑ کے طرزِ عمل میں عدم تشدّد کے حامیوں کے لئے کتنی بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔

قربانی و حقانیتِ اسلام کی تصدیق

تاریخ عالم میں خونریزی، لوٹ مار، آتش زنی اور غارت گری کے درد انگیز واقعات پڑھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ مسلسل خونریزی اور قتل و غارت کے بعد نسلِ

انسانی اب تک کیوں باقی رہی اور اس لگاتار فتنہ و فساد کی وجہ سے کیوں فنا نہ ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر حیران کن امر یہ ہے کہ بالعموم اس تباہی و ہلاکت کی ذمہ داری ان مذہبی قائدین کے سر عائد ہوتی ہے جو ہمیشہ اپنی سیاسی اغراض کو قومی فلاح ملکی بہبود یا مذہبی حفاظت کا رنگ دے کر دنیوی جاہ و حشم اور مال و متاع کے حصول کی کوشش کرتے ہیں اور پھر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا ہی نہیں رہتی کہ عارضی غلبہ و ہنگامی فتح مندی کے بعد وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں لیکن نظام عالم اسی طرح قائم و دائم رہتا ہے بلکہ اس خونی انقلاب کے بعد حق زیادہ زور سے ابھرتا ہے اور باطل کو عارضی غلبہ کے بعد نگونساری حاصل ہوتی ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ حق بظاہر مغلوب ہو کر پھر کیوں اس قدر زور سے ابھرتا ہے کہ باطل کو اپنے دنیوی ساز و سامان کی موجودگی، مادی جاہ و حشم اور تخت و تاج کے باوجود چاروں شانے چت گرنا پڑتا ہے۔ قوموں کے اس عروج و زوال کی حکایت کا اگر محققانہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں کچھ اس قسم کے بلند مرتبہ و جلیل القدر افراد نظر آتے ہیں جو بدی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے چٹان کی طرح ڈٹ جاتے ہیں۔ اپنا تن من، دھن سب کچھ راہِ حق میں قربان کر کے باطل کے تلاطم خیز طوفان کی موجوں کو پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کے ضمیر کو نہ تو حکومت کے سنہری و روپہلی انبار خرید سکتے ہیں اور نہ فوجی قوت و عسکری طاقت ان کو مرعوب کر سکتی ہے۔ وہ خوف و طمع کے وقت یکساں طور پر مضبوطی سے اپنے نصب العین پر ڈٹے رہتے ہیں اور غیبی رہنمائی کی روشنی میں چل کر گمراہ نفوس کی جادۂ حقیقت پر رہنمائی کرتے ہیں۔ ناتواں کی ہمت بڑھاتے اور کمزور کی دستگیری کرتے ہیں اور اپنے اسوۂ حسنہ سے یہ دکھا دیتے ہیں کہ خدا کا منشاء یہ نہیں کہ دنیا ایک بدترین ٹھکانہ بن جائے اور بنی آدم عیش پرست وحشیوں اور خونخوار درندوں

کی نسل کہلائے۔ سچائی دنیا میں اس لئے زندہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ وحضرت موسیٰؑ جیسی مایۂ ناز ہستیاں نمرود و فرعون کے مقابل حق کی پشتیبان رہی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ و حضرت محمد عربیؐ جیسے جلیل القدر و عالی مقدار انبیائے کرام نے خود مصیبتیں جھیلیں صعوبتیں برداشت کیں، حق وصداقت کو بلند و بالا رکھا اور ظلم و جور کی جگہ عدل و انصاف کو رائج کیا۔ ان بزرگوں کی قربانیوں ہی کی وجہ سے آج تک دنیا قائم ہے۔ ایسے ہی ذلیشان انسانوں میں سے ایک حضرت امام حسینؑ بھی تھے۔ اگرچہ نبی نہ تھے مگر آزادی وحریت کے پیغمبر اور سچائی وحقانیت کی کشتی کے ناخدا تھے جو دریائے فرات کے کنارے وہ کارنامہ سرانجام دے گئے جو اولوالعزم انبیاء و رسل کے شایان شان تھا

امام حسینؑ کی عظیم الشان قربانی ایک منظم حیثیت رکھتی تھی اگر وہ اپنی شہادت کے مرحلہ کو پہلی ہی دفعہ قطع کر دیتے تو کہنے والا یہ کہہ سکتا تھا کہ مصائب سے گھبرا کر جان دے دی لیکن آپ نے آہستہ آہستہ قربانی کی منازل طے کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ اقدام کسی وقتی جذبہ و ہنگامی جوش کا نتیجہ نہیں بلکہ معاملہ فہمی و فرض شناسی پر مبنی ہے۔ آپ کی قربانی کی تدریجی ترقی جس طرح بے مثال و حیرت انگیز ہے اسی طرح سبق آموز و عبرت خیز بھی۔ آپ نے مدینہ چھوڑ کر قومیت کے تحفظ پر وطن کی محبت کو قربان کر دیا پس آپ نے حسین احمد مدنی جیسے ہندوستانی، کانگرسی مزاج مسلمانوں کے لئے اپنے لائحہ عمل سے یہ سبق چھوڑا کہ مسلمانوں کی قومیت کی تشکیل **وطنیت پر نہیں** بلکہ **اسلام پر مبنی ہے** ؎

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند (اقبالؒ)

امام حسینؑ نے دوست و آشنا اور عزیز و اقربا کو اسلام کی حفاظت کے لئے قربان کر کے یہ سبق دیا کہ حق کی خاطر عزیز سے عزیز متاع قربان کر دینا اصل ایمان

ہے۔ حسینؑ نے عزیز ترین معبد "خانہ کعبہ" کو جس کے موروثی متولی چلے آتے تھے چھوڑ کر یہ دکھا دیا کہ جان دے دو لیکن بیت اللہ کی حرمت کو برقرار رکھو۔ تین روز کی بھوک اور پیاس برداشت کر کے اور سوکھے گلے کٹوا کر یہ بتا دیا کہ مسلمانو! جب کبھی اسلام پر ایسا نازک وقت آجائے تو تم بھی اعلیٰ اصول کے تحفظ کے لئے سب کچھ نثار کر دو۔ حسینؑ نے اہل وعیال کو، خونخوار اور جاہل فوجیوں کے رحم وکرم پر، اسیری کی مصیبتیں جھیلنے کے واسطے، بے والی و وارث چھوڑ کر بتا دیا کہ افراد وجماعات کی ہر عزیز سے عزیز شے کو دین کی راہ میں بے دریغ قربان کر دینا انسان کے لئے انتہائی شرف وسعادت ہے۔

حسینؑ قربانی کا کمال، صرف پیری کے سہارے، حضرت علی اکبرؑ کی شہادت، آنکھوں کی بینائی حضرت قاسمؑ کی قربانی، بازو کی قوت حضرت عباسؑ کی موت تک ہی محدود نہیں بلکہ انتہائے کمال غنچۂ ناشگفتہ حضرت علی اصغرؑ کو اپنے ہاتھوں پر قربان کرنا ہے۔ اس سے بھی عظیم تر قربانی اس جسم مقدس کی تھی جس کے ہر عضو سے خون ٹپک کر حق کی حمایت کر رہا تھا۔ زخموں کی کثرت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ دشمن کے تیروں ظالم کی تلواروں اور مخالف کے نیزوں کو جستجو کے بعد بھی کوئی خالی مقام نظر نہ آتا تھا جہاں وہ نیا زخم پہنچا کر اَن گنت زخموں کی تعداد میں اضافہ کر سکیں۔ امام حسینؑ کے جسم کا ہر حصہ، خون کا ہر قطرہ اور دل کا ہر ٹکڑا اعلائے کلمۃ الحق کے لئے قربان ہو چکا تھا، اور نواسۂ رسولؐ کے لئے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا اور قربانی کی مذبح پر بھینٹ چڑھانے کے لئے نہ کوئی **اکبر** رہا اور نہ کوئی **اصغر** رہا۔ صرف ایک رشتۂ حیات باقی تھا جو روح وبدن کی باہمی متضاد کشمکش کے باوجود قائم رہا۔ سر وگردن کا ارتباط باقی تھا جن میں ابھی تک جدائی نہ ہوئی تھی۔ عصر ہوتے ہی باہمت مجاہد، اسلام کے مخلص شیدائی، صبر وصداقت کے پیکر، دین کے سچے پرستار یعنی

فرزندِ رسولؐ کا سرِ اقدس معبودِ حقیقی کی درگاہِ بے نیاز میں آخری بار جھکا۔ یہ قربانی کی آخری منزل تھی۔ بدخو، خونخوار کا خنجرِ لیثت گردن پر چلا۔ ایک طرف تو نفس و بدن کا ظاہری اتصال قطع ہوا، دوسری طرف سر اور گردن کے باہمی ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔

نواسہ رسولؐ نے ایک طرف تو مادی قوتوں کے سامنے سر نہ جھکا کر ان کا مضحکہ اڑایا اور دوسری طرف اَن دیکھی طاقت (خدائے قدیر) پر اپنی قوتِ ایمان کا مظاہرہ کر کے فنا کو بقا اور موت کو حیات بنا دیا۔ حسینؑ نے اپنی لازوال قربانی سے اسلام کی حقانیت کی تصدیق کی اور اسلام کی آئندہ اشاعت کے لئے رستہ صاف کر دیا۔ جب ہی تو بھارت دیش کا ایک مہاپرش (مہاتما گاندھی) حسینِؑ شہید کی مدح سرائی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ "امام حسینؑ نے اپنی اولاد، نیز اپنے پورے خاندان کے لئے پیاس اور موت کی تکالیف قبول کر لیں مگر ظالم حکام کے سامنے سر نہ جھکایا۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کی ترقی اس کے ماننے والوں کی تلواروں کی بدولت نہیں ہوئی بلکہ اس کے فقراء کی قربانیوں کی وجہ سے ہوئی ہے"۔

حضرت امام حسینؑ نے فی الحقیقت اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تباہی کے بھنور سے نکال کر ساحلِ مراد پر لا کھڑا کیا ؎

تو اپنے خون پاک کے چھینٹوں سے اے حسینؑ　　انسان کی شرافتِ خفتہ جگا گیا
اسلام کی کشش کا نہ جن پر اثر ہوا　　تو درد بن کے ان کے دلوں میں سما گیا
(رزم ردولوی)

آسمان لاکھوں برس گردش کرے۔ دن رات کا تغیر و تبدل زمانے کے ہزاروں ورق الٹ دے لیکن اتنی شاندار، مکمل، منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی ؎

از حسینؑ آموز در دورِ فتن　　جانِ خود را بہرِ ملت باختن
تا ز خونِ سرخت از خاکِ وطن　　گل دمد ہر سو چو ریحان و سمن

(ہز ہائی نس ناصر الملک مہتر آف چترال)

باب دوازدہم

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ۝ وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ ۝

کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو
اور روتے نہیں اور تم غفلت شعار ہو

(النجم۔ ۵۹-۶۱)

بُکَاءِ عَلَی الْحُسَیْنؑ

اسلام دینِ فطرت ہے

مذاہبِ عالم میں اسلام کو یہ ایک نمایاں خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دینِ فطرت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو لوگ وجودِ باری کے قائل ہیں ان کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ وہ تمام کائنات کا فاطر و خالق ہے اور نظامِ عالم اس کی حکمتِ کاملہ کی بنا پر قائم ہے۔ اس لئے دینِ حق صرف دینِ خدا ہی ہو سکتا ہے اور عقلاً دینِ خدا دینِ فطرت ہی ہونا چاہئے کیونکہ خالق کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتا جو فطری نہ ہو اور ایسی تکلیف بار نہیں کر سکتا جس کو فطرت برداشت نہ کر سکے اور انسان اپنی فطری کمزوریوں کی موجودگی میں اس کا متحمل نہ ہو سکے۔ اسی لئے تو ارشاد ہوتا ہے۔ "لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" ہم ہر نفس کو اس کی وسعت و طاقت کے مطابق مکلف کرتے ہیں۔ (الانعام ۱۵۳)

قرآن حکیم نے دینِ فطرت کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم ۳۰)

(ترجمہ) پس دینِ حنیف کے لئے اپنا منہ سیدھا کر۔ اللہ کی فطرت وہی ہے جس پر انسان کی پیدائش ہوئی ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تغیر نہیں۔ یہی درست و صحیح دین ہے ولیکن لوگوں کی اکثریت اس سے ناآشنا ہے۔

وہ افراد بھی جو ہستی باری تعالیٰ کے قائل نہیں، ان تمام فطری اصول کو کسی نہ کسی رنگ میں مانتے ہیں بلکہ حتیٰ المقدور ان پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ وہ بھی انسانی آزادی، مساوات، اخوت، رحم و عدل، اخلاق و امانت، احسان و ایثار کو بہترین انسانی اوصاف تصور کرتے ہیں اور ان کے اضداد غلامی و استحصال، جور و ظلم، کذب و خیانت، خود غرضی و فتنہ پردازی کو برائی و بدکرداری پر محمول کرتے ہیں۔ ان ہی

اصول پر اسلام کا دارومدار ہے۔ اسلام کا کوئی قانون، کوئی اصول ایسا نہیں جو نوعِ انسانی کے فطری تقاضا کو پورا نہ کرتا ہو۔ اسلام تمام مسلمانانِ عالم کو ایک عالمگیر برادری و اخوت کا درس دیتا ہے: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" (الحجرات ۱۲) "تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں"۔

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ بھائی بھائی کی تکلیف و مصیبت میں اس کا یاور و ناصر ہو۔ اس سے اظہارِ ہمدردی کرے۔ اس کے حقوق کا پاس و تحفظ ملحوظِ خاطر رکھے۔ جور و جفا سے تنفر کیا جائے اور حق و عدل کو دنیا میں رائج کیا جائے ظالم و سفاک سے کوئی انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو محبت نہیں کرتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مظلوم کے ساتھ رحم و ہمدردی کا جذبہ انسانی فطرت میں خمیر کیا ہوا ہے۔ لہٰذا انسان فطرتاً مجبور ہے کہ ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے ظالم پر نفرین کرے اور مظلوم کی حمایت و ہمدردی میں گریہ و زاری کرے۔ اب انسان کی اس نفسیاتی کیفیت پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے کہ یہ کس طرح انسانی دل و دماغ کو اپنے تصرف میں لیتی ہے اور وہ کون سے مخصوص حالات ہیں جن کے تحت ہم گریہ کرنے پر فطرتاً مجبور ہو جاتے ہیں۔

غم و خوشی کی حقیقت و مدارج

روزمرہ کا انسانی تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ انسان پر دو متضاد کیفیتیں وقتاً فوقتاً طاری ہوتی رہتی ہیں **غم اور خوشی**۔ انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مسرت افزا واقعات پیش آتے ہیں کہ وہ ان کے لذائذ سے مستفید ہونے کی امید پر ایک گونہ قلبی فرحت و تازگی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح جانکاہ سوانح بھی درپیش ہوتے ہیں جو حزن و ملال کا باعث بنتے ہیں اور انسان اظہارِ غم کے لئے غیر ارادی

طور پر فطرتاً مجبور ہو جاتا ہے۔ بی اے کے امتحان کے امیدوار کو جب اپنی شاندار کامیابی کی اطلاع موصول ہوتی ہے تو اس پر فرحت و انبساط کی ایک فوری کیفیت چھا جاتی ہے۔ برعکس اس کے جب کسی باپ کو اپنی زندگی کے آخری سہارے، اپنے اکلوتے فرزند کی موت کی اچانک اطلاع ملتی ہے تو وہ رنج و غم کی مجسم تصویر بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کا ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کیفیات غم و سرور کے اظہار کے مختلف درجات ہیں جس قدر کیفیت شدید ہوگی اسی قدر انسانی اعضاء و جوارح اس کی شدت سے متاثر ہونگے اور جس قدر خفیف ہوگی اسی قدر اس کے اثرات ہلکے اور خفیف ہونگے۔ اظہارِ غم و اظہارِ فرحت و سرور کے چار مختلف مدارج ہیں جن کو ہم ان کی خفت و شدت کے اعتبار سے ترتیب وار بیان کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ذی شعور حضرات آپنے ذاتی مشاہدات کی بناء پر ان نظریات کی تائید کریں گے۔

درجاتِ اظہارِ فرحت و سرور

۱۔ **چہرے کی شگفتگی و بشاشت**:۔ معمولی خوشی کی صورت میں انسان کے چہرے کی شگفتگی و بشاشت قلبی فرحت و انبساط کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

۲۔ **تبسم**:۔ خوشی میں جب اضافہ ہوتا ہے تو لب پر تبسم رونما ہوتا ہے۔ مسکراہٹ کھیلتی ہے اور قلبی سرور پر دلالت کرتی ہے۔ اس کیفیت کے طاری ہونے پر صدف شفتین وا ہوتے ہیں، معمولی ہونٹ کھلتے ہیں، قدرے دانت بھی نمایاں ہوتے ہیں لیکن ہنسی کی آواز پیدا نہیں ہوتی۔

۳۔ **قہقہہ**:۔ خوشی کی شدت انسان پر قہقہہ کی کیفیت طاری کر دیتی ہے اور انسان زور سے ہنستا ہے۔ جسم میں معمولی سی حرکت بھی پیدا ہو جاتی ہے، منہ

کھلتا ہے اور ہنسی کی آواز سے حاضرین کے کان بھی مانوس ہونے لگتے ہیں۔ جب ہنسی انتہائی شدّت اختیار کر لیتی ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس کو گریۂ شادی کہتے ہیں۔

۴۔ قہقہۂ اضطراری :۔ اظہارِ خوشی کا آخری درجہ ہے۔ ہنسی کی یہ کیفیت اس شدّت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ ہنسنے والا (SELF CONTROL) خود ضبطی سے محروم ہو جاتا ہے۔ تمام جسم پر تحرک طاری ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو انسان لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے اور پیٹ میں درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ طب کی بعض کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ انتہائی خوشی کی صورت میں شادی مرگ بھی ہو جاتی ہے ؎

تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا (غالب)

ہمارے روزمرّہ کے مشاہدات ان درجات کی صداقت کے شاہد ہیں۔ اسی طرح اظہارِ غم کے بھی چار درجے ہیں جن کو ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں۔

درجاتِ اظہارِ غم

۱۔ چہرے کی پژمردگی :۔ معمولی غم کی صورت میں انسانی چہرے کی حیرانی و پژمردگی اس کے قلبی حزن و ملال کی غمازی کرتی ہے۔

۲۔ اشکباری :۔ غم کی زیادتی کی صورت میں آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ مسلسل آنسو گرتے ہیں لیکن لبوں پر سکوت طاری رہتا ہے۔

۳۔ نالہ و زاری :۔ رنج و الم کی شدّت کی وجہ سے انسان پر ایک ایسی درد انگیز حالت طاری ہو جاتی ہے کہ آنکھوں کی خونابہ باری کے علاوہ زبان سے آہ و زاری، فریاد و فغاں بلند ہوتی ہے اور رونے والے کی درد بھری آواز

سے حاضرین بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ اس کی بہترین مثال اس دردناک منظر میں موجود ہے کہ جس وقت نائبِ زہرا حضرت زینبؑ کو بے مقنع و ردا مظلوم کربلاؑ کی پامال شدہ لاش پر لایا گیا تو آپ کے درد بھرے، غم میں ڈوبے ہوئے بین سن کر دوست و دشمن سب کی آنکھوں میں سے آنسو برسنے لگے۔(ابن جریر)

۴۔سینہ کوبی :۔ اظہارِ غم کی انتہائی صورت میں فریاد و زاری اور اشک فشانی کے علاوہ وجدانِ غم کے اثرات سے انسانی اعضاء وجوارح میں تحرک پیدا ہو جاتا ہے اور بسا اوقات آدمی غیر ارادی طور پر سینہ زنی و سینہ کوبی شروع کر دیتا ہے ۔منہ پر طمانچے مارتا ہے، سر میں خاک ڈال لیتا ہے ۔بعض لوگ شدتِ غم کے اثرات سے بیتاب ہو کر، پتھر اٹھا کر سر پر دے مارتے ہیں اور بعض سر کو دیوار سے پھوڑ لیتے ہیں، کوہکن کا تیشہ سے سر پھوڑنا ایک ایسا مشہور تاریخی واقعہ ہے جس کو ہر ذی علم جانتا ہے ۔اس قسم کے واقعات کسی خاص مذہب و ملت یا رنگ ونسل سے وابستہ نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں میں ایسے حالات مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ ایسے واقعات کے وقوع پذیر ہونے سے تو انکار نہیں ہو سکتا البتہ معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کے افعال صرف جہلا ہی سے صادر ہوتے ہیں کیونکہ ان میں خود ضبطی یعنی سیلف کنٹرول کا مادہ موجود نہیں ہوتا اور صبر کا فقدان ہوتا ہے لیکن تاریخی شواہد سے یہ بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بڑی بڑی اولوالعزم ہستیوں سے بھی افراطِ غم کی وجہ سے اس قسم کے افعال سرزد ہوتے رہتے ہیں اور یقیناً ہوتے رہیں گے ۔ تاریخی شواہد ملاحظہ فرمائیے :۔

تاریخی شواہد :۔ (۱) حضرت ابوبکرؓ نے وفاتِ رسولؐ کے صدمہ سے اپنے آپ کو زمین پر دے مارا۔ (صحیح بخاری جلد۳۔ باب مرض النبیؐ۔ ص ۹۳)

(۲) جب حضرت بلالؓ نے آنحضرتؐ کا پیغام حضرت ابوبکرؓ کو پہنچایا کہ آنحضرتؐ

مسجد میں تشریف نہیں لا سکتے، حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا دیں، تو یہ خبر سن کر کہ آج مسجد جناب رسالتمآبؐ سے خالی رہے گی، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے تئیں منہ کے بل زمین پر گرا دیا اور بے ہوش ہو گئے۔ اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں :-

" خود را پس بروئے افتاد و بے ہوش شد "

(مدارج النبوۃ جلد دوم ذکر گذاردن نماز حضرت ابوبکرؓ در مرض رسولؐ مطبوعہ نولکشور کانپور ص ۴۴)

۳۔ جناب رسالتمآبؐ کے انتقالِ پرملال پر جناب ام المومنین حضرت عائشہؓ و دیگر زنانِ صحابہؓ نے ماتم کیا اور اپنا سر و سینہ پیٹا۔ (مسند احمد حنبل جلد ۶۔ ص ۲۷۴)

۴۔ جب آنحضرتؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کو پیغام پہنچا دیں کہ آج میں خود مسجد میں نہ آؤں گا تو بلالؓ سر پیٹتے ہوئے، فریاد کرتے ہوئے، گھر سے باہر نکلے۔ "پس بیرون آمد بلالؓ دست بر سر زنان و فریاد کناں"۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم ذکر گذاردن نماز حضرت ابوبکرؓ در مرض رسولؐ مطبوعہ نولکشور کانپور۔ ص ۲۴)

۵۔ جب جنگِ احد میں آنحضرتؐ کے قتل کی غلط خبر بواسطہ شیطان مشتہر ہوگئی اور مدینہ تک جا پہنچی تو زنانِ ہاشمیہ پر اس کا سخت اثر ہوا یہاں تک کہ جناب فاطمۃ الزہراؑ سر پیٹتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے:-

"جناب فاطمہ زہراؑ چوں ایں آواز شنید، دست بر سر زنان از خانہ بیروں دوید"۔

(مدارج النبوۃ ج ۲۔ ص ۱۶۳)

۶۔ علامہ ابن خلدون حضرت عائشہؓ کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ کے انتقال فرمانے کی خبر سن کر حضرت عمرؓ اس قدر وارفتہ ہو گئے کہ مسجد نبوی میں جاکر اعلان کیا کہ جو شخص کہے گا کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی میں اس کو قتل کر دوں گا لیکن جب حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور انہوں نے آیہ کریمہ ۔" وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ .... الخ " تلاوت فرمائی تو حضرت عمرؓ لڑکھڑا کر زمین پر گر

پڑے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ خود ارشاد فرماتے ہیں: "جب میں نے ابوبکرؓ کو یہ آیت پڑھتے سنا تو میرے پاؤں مجھے سنبھال نہ سکے اور میں زمین پر گر گیا اور معلوم ہوا کہ رسولِ خدا نے رحلت فرمائی ہے۔"

قَالَ عمر فما هو الا ان سمعتُ ابا بكر يتلوها فوقعت الى الارض و ما تحملني رجلائي وعرفت انهٗ قد مات۔" (البقیۃ الجزء الثانی من تاریخ ابن خلدون مطبوعہ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۴ھ۔ ص ۶۳)

پس ثابت ہوا کہ اظہارِ غم کی آخری صورت جس میں انسانی اعضاء و جوارح میں تحرک پیدا ہو جاتا ہے فطری ہے اور حضرت عمرؓ جیسی جابر و با تمکنت ہستی بھی فطرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ البتہ یہ دردناک کیفیت انتہائی درد و غم کے موقع پر ہی رونما ہوتی ہے۔

گریہ و سینہ زنی متحد الاصل ہیں

گزشتہ بحث کے دوران یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ سینہ زنی و گریہ کی حقیقت ایک ہی ہے۔ ہر دو اظہار غم کے دو مختلف درجے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے فطرت کے عین مطابق ہیں۔ بعض اطباء کا خیال ہے کہ جب کسی شخص پر کوئی ناگہانی صدمہ آتا ہے تو اس کو رو لینا چاہیے کیونکہ رونے سے طبیعت ہلکی ہو کر قدرے تسکین ہو جاتی ہے۔ رونے کو ضبط کرنے کی کوشش ایک خلافِ فطرت عمل ہے اور اس سے کسی مہلک مرض میں مبتلا ہونے کا قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے روزمرہ کے تجربات و مشاہدات اس امر کے گواہ ہیں کہ رونا اظہارِ غم کا ایک قدرتی و فطری طریق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کتابِ زندگی کا کوئی باب غم و الم کے نقوش سے خالی نہیں ہے ؎

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی　　اشک بھی دامن میں رکھتا ہے سحابِ زندگی

ہے الم کا سورہ بھی جزو کتابِ زندگی موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ایک پتی بھی اگر کم ہو تو وہ گُل ہی نہیں جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں (اقبالؒ)

چونکہ زندگی و غم لازم و ملزوم ہیں اس لئے زندگی میں غم سے نجات محال ہے۔
جب غم سے چھٹکارا محال ہے تو اظہارِ غم پر بھی انسان قدرتاً مجبور ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

انسان عالمِ کون و فساد میں رہتے ہوئے دائمی اطمینان و قلبی سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ جب غم اٹل ہے تو اظہارِ غم فطرتاً ناگزیر ٹھہرا۔ طریقِ اظہارِ غم کی نوعیت کے مطابق ہو گا۔ اگر شدّتِ غم ہے تو اس کا اثر بھی انسانی اعضاء و جوارح پر شدید ہو گا لہٰذا طریقِ اظہار بھی شدّت پذیر ہو گا۔ اور مندرجہ بالا درجات کی آخری صورت رونما ہو گی جس کو سینہ زنی و سینہ کوبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دل کی ممتاز حیثیت اور دل کا گریہ سے تعلق

انسانی جسم میں دل، دماغ اور جگر ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور طبّی اصطلاح میں اعضائے رئیسہ کہلاتے ہیں۔ ہر ایک کی کارکردگی کو اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو لازماً کہنا پڑتا ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین ترکیب سے کی گئی ہے اور وہ احسن تقویم کی جیتی جاگتی تصویر اور عملی تفسیر ہے۔ طبّی نقطۂ خیال سے انسانی زندگی میں دل کو ایک اہم و منفرد مقام حاصل ہے۔ دورانِ خون کے نظام کا دار و مدار محض دل کی حرکت پر قائم ہے۔ اگر دل کی حرکت ایک لمحہ کے لئے رک جائے تو انسانی زندگی کا فوراً خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح ظاہراً انسانی زندگی کا قیام محض دل کی حرکت پر ہے اسی طرح روحانی زندگی کا ارتقاء دل کی طہارت، پاکیزگی اور

قدسیت سے وابستہ ہے ؂

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

یہ ایک شاعرانہ تخیّل ہی نہیں بلکہ خود قرآنِ حکیم اس حقیقت کی پُرزور تائید کرتا ہے کہ انسان کی ساری کائناتِ حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ (الحج ۴۶)

یقیناً ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ وہ دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہیں۔ انبیائے کرامؑ کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ تبلیغِ حق سے عوام کا تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کر کے دلوں میں تقویٰ و طہارت پیدا کرتے ہیں کیونکہ دل کی صفائی پر ہی روحانی ارتقار کی بنیادیں استوار ہو سکتی ہیں۔ دل ہی احساسات و جذبات، رحم و محبت، ہمدردی و ایثار کی قیام گاہ ہے۔ دل کو ٹھیس لگنے سے آہ و بکا، نالہ و فریاد بلند ہوتا ہے لہٰذا گریہ کا تمام تر تعلق دل ہی سے ہے۔ مرزا غالب نے اس حقیقت کی کس قدر شاندار ترجمانی کی ہے ؂

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دل پتھر اور اینٹ تو نہیں کہ جذباتِ محبت و احساساتِ غم سے عاری ہو، ایذا پہنچنے پر درد سے بھر آتا ہے اور فریاد و زاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے سفاک و ظالم کو سنگدل سے اس لئے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے دل میں رحم و محبت، ہمدردی و ایثار کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ احساسات و جذبات سے کلیتاً محروم ہوتا ہے۔ کونسا ایسا انسانی دل ہے جو غم و الم سے متاثر نہ ہو۔ دوسروں کو مصائب و پریشانی میں دیکھے اور غمگین نہ ہو۔ کسی کو دم توڑتے دیکھے اور آنسو نہ بہ

نکلیں۔ شاید کوئی قسی القلب اور پتھر کا دل رکھنے والا فرد ہو جس پر یہ فطری تاثرات بھی اثر انداز نہ ہو سکیں بلکہ ایسا دل تو پتھر سے بھی سخت تر ہے کیونکہ بسا اوقات پتھروں سے بھی پانی کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں چنانچہ خداوند عالم ایسے ہی سخت دل اور قسی القلب آدمیوں کے بارے میں فرماتا ہے :-

"ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○ (البقرہ ۷۴)

(ترجمہ) "پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے پس وہ پتھر کی مانند تھے یا اس سے بھی زیادہ سخت حالانکہ بعض پتھر تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے دراڑ سے پانی بہ نکلتا ہے اور بعض ان میں ایسے بھی ہیں جو خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں۔ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں"۔

پس قرآنِ حکیم کی روشنی میں ثابت ہوا کہ اشکباری سنگ دل اور قسی القلب کفار کی خصوصیت میں سے نہیں بلکہ گریہ و زاری جس کی ابتدا "خَشْيَةِ اللَّهِ" یعنی خوفِ خدا سے ہوتی ہے خدا ترس مومن کی شان ہے کیونکہ یہ اللہ کا ڈر ہے جو زبردست کو زیر دست پر جور و جفا کرنے سے باز رکھتا ہے اور نوعِ انسانی کی ہمدردی و محبت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ قسی القلب کافر اس لئے بے دھڑک ظلم و ستم روا رکھتا ہے اور کمزور و ناتواں کو تختہ مشقِ ستم بناتا ہے کیونکہ اس کے دل میں نہ خوفِ خدا ہوتا ہے اور نہ اس کا فردائے قیامت کی باز پرس پر ایمان۔ وہ عذابِ دوزخ کی دھمکی کو ایک مجذوب کی بڑ تصور کرتا ہے۔ پس وہ مقدس دل ہی گریہ کریگا جس میں خوفِ خدا ہے، دوسروں کی ہمدردی ہے، ایثار ہے اور فداکاری و

سرفروشی کا جذبہ موجود ہے۔

مخصوص حالات جب فطرت دل کو گریہ پر مجبور کرتی ہے

۱۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ اپنے ہادی و رہنما سے انتہائی اخلاص و محبت ہونا چاہیئے اگر مقتدی کو مقتدا سے اور معتقد کو ہادیٔ دین سے قلبی انس نہیں تو وہ اس کے قول و فعل کی تقلید نہیں کریگا۔ کیونکہ تقلید کرانے کا جذبۂ محبت مفقود ہے پس عدم اتباع سے معتقد پر ضلالت و عصیاں کا مسلط ہونا ناگزیر ہوگا۔ اعتقاد و محبت لازم و ملزوم ہیں۔ جب ہی تو قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

" اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ "۔ (الاحزاب ۶)

(ترجمہ) " نبیؐ مومنین کو ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے"۔

معتقد اپنے ہادی کی محبت میں صرف اس وقت کامل متصور ہوگا کہ جس شخص سے ہادی محبت کرنے کا حکم دے اس سے محبت کرے اور جس سے ہادی اظہارِ بیزاری کرے اس سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ اگر ایسا نہیں تو مقتدی اپنے دعویٔ محبت میں یا تو کاذب ہے یا ناقص۔ انسانی فطرت کا دوسرا تقاضا اپنی اولاد سے محبت کرنا ہے اس لئے ہادی کو بھی اپنی اولاد سے فطرتاً محبت ہوتی ہے جب ہی تو " اَلْفَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّیْ " کا ارشاد گرامی لسانِ رسالتؐ سے صادر ہوتا ہے اور آیۂ کریمہ " قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى " (الشوریٰ ۲۳) کی روشنی میں اہلِ بیتؑ سے محبت و مودّت اجرِ رسالت قرار دیا گیا۔ حضرت رسالتمآبؐ کو سبطِ اصغر حضرت امام حسینؑ سے انتہائی محبت تھی۔ یہ ایک ایسی مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جس سے کسی دشمنِ اہلبیتؑ کو بھی مجالِ انکار نہیں۔ خود جناب رسالتمآبؐ کا قول " اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ "۔

اس پر شاہد ہے پس ظاہر ہے کہ اگر ہم کو اپنے ہادیٔ دین جناب سرور دوعالمؐ سے قلبی انس ہے تو یقیناً ہم آنحضرتؐ کی مقدس اولاد سے دلی محبت رکھیں گے کیونکہ اولادِ رسولؐ جناب رسالتمآبؐ کی باغی و نافرمان نہ تھی بلکہ وہ حضورؐ کے قدم بقدم چلنے والی تھی اور جس نے کسی حال میں بھی آنحضرتؐ سے انحراف نہیں کیا۔ ہادیٔ مطلقؐ نے ہمیں بارہا وصیت فرمائی کہ قرآنِ حکیم اور عترتِ رسولؐ سے تمسک رکھو تاکہ گمراہی و ضلالت سے بچے رہو۔ اس کے باوجود اگر ہم حسینِ شہیدؑ سے محبت نہیں کرتے تو ہم اپنے ہادیٔ برحق کے دعوئٰ محبت میں یا تو کاذب ہیں یا ناقص۔ اگر (عیاذ باللہ) کاذب ہیں تو منافق ٹھیرے، اگر ناقص ہیں تو کامل الایمان نہ ہوئے۔ پس اگر ہمیں رسولِ خداؐ سے قلبی انس و محبت ہے تو ہم فطرتاً مجبور ہیں کہ مصائبِ حسینؑ پر گریہ و بکا کریں۔ (فَافْهَمْ فَتَدَبَّرْ)

۲۔ مظلوم سے اُنس و ہمدردی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ ہر فرد بشر قسی القلب ظالم کے سوا اس صفت سے متصف ملے گا۔ ماسوائے ظالم ہر انسان مظلوم سے ہمدردی رکھتا ہے اور ظالم سے نفرت کرتا ہے کیونکہ مظلوم سے نفرت اور ظالم سے محبت خود ظالم ہونے کی دلیل ہے جب ہی تو زبانِ قدرت پکارتی ہے "لَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ہود ۱۱۳) ہرگز ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنہوں نے کسی پر ظلم کیا ورنہ تم بھی ان کے نتیجہ ظلم میں شمار ہوکر واصل جہنم ہو جاؤ گے۔ "وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔" (الشوریٰ ۸) ظالم کا کوئی مددگار اور شفیع نہیں ہو سکتا۔ "بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"۔ (لقمان ۱۱) بلکہ ظلم کرنے والے صاف صاف گمراہی میں ہیں اور راہِ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔ "فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ" (انعام ۶۸) اس نصیحت کے بعد تمہیں ظالموں کی ہم نشینی اختیار نہیں کرنا چاہئے۔

کیونکہ: "وَمَنْ أَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ" جو کسی قوم کو دوست رکھے وہ بھی ان ہی میں سے ہے۔ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (ہود-۴۴) قوم ظالمین رحمتِ خدا سے دور ہے۔ نہ ان کی توبہ قبول اور نہ ان کی شفاعت منظور ہے مَأْوَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ (آل عمران ۱۵۱) بلکہ ٹھکانہ ان کا جہنم ہے اور ظالموں کے رہنے کی جگہ بہت بری ہے۔

قرآنِ حکیم کی ان واضح ہدایات کی موجودگی میں اگر ہمیں حسینؑ مظلوم سے محبت نہیں تو ہمارا شمار (العیاذ باللہ) یزید علیہ ما علیہ کے دوستوں و حامیوں میں ہوگا اور ہمارا ٹھکانہ بھی ~~قرب~~ یزید کے جوار ہی میں ہوگا۔

۳۔ غمگین و مصیبت زدہ سے ہمدردی فطرتِ انسانی میں داخل ہے غمگین و حزیں کو دیکھ کر انسان غم سے متاثر ہو جاتا ہے۔ رونے والے کو دیکھ کر اکثر انسان رونے لگتا ہے۔ اگر روتا نہیں تو ہنستا بھی نہیں۔ اظہارِ غم کرتا ہے اور غمگین و حزیں کا مضحکہ نہیں اڑاتا لیکن جفا کار ستم پیشہ اس فطری اصول سے مستثنیٰ نظر آئیگا۔ اگر ہم انسان ہیں اور لباسِ انسانیت میں درندے اور وحوش نہیں تو ہم مصائبِ حسینؑ پر گریہ کریں گے۔ اگر گریہ نہ کریں گے تو کم از کم مصائبِ حسینؑ پر گریہ و بکا کرنے والوں کا مضحکہ تو نہیں اڑائیں گے۔

۴۔ حالات مخالف ہونے اور محبوب شے سلب یا مفقود ہونے پر حزن و ملال اور گریہ و بکاء فطری ہے۔ نہ حالاتِ انسانی اختیار میں ہیں اور نہ یہ جذبات و احساسات فطری اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ دل دکھے گا تو آنسو ضرور نکلیں گے اور غم ہلکا ہوگا۔ وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا (النجم ۴۳-۴۴) بیشک اسی خدا نے ہنسایا اور رولایا، اور وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ (الملک-۲) موت و حیات اسی نے پیدا کی ہے اور رونا ہنسنا بھی

اسی نے بنایا ہے اور یہ صفات انسان میں خلق کی ہیں بلکہ جس طرح موت، حیات پر مقدم ہے اسی طرح رونا ہنسنے پر مقدم ہے۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ لا وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ لا وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ

(النجم ۵۹--۶۰) کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو اور اس پر ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور تم غافلین میں سے ہو"

پس دلِ بیدار کبھی گریہ سے خالی نہیں رہ سکتا۔ جو گریہ سے خالی ہے وہ اَنْتُمْ سَامِدُوْنَ کا مصداق ہے اور غفلت شعار ہے ۔

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب کاری ہے نہ میری ضرب کاری ہے

رونا منافی صبر نہیں

بعض تنگ نظر حضرات جو حقائق صحیفۂ فطرت کا سطحی نظر سے مطالعہ کرتے ہیں، نہ صرف سینہ کوبی و نوحہ خوانی ہی کو خلافِ شرع تصور کرتے ہیں بلکہ رونے کو بھی صبر کے منافی سمجھ کر غمِ حسینؑ میں گریہ و بکاء کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ یہ مغالطہ محض صبر کے مفہوم کو غلط سمجھنے پر پیدا ہوا ہے لہٰذا اس کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

صبر کے معنی کسی ناپسندیدہ امر کے برداشت کرتے وقت، دماغی توازن قائم رکھتے ہوئے ثابت قدمی کا ثبوت دینا اور خلافِ فطرت حرکات سے اجتناب کرنا ہے تاکہ عقل کی نگاہ میں فاعل کے افعال قابلِ مذمت نہ ہوں۔ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ صرف مصائب و آلام میں استقامت کا نام صبر ہے۔ حالانکہ جیساکہ اس تعریف سے پتہ چلتا ہے کہ صبر کا تعلق ہر اس امر سے ہے جو ناپسندیدہ ہو خواہ اس کا واسطہ قوت غضبیہ سے ہو خواہ قوتِ شہوانیہ یا قوتِ عاقلہ سے۔ ان تینوں قوتوں

میں فضائل کے جو پہلو نکلتے ہیں ان میں فی الحقیقت صبر ہی کارفرما ہوتا ہے۔

قوت غضبیہ کا محل استعمال

ایسے مہلکوں میں جہاں قوتِ غضبیہ کا مظاہرہ ہوتا ہے اگر دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ جائے تو یا جُبن و بزدلی پیدا ہوگی اور انسان کے پائے استقامت میں لغزش آئے گی اور وہ میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ نکلے گا یا تہوّر کا مظاہرہ ہوگا۔ انسان دماغی توازن کھو کر بے سمجھے بوجھے مہلکہ میں پل پڑے گا اور نادانستہ طور پر اپنی ہلاکت کا سبب بن جائیگا۔ اگر صبر و سکون سے کام لے کر قوتِ غضبیہ کو حدِّ اعتدال کے ساتھ استعمال کرے گا تو شجاعت کا مظاہرہ ہوگا اور وہ شخص شجاع کہلائے گا اگر قوتِ غضبیہ کے استعمال کا محل ہی نہیں اور اختیاراً اس قوت کو معطل کر کے غیظ و غضب کو پی جائیگا تو حلم و بردباری کا مظاہرہ ہوگا جس کو "کظمِ غیظ" کہتے ہیں اور اس صفت سے متصف حلیم و کاظم کہلائے گا۔

قوت شہوانیہ کا محل استعمال

خواہشِ لباس و طعام، آرزوئے جاہ و حشم اور حرصِ مال و منال کا تعلق قوتِ شہوانیہ سے ہے۔ اگر اس میں انسان صبر سے کام نہ لے تو جائز و ناجائز کا امتیاز جاتا رہے گا اور انسان نہ جانے کتنے گناہوں اور بداخلاقیوں کا ارتکاب کرے گا یا تو حریص و بخیل بن کر جائز و ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرنے کی سعی کرے گا رشوت و سود خواری سے غربا کا خون تک چوس لے گا یا دولت کے بیجا اسراف سے عیاشی میں مبتلا ہو کر "اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ" کا تمغہ حاصل کرے گا اور قوم و ملت کے لئے ننگ و عار بن جائیگا۔ اگر صبر سے کام لیا یعنی نفسانی خواہشات پر قابو پا کر جائز سے فائدہ اٹھایا اور ناجائز سے پرہیز کیا

تو عفت کا مظاہرہ ہوگا اور وہ شخص عفیف کہلائے گا اگر جائز کے ترک پر بھی صبر کیا اس سے کہ روزِ قیامت زیادہ حساب نہ دینا پڑے اور امکانِ گناہ کم ہو جائے تو یہ زہد کی منزل ہوگی اور وہ شخص زاہد کہلائیگا۔ اگر جائز کو ترک کر کے خود اپنی ذات پر تکلیف برداشت کی تاکہ دوسروں کو آرام پہنچایا جائے تو یہ سخاوت و ایثار کی منزل ہوگی۔ وہ شخص سخی و موثر کہلائے گا۔

قوتِ عاقلہ کا محلِ استعمال

مشکلات کے حل پر غور و تدبّر کرنے کا تعلق قوتِ عاقلہ سے ہے۔ اگر اس موقع پر ہم صبر سے کام نہیں لیتے تو اپنی بیجا قیاس آرائی کے باعث کفر و ضلالت میں جا پڑیں گے یا جہالت کی بنا پر دینی مسائل کو سمجھنے سے قاصر اور راہِ مستقیم سے ہٹے رہیں گے۔ بفرضِ محال صراطِ مستقیم پر گامزن بھی ہوئے تو محض چند قدم چلنے کے بعد فقدانِ شعور کی وجہ سے پھر بھٹک جائیں گے لیکن اگر صبر سے کام لیا اور قوتِ عاقلہ کو اس کے جائز حدود کے اندر رکھ کر تدبّر کیا تو ہم مشکلات پر قابو پا لینے کی راہ تلاش کرلیں گے اور مذہبی امور میں خدا و رسولؐ کے بتائے ہوئے اصول پر عمل پیرا ہو کر فلاح و نجات کی راہ پالیں گے۔ ایسے امور (یعنی حقیقتِ خدا، حقیقتِ رسولؐ اور حقیقتِ حشر و نشر جن کا تعلق محض عقائد سے ہے) جہاں قوتِ عاقلہ کا محلِ استعمال ہی نہیں اور ہمارا شعور و ادراک قاصر ہے۔ ہم بلاچون و چرا حکمِ خدا و رسولؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں تو یہ ایمان کی منزل ہے۔ افراط و تفریط سے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ اسلام کا راستہ اعتدال و میانہ روی ہے صبر متذکرہ بالا قوائے کو اعتدال سے استعمال کرنے کا نام ہے۔

ان تینوں قوتوں کے تحت جتنے بھی فضائلِ نفسانی پیدا ہوتے ہیں وہاں صبر

ہی کارفرما ہوتا ہے اور جہاں جہاں رذائلِ نفسانی ملیں گے وہاں یاتو فقدانِ صلاحیت ہوگا یا فقدانِ صبر۔ بغیر صبر کے نہ ایمان و اسلام کامل ہے، نہ فضائل و حسنات حاصل ہو سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا حقائق سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ صبر کا محل صرف مصائب و آلام ہی نہیں بلکہ میدانِ قتال و جدال، خزانہ زر و مال اور مسندِ جاہ و جلال بھی ہے اور یہ کہ صبر کی ضد آنسو بہانا یا رونا نہیں بلکہ موقع و محل کے سے صبر کی ضدیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً مصائب و آلام میں صبر کی ضد دماغی توازن کا قائم نہ رہنا، خوف کھانا اور خداو تقدیر کی شکایت شروع کر دینا۔ میدانِ قتال میں صبر کی ضد فرار یا تہور ہے اور صبر سے کام لینا شجاعت ہے۔ محلِ خواہشات میں صبر کی ضد حرص و طمع ہے اور صبر کرنا عفت۔ زر و مال میں صبر کی ضد بخل و اسراف ہے اور صبر کرنا سخاوت۔ احکامِ الٰہی میں صبر کی ضد سرکشی و نافرمانی ہے اور ان کی پابندی میں صبر کرنا طاعت و عبادت، منہیاتِ الٰہی میں صبر کی ضد عصیان و گنہگاری ہے اور ان کے ترک پر صبر کرنا تقویٰ و پرہیزگاری۔ لہٰذا یہ کہنا کہ صبر کی ضد رونا ہے بالکل غلط ہے۔ اشک ریزی خلافِ فطرت نہیں ہے اس لئے یہ صبر کی ضد نہیں لہٰذا رونا منافیِ صبر نہیں۔

مصائب و نوائب کا مقابلہ ثابت قدمی و پامردی سے کرنے کا نام صبر ہے۔ صبر ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ہم شدائد کا سامنا کرتے ہوئے اپنے نصب العین سے سرِمو تجاوز نہ کریں اور اس اصول کے تحفظ و بقا کے لئے جس کی حقانیت کے ہم دعویدار ہیں، جانِ عزیز نثار کر دیں لیکن ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ صبر کی حقیقی تشریح یہی ہے جس کی مجسم شکل و صورت کربلا کے خارزار میں، تیروں کی بارش میں امام عالیمقامؑ نے پیش کی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی آیۂ کریمہ "رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا" (البقرۃ ۲۵۰) کے تحت صبر

کے معنی استقامت و ثابت قدمی ہی لیتے ہیں۔ اور اسی طرح آیہ کریمہ "یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا" (آلِ عمران ۲۰۰) کے ذیل میں صبر کے معنی ثابت قدمی ہی لئے گئے ہیں۔ لہٰذا عقلی و نقلی بحث کا یہ منطقی نتیجہ نکلا کہ رونا بے صبری نہیں ہے۔ اگر رونا بے صبری ہوتا تو حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کے فراق میں کیوں اس قدر فریاد و زاری کرتے کہ آنکھوں کی بصارت جاتی رہی۔ حالانکہ حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کی زندگی اور دوسری ملاقات کا قطعی علم بذریعہ وحی و الہام حاصل تھا۔

رونا ممنوع نہیں

جوازِ گریہ از آیاتِ جلی:۔ اب چند آیاتِ جلی کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے کہ کیا رونا ممنوع و بدعت ہے یا خاصانِ خدا کا شیوہ ؟

۱۔ قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا إِنَّ الَّذِینَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا یُتْلَىٰ عَلَیْهِمْ یَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَیَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝ وَیَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ یَبْكُونَ وَیَزِیدُهُمْ خُشُوعًا ۝

(ترجمہ) (اے محمدؐ! اعراب سے) کہہ دو۔ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ یقیناً وہ لوگ جن کو اس کے قبل علم دیا گیا ہے جب ان پر اس کی تلاوت کی جاتی ہے، ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں، ہمارا پروردگار پاک ہے اور ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو گیا ہے۔ وہ پیشانیوں کے بل زمین پر گرتے ہیں اور **گریہ و زاری** کرتے ہیں اس طرح انکے خشوع میں اضافہ ہوتا ہے۔ (اسرائیل ۱۰۷ تا ۱۰۹)

اللہ کے مخصوص بندے جنہیں رسالتمآبؐ کی آمد سے قبل ہی آپکی تشریف آوری کا علم بذریعہ صحائف انبیاءؑ حاصل تھا جب دیکھتے تھے کہ پروردگارِ عالم کا وعدہ

پورا ہو رہا ہے تو وہ جوش، معرفتِ حق اور شوقِ بقا کی وجہ سے سجدہ میں گر کر مصروفِ گریہ ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ان کے خشوع میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ق وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ز وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ز وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ○ (مریم ۵۸)

(ترجمہ) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے اولادِ آدم میں سے انبیاء پر انعام کیا اور اس منعم علیہ گروہ میں سے ہیں جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) چڑھالیا تھا اور ابراہیمؑ و یعقوبؑ کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت کی اور برگزیدہ کیا تھا۔ جب ان کو رحمٰن کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر کر مصروفِ **گریہ و بکا** ہوتے ہیں۔

اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ انبیاءؑ اور خدا کے ہدایت یافتہ و برگزیدہ بندوں کا یہ خاصہ ہے کہ جب قرآن حکیم کی آیات اور اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام ان پر تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ جوشِ معرفتِ حق کی وجہ سے سجدہ میں گر کر محوِ گریہ ہوتے ہیں۔

۳۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○ (مائدہ ۸۳)

(ترجمہ" جب وہ کلام اللہ کو سنتے ہیں جو رسولِ عربی پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ معرفتِ حق کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں **آنسو** جاری ہو جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے! ہم نے اس کی تصدیق کی۔ اس پر ایمان لائے اور ہم کو اس کے گواہوں میں لکھ لے۔"

آیۂ مذکور اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ معرفتِ حق کی وجہ سے عبادت گزار

عیسائی علماء کے آنسو جاری ہو جاتے تھے اور وہ دولتِ ایمان کی خوشی میں روتے تھے اور قرآنِ حکیم کی صداقت پر ایمان لاکر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے تھے۔

۴۔ وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ ۝

(التوبہ ۹۲)

(ترجمہ) لوگوں کے جہاد میں شریک نہ ہونے کا کوئی حرج نہیں۔ جو اے رسولؐ! تیرے پاس آتے ہیں کہ ان کو اپنے ساتھ لے چلو تو تم نے کہا کہ میرے پاس تمہارے لئے خرچ اور سامان نہیں، تو اس حال میں وہ اپنے گھروں کو حزن و ملال سے مڑتے ہیں کہ ان کے پاس راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ ان کی آنکھوں سے **آنسو** جاری ہو جاتے ہیں۔

یہ نادار مومنین اس حسرت و ارمان کی وجہ سے روتے تھے کہ ہائے وہ بھی صاحبِ استطاعت ہوتے اور سامانِ جہاد مہیا کر سکتے تو میدانِ شہادت اور معرکۂ جدال و قتال میں رسولؐ کی ہمراہی سے مشرف ہوتے۔ اس آرزو کے فوت ہونے پر روتے تھے کہ ہائے ہمیں یہ توفیق حاصل نہ ہوئی کہ ہم بھی رسولِ خدا کی خدمت و نصرت میں جہاد کرتے۔ ہائے اس دولت سے محروم رہ گئے۔

۵۔ وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَى عَلَى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۝ قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ۝ (یوسف ۸۴-۸۵)

(ترجمہ) اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا اے افسوس اوپر یوسفؑ کے! یعقوبؑ کی آنکھیں حزن و ملال سے سفید ہو گئی تھیں پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ بیٹوں نے کہا۔" قسم ہے خدا تعالیٰ کی تو یوسفؑ کو ہمیشہ یاد کرتا رہے گا۔ حتیٰ کہ

تو مضمحل یا ہلاک ہو جائے گا۔"

حضرت یعقوبؑ نے اپنے فرزند حضرت یوسفؑ کی جدائی میں حزن و ملال کی بناء پر اس قدر گریہ و زاری فرمائی کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی جیسا کہ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ" سے ظاہر ہے۔ ان کا غم معمولی درجے کا غم نہ تھا بلکہ انتہائی شدت کو پہنچا ہوا تھا جیسا کہ "فَهُوَ كَظِيمٌ" سے عیاں ہے۔ وہ یوسفؑ! یوسف! پکارتے پکارتے مضمحل ہو چکے تھے۔ بلکہ ہلاکت تک پہنچ چکے تھے۔ جیسا کہ "تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ" سے واضح ہے۔ پیغمبر خداؑ کا یہ سب گریہ و ملال اس الہامی علم کی موجودگی میں تھا کہ یوسفؑ بقید حیات ہیں اور دوبارہ ملاقات نصیب ہو گی جیسا کہ أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ سے نمایاں ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں اولاً یہ ثابت ہوا کہ غم و الم میں رونا پیغمبروں کی سنّت ہے۔ اور ثانیاً عام انسانوں کی طرح ہادیانِ دین کو بھی اپنی اولاد سے انتہائی محبت ہوتی ہے اور اولاد کی جدائی اور ان کے مصائب انبیاء کو ہلاکت تک پہنچا دیتے ہیں۔ اب ذرا اسی زاویۂ نگاہ سے اندازہ فرمائیے کہ جب کربلا کا دردانگیز منظر حضرت رسالتمآبؐ کے سامنے آیا ہو گا تو حضور سرورِ دو عالمؐ کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ یہ خیال نہ فرمادیں کہ آنحضرتؐ انتقال فرما چکے تھے اور کربلا کا خونیں منظر ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ذرا "يَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" (البقرہ - ۱۴۳) پر غور فرمالیں۔ اگر رسولِ خدا بچشمِ خود اپنی امت کے اعمال ملاحظ نہیں فرمائیں گے تو بروزِ قیامت خدا کے حضور کیا گواہی دیں گے؟ سماعی یا چشم دید؟ مزید برآں یہ بھی دیکھیۓ کہ یہاں حضور نبیؐ کی حیثیت بطور **شاہد نہیں** بلکہ بطور **شہید** بیان کی گئی ہے۔ نیز لفظ شہید کی وسعت و ہمہ گیری کو "إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا" کی روشنی میں دیکھیۓ۔

نفسِ مضمون کی طرف رجوع کرتے ہوئے اگر پہلے تین حوالوں کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خدا کے برگزیدہ بندے جوشِ معرفتِ حق اور شوقِ لقا کی وجہ سے مصروفِ گریہ ہوئے۔ چوتھے حوالہ میں رسولِ خدا کی معیت و ہمراہی میں جہاد و شہادت کا جذبہ کارفرما ہے اور اس آرزو کے فوت ہو جانے پر آنکھیں سیلابِ اشک بہاتی ہیں۔ پانچویں حوالہ میں اولاد کے مصائب پر رونا انبیاءؑ کی سنت ہے۔ اگر تعصب کی عینک اتار کر معترض حضرات غور فرما دیں تو وہ دیکھیں گے کہ شہدائے کربلا کے ذکر سے رونے والے ان تمام جذباتِ فطرت سے متاثر ہو کر روتے ہیں۔ اس غم میں روتے ہیں کہ ایسے نفوس پاک ہم سے جُدا ہو گئے۔ شوقِ لقا میں روتے ہیں۔ جوشِ معرفتِ حق سے روتے ہیں کیونکہ حسینی اسوۂ حسنہ حق و معرفت کے انکشاف کی بہترین مثال ہے۔ یقیناً حضرت حسینؑ کا تذکرہ حقیقی معرفتِ حق پیدا کرتا ہے۔ حسینؑ پر رونے والے اس لئے روتے ہیں کہ کاش! ہم بھی امامؑ کی مظلومیت و مصائب میں امامؑ کی خدمت و نصرت کرتے اور شہادت کے درجہ پر فائز ہوتے۔ اس شوق اور محرومی پر روتے ہیں۔ اس مظلومیت اور اس اذیت پر روتے ہیں جو خدا ناترس، سفّاک، جابر اور ظالم گروہِ اشقیاء کے ہاتھوں اہلِ بیتِ رسولؐ کو پہنچی۔

روتے ہیں مصیبت پہ حسینؑ ابن علیؑ کی
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

جوازِ گریہ از حدیثِ نبوی

اب ہم احادیثِ نبوی کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا پیغمبرِ اسلامؐ نے قولاً یا فعلاً گریہ و بکاء کو جائز قرار دیا ہے یا ممنوع ٹھیرایا ہے؟

۱۔ مشہور انگریز مؤرخ سر ولیم میور "WAILING OF HAMZA" کے تحت

حضرت صفیہؓ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"Where is my brother Hamza ?" asked Safia, eagerly of Mohamet. He would willingly kept her from the sight, but she refused to go back. So he led her to the spot. She sat down with Fatima by the body and both wailed aloud. Mohamet wept also. His spirit was stirred within him at the sight of the mangled remains of the noble dead and at the anguish of his aunt."

(Mohamet & Islam-p-117)

(ترجمہ) "میرے بھائی حضرت حمزہؓ کہاں ہیں ؟ حضرت صفیہؓ نے نہایت بیصبری و بیتابی سے آنحضرتؐ سے استفسار کیا۔ آنحضرتؐ انہیں اس منظر سے دور رہنے کے لئے رضامند کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ پس آنحضرتؐ انہیں جائے حادثہ پر لے آئے۔ جناب صفیہؓ معہ حضرت فاطمہؑ میت کے پاس بیٹھ گئیں اور دونوں نے باآوازِ بلند گریہ و زاری شروع کر دی۔ حضرت محمدؐ خود بھی ضبطِ گریہ نہ کر سکے۔ خالہ کا انتہائی رنج و غم اور معززؓ لاش کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر آپؐ کی روح تڑپ اٹھی۔"

۲۔ ابنِ سعد نے طبقات الکبریٰ میں ذکر کیا ہے کہ جناب رسول خداؐ نے مدینہ میں پہنچ کر زنانِ بنی عبدالاشہل کا رونا سنا جو اپنے مقتولین پر رو رہی تھیں۔ تو فرمایا: "افسوس! حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہیں"۔ یہ سن کر سعد بن معاذ زنانِ بنی عبدالاشہل کے پاس گئے اور ان کو درِ دولتِ نبوی پر لائے

انہوں نے وہاں حضرت حمزہؓ پر نوحہ کیا جسے سن کر حضرت نبی کریمؐ نے ان عورتوں کے لئے دعائے خیر کی اور انہیں ان کے گھروں کو واپس کردیا۔ بعد ازاں انصا کی عورتوں میں سے کوئی ایسی عورت نہ تھی جو بغیر حضرت حمزہؓ پر نوحہ کئے اپنی میت کے لئے روتی ہو۔ (طبقات الکبریٰ ابن سعد۔ ق ا۔ جلد ۳ ص ۱۰-۱۱)

۳۔ سیرۃ ابن ہشام میں مرقوم ہے :۔

"جناب رسول خداؐ انصار کے قبیلہ بنی عبدالاشہل کے گھروں میں سے ایک گھر کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے وہاں سنا کہ ان کی عورتیں اپنے مقتولین پر نوحہ و بکا کررہی ہیں۔ آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا کہ حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہیں۔ جب سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر محلہ بنی عبدالاشہل کی طرف واپس آئے تو ان دونوں نے حکم دیا کہ ان کی عورتیں سوگ کے کپڑے پہن کر جائیں اور حمزہؓ عم رسولؐ پر نوحہ و بکا کریں۔

اسی واقعہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے :۔

سیرت النبی مولانا شبلی نعمانی۔ جلد اوّل۔ ص ۲۸۳۔ البلاغ المبین۔ ص ۶۰۱-۶۰۲۔

مدارج النبوت۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ جلد دوئم۔ ص ۱۸۲۔

معلوم نہیں کہ محمود عباسی اور ان کے ہم خیال حضرات جو امام حسینؑ پر گریہ و بکا کو بدعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ جناب رسول خداؐ کے اس طرزِ عمل کو کس نظر سے دیکھیں گے اور اس پر کیا نکتہ چینی کریں گے۔؟

۴۔ اسی قسم کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں روایت کیا گیا ہے۔ جنگ موتہ میں جب اہلِ اسلام کفار کے ساتھ نبرد آزما ہوئے تو جناب رسالتمآبؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ قدرت نے آپ کے سامنے سے حجاب اٹھا دیئے اور آپ جنگ کا معائنہ فرمانے لگے۔ دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ کہ زید بن حارثہ نے علم لیا اور

شہید ہو گئے۔ وہ جعفرؓ نے علم لیا اور شہید ہو گئے۔ ابن رواحہ نے علم اٹھایا اور شہید ہو گئے۔ یہ فرماتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔
(بخاری جلد اول ص ۱۶۷۔ مطبع احمدی۔ مدارج۔ جلد ۲۔ ص ۴۱۷)

۵۔ صحیح بخاری کا دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمائیے جس کو مقتدر سنی عالم مولینا مناظر احسن گیلانی نے اپنے مقالہ "شہادتِ حسنیٰ" میں نقل فرمایا ہے :۔

"جب ابراہیم ابن رسول اللہؐ پر عالمِ نزع طاری ہوا تو سرورِ کائناتؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوف نے دریافت کیا کہ "وَاَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ"۔ "آپ یا رسول اللہ روتے ہیں!" آپ نے ارشاد فرمایا۔ "انہا رحمۃ" (یہ رحم اور ترس ہے)۔ اتنا فرمایا تھا کہ پھر آنکھوں سے دوسرا سلسلہ جاری ہوا۔ حضورؐ روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ "آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ دل غمناک ہے اور ہم نہیں کہتے لیکن وہی جو ہمارے رب کی مرضی ہو۔" (داستانِ کربلا۔ نفیس اکیڈمی۔ حیدرآباد دکن۔ ص ۱۹۰)

۶۔ رسولِ خداؐ کی وفات پر امہات المومنین کا ماتم کرنا اور حضرت عائشہؓ کا بالخصوص سینہ زنی کرنا مؤرخ طبری نے شرح و بسط سے روایت کیا ہے اور یہی واقعہ مسند امام احمد حنبل۔ جلد ۶۔ ص ۲۷۴۔ میں بالتفصیل مذکور ہے لیکن محمود عباسی کے ہم نوا حضرات کی مزید تشفی کے لئے انگریز مؤرخ سر ولیم میور کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے :۔

"His head grew heavy on the breast of Ayesha. the Prophet of Arabia was no more. softly removing his head from her bosom, Ayesha placed it on the pillow. Then she rose and joined the other women, as they

beat their faces in loud and bitter lamentation.

(Mohammet and Islam p-232)

"آپ کا سر عائشہ رض کے سینہ پر گراں ہوچکا تھا۔ پیغمبر عرب ؐ انتقال فرما چکے تھے۔ عائشہ رض نے آہستگی کے ساتھ آپ کا سر اپنے سینہ سے جدا کر کے بالین پر رکھا۔ پھر اٹھیں اور ان عورتوں میں شامل ہوگئیں جو شدّتِ ماتم میں نوحہ و بکا کرتے ہوئے اپنا منہ **پیٹ** رہی تھیں۔"

حضرت عائشہ رض کی سینہ زنی کو مشہور حدیثِ نبوی "خُذُوا شَطرَ دِینِکُم عَن الحمیراء"۔ (اپنے دین کا نصف حضرت عائشہ رض سے سیکھو۔ النہایہ ابن الاثیر) کی روشنی میں دیکھئے اور پھر فیصلہ دیجئے کہ کیا غمِ حسین ؑ میں سینہ زنی ممنوع و بدعت ہے؟

۷۔ حضرت ابوبکر رض کی وفات پر جناب عائشہ رض کا ماتم برپا کرنا تاریخ الامم والملوک میں بالتفصیل مذکور ہے۔

۸۔ حضرت عمر رض کی میت پر حضرت حفصہ رض کا نوحہ و بکاء کرنا بخاری کتاب فضائل الاصحاب میں درج ہے۔ بعض شارحین نے تو وہ بَین بھی درج کئے ہیں جو حضرت حفصہ رض نے اپنے والد محترم کی شان میں ارشاد فرمائے۔

۹۔ حضرت عثمان رض کی شہادت پر حضرت نائلہ رض کی چیخ و پکار تمام کتب تواریخ میں درج ہے۔ جناب عثمان کے خون آلودہ کرتہ کو دیکھ کر دمشق میں مہینوں ماتم ہوتا رہا اور حضرت علی ؑ کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر اُکسایا جاتا رہا۔ یہ تمام کچھ بدعت نہیں اور نہ ہی ممنوع ہے۔ صرف حسین مظلوم ؑ کا ماتم بدعت ہے:۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

جوازِ گریہ از کتابِ مقدس (بائیبل: نیا و پرانا عہدنامہ)

۱۔ حضرت ابراہیم ؑ نے سارہ کی موت پر ماتم و نوحہ کیا۔ (پیدائش ۲۳:۲)

۲۔ حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کی جدائی میں پیراہن چاک کیا، کمر سے ٹاٹ لپیٹا اور کئی دنوں تک بیٹے کا ماتم کرتے رہے۔ (پیدائش ۳۷: ۳۴)

۳۔ روبن نے یوسفؑ کے ماتم میں پیراہن چاک کیا۔ (پیدائش ۳۷: ۲۹)

۴۔ مصر میں یعقوبؑ کی موت پر ستر دن تک ماتم ہوتا رہا (پیدائش ۵۰: ۳)

۵۔ یوسفؑ نے سات دن اپنے باپ کا ماتم کرایا۔ (پیدائش ۵۰: ۱۰)

۶۔ یشوع نے کپڑے پھاڑے اور سر پر خاک ڈالی۔ (یشوع ۷: ۶)

۷۔ ایوبؑ نے پیراہن چاک کیا اور سر منڈایا۔ (ایوب ۱: ۲۰)

۸۔ ایوبؑ کے غم میں اسکے دوستوں نے پیرہن پھاڑے اور ماتم کیا۔ (ایوب ۲: ۱۲)

۹۔ یرمیاہ نے نوحہ کیا۔ (یرمیاہ ۷: ۲۹)

۱۰۔ سموئیل کی موت پر نوحہ کیا گیا۔ (سموئیل ۱: ۲۵: ۱)

۱۱۔ داؤدؑ نے ساؤل اور یونتن پر مرثیہ کے ساتھ ماتم کیا۔ (سموئیل ۲: ۱: ۱۷)

۱۲۔ داؤدؑ کے حکم سے ابیز کی موت پر لوگوں نے کپڑے پھاڑے، ٹاٹ پہنے اور ماتم کیا اور داؤدؑ نے خود مرثیہ کہا۔ (سموئیل ۲-۳: ۳۱: ۳۳)

۱۳۔ عذرا نے گریبان پھاڑا اور بال نوچے۔ (عذرا ۱۰: ۷)

۱۴۔ عذرا نے ماتم کیا۔ (عذرا ۱۰: ۷)

۱۵۔ ماتم کرنے والوں کو سرفرازی ملتی ہے۔ (ایوب ۵: ۱۱)

بخوفِ طوالت بائبل کے ان پندرہ حوالوں پر بمصداق مشتے از خروارے اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان حوالوں سے صاف عیاں ہے کہ مصائب و آلام میں گریہ و زاری خاصانِ خدا کا شیوہ ہے اور انبیاءؑ کی سنت رہی ہے۔ ان بزرگ ہستیوں نے بھی ماتم میں کپڑے پھاڑے، بال نوچے، سر پر خاک ڈالی اور بعض نے نوحہ خوانی بھی کی۔ حضرت داؤدؑ نے ابیز کی موت پر صرف ماتم ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جنازہ کی قیادت

بھی کی اور مرثیہ بھی کہا۔

میت پر رونا حرام نہیں

بعض کم فہم لوگ جو بکاء علی الحسینؑ کو ممنوع قرار دیتے ہیں اپنے خیال کی تائید میں بیان کرتے ہیں کہ میت پر رونا حرام ہے کیونکہ رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔

نہ ہی میت پر رونا حرام ہے اور نہ یہ منافی صبر ہے بلکہ خاصانِ خدا کا شیوہ ہے۔ جیساکہ عقلاً و نقلاً ثابت کیا جا چکا ہے۔ اگر میت پر رونا حرام ہوتا تو جناب رسالتمآبؐ اپنے چچا حضرت حمزہؑ اور حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت پر کیوں گریہ و زاری فرماتے اور اپنے بیٹے ابراہیمؑ کی وفات پر کیوں روتے ؟ رسول خداؐ کا کوئی قول و فعل حکم خدا کے خلاف نہیں ہوتا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم۔۳۔۴) رسولؐ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وہ تو وہی کچھ ارشاد فرماتے ہیں جو ان کو وحی کیجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ فعل نبی و سنتِ رسولؐ کے مطابق معترض حضرات کا قول بالکل بے وزن، بے حقیقت اور بے معنی ہے لیکن پھر بھی سوال یہ ہے کہ آخر یہ اعتراض کیونکر پیدا ہوا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ بخاری کی ایک روایت سے عوام میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔

"حضرت عمرؓ نے صہیب سے کہا کہ تم رو رہے اور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ میت پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ ابن عباسؓ نے یہ ذکر حضرت عائشہؓ سے کیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ خدا رحم کرے عمرؓ پر۔ واللہ رسول خداؐ نے مومن کے باب میں یہ نہیں فرمایا۔ ہاں کافر کی میّت کے باب میں ایسا ارشاد کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے بیان کی تائید میں آیۂ کریمہ "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔" (انعام ۱۶۵) تلاوت فرمائی۔ "ایک پر دوسرے کا بوجھ نہیں ڈالا جائیگا۔"

حضرت عمرؓ کا مفروضہ ارشاد رسولِ اکرمؐ کے قول و فعل کے قطعاً منافی ہے کیونکہ اس کی تردید خود عملِ رسولِ خداؐ سے ہوتی ہے جو آنحضرتؐ نے حضرت حمزہؓ کی شہادت اور واقعہ موتہ کے سلسلہ میں انجام دیا اور حضرت عائشہؓ کا استدلال اس لئے تعجب خیز ہے کہ جب مومن کی میت پر اس کے اہل و عیال کی گریہ و زاری سے میت پر عذاب کا نزول آیۂ کریمہ "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" کے منافی ہے تو کافر کی میت کے باب میں کیوں یہی چیز نصِ مذکور کے خلاف نہیں؟ کیا ایسا کرنا عدلِ خداوندی کی شان کے منافی نہیں کہ مومن کی میت پر اس کے اہل کی گریہ و زاری میت کے لئے موجب عذاب نہ ہو۔ لیکن اگر کافر کی موت پر اس کے اہل روئیں تو اس کی سزا میت کو ملے۔ یہ ایک ایسا عجیب منطق ہے کہ دورِ حاضرہ کا دماغ اس کو بآسانی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر میت پر رونا فی الواقعہ کوئی جرم ہے تو اس کی سزا رونے والے کو ملنی چاہیئے نہ اس شخص کو جو مرچکا ہے اور اس کو پسماندگان پر کسی قسم کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔ وہ تو گویائی سے بھی معذور ہے کہ ان کو رونے سے منع کر دے۔

بہرکیف ان دلائل و حقائق کی موجودگی میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ روایت زمانۂ مابعد کی پیداوار ہے اور اموی دورِ خلافت میں حدیث سازی کی فیکٹری میں محض اس لئے وضع کی گئی ہے کہ اس کی آڑ لے کر ذکرِ حسینؑ ممنوع قرار دیا جائے اور واقعاتِ کربلا پر ایک دائمی نقاب پڑا رہے اور مجرمین کے کرتوت عوام کی نگاہ سے پوشیدہ رہ سکیں۔ اس بناء پر روایت کو خواہ مخواہ حضرت عائشہؓ و حضرت عمرؓ کی معرفت جناب رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے تاکہ عوام حضرت عائشہؓ و حضرت عمرؓ کے بلند مراتب کی بنا پر اس کو سچا سمجھ لیں۔

بفرضِ محال اگر اس روایت کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بیان

سے جناب رسالتمآبؐ کا مقصد صرف یہ تھا کہ آنحضرتؐ نے ان نو مسلموں کو ان کے کفار یا منافقین باپ، بھائی، دیگر اعزہ و اقربا کی موت پر رونے سے منع کیا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین و اعدائے اسلام کی موت پر رونا ان سے محبت کی علامت ہے اور ان سے محبت یا اظہار محبت خلاف حکم خدا اور خلافِ حبِّ رسولؐ ہے اس لئے جائز نہیں۔ کسی کی مصیبت یا موت پر اسی وقت کوئی روتا ہے جب رونے والے کو اس مصیبت زدہ یا متوفی سے کوئی قلبی لگاؤ اور محبت ہو یا کم از کم اس سے کسی منفعت کی امید رہی ہو جو منقطع ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں کسی کافر یا منافق کی موت پر آنسو بہانا جو اسلام کا دشمن رہا ہو جائز نہ تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو اس کی ممانعت کی گئی مگر کسی مومن کی میت پر رونا، چونکہ اس مومن سے محبت کی علامت ہے اور قلبی لگاؤ کی دلیل ہے، جائز تھا اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسے مواقع پر خود بھی گریہ فرمایا مثلاً شہادتِ حمزہؓ اور واقعہ موتہ وغیرہ۔ مگر کوتاہ اندیش اس فرق کو نہ سمجھ سکے اور رسولِ خداؐ کے قول و فعل میں انہیں تضاد نظر آنے لگا کہ کہیں تو رسولِ خداؐ شہدائے احد و موتہ پر خود گریہ فرما رہے ہیں اور کہیں حکم دے رہے ہیں کہ میّت پر گریہ مت کرو کیونکہ رونے سے میّت پر عذاب ہوتا ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق (اقبالؒ)

حسینِ مظلومؑ کا ماتم بدعت نہیں

امام حسینؑ کی شہادت تاریخِ عالم کا معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس شہادت کے پردہ میں اسلام کی بقاء اور ارتقاء کا راز مخفی تھا۔ اس ہولناک واقعہ کی خبر قریب

قریب تمام انبیائے کرامؑ کو پہنچائی گئی تھی۔ یہ ایسا اہم و واجب التعظیم امر تھا کہ ہر ایک نبی نے اس کی نسبت پوری ہمدردی اور مکمل خلوص کا اظہار فرمایا۔ اس دردبھری مصیبت کو یاد کر کے اولوالعزم رسلؑ بھی روئے اور آئمۃ الطاہرینؑ و بزرگانِ دین گریہ وزاری فرماتے رہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں حسین مظلومؑ کا ماتم بدعت نہیں۔

غمِ حسینؑ میں حضرت آدمؑ کا ماتم

حضرت آدمؑ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے پر جب پریشان خاطر ہوئے تو آپ کو چند کلمات تعلیم کئے گئے جن کے طفیل آپ کو کھوئے ہوئے مراتب دوبارہ حاصل ہوئے۔ چنانچہ آیۂ کریمہ "فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝ (البقرۃ ۳۷) میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(ترجمہ) "پس آدمؑ کو اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات ملے (جن سے) خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

ایک روایت کے مطابق وہ کلمات یہ تھے: یَا حَمِیْدُ بِحَقِّ مُحَمَّدٍؐ وَ یَا عَالِیُ بِحَقِّ عَلِیٍّؑ وَ یَا فَاطِرُ بِحَقِّ فَاطِمَةَؑ وَ یَا مُحْسِنُ بِحَقِّ الْحَسَنِؑ وَالْحُسَیْنِؑ وَ مِنْكَ الْاِحْسَانُ تُبْ عَلَیَّ۔" حضرت آدمؑ نے خدا کو ان کلمات کی سوگند دی۔ جب امام حسینؑ کا نام آیا تو حزن و ملال کی آگ دل میں بھڑک اٹھی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جبرئیلؑ سے مخاطب ہوئے کہ کیا وجہ ہے جب میں نے پانچواں نام لیا ہے تو میرا دل پاش پاش ہو گیا ہے اور آنکھیں اشکبار ہونے لگی ہیں؟ جبرائیلؑ نے کہا کہ آپ کا یہ فرزند ایسی مصیبتِ عظیم میں مبتلا ہو گا کہ دنیا کے تمام مصائب اس کے مقابلہ میں

بیچ ہیں۔ وہ بھوکا پیاسا، یکہ و تنہا، بے یار و مددگار عالم مسافرت میں قتل کیا جائیگا۔ حضرت آدمؑ نے واقعہ کربلا کی جب تفصیلات سنیں تو بذاتِ خود و جبرائیلِ امینؑ سوگوار عورت کی طرح مصروفِ گریہ و بکاء ہوئے۔
(ناسخ التواریخ بحوالہ دُرِ ثمین)

غمِ حسینؑ میں حضرت نوحؑ کا ماتم

جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ پروردگارِ عالم نے طوفانِ نوحؑ کے موقع پر حضرت نوحؑ کو کشتی تیار کرنے کا حکم دیا تھا تو حضرت جبرئیلؑ کی رہنمائی میں کشتی تیار کی گئی۔ کشتی کو استحکام دینے و سفینۂ نجات بنانے کے لئے پانچ مخصوص میخیں دی گئیں جو پنجتنِ پاک سے منسوب تھیں۔ پہلی چار میخیں گاڑنے پر شعلۂ نور درخشاں ہوا لیکن پانچویں پر ضرب لگانے سے نور ساطع و طالع ہونے کے علاوہ آثارِ خون نمایاں ہوئے۔ جبرئیلِ امینؑ نے عرض کیا یہ **خون** ہے۔ پھر شہادتِ حسینؑ اور بدکرداری امت کی مفصل داستان سنائی جس پر حضرتِ نوحؑ نے حسینؑ کی مظلومیت پر اظہار افسوس و ہمدردی فرمایا اور قاتلانِ امامؑ پر لعنت و نفرین کی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: ناسخ التواریخ۔ جلد ششم، مطبوعہ بمبئی۔ ذبحِ عظیم ص ۔۱۱۴۔

حدیث منتخب شیخ طریحی کے مطابق کربلا کی سرزمین پر سفینۂ نوحؑ موجوں کی لپیٹ میں آگیا اور غرق ہونے کا خوف پیدا ہوا۔ جس پر خدا تعالیٰ کی وحی ہوئی اور قتلِ امام حسینؑ کی حضرت نوحؑ کو خبر دی گئی جس پر وہ انتہائی غمگین ہوئے اور قاتلانِ امامؑ پر لعنت و نفرین کی۔ اگرچہ یہ واقعہ توریت میں مذکور نہیں تاہم ساتویں مہینے (ماہِ محرم) کی سترھویں تاریخ کو اراراط کے پہاڑوں پر کشتی کا

ٹکنا مذکور ہے (پیدائش ۸ : ۲-۴) کوہِ اراراط ملک شنعار میں واقع تھا جہاں شہر بابل کی بنیاد پڑی اور اسی شہر بابل ہی سے اولادِ نوحؑ اختلافِ زبان کی وجہ سے اقطاعِ عالم میں منتشر ہوئی۔ (پیدائش ۔ باب ۱۱-۹)

پس بابل کی سرزمین میں کشتیٔ نوحؑ کا گھومنا اور طوفانی ہونا قرینِ قیاس ٹھہرا۔ کوفہ و حلّہ اسی قدیم بابل کے مقام پر آباد ہیں۔ حلّہ کے قریب بابل کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں (مراصد الاطلاع) عقرِ بابل قریب کربلائے معلّیٰ نواحی کوفہ میں جو اب ویران ہے بالکل دریائے فرات کے کنارے واقع ہے۔ پس ان حقائق کی موجودگی میں بقولِ حکیم الامت علامہ ہندی سفینۂ نوحؑ کا کربلا میں وارد ہونا اور اس کا طوفانی ہونا تاریخی حیثیت سے مستعبد نہ رہا۔ (نبیوں کا ماتم۔ ص ۲۵)

غمِ حسینؑ میں حضرت ابراہیمؑ کا ماتم

روضۃ الشہداء، حبیب السیر اور معارج النبوۃ وغیرہ میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے حسب منشائے خداوندی حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان کرنا چاہا اور بعدہٗ اس عمل سے روک دیئے گئے تو آپ کو شدید حزن و ملال کے ساتھ یہ خیال پیدا ہوا کہ جس قربانی کے لئے کئی بار شد و مد کے ساتھ تقاضا ہوا ہے اس سے کیوں روک دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اے ابراہیمؑ! یہ بہت سخت امتحان تھا۔ تیرا فرزند اسمٰعیلؑ حاملِ نورِ ختم المرسلینؐ ہے اس لئے اس کو ایک بڑی قربانی کے بدلے بچالیا۔ تمہارے حسن نیت کی قدر کی اور تمہیں امامت کا بلند مرتبہ عطا کردیا۔ پھر خلیل اللہؑ کی نظروں سے رفع حجاب فرمایا گیا۔ تو آپ نے جناب محمدؐ مصطفےٰ اور ان کی آلِ باصفا کا رتبۂ جلیلہ مشاہدہ

فرمایا اور یہ منظرِ عالی منزلت ملاحظہ فرما کر بہت محظوظ ہوئے۔ پھر حضرت حسینؑ کا تعارف کرایا گیا کہ رسولِ عربیؐ کے سبطِ اصغر یہی ہیں اور اسمٰعیلؑ کا فدیۂ عظیم بھی یہی ہیں۔ اشقیائے امت ان کو مع اطفالِ خورد سال کے تین دن کا بھوکا پیاسا غربت و بکیسی کی حالت میں نہایت ظلم و ستم کے ساتھ شہید کریں گے۔ یہ واقعہ سن کر حضرت ابراہیمؑ کو شدید رنج پہنچا اور سرشکِ غم دیدہ ہائے مبارک سے بہ نکلے۔ خطاب آیا کہ اے ابراہیمؑ! حسینؑ کی مصیبت پر آپ کا رونا اسی ثواب کے برابر ہے جو اسمٰعیلؑ کی قربانی سے حاصل ہوتا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ذبح عظیم۔ فوق بلگرامی۔ ص ۱۱۵-۱۱۶)

غمِ حسینؑ میں حضرت موسیٰؑ کا ماتم

مروی ہے کہ یوشع بن نون کی معیت میں حضرت موسیٰؑ کا سرزمینِ کربلا سے گزر ہوا۔ خارزار میں گزرنے سے پاؤں لہو لہان ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے پالنے والے! مجھ سے کیا خطا سرزد ہوئی کہ اس صورتِ حال میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ یہ حسینؑ کا مقتل ہے۔ اس سرزمین پر ان کا خون گرے گا۔ آپ کا خون، خونِ حسینؑ کی موافقت میں جاری ہوا۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت حسینؑ کے درد و غم پر اظہارِ افسوس کیا اور یزید پر نفرین کی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ناسخ التواریخ جلد ششم مطبوعہ بمبئی) اسی کتاب کے بابِ اوّل میں "یومِ عاشور کی قدر و منزلت"۔ ماتم کی اہمیت، قربانی کا تعین وغیرہ متعلقہ موضوعات پر مفصل بحث سپردِ قلم کی جا چکی ہے اور حسبِ ضرورت توریتِ مقدس کے متعدد اقتباسات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ اسلئے ان ہی باتوں کا یہاں دہرانا غیر ضروری ہے۔

غمِ حسینؑ میں حضرت سلیمانؑ کا ماتم

مروی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے بچھونے پر تشریف فرما تھے اور ہوا میں محوِ پرواز تھے کہ اچانک زمین کربلا پر سے گزر ہوا۔ ہوا نے بساط کو چکر میں ڈال دیا اور وہ خاک پر گر پڑی۔ فَقَالَ سُلَیْمَانُ لِلرِّیحِ لِمَ سَکَنْتَ۔ ان ھٰھنا یقتل الحسین علیہ السلام۔ حضرت سلیمانؑ کے استفسار پر ہوا نے عرض کیا کہ یہ حسینؑ کا مقتل ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے امام عالیمقامؑ کے مصائب پر اظہارِ افسوس کیا اور یزید پر لعنت کی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ناسخ التواریخ۔ جلد ششم۔ مطبوعہ بمبئی۔

غمِ حسینؑ میں یسعیاہ نبی کا ماتم

پرانے عہد نامہ سے تین اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ **عرب کی بابت الہامی کلام** :۔ عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے اے دوانیو کے قافلو! پانی لے کر پیاسے کا استقبال کرو۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کر بھاگنے والے کو ملنے آؤ کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے، کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ سے یوں فرمایا کہ مزدور کے برسوں کے مطابق ایک برس کے اندر اندر **قیدار** کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کی تعداد کا بقیہ یعنی بنی قیدارؑ کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے۔ کیونکہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔" (یسعیاہ ۲۱ : ۱۳-۱۷)

تیما بن اسمٰعیلؑ اور دوانیوں کو کس بھوکے پیاسے کے استقبال کا حکم ہے جو مدینہ سے جنگ و پیکار، تلواروں اور کمانوں سے جان بچاتا ہوا نکلا۔

مکہ کی پر امن سرزمین میں بھی قوم اشقیاء نے آرام سے ٹکنے نہ دیا۔ حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے مکہ و کعبہ کی حرمت بچانے کے لئے نکلا۔ دشت و بیابان طے کرتا ہوا ارضِ بابل میں پہنچا اور تین روز کا بھوکا، پیاسا، بے یار و مددگار عالمِ مسافرت میں مقتول ہوا۔ مزدور کے ایک طویل برس یعنی ایک صدی میں قیدار بن اسمٰعیلؑ (قومِ قریش) کی ساری حشمت جاتی رہی۔ یعنی خونِ ناحق کے ردِّ عمل کی بدولت ایک صدی کے اندر ہی بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت (از سنہ ۴۱ھ تا سنہ ۱۳۲ھ) صفحۂ ہستی سے اس طرح نیست و نابود ہوئی کہ کوئی اس کا نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔

۲۔ پر آخری زمانوں میں غیر قوموں کے جلیل (گلیل) میں **دریا کی سمت** یردن کے پار بزرگی دے گا۔ ان لوگوں نے جو تاریکی میں چلتے تھے بڑی روشنی دیکھی اور ان پر جو موت کے سائے کے ملک میں رہتے تھے نور چمکا۔ (یسعیاہ ۹/۲۱)

متی نے صرف اتنی سی بات پر حضرت عیسیٰؑ فرات کے کنارے جلیل میں ٹھیرے تھے۔ مذکورہ بشارت کو حضرت مسیح ناصری پر چسپاں کر دیا۔ (متی ۴/۱۴)

متی کی شہادت مندرجہ ذیل دلائل کی بنا پر نہ قابلِ سماعت ہے نہ لائقِ اعتبار:-

۱۔ تاریخی نقطۂ نظر سے آخری زمانہ محمد عربیؐ کا ہے نہ کہ مسیح ناصری کا۔

۲۔ "**غیر قوموں**" کا اطلاق بنی اسمٰعیلؑ پر ہو سکتا ہے نہ کہ بنی اسرائیل پر کیونکہ یسعیاہ نبی اور حضرت مسیح ناصریؑ دونوں کا تعلق نسبی لحاظ سے بنی اسرائیل سے تھا اور انکا دائرۂ نبوت بھی صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں تک محدود تھا۔

۳۔ "یردن کے پار دریا کی سمت" کا اشارہ بھی دریائے فرات کی طرف ہے جہاں مسیح ناصری نہ ذبح ہوئے اور نہ مصلوب۔

۴۔ موت کے سائے کے ملک کا اطلاق حضرت مسیحؑ پر درست نہیں کیونکہ

انہیں نہ وہاں صلیب دی گئی نہ وہ وہاں مارے گئے بلکہ صلیب دیئے جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر جلیل تشریف لائے۔ (دیکھئے متی ۲۸ : ۱۰)
پھر وہ کونسی جلیل القدر ہستی اس سرزمین میں موت کے گھاٹ اتری جس کی بناء پر پورے ملک کو موت کا ملک کہا گیا ہے۔ یہ وہی عظیم موت ہے جس کا تذکرہ یرمیاہ نبی نے بدیں الفاظ فرمایا ہے:۔

"خداوند رب الافواج کے لئے اتّر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ذبیحہ مقرر ہے" (یرمیاہ ۴۶ : ۱۰)

امام حسینؑ کے سوا دریائے فرات کے کنارے کونسا ایسا ذبیحہ گزرا ہے جو اس قابل ہو کہ الہامی کتابوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

۳۔ خداوند رب الافواج اس دن روزے کا حکم کرتا ہے اور ماتم کرنے کا، سر منڈانے اور ٹاٹ باندھنے کا، لیکن دیکھ! خوشی اور شادمانی ہے۔ گائے بیل ذبح کرتے ہیں، بھیڑ بکری حلال کرتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں اور مے پیتے ہیں کہ آؤ کھائیں اور پیئیں کیونکہ کل تو ہم مریں گے۔ سو رب الافواج نے میرے کان میں کہا۔ تمہاری اس بدکاری کا کفارہ تمہارے مرنے تک قبول نہ ہوگا۔ خداوند رب الافواج یہی فرماتا ہے۔ (یسعیاہ ۲۲ : ۱۲-۱۴)

خداوند رب الافواج نے حضرت موسیٰؑ کی معرفت تمام قوموں کے لئے نسل در نسل ابدی قانون نافذ کیا تھا۔ کہ وہ ساتویں مہینے کی دس تاریخ (عاشورِ محرم) یوم غم منائیں اور ماتم کریں۔ (احبار ۲۳ : ۲۶-۳۲)
لیکن اس دائمی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قوم اشقیاء فرزندِ رسولؐ کو ذبح کر کے خوشی و شادمانی میں مشغول، گوشت خوری و مے نوشی میں مصروف ہے۔ اور امامِ شہیدؑ کی باتوں کا اس طرح مضحکہ اڑا رہی ہے کہ آؤ

کھائیں، پیئں اور گلچھرے اڑائیں، کل تو ہم بقولِ حسینؑ مر جائیں گے۔

یاد رہے قومِ اشقیاء کے سامنے یوم عاشور امام عالیمقامؑ نے جو خطبہ دیا تھا اس کے آخری فقرات یہ تھے:۔

"قسم بخدا، ہمارے بعد تم لوگ دنیا میں زیادہ دیر نہ رہو گے۔ موت کی چکی تمہارے سروں پر گھومے گی اور تم کو پامال و فنا کر ڈالے گی۔ میرے پدر بزرگوار نے میرے جد عالیمقدارؐ کی زبانی اس دن اور اس واقعہ کی پوری خبر پہنچائی ہے۔"

بعد ازاں عالی منزلت امامؑ نے عمر بن سعد سے یوں خطاب فرمایا:۔

"اے عمر سعد! تو مجھ کو ان خواہشوں کی وجہ سے قتل کرتا ہے کہ یہ زنا زادہ ابن زیاد تجھ کو ملک رَے اور جرجان کی حکومت عطا کرے گا۔ قسم اس خدا کی جس نے مجھے پیدا کیا کہ سلطنت رَے تجھے نصیب نہ ہوگی۔ تو اپنی اس بات پر قائم رہ۔ تیرے جو جی میں آئے وہ کر لیکن یہ یقین کر لے کہ میرے بعد تجھ کو دنیا و آخرت میں کوئی حصہ ملنے والا نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ **کوفہ میں تیرا سر نیزہ پر نصب ہے** اور لڑکے اس پر پتھر مار رہے ہیں۔"

تاریخ کے صفحات سے پوچھئے کہ عالی منزلت امامؑ کی پیشینگوئی کے بموجب چند سال کے اندر اندر قوم اشقیاء کا کیا حشر ہوا؟ امیر مختارؒ اور ابراہیم بن مالک اشترؒ نے قاتلانِ حسینؑ کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا اور عمر بن سعد و ابن زیاد کے سر نیزوں پر نصب ہوئے اور لڑکوں نے ان پر پتھر مارے۔ خداوند رب الافواج نے یسعیاہ نبی کے کان میں جو کچھ فرمایا تھا وقت آنے پر لفظ بلفظ پورا ہو کر رہا۔ "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ"۔

غمِ حسینؑ میں یرمیاہ نبی کا ماتم

یرمیاہ باب نہم میں واقعہ ہائلہ کربلا و قوم جفا کار کے کردار کی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے لیکن ہم اس کو بخوفِ طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف چند آیات کے بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ "اے کاش! میرا سر پانی ہوتا اور میری آنکھیں آنسوؤں کا چشمہ ہوتیں۔ تب میں اپنی قوم کی بیٹی کے مقتولوں پر دن رات روتا۔ کاش کہ میرے لئے بیابان میں مسافروں کے رہنے کا مکان ہوتا تو میں اپنی قوم کو چھوڑ دیتا اور ان میں سے نکل جاتا کیونکہ وہ سب زنا کار ہیں۔ بیوفاؤں کی جماعت۔ وہ اپنی زبان کو کمان کی مانند جھوٹ بولنے کے لئے کھینچتے ہیں اور سچائی کے لئے سرزمین میں دلیر نہیں ہیں کیونکہ وہ برائی سے برائی تک بڑھتے جاتے ہیں اور مجھ کو نہیں جانتے خداوند کہتا ہے۔" (یرمیاہ ۹: ۱-۳)

مقتولینِ کربلا پر گریہ کرنا کس قدر زور دار الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کوفہ کی بے وفا، دھوکا باز اور زناکار جماعت سے کس شدت کے ساتھ اظہارِ بیزاری کیا گیا ہے جو اپنی زبان کو جھوٹ بولنے میں کمان کی طرح کھینچتے ہیں اور ابنِ زیاد کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی جرأت تک نہیں کر سکتے بلکہ برائی و بے حیائی میں مسلسل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

۲۔ "رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ سوچو اور ماتم کرنے والی عورتوں کو بلاؤ کہ آئیں اور ماہر عورتوں کو بلا بھیجو کہ وہ بھی آئیں اور جلدی کریں اور ہمارے لئے نوحہ اٹھائیں تاکہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوں اور ہماری آنکھوں سے **سیلابِ اشک** بہ نکلے۔" (یرمیاہ ۹: ۱۷-۱۸)

وہ حضرات جو رونے کو ممنوع و خلافِ شرع قرار دیتے ہیں ان آیات پر

غور کریں۔ اگر وہ موروثی تعصب کی بنا پر حضرت حسینؑ کو ان کا مصداق قرار نہیں دیتے تو نہ دیں لیکن رونے کی اہمیت کا اندازہ کریں کہ رب الافواج ماتم کرنے والی اور ماہر عورتوں کے بلوانے کا حکم دے رہا ہے کہ وہ آکر ایسی درد بھری آواز میں نوحہ خوانی کریں کہ سامعین متاثر ہو کر اس شدت سے گریہ و بکا کریں کہ آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری ہو جائے۔

۳۔ یرمیاہ نبی کا نوحہ جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے الہامی کتاب کا طرزِ بیان ملاحظہ فرمائیے کہ اصغرِ معصومؑ کی پیاس کا تذکرہ کس رنگ میں کرتی ہے :۔

"The tongue of the sucking child cleavth to the roof of his mouth for thirst."

"شیر خوار بچے کی زبان پیاس کے مارے تالو سے چپٹ گئی ہے۔ ننھے بچے روٹی مانگتے ہیں پر ان کے لئے کوئی توڑتا نہیں۔" (یرمیاہ کا نوحہ ۴: ۳-۴)

تاریخ عالم میں صرف ایک ہی ایسے طفلِ شیر خوار حضرت علی اصغرؑ ہی ہیں جن کو یہ تاریخی اہمیت و خصوصیت حاصل ہے کہ ان کا عبرت آموز ذکر الہامی کتاب میں ہوتا اور جنہوں نے قوم اشقیاء کے سامنے زبانِ حال سے اپنی پیاس کا تذکرہ فرما کر قوم سے پانی کا مطالبہ کیا لیکن جواب میں تیرِ ستم زبان میں پیوست ہوا اور اس درد بھرے واقعہ پر یرمیاہ نبی کو نوحہ کرنا پڑا۔

۴۔ جناب یرمیاہ نے شہدائے کربلا پر نہ صرف نوحہ ہی کیا ہے بلکہ قومِ اشقیاء پر لعنت و نفرین بھی کی ہے اور ان کی ہلاکت و تباہی کے لئے بد دعا بھی کی ہے۔

"اے خداوند! ان کے اعمال کے مطابق ان کو بدلہ دے۔ ان کو کور دل بنا۔ تیری لعنت ان پر ہو۔ قہر سے ان کو رگید اور روئے زمین سے ان کو

نیست و نابود کر دے۔"

امیر مختار ثقفیؒ ، ابراہیم بن مالک اشترؒ ، ابوالعباس سفاح عباسی اور ابومسلم خراسانی کے ہاتھوں سے قدرت نے ان کو قہر سے رگیدا اور رُوئے زمین سے نیست و نابود کر دیا۔ حتیٰ کہ امیر تیمور نے ان کے شاہانہ تاریخی آثار و نشانات بھی مٹا دیئے۔ رہی لعنت۔ تو قوم یزید پر قیامت تک برستی رہے گی۔

غمِ حسینؑ میں حبقوق نبی کا ماتم

"تو اپنی قوم کو رہائی دینے کے لئے، ہاں اپنے ممسوح کو رہائی دینے کے لئے نکل چلا۔ تو بنیاد کو ننگا کر کے گردن تک شریر کے گھر کے سر کو کچل ڈالتا ہے۔ سلاہ۔ تو نے اس کے سرداروں میں سے جو عالی درجہ کا تھا، بھالوں سے مار ڈالا۔ وہ مجھے پراگندہ کرنے کے لئے آندھی کی طرح نکل آئے۔ ان کا فخر یہ تھا کہ مسکینوں کو ہم چپکے نگل جائیں گے۔" (حبقوق ۳: ۱۳-۱۴)

خدا کے ممسوح بندے کو اموی گرفت سے آزاد کرنے کے لئے خدا کی مشیت ہوئی کہ اس کے نانا کے کلمہ گو اس عالی درجہ سردار امام حسینؑ کو بھالوں سے قتل کریں۔ گروہِ اشقیا کا دلی مقصد تھا کہ نواسۂ رسولؐ کو خاموشی سے نگل جائیں اور چپ چپاتے آلِ رسولؐ کا خاتمہ ہو جائے اور دنیا اس سانحۂ عظیم سے بے خبر رہے لیکن قدرت نے مفسدوں کی شر انگیزی و فتنہ پردازی کو بے نقاب کرنے کے لئے محیّر العقول انتظام کر رکھا تھا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک اہل بیتِ رسولؐ کے رقّت انگیز خطبوں نے جو حق گوئی و بیباکی کے علمبردار تھے عالم میں ایک تہلکہ مچا دیا اور خونِ حسینؑ نے جس انقلاب کی بنیاد رکھی وہ بپا ہو کر رہا اور نبی کریمؐ کی اولاد کو خاموشی سے ختم کرنے کی منصوبہ بندی

شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکی اور رسولِ خدا کو ابتر کہنے والی اموی نسل خودبخود قیامت تک ابتر و منقطع النسل ہوگئی۔

غمِ حسینؑ میں صفنیاہ نبی کا ماتم

تم خود یہوواہ کے حضور چپکے رہو کیونکہ خداوند کا دن نزدیک ہے اس لئے کہ خداوند نے "ذبیحہ" کی تیاری کی ہے اور مہمانوں کو مخصوص کیا اور خداوند کے ذبیحہ کے دن یوں ہوگا کہ میں امراء اور شاہزادوں کو اور ان سب کو جو اجنبی پوشاک پہنتے ہیں سزا دوں گا۔" (صفنیاہ ۱ : ۷-۸)

خدا نے بقول یرمیاہ جس ذبیحہ کی دریائے فرات کے کنارے تیاری کی ہے اور جو ذبح ہونے کے لئے مخصوص طور پر مہمانِ کربلا کی حیثیت سے بلایا گیا ہے وہی خدا کی راہ میں ذبح ہوگا۔ اس کا عوض و بدل گوسفند نہیں ہوسکتا۔ اس ذبیحہ کے بعد اس کے قاتل امراء اور شہزادے جو لباسِ تقویٰ کی بجائے اجنبی پوشاک (غیر اسلامی کردار) سے ملبوس ہیں خدا کی بارگاہ میں باریاب ہونگے۔ آیہ زیر بحث میں غیر اسلامی کردار کو اجنبی پوشاک سے تشبیہ دی گئی ہے الہامی کلام کی یہی اعجاز بیانی ہے۔ دیکھئے قرآنِ حکیم میں تقویٰ کو لباس سے تعبیر کیا گیا ہے: وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف - ۲۶) تقویٰ کا لباس بہترین لباس ہے۔

غمِ حسینؑ میں ذکریاؑ نبی کا ماتم

تب رب الافواج کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ مملکت کے سب لوگوں اور کاہنوں سے کہدو کہ جب تم نے پانچویں اور ساتویں مہینے میں ستر برس تک روزہ

رکھا اور ماتم کیا تو کیا کبھی میرے لئے روزہ رکھا تھا اور جب تم کھاتے پیتے تھے تو اپنے ہی لئے نہ کھاتے پیتے تھے ؟ کیا یہ وہ باتیں نہیں جو خدا نے اگلے نبیوں سے پکار پکار کر کہیں" (زکریا ۷ : ۴-۷)

ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ (یوم عاشور) کا روزہ اور ماتم وہی ہے جس کو کتابِ احبار باب تئیس حضرت موسیٰؑ نے ابدالآباد تک بطور یادگار حسینی قائم رکھنے کا حکم دیا تھا اور بعد میں آنے والے ہر نبی نے بھی یہی تاکید کی کہ "لوگوں کا روزہ رکھنا، افطار کرنا اور ماتم کرنا خدا کو نفع رساں نہ تھا اور نہ ہے بلکہ غمِ حسینؑ میں ماتم کرنے والے سوگ نشینوں کے لئے نفع بخش و فائدہ مند تھا، ہے اور رہے گا۔

غمِ حسینؑ میں حضرت عیسیٰؑ کا ماتم

مروی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا اپنے حواریوں کی معیت میں کربلا سے گزر ہوا دیکھا تو ایک خوفناک شیر نے رستہ کو مسدود کر رکھا ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ مقتلِ حسینؑ ہے چنانچہ حضرت مسیحؑ نے امام مظلومؑ سے اظہار ہمدردی فرمایا اور قوم اشقیاء پر لعنت و نفرین کی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے ناسخ التواریخ جلد ششم۔ نئے عہد نامہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:۔

جو غالب آئے میں اسے اپنے ساتھ اپنے تخت پر بٹھاؤں گا جس طرح میں غالب آکر اپنے باپ کے ساتھ اس کے تخت پر بیٹھ گیا۔ جس کے کان ہوں وہ سنے کہ روح کلیسا کیا کہتی ہے" (مکاشفہ ۳ : ۲۱-۲۲)

بتایئے دنیا میں حضرت مسیحؑ کے برابر ان کے تخت پر بیٹھنے والی وہ کونسی مقدس ہستی ہو سکتی ہے جو مثل مسیحؑ ظاہری مغلوبیت کے بعد حقیقی فتح و دائمی

غلبہ حاصل کر چکی ہو وہ افضل ترین خلائق حضرت حسینؑ کی ذات قدسی صفات ہے جس کو یزیدیوں کے مقابل ظاہری و سطحی نگاہ میں مغلوبیت لیکن حقیقت میں دائمی غلبہ حاصل ہوا ہے وہ اس طرح کہ حسینیت باطل کی تمام طاغوتی طاقتوں کو شکست فاش دے کر زندۂ جاوید ہو گئی ہے۔

غمِ حسینؑ میں یوحنا حواری کا ماتم

۱۔ "تو نے ذبح ہو کر اپنے خون سے ہر ایک قبیلہ اور اہلِ زبان اور امت و قوم میں سے خدا کے واسطے لوگوں کو خرید لیا۔" (مکاشفہ ۵: ۹)

یہ مذبوح من القفاء امام حسینؑ ہیں جنہوں نے اپنے خون سے اسلام کے تنِ مردہ میں نئی زندگی کی روح پھونک دی۔ قاہریت، آمریت اور استبداد کے سنگین محلوں کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور سرفروشی و فداکاری سے جنتِ نعیم کو خرید لیا تاکہ دنیا کے تمام قبیلے، اہلِ زبان، امتیں اور قومیں ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے منزلِ فلاح تک پہنچ سکیں۔ مسیح ناصریؑ اس آیت کے مصداق نہیں ہو سکتے کیونکہ نہ وہ ذبح ہوئے اور نہ ہی مصلوب۔ اگر بشرطِ صحت مصلوب بھی ہوں تو بھی دنیا کی کسی لغت میں مصلوب کو ذبیحہ نہیں کہتے۔

۲۔ دیکھو وہ بادلوں کے ساتھ آنے والا ہے اور ہر آنکھ اسے دیکھے گی اور جنہوں نے اسے چھیدا تھا وہ بھی دیکھیں گے اور زمین پر کے سارے قبیلے اس کے سبب **چھاتی پیٹیں گے**۔ بیشک۔ آمین۔ (مکاشفہ ۱: ۷)

زمین کے سارے قبیلوں کا چھاتی پیٹنا بجز حسین مظلومؑ تاریخ عالم میں کس کے واسطے ہوا اور کون تیروں اور نیزوں سے چھیدا گیا؟ اگر عیسےٰؑ بشرطِ صحت مصلوب بھی ہوئے تو کس نے چھاتی پیٹی؟ کہاں چھاتی پیٹی گئی، کہاں

ماتم کی مجالس برپا ہوئیں؟ اغیار کا تو کیا کہنا۔خود عیسائیوں نے کس زمانے میں کس ملک میں غمِ یسوع مسیحؑ میں چھاتی پیٹی یا ماتم کی محفل منعقد کی بلکہ مسیحؑ کے ماننے والے اپنے خداوند کی موت کی یادگار شکر گزاری کی ضیافت کے ساتھ مناتے ہیں۔ اور انگور کے رس کو مسیحؑ کے خون بہائے جان کا نشان سمجھ کر انتہائی مسرت سے پیتے ہیں۔ عیسائی دنیا کی تاریخ میں چھاتی پیٹنے کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ اگر مل بھی جائے تو مسیحؑ کے ماتم میں وہ وسعتِ زمانی اور وسعتِ مکانی کہاں جو حسینؑ شہید کے ماتم میں ہے۔ نواسۂ رسولؐ کے ماتم میں، دوستوں کا تو کیا ذکر، وہ تو دنیائے تاریخ میں ملّتِ گریہ کناں سے موسوم ہے ماہِ محرم میں تمام اسلامی ممالک کے اندر ہر قصبہ اور ہر قریہ کے اندر چھاتیاں پیٹی جاتی ہیں اور بعض مقامات پر غیر مسلم بھی تعزیے نکالتے ہیں۔

نیز بتائیے۔ شہادت کے بعد حیاتِ جاوداں کا کس نے عملی ثبوت دیا؟ وہ کون تھا جو دوست و دشمن سب کو دکھائی دیا اور ہر آنکھ نے اس کے مقدس سر کو نوکِ سناں پر تلاوتِ سورۂ کہف میں معروف دیکھا؟ وہ زندۂ جاوید حسینؑ مظلوم ہیں جن کی دائمی زندگی پر قرآنِ حکیم نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

حسینؑ کی زندگی میں شہادتِ حسینؑ پر حضورؐ سرورِ دو عالم کا گریہ

ہم اسی کتاب کے دوسرے باب میں بالتفصیل بیان کر چکے ہیں کہ حضرت رسالتمآبؐ نے بذریعہ وحی شہادتِ حسینؑ کی خبر پا کر گریہ و زاری کی۔ اسی سلسلہ میں ہم نے ام الفضل کا وہ خواب بھی بیان کیا جس کو سن کر حضورؐ رونے لگے اور ارشاد فرمایا:-

"میرے اس فرزند حسینؑ کو میری امت قتل کرے گی۔"

حضرت علی مرتضیٰؑ کا لوگوں کو شہادتِ حسینؑ کی خبر دینا اور گریہ و بکا کرنا

ہم دوسرے باب میں بالتفصیل بیان کر آئے ہیں کہ جب سفرِ صفین کے دوران حضرت علی مرتضیٰؑ کا ارضِ کربلا سے گزر ہوا تو آپ نے نینویٰ کے قریب پہنچ کر ندا کی۔ "اے ابا عبداللہ! (جنابِ حسینؑ کی کنیت ہے) کنارۂ فرات پر **صبر کرنا**" اس کے بعد آپ اس قدر روئے کہ زمین آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

حسینؑ کی زندگی میں حضرت فاطمۃ الزہراؑ کا گریہ

اپنے والد بزرگوارؐ سے شہادتِ حسینؑ کی خبر پا کر حضرت مخدومۂ عالمؑ کا گریہ کرنا تمام کتبِ تواریخ میں مذکور ہے۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے امالی میں روایت بیان کی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ابو بصیر سے کہا کہ جنابِ فاطمہؑ غمِ حسینؑ میں روتی ہیں کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تم بھی اس گریہ و زاری میں ان کا ساتھ دو۔

ہم روضۃ الشہداء سے ایک روایت کا اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:۔

(حضرت فاطمہ زہراؑ نے جب واقعۂ شہادت سنا) تو گریہ و زاری کرنے لگیں اور ارشاد فرمانے لگیں۔ "ہمارے فرزند حسینؑ نے آخر کون گناہ کیا ہوگا جس کی وجہ سے عالمِ طفلی میں اس پر یہ ظلم روا رکھا جائے گا؟" خواجہ کائناتؐ سرورِ دو عالم نے فرمایا۔ "بیٹی فاطمہ! یہ واقعۂ شہادتِ حسینؑ کے لڑکپن یا جوانی کے زمانہ میں پیش نہیں آئے گا۔ اس وقت نہ میں ہوں گا، نہ تم، نہ علیؑ ہوں گے نہ حسنؑ۔" یہ سننا تھا کہ جنابِ سیدۂ عالمؑ نے ایک چیخ ماری۔ "اے ماں کے مظلوم فرزند! اے شہیدِ بیکس! اس زمانے میں جب ماں باپ نہ ہوں گے تو تعزیت کرنے اور صفِ ماتم بچھانے والا کون ہوگا۔ کاش کہ میں زندہ ہوتی تو مراسمِ عزا قائم کرتی۔" راوی کہتا ہے اس وقت ہاتف کی ایک ندا آئی جو کہہ

رہا تھا" اے دخترِ رسولؐ! ہر زمانے میں کچھ مصیبت زدہ لوگ ہونگے جو حسینؑ کا ماتم کرتے رہیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ہر سال جب وہ زمانہ آئیگا جس میں حسینؑ شہید ہونگے تو اس زمانہ میں مجالس عزاداری برپا ہوں گی اور لوگ، آہ و فریاد اور گریہ وزاری کریں گے۔"

اس پیشین گوئی کو صفحہ کاغذ پر لکھنے والے بزرگ ملّا حسین واعظ کاشفی جو ایک متقی، مقتدر اور مستند سنّی عالم، مورخ اور محدث تھے عرصہ ہوا کہ ۹۰۱ھ میں پیوندِ خاک ہو گئے لیکن آج قریباً پانچ صدیوں کے بعد بھی یہ پیشین گوئی پوری آب و تاب سے پوری ہو رہی ہے۔ دنیا میں تعزیتِ حسینؑ کی مجالس برپا کی جاتی ہیں، نوحہ خوانی ہوتی ہے، سینہ زنی کی جاتی ہے اور بقولِ یوحنا حواری زمین پر کے سارے قبیلے اس کے سبب سے چھاتی پیٹتے ہیں اور پیٹتے رہیں گے۔

غمِ حسینؑ میں حسن المجتبیٰؑ کا ماتم

ذیل میں ہم حضرت حسنؑ کی وہ آخری وصیت درج کرتے ہیں جو آپ نے دمِ مرگ امامِ حسینؑ کو تلقینِ صبر و استقامت کے سلسلہ میں فرمائی تھی:۔

امام حسنؑ نے فرمایا: "اے اباعبداللہ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟" عرض کیا کہ "میں اس جور و ستم کی وجہ سے مصروفِ گریہ ہوں جو آپ کی ذاتِ مقدس سے روا رکھا گیا۔" حضرت حسنؑ نے فرمایا۔ "مجھے تو پوشیدہ طور پر زہر دی گئی ہے لیکن میرے اس دن کو آپ کے اس دن سے کیا نسبت، جب تیس ہزار آدمی آپ پر حملہ آور ہونگے، جو بزعمِ خود ہمارے جدِ بزرگوار کے امتی ہونگے اور دینِ اسلام کے دعویدار۔ وہ آپ کا خون بہانے، آپ کی حرمت توڑنے، آپ

کے فرزندوں کو اسیر کرنے اور آپ کے مال و متاع کو لوٹ لینے پر متفق و مجتمع ہو جائیں گے اس وقت بنی امیہ پر لعنت و نفرین ہوگی۔ آسمان سے خاک و خوں برسے گا۔ دنیا کی تمام چیزیں حتیٰ کہ وحوشِ صحرا و ماہیانِ دریا آپ پر گریہ و بکا، کریں گی۔ رضینا بقضاء اللہ و صبرنا علیٰ بلائہ۔

بعدِ شہادت غمِ حسینؑ میں حضرت رسالتمآبؐ کی بیقراری

۱۔ سلمیٰ انصاریہ کہتی ہیں کہ میں ایک روز ام المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کے پاس گئی اور وہ رو رہی تھیں میں نے پوچھا کہ "آپ کیوں روتی ہیں؟" فرمایا۔ "میں نے ابھی رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپؐ کے سر اور ڈاڑھی پر گرد پڑی ہوئی تھی اور روتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ یا رسول اللہؐ! حضور کا یہ کیا حال ہے؟ فرمایا میں ابھی حسینؑ کے مقتل میں گیا تھا۔" (صواعق محرقہ ابن حجر مکی میمنہ مصر ص ۱۱۵ تاریخ الخلفاء علامہ جلال الدین سیوطی۔ طبع لاہور۔ ص ۱۴۱)

۲۔ مستدرک حاکم و دلائل النبوۃ بیہقی میں حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ جس دن امام حسینؑ شہید ہوئے میں نے رسول اللہؐ کو خواب میں اس حال میں دیکھا کہ رو رہے تھے اور آپؐ کے سر اور ریشِ مبارک کے بال خاک آلودہ تھے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ! یہ کیا حال ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "ابھی میں مقتلِ حسینؑ پر گیا تھا۔"

۳۔ مسند احمد حنبل و دلائل النبوۃ بیہقی میں عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں نے دوپہر کے وقت خواب میں رسول اللہؐ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپؐ کے بال پریشان اور غبار آلودہ ہیں اور آپؐ کے ہاتھ میں ایک شیشہ خون سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! یہ کیسا خون ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ یہ خونِ حسینؑ اور اس کے رفقاء کا ہے جس کو اس شیشے میں اٹھا رہا ہوں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ پس میں نے اس دن کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ امام حسینؑ اسی روز شہید ہوئے تھے جس روز میں نے یہ خواب دیکھا تھا۔"

(مسند امام احمد حنبل جلد اول بسند ابن عباس۔ صحیح ترمذی طبع نولکشور ص ۴۲۶۔ صواعق محرقہ ابن حجر کی طبع میمنہ مصر ص ۱۱۶۔ ماثبت من السنۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۱)

یاد رہے اگر کسی فرد نے خواب میں رسالتمآبؐ کو دیکھا تو اس نے فی الحقیقت ان ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان ان کی صورت پر متمثل نہیں ہو سکتا۔ من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتمثل صورتی۔

(صحیح بخاری ج ۴۔ ص ۔۵۶۔ باب من سمی اسماء الانبیاء)

غمِ حسینؑ میں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کا ماتم

ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں نے شہادتِ حسینؑ پر جنات کو نوحہ و بکا کرتے سنا ہے۔ یہ کہہ کر آپ اتنا روئیں کہ غش آگیا۔

غمِ حسینؑ میں فرشتوں کا قیامت تک روتے رہنا

۱۔ ابو نصر اپنے والد کی اسناد سے ابو اسامہ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ روزِ شہادت (مقام) قبر حسینؑ پر ستر ہزار فرشتے نازل ہوئے جو قیامت تک حضرتؑ پر گریہ و زاری کرتے رہیں گے۔

(غنیۃ الطالبین۔ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی۔ جلد دوم طبع مصر۔ ص ۶۱)

۲۔ قبر مقدس امام حسینؑ کے ہر چہار جانب ستر ہزار فرشتے ہیں جو گرد و غبار آلودہ رہتے ہیں اور قیامت تک حضرتؑ پر رویا کریں گے۔

(ذخائر العقبیٰ فی المودۃ اہل القربیٰ علامہ محب الدین الطبری)
(عزاداری کی تاریخ۔ سبط الحسن فاضل ہنسوی۔ ص ۱۱۶-۱۱۷)

غم حسینؑ میں جنات کا رونا اور نوحہ کرنا

۱۔ ثعلب نے امالی میں ابی حباب کلبی سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں کربلا میں آیا۔ میں نے ایک شخص سے جو وہاں کے اشراف میں سے تھا پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم لوگ جنوں کا نوحہ سنا کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ تم جس سے ملو گے وہ یہی بیان کریگا کہ ہم نے نوحہ سنا ہے۔ (ماثبت من السنۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ طبع کانپور۔ ص ۲۹)

۲۔ حافظ ابونعیم نے حبیب بن ثابت سے روایت کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک جنّیہ کو سنا کہ وہ امام حسینؑ پر بین کرتی ہے اور کہتی ہے رسول اللہؐ نے ان کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ ان کے رخسار میں چمک ہے۔ ان کے باپ دادا قریش کے بزرگ ہیں۔ ان کے نانا سب سے بہتر ہیں۔

۳۔ جابر حضرمی اپنی ماں سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک جن کو سنا ہے وہ امام حسینؑ پر بین کر رہا ہے اور کہتا ہے: "انعی حسینؑ ھبلا۔ کان حسینؑ جبلا"۔ حسینؑ کی سنانی سنا رہا ہوں۔ وہ غمگین تھے اور صبر کے پہاڑ تھے۔
(تحریر الشہادتین۔ طبع لکھنو۔ ص ۹۶-۹۷)

۴۔ جب یزید کی فوج اہلبیتؑ کو اسیر کرکے دمشق کی طرف منزل بہ منزل جا رہی تھی اور مقام تکریت سے کوچ کرکے وادی النخلہ میں پہنچی تو ان لوگوں نے جنّات کو روتے ہوئے سنا اس حالت میں کہ جن اپنے رخساروں پر دوہتّڑ مار رہے تھے اور نوحہ پڑھ رہے تھے........ جب حضرت ام کلثوم نے

سنا تو فرمایا۔ خدا تم پر رحم کرے۔ تم کون ہو؟ جواب ملا۔ میں قوم جن کا بادشاہ ہوں۔ میں مع جنات کی فوج کے امامؑ کی مدد کے لئے آیا تھا لیکن بدقسمتی سے ہمیں تاخیر ہوگئی اور جنگ میں شمولیت کی سعادت حاصل نہ ہوسکی۔ ایک دوسری روایت ہے کہ امامؑ نے جنگ میں شامل ہونے کی اجازت مرحمت نہ فرمائی۔ جب فوج یزید نے سنا تو ان کو یقین ہوگیا کہ وہ دوزخی ہیں۔ (ینابیع المودۃ۔ جلد دوم۔ شیخ الاسلام قندوزی۔ طبع قسطنطنیہ ص ۳۵۱۔ ۳۵۲)

شہادتِ حسینؑ پر غیر معمولی قدرتی آثار

شہادتِ عظمیٰ تاریخ عالم کا ایک انوکھا و عبرت انگیز واقعہ ہے اس کے پردہ میں اسلام کی بقاء و ارتقاء کا راز مخفی تھا اس لئے اس ہولناک واقعہ کی خبر تقریباً تمام انبیائے کرامؑ کو پہنچائی گئی اور غیر معمولی قدرتی آثار ظہور پذیر ہوئے تاکہ جفاجو، کینہ پرور، باطل پرست آمر کی بدکرداری اور اسلام دشمنی نمایاں ہوسکے اور اس کے بالمقابل حق پسند، حق نما اور حق پرست امامؑ کی قربانی کی ضرورت، اہمیّت اور عظمت واضح ہوسکے۔

۱۔ صواعق محرقہ میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ جس دن حسینؑ شہید ہوئے میں نے یہ غیبی آواز سنی۔ "اے حسینؑ کے قتل کرنے والو! تم کو عذاب و ذلت کی بشارت ہو۔ تم لوگ سلیمانؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی زبانوں پر ملعون ہوئے" ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں یہ سن کر رونے لگی اور جس شیشی میں خاکِ کربلا تھی اس پر نگاہ کی تو دیکھا کہ اس کے ذرّات سے تازہ خون جاری ہے۔ (تاریخ احمدی ص ۳۱۸)

۲۔ سرّ شہادتین میں بروایت بیہقی و ابونعیم نضرہ ازدیہ سے مروی ہے کہ جب امام حسینؑ قتل ہوئے تو آسمان سے خون برسا اور بروایت بیہقی و ابونعیم زہری

سے مروی ہے کہ روز شہادتِ حسینؑ بیت المقدس میں جو پتھر اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے تازہ خون نظر آتا تھا اور بروایت بیہقی علی بن مسہر سے مروی ہے کہ میری دادی نے مجھ سے بیان کیا کہ جب حسینؑ قتل ہوئے تو میں جوان تھی میں نے دیکھا کہ آسمان چند روز حسینؑ پر گریاں رہا۔ (تاریخ احمدی ص ۲۱۹)

۳۔ درّ منثور سیوطی میں "فما بکت علیھم السمآء" کی تفسیر کے سلسلہ میں مروی ہے کہ جب امام حسینؑ شہید ہوئے تو چار مہینے تک آسمان سرخ رہا۔ عطا کہتے ہیں کہ آسمان کا رونا اس کے کناروں کے سرخ ہو جانے سے مراد ہے۔

بروایت بیہقی جمیل بن مرّہ سے مروی ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے اونٹ یزید کے لشکر والے پکڑ کر لے گئے اور ذبح کرنے کے بعد گوشت پکا کر چکھا تو وہ مثل حنظل کے کڑوا ہو گیا حتیٰ کہ اس کو کوئی نہ کھا سکا۔ (تاریخ احمدی ص ۳۱۹)

۴۔ "جب امام حسینؑ شہید ہوئے تو سات دن تک دنیا روتی رہی۔ آفتاب کی دھوپ دیواروں پر ایسی تھی جیسے کسم کی رنگین چادریں۔ ستارے آپس میں ٹکراتے تھے۔ روزِ عاشور سورج کو گہن لگا۔ بعد شہادت چھ ماہ تک آسمان کے کنارے سرخ رہے۔ پھر اس روز سے ہمیشہ یہ سرخی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے پہلے کبھی نظر نہ آتی تھی۔" (ماثبت من السنۃ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کانپور۔ ص ۲۵-۲۶)

۵۔ نصرۃ الازدیہ کہتی ہیں کہ جب امام حسینؑ قتل ہوئے تو آسمان سے خون برسا۔ ہمارے تمام گھڑے مٹکے خون سے بھر گئے۔ آسمان بالکل سیاہ ہو گیا، گھٹا ٹوپ اندھیاری کی وجہ سے دن کو تارے دکھائی دینے لگے۔ سورج کو گہن لگ گیا۔ جس پتھر کو اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے سے تازہ خون ملتا تھا۔ علامہ ابن جوزی ابن سیر ے نقل کرتے ہیں کہ بعد شہادت پہلے دنیا میں تین دن تک اندھیرا چھایا رہا۔ اس

کے بعد آسمان سرخ ہوا۔ ابو سعید کہتے ہیں کہ آسمان سے خون کی بارش ہوئی یہاں تک کہ سرخی کا اثر کپڑوں پر مدت تک باقی رہا اور سرخی نہ چھوٹی۔ (مواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی طبع میمنہ ص ۱۱۶)

ممکن ہے کہ دورِ حاضرہ کے بعض ترقی یافتہ سائنسی نظریات کے دلدادہ لوگ ان قدرتی آثار کا ظہور خلافِ عقل و خلافِ فطرت تصور کریں لیکن ان نشانات کا ظہور پذیر ہونا اولاً اس لئے خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ نہیں کیونکہ ان واقعات کی تائید و تصدیق میں بکثرت معتبر شہادتیں معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں کہ شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسلامی کتب احادیث و تفاسیر و تواریخ اس قسم کے حوالوں سے مملو ہیں اور ثانیاً اس قسم کے نشانات حضرت مسیح ناصری کے مصلوب ہونے پر بھی ظہور پذیر ہوئے اپنے بیان کی تائید میں ہم چند اقتباسات انجیلِ مقدس سے نقل کرتے ہیں :۔

۱۔ "پھر دوپہر کے قریب تیسرے پہر تک ساری زمین میں اندھیرا چھایا رہا اور سورج کی روشنی جاتی رہی اور مقدس کا پردہ بیچ میں سے پھٹ گیا۔ پھر یسوع نے بڑی آواز سے پکار کر کہا کہ اے باپ! میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں اور یہ کہہ کر دم دے دیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر صوبیدار نے خدا کی بڑائی کی اور کہا۔ بیشک یہ آدمی راستباز تھا۔ اور جتنے لوگ اس نظارے کو آئے تھے یہ ماجرا دیکھ کر چھاتی پیٹتے ہوئے لوٹ گئے۔" (لوقا ۲۳ : ۴۴-۴۷)

۲۔ دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا........ یسوع نے پھر بڑی آواز سے چلا کر جان دیدی اور مقدس کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ زمین لرزی اور چٹانیں ٹوٹ گئیں اور قبریں کھل گئیں اور بہت سے جسم ان مقدسوں کو جو سو گئے تھے جی اٹھے اور جی اٹھنے کے بعد قبروں سے نکل کر مقدس شہر میں گئے اور بہتوں کو دکھائی دیئے۔ پس صوبہ دار اور

جو اس کے ساتھ یسوع کی نگہبانی کرتے تھے بھونچال اور تمام ماجرا دیکھ کر بہت ڈرے۔ (متی ۲۷ : ۴۵-۵۴)

۲۔ اسی قسم کے غیر معمولی آثار کا نمایاں ہونا مرقس میں بھی مذکور ہے۔ (مرقس ۱۵: ۳۳-۳۸)

پس جب کہ مسیحؑ کی فرضی صلیب پر اس قدر غیر معمولی نشانات نمایاں ہوئے کہ دنیا میں تاریکی چھا گئی، سورج کی روشنی جاتی رہی، زمین لرزی، چٹانیں ٹوٹ گئیں، قبریں کھل گئیں اور مقدس اجسام دوبارہ زندہ ہو کر شہر میں حرکت کرتے ہوئے لوگوں کو دکھائی دیئے تو حضرت حسینؑ کی دردناک شہادت پر جو مفروضہ صلیب مسیح سے بدرجہا زیادہ درد انگیز، حیرت خیز اور عبرت آمیز ہے کیوں نہ غیر معمولی قدرتی آثار رونما ہوتے۔

پس علامہ ابن جوزی کا یہ بیان کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ قتل حسینؑ سے آسمان کے کناروں پر سرخی کے رونما ہونے میں حکمت یہ ہے کہ غصہ کی وجہ سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور خدا کی ذات جسم و جسمانیات سے بری ہے اس لئے اس نے امام حسینؑ کے قتل پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار آسمان کے کناروں کو سرخ کرنے سے کیا ہے تاکہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ امت ایک گناہِ عظیم کی مرتکب ہوئی جس کی پاداش میں عذاب و عقاب ناگزیر ہے۔

مسئلہ زیر بحث کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ملاحظہ فرمائیے:۔

"زمین و آسمان نہیں روئے سوائے حضرت یحییٰؑ بن زکریاؑ اور میرے فرزند حسینؑ پر"

کثیر بن شہاب الحارثی بیان کرتے ہیں کہ مقام رحبہ میں ہم لوگ حضرت علیؑ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں امام حسینؑ پر نظر پڑی تو امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ خداوند عالم نے اس آیت "فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ" میں کچھ لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ قسم ہے اس کی جس نے دانوں کو شگافتہ کیا، ہر آئینہ یہ میرا فرزند قتل کیا جائیگا اور اس پر زمین و آسمان روئیں گے" علامہ جلال الدین سیوطی درِ منثور میں

اسی آیۂ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ امام حسینؑ شہید ہوئے تو چار مہینے تک آسمان سرخ رہا۔ عطا کہتے ہیں کہ آسمان کا رونا اس کے کناروں کے سرخ ہو جانے سے مراد ہے۔

شہادتِ حسینؑ پر اہلبیتِ حسینؑ کی فریاد و زاری

۱۔ مصائبِ امام حسینؑ پر اہلبیتِ امامؑ کی گریہ وزاری ایک قدرتی و فطری چیز تھی۔ خیمہ گاہ سے امامؑ کی آخری الوداعی کے موقع پر کہرام مچ گیا اور چاروں طرف سے صدائے الوداع، الوداع اور ندائے الفراق، الفراق بلند ہوئی۔ امامؑ نے اہلِ بیت کو صبر و شکیبائی کی تلقین فرمائی اور جناب سکینہؑ کو پیار کیا اور چند اشعار ارشاد فرمائے جن کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:۔

قریب ہے کہ میرے بعد اے سکینہؑ! تیرا رونا طول کھینچے گا جبکہ موت مجھے آ لے گی۔ تو میرے قلب کو رونے سے نہ جلا جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے ہاں جس وقت میں مقتول ہو جاؤں تو اے بہترینِ دختران! تجھے سب سے زیادہ رونے کا حق ہوگا۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد ابنِ جریر کے حوالے سے رقمطراز ہیں:۔

"قرہ بن قیس (جو شاہدِ عینی ہے) روایت کرتا ہے کہ ان عورتوں (خواتین اہلبیتؑ) نے جب حضرت حسینؑ اور ان کے لڑکوں و عزیزوں کی پامال شدہ لاشیں دیکھیں تو ضبط نہ کر سکیں اور آہ و فریاد کی صدائیں بلند ہوگئیں میں گھوڑا لے کر ان کے قریب پہنچا........ مجھے زینب بنت فاطمہ علیہا السلام کا بین کسی طرح بھی نہیں بھولتا۔

"اے محمدؐ! تجھ پر آسماں کے فرشتوں کا درود و سلام! یہ دیکھو! حسینؑ ریگستان میں پڑے ہیں خاک و خون سے آلودہ ہیں۔ تمام بدن ٹکڑے ٹکڑے

ہے۔ تیری بیٹیاں قیدی ہیں۔ تیری اولاد مقتول ہے۔ ہوا ان پر خاک ڈال رہی ہے"۔ راوی کہتا ہے دوست و دشمن کوئی نہ تھا جو ان کے بین سے رونے نہ لگا ہو"۔
(داستانِ کربلا ص ۹۵-۹۶)

۳۔ امام اسفرائنی نے مصیبت زدہ و آفت رسیدہ قافلۂ اہلبیتؑ کی لاشِ امامؑ پر فریاد و زاری کا نہایت ہی دردناک منظر کھینچا ہے۔ لاشِ حسینؑ کو پارہ پارہ دیکھ کر حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے ایک جگر دوز آہ کھینچی اور سخت مضطرب ہو کر فرمانے لگیں:-
"اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! خدائے آفرینندہ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے آپ ملاحظہ فرمائیں یہ حسینؑ ہیں جن کے اعضاء پارہ پارہ کر دیئے گئے ہیں جو اپنے خون میں آپ آغشتہ ہیں۔ یہ تمہاری صاحبزادیاں ہیں جو مثل اسیروں کے مقید کی گئی ہیں۔ یہ حسینؑ ہیں جن کو بدکارانِ امت نے قتل کیا ہے اور جن کے ماتم میں بادِ صبا بھی تاسف کرتی ہے۔ یہ آپ کا پیارا حسینؑ ہے جس کے سر کو پس پشت سے کاٹا ہے اور جس کے عمامہ اور ردا تک کو لوٹ لیا ہے۔ میرے ماں باپ اس پر فدا ہوں جس کے خیمہ کو گرا دیا۔ میرے ماں باپ اس مسافر کے قربان جس کے پھر لوٹنے کی امید نہیں۔ میرے ماں باپ اس پر فدا جس مجروح کے لئے کوئی امداد اور سامان نہ کیا گیا۔ میری جان اس پر فدا ہو جو بالبِ تشنہ جہاں سے اٹھ گیا۔ میرے ماں باپ اس پر فدا ہوں جس کا خون بہہ کر تمام چہرے پر بھر گیا"۔ ان درد بھرے فقرات کو سن کر دوست و دشمن کے آنسو بہہ رہے تھے۔

شہادتِ حسینؑ پر صحابہ کرام و بزرگانِ دین کا گریہ و بکاء

۱۔ شہادتِ حسینؑ پر ابن عباسؓ و عبداللہ بن عمرؓ اتنا روتے تھے کہ غش آجاتا تھا محمدؐ ابن حنفیہؓ اتنا روتے تھے کہ وہ طشت جو برائے آبِ وضو آپ کے پاس لایا جاتا تھا

آپ کے آنسوؤں سے بھر جاتا تھا۔ (صواعق محرقہ ص ۱۱۷۔ ینابیع المودۃ ص ۳۲۳)

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں:۔

"حمید بن مسلم (جو خولی بن یزید کے ساتھ حضرت حسینؑ کا سر کوفہ میں لایا تھا) روایت کرتا ہے کہ حسینؑ کا سر ابنِ زیاد کے روبرو رکھا گیا۔ مجلس حاضرین سے بھری تھی ابن زیاد کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ چھڑی آپ کے لبوں پر مارنے لگا۔ جب اس نے بار بار یہی حرکت کی تو زیدؓ بن ارقم صحابی چلا اٹھے:" ان لبوں سے اپنی چھڑی ہٹا لے۔ قسم خدا کی۔ میری ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ اپنے ہونٹ ان ہونٹوں پر رکھتے تھے اور ان کا بوسہ لیتے تھے۔" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے۔ ابن زیاد خفا ہوگیا اور کہنے لگا:" خدا تیری آنکھوں کو رلائے واللہ اگر تو بوڑھا ہو کر سٹھیا نہ گیا ہوتا تو ابھی تیری گردن مار دیتا۔ (داستانِ کربلا ص ۹۶)

مدینہ میں ماتم

مولانا ابوالکلام آزاد رقمطراز ہیں:۔

"اہلبیت کے آنے سے بہت پہلے مدینہ میں یہ جانگسل خبر پہنچ چکی تھی۔ بنی ہاشم کی خواتین نے یہ سنا تو گھروں سے چلاتی ہوئی نکل آئیں حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کی صاحبزادی آگے آگے تھیں اور یہ شعر پڑھتی جاتی تھیں:۔

"کیا کہو گے جب نبیؐ تم سے سوال کرینگے کہ اے وہ جو آخری امت ہو"

"تم نے میری اولاد اور خاندان سے میرے بعد کیا سلوک کیا کہ ان میں سے بعض قیدی ہیں اور بعض خون میں نہائے پڑے ہیں۔" (داستانِ کربلا۔ ص ۱۱۰۔۱۱۱)

اولیائے عظام وصوفیائے کرام کا غمِ حسینؑ میں رونا

زہری کہتے ہیں کہ جب خواجہ حسن بصریؒ کو امام حسینؑ کی شہادت کی خبر ہوئی تو اس قدر روئے کہ ان کی کنپٹیاں شدتِ گریہ سے پھڑکنے لگیں۔ کہنے لگے:۔
"خدا اس امت کو ذلیل کرے کہ اس نے اپنے نبیؐ کے نواسے کو شہید کیا"۔

(ینابیع المودۃ جلد ۲۔ ص ۳۴۱)

۲۔ امام آئمہ اہلِ سنت و سرخیل صوفیائے کرام حضرت سفیان ثوریؒ غمِ اہلبیتؑ میں رونے اور فریاد کرنے کو علامتِ ایمان قرار دیتے ہیں۔ ان کے ارشادِ مبارک کا ماحصل یہ ہے کہ "اولادِ فاطمہؑ کی محبت میں ان کے گوناگوں مصائب پر جزع و فزع کرکے اظہارِ غم اور گریہ وزاری وہی شخص کرے گا جس کے دل میں کچھ بھی ایمان ہے"۔

(مقاتل الطالبین علامہ ابوالفرج القرشی۔ طبع عراق ۱۳۵۳ھ۔ ص ۲۷۸)

۳۔ شیخ کمال الدین علیہ الرحمہ کا ارشاد گرامی ملاحظہ فرمائیے:۔
"امام حسینؑ کا واقعۂ شہادت اہلِ ایماں کی آنکھوں سے آنسو جاری کراتا ہے اور حزن و اندوہ کے ساتھ دلوں میں غم کی آگ سلگاتا ہے"۔ (ذخیرۃ المال شہاب الدین ہمؒ)

۴۔ شیخ سہل بن عبداللہ تستری کے رونے کا تذکرہ روضۃ الشہداء میں موجود ہے۔ امام بوصیریؒ، شیخ شہاب الدین عبدالقادرؒ، شیخ الاسلام بابا فرید گنج شکرؒ، مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، مخدوم شیخ علاالحق پنڈویؒ خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ اور سید عبدالرزاق بانسویؒ وہ مشہور عالم مشائخِ اسلام وصوفیائے کرام گزرے ہیں جو ایامِ عزا میں خود بھی معروفِ گریہ وبکا رہتے تھے اور عزاداری کی مجالس برپا کرنے کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔

۵۔ خواجہ منصور اصفہانی، مقتدائے احناف خواجہ علی غزنوی حنفی، مجدالدین ہمدانی، شیخ ابوالفتوح نصرآبادی، خواجہ محمود حدادی حنفی، خواجہ امام شرف الآئمہ ابونصر سجانی،

خواجہ تاج اشعری نیشاپوری اور شیخ احمد شیبانی رحمہم اللہ وہ بزرگ ہستیاں ہیں جو امام مظلومؑ کے غم میں گریہ و ماتم کرتی تھیں۔ (اخبار الاخیار، محدث دہلوی۔ نقض الفضائح ملا عبدالجلیل رازی) جو حضرات اس سلسلہ میں مزید معلومات فراہم کرنا چاہیں، وہ عزاداری کی تاریخ مصنفہ سید سبط الحسن فاضل ہنسوی کی طرف رجوع فرمائیں۔

غمِ حسینؑ میں مرثیہ گوئی و نوحہ خوانی بدعت نہیں

نوحہ خوانی و مرثیہ گوئی مطلقاً بدعت نہیں کیونکہ بزرگانِ ماسلف کے مصائب کا ان کی اولاد و دوستوں سے تذکرہ کرنا مرثیہ کہلاتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے قرآن حکیم بھی مرثیہ گوئی سے خالی نہیں کیونکہ اس میں بھی انبیائے کرامؑ کے مصائب و ابتلا کا ذکر موجود ہے۔ اس طرح انبیائے ماسلف کے امتحانات و مصائب سے جناب رسالتمآبؐ کو آگاہ کیا گیا اور پھر آنحضرتؐ کی وساطت سے یہ ذکرِ خیر ملتِ اسلامیہ کے افراد تک پہنچا ہے اور ہم انبیاء علیہم السلام کے مصائب اور دردبھرے واقعات سے روشناس ہوئے ہیں۔ اگر مرثیہ بدعت اور فعلِ قبیح ہوتا تو پھر خدا اور رسولؐ اسکے مرتکب کیوں ہوتے؟

۱۔ صحیح بخاری جلد اول ص ۱۵۵ باب رثی النبی سعد بن خولہ میں ہے کہ رسولِ خدا نے خود مرثیہ پڑھا اور محمد بن اسمعیل بخاری نے اس باب کا نام ہی رثی النبی رکھ دیا۔

۲۔ آنحضرتؐ کی وفات پر جمیع اصحابِ رسولؐ و اہلِ بیت عظام نے مرثیئے کہے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے بھی مرثیے تصنیف کئے اور پڑھے۔ اس سلسلہ میں ہم روضۃ الاحباب کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"آوردہ اند کہ اہلِ بیت و اصحاب در مفارقتِ سید الاحبابؐ بسیار غمناک و حزیں بودند و ہر یک از سوز و نیاز مراثی ہائے گفتند۔ از آں جملہ عائشہ صدیقہؓ مے گریست و ایں ابیات انشاء کرد ...."

" وگویند فاطمہ زہرا مطہرہ علیہا التحیۃ والرضوان بہ زیارت پدر بزرگوار آمد و قبضہ از خاک آنحضرت ص برداشت و بر چشمانِ خود نہاد و گریہ آغاز کرد و گفت ...."

" حضرت ابوبکر صدیق رض از جملہ مراثیہا کہ برآں سرور ص گفتہ یکے آنست ...."

(روضۃ الاحباب ۔ علامہ جمال الدین محدث ۔ جلد ا ص ۵۲۶)

اس مقام پر بخوفِ طوالت ہم نے مذکورہ بالا مرثیے قلم انداز کر دیئے ہیں۔ شائقین حضرات ان مراثی کو کتابِ محولہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہمارا مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ حضرت رسالتمآب ص کی وفات پر ان بزرگ ہستیوں نے مرثیے انشاء کئے اور پڑھے جس سے جوازِ مرثیہ ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۵۷۰ در ذکر دفن آنحضرت ص مطبوعہ نولکشور میں مرقوم ہے:۔

" آنحضرت ص کی وفات پر تمام اہلبیت ع اور صحابہ کرام رض نے مرثیے تصنیف کئے۔"

۴۔ شواہد الحق ص ۵۵ پر ہے کہ جناب فاطمہ زہرا ع نے اپنے والد بزرگوار سردارِ دوجہان کی قبر پر نوحہ کیا اور خاکِ قبر آنکھوں پر ڈالی اور مرثیہ کے دو بیت نظم کر کے پڑھے۔

۵۔ صحیح بخاری جلد ۳ ص ۶۰ باب مرض النبی ص میں جناب فاطمہ زہرا ع کا نوحہ درج ہے۔

۶۔ مدارج النبوۃ کے ص ۵۶۷ پر ہے کہ حضرت عمر رض نے عروہ بن مسعود کی وفات پر مرثیہ کہا۔

۷۔ حضرت عمر رض نے اپنے بھائی زید کی شہادت پر مشہور مرثیہ گو شاعر متمم بن نویرہ سے مرثیہ کہنے کی فرمائش کی۔ ملاحظہ کیجئے الفاروق حصہ دوم ص ۲۸۸:۔

" (حضرت عمر رض) کو البتہ زید سے جو حقیقی بھائی تھے، نہایت ہی الفت تھی چنانچہ جب وہ یمامہ کی لڑائی میں شہید ہوئے تو بہت روئے اور سخت قلق ہوا۔ فرمایا کرتے تھے۔ جب یمامہ کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو مجھ کو زید کی خوشبو آتی ہے۔ عرب کا مشہور مرثیہ گو شاعر متمم بن نویرہ جب ان کی خدمت میں آیا تو فرمائش کی کہ زید کا مرثیہ کہو۔ مجھ کو تمہارا سا کہنا آتا تو میں خود کہتا۔"

مرثیہ گوئی کو بدعت کہنے والے اور زندہ جاوید حسین ع شہید کے ماتم کو ممنوع

قرار دینے والے حضرات معلوم نہیں کہ حضرت عمرؓ کے اس فعل کو کس نگاہ سے دیکھیں گے اور کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے۔ فافہم فتدبر۔

امام مظلومؑ کی شہادت پر ہزارہا انسانوں نے مرثیہ گوئی کی ہے اور اہلبیتِ نبیؐ سے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ عربی زبان میں سلیمان بن قتہ کے مرثیے کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے جس کا اردو ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے :۔

۱۔ میں خاندانِ محمدؐ کے گھروں کی طرف سے گزرا مگر وہ کبھی ایسے نہ تھے جیسے اس دن جب ان کی حرمت توڑی گئی۔

۲۔ خدا ان مکانوں اور مکینوں کو دور نہ کرے اگرچہ وہ اب اپنے مکینوں سے خالی پڑے ہیں۔

۳۔ کربلا میں ہاشمی مقتول کے قتل نے مسلمانوں کی گردنیں ذلیل کر ڈالی ہیں۔

۴۔ ان مقتولوں سے دنیا کی امیدیں وابستہ تھیں مگر وہ مصیبت بن گئے۔ آہ یہ مصیبت کتنی بڑی اور سخت ہے۔

۵۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین حسینؑ کے فراق میں بیمار ہے اور دنیا کانپ رہی ہے۔ آسمان اس کی جدائی پر روتا ہے۔ ستارے بھی ماتم کرتے ہیں اور سلام بھیج رہے ہیں۔ (داستانِ کربلا۔ ص ۱۱۱۔۱۱۲)

اسی درد انگیز منظر کو جب محتشم کاشی نے نظم کر کے مرثیہ کے رنگ میں طہماسپ صفوی شاہ ایران کے دربار میں پیش کیا تھا تو بادشاہ تڑپ اٹھا اور غش کھا کر تخت سے نیچے جا پڑا۔ بقولِ مولانا شبلی نعمانی یہ مرثیہ درد و غم کی مجسم تصویر ہے جس کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔ (موازنہ انیس و دبیر۔ مولفہ شبلی نعمانی۔ ص ۱۲)

مرثیہ مذکور کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے :۔

۱۔ پس با زبان پر گلہ آں بضعۃ البتولؑ رُو در مدینہ کرد کہ یا ایہا الرّسول

۲۔ ایں کشتہ فتادہ بہ ہاموں حسینؑ تست ویں صید دست و پا زدہ در خوں حسینؑ تست

۴۔ایں غرقہ محیطِ شہادت کہ روئے دشت | از موجِ خونِ او شدہ گلگوں حسینؑ تست
ایں خشک لب فتادہ ممنوع از فرات | کز خونِ او زمیں شدہ جیحوں حسینؑ تست
۵۔ایں شاہِ کم سپاہ باخیلِ اشک و آہ | خرگاہ ازیں جہاں زدہ بیروں حسینؑ تست
۶۔ایں قالبِ طپاں کہ چنیں ماندہ بر زمیں | شاہِ شہید ناشدہ مدفوں حسینؑ تست

اردو زبان میں میر انیسؔ نے مرثیہ گوئی کے فن کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔ واقعاتِ کربلا کا ایسے درد بھرے انداز میں مرقع کھینچا کہ غمِ حسینؑ میں بے اختیار آنسو بہ نکلتے ہیں حضرت امام شافعیؒ کا مرثیہ درد و محبت کے جذبات سے معمور ہے جس سے جناب شافعیؒ کا شہادتِ حسینؑ پر بشدت گریہ و بکاء کرنا ظاہر ہے۔ چونکہ حضرت امام شافعیؒ اہلِ سنّت و الجماعت کے آئمہ اربعہ میں سے ایک ہیں لہٰذا غمِ حسینؑ میں مرثیہ گوئی حضرت شافعیؒ کی سنّت کی ایک طرح سے تقلید ہے۔

امام شافعیؒ کا مرثیہ

۱۔ ومما نفی نومی وشیب لمتی | تصاریف ایام لھن خطوب
۲۔ تأوّب ھمّی والفواد وکرب | وَ اَرّقَ عَیْنِیْ والرُّقاد غریب
۳۔ تزلزلت الدنیا لِآلِ محمّدؐ | وَ کادت لھم صم الجبال تذوب
۴۔ فمن یبلغن منّی الحسین رسالۃً | وان کرھھا النفس و قلوب
۵۔ قتیلٌ بلاجرمٍ کان قمیصہٗ | صبیغٌ بماء الارجون خضیب
۶۔ نُصلّی عَلَی المُختارِ من آلِ ھاشم | وَ نُوذی لَہٗ ابن اِنّ ذالعجیب
۷۔ لَئِنْ کَانَ ذنبا حُبُّ آلِ محمّدؐ | فَذٰلِکَ ذَنْبٌ لَسْتُ عَنْہُ اَتُوْب
۸۔ ھُمْ شُفَعَائِیْ یومَ حشری وموقفی | وَحُبُّھُم لِلشّافعی ذُنُوْب

(ینابیع المودۃ مطبوعہ بمبئی ص ۲۹۷۔ معراج الوصول حافظ جمال الدین)

(ترجمہ) (۱) جنہوں نے میری رات کی نیند اڑادی اور مجھے بوڑھا کر دیا وہ انقلابات زمانہ ہیں۔
(۲) غموں سے مضمحل ہوگیا اور میرا دل رنج سے بھر گیا۔ رات بھر جاگتا رہا ہوں نیند مجھ پر حرام ہوگئی۔
(۳) آلِ محمدؐ کی مصیبت میں دنیا کو زلزلہ آیا اور قریب تھا کہ اس غم سے پہاڑ پگھل جاتے۔
(۴) کوئی ہے جو میری طرف سے حسینؑ کو میرا پیغام پہنچا دے اگرچہ لوگ اس بات کو پسند نہ کریں۔
(۵) حسینؑ بلا جرم و خطا قتل کئے گئے۔ ان کی قمیص سرخ خون سے رنگین ہے۔
(۶) کس قدر تعجب ہے کہ نبی مختار ہاشمی پر درود بھی پڑھا جاتا ہے اور ان ہی کے فرزند کو قتل بھی کیا جاتا ہے۔
(۷) اگر آلِ محمدؐ سے محبت رکھنا گناہ ہے تو یہ ایسا گناہ ہے جس سے میں کبھی توبہ نہ کروں گا۔
(۸) یہی ہستیاں تو قیامت میں میری شفاعت کرنے والی ہیں اور ان ہی سے محبت رکھنا شافعی کے لئے گناہ کہا جاتا ہے۔

حسین غم کا ماتم دشمنانِ حسینؑ کی ضد میں قائم نہیں ہوا

یہ کہنا کہ حسینؑ کا ماتم دشمنانِ حسینؑ کی ضد میں قائم ہوا صریح ظلم و ناانصافی ہے۔ امام حسینؑ کی مظلومیت پر انبیائے کرامؑ روئے۔ خود جناب رسالتمآبؐ روئے حضرت علی مرتضیٰؑ روئے۔ جناب فاطمہ زہراؑ روئیں۔ حضرت ام سلمیٰؓ روئیں۔ صحابہ کرامؓ روئے۔ اہل بیت عظام روئے۔ صوفیائے کرام روئے۔ زید بن ارقمؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، محمد بن حنفیہؓ روئے۔ خواجہ حسن بصریؒ روئے اور جناب شافعیؒ روئے۔ حضرت امام زین العابدینؑ عمر بھر مجالس عزا قائم کرتے رہے حضرت زینبؑ و حضرت ام کلثومؑ کا کربلا سے کوفہ، کوفہ سے شام اور پھر شام سے مدینہ منورہ تک گریہ و زاری کا ایک مسلسل مظاہرہ تھا۔ لہٰذا اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ حسین مظلومؑ کا ماتم بنوامیہ و دشمنان اہلبیتؑ کی ضد میں قائم نہیں ہوا۔ یہ شہادت بذاتِ خود ایسی المناک ہے کہ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے یہ خود ہی کافی ہے۔ بیرونی اسباب

یعنی ضد و عداوت کی محتاج نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ موت ایک ایسی چیز ہے جو دشمن کے دل سے بھی مرنے والے کی دشمنی نکال دیتی ہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہلبیتِ رسولؐ سے دشمنی کرنے کی ابتدا کچھ ایسے وقت سے ہوئی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی دشمنی کو دل میں قائم رکھنا ایک سنّت قرار دی گئی ہے۔ امام حسینؑ پر سنان، نیزہ اور تلوار کے حملے تو ختم ہو گئے لیکن سنانِ قلم اور تیغِ زبان سے زخم پہنچانے کی کوشش اب تک جاری ہے۔

بکاء علیٰ الحسینؑ فعلِ عبث نہیں

۱۔ حسینِ شہیدؑ پر گریہ کرنا انبیاء کرامؑ اور آئمہ اطہارؑ کی سنّت اور خاصانِ خدا کا شیوہ ہے اس لئے یہ فعلِ عبث نہیں بلکہ موجبِ ثواب ہے۔ ہادیانِ دین کا ہر قول و فعل مقلدین کے لئے موجبِ ہدایت ہوتا ہے۔ مستند روایات کے ذریعہ آنحضرتؐ کا ارشادِ گرامی امتِ مسلمہ تک پہنچا ہے جس کو حضرت امام احمد حنبل اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں کہ جو شخص امام حسینؑ پر آنسو بہائے یا صرف ایک ہی قطرہ آنکھوں سے ٹپکے تو خداوندِ عالم اس کو جنت عطا کرے گا۔

(وسیلۃ النجاۃ۔ ملا مبین فرنگی محل۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ شریف۔ ملا علی قاری)

۲۔ امام ابو اسحٰق اسفرائنی اپنی کتاب نور العینین میں ایک روایت نقل کرتے ہیں:۔

امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا کہ ماہ محرم میں جاہلیت کے زمانہ میں کفار بھی جنگ کرنا حرام سمجھتے تھے لیکن مسلمانوں نے اس ماہ حرام میں ہمارے خون کو حلال کر دیا ہمارے مال کو لوٹ لیا۔ ہماری حرمت کو برباد کر دیا۔ عاشورِ محرم کو ہمارے قلوب غم سے جلتے ہیں۔ آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ کربلا کی زمین نے کرب و بلا ہمیں ورثہ میں دیا ہے پس رونے والوں کو چاہئے کہ حسینؑ پر روئیں اسلئے کہ حسینؑ پر رونا گناہوں کو مٹاتا ہے۔

۳۔ ملا حسین واعظ کاشفی روضۃ الشہداء میں لکھتے ہیں :۔

"حسینؑ کے غم میں گریہ کرنا خدا کی رضا حاصل کرنے اور جنت میں پہنچنے کا سبب ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو شخص امام حسینؑ پر روئے یا رونے والوں کی شکل بنائے اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔ (روضۃ الشہداء مطبوعہ نولکشور کانپور ص ۵-۶)

۴۔ علامہ سبط ابن الجوزی اپنے "تذکرہ خواص الامت" میں لکھتے ہیں کہ ابن ہباریہ شاعر کا گزر جب کربلا سے ہوا تو امام حسینؑ کی مصیبت پر رونے لگا اور یہ مرثیہ کہا :۔

"...... اس کے بعد سو گیا اور خواب میں حضرت سرور دو عالمؐ کو دیکھا۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں۔ خدا تجھے نیک بدلہ دے۔ تجھ کو بشارت ہو کہ اس کے عوض میں خدا نے تجھے مجاہدین کربلا کے گروہ میں قرار دیا ہے۔" (ینابیع المودۃ جلد دوم طبع قسطنطنیہ ص ۱۲۹-۱۳۰)

بروئے قولِ اقبالؒ مؤلف بھی جنابِ امام عالیمقامؑ کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا ہے :۔

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں
اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

حسینؑ کے ماتم کو ممنوع قرار دینے کی وجوہات

بائیبل، قرآن حکیم، احادیث نبوی، اقوال و افعالِ انبیائے کرام و آئمۃ الطاہرین کی روشنی میں جب حسینِ شہیدؑ پر گریہ کرنا کارِ ثواب ٹھیرا تو پھر عوام الناس میں اس قسم کی احادیث کیوں رائج ہیں جو گریہ کے ممنوع ہونے پر بطورِ حجت پیش کی جاتی ہیں؟

۔ اس سوال کا سیدھا و صاف جواب یہ ہے کہ اس قسم کی تمام احادیث زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں جو اموی دورِ حکومت میں وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت وضع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے موضوع ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہ قرآنِ حکیم کے متناقض اور جناب رسالتمآبؐ کے

ذاتی عمل کے خلاف ہیں کیونکہ اگر گریہ ممنوع ہوتا تو آنحضرتؐ بذاتِ خود حضرت حمزہؓ کی شہادت اور واقعہ ہونے پر کیوں گریہ فرماتے؛ لہٰذا ہر وہ حدیث جو قرآنِ حکیم کے خلاف یا عملِ رسولؐ کے مخالف ہے یقینی طور پر اموی عہدِ حکومت و دورِ اقتدار کی یادگار ہے جو حدیث سازی کی فیکٹری میں تیار ہوئی ہے۔ تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کرنا نہایت ہی آسان ہے کہ اموی دورِ اقتدار میں حکومت کے ایسے تنخواہ دار موجود تھے جو اپنے پیشواؤں کے فضائل اور آلِ محمدؐ کی تنقیصِ شان میں حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ ان کو شاہانہ قرب حاصل ہوتا تھا اور دربار میں ان کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ امیر معاویہ کے عہدِ حکومت میں فنِ حدیث سازی کی ابتدا ہوئی۔ باسوائے عمر بن عبدالعزیزؒ تمام اموی خلفا کے دورِ حکومت میں اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغہ۔ الجزء الرابع۔ ص ۳۵۸ بحوالہ جعفر اسکافی)"

اس قبیل کی تمام حدیثیں اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر وضع کی گئیں تاکہ ان کی آڑ لے کر ماتمِ حسینؑ کو حرام قرار دیا جائے۔ ذکرِ حسینؑ و واقعاتِ کربلا پر ایک دائمی پردہ ڈال دیا جائے اور اس طرح سے قومِ اشقیاء کی بدکرداریاں پردۂ اخفا میں رہیں۔ نہ مجالسِ ماتم برپا ہوں، نہ واقعاتِ کربلا کا تذکرہ باقی رہے اور نہ ہی قومِ بدکار کا جور و جفا منظرِ عام پر آئے۔ چونکہ حسینؑ مظلوم ہیں اور مظلوم سے فطرتاً ہر سلیم القلب کو ہمدردی اور ظالم سے قدرتاً نفرت ہوتی ہے اس لئے واقعاتِ کربلا کا تذکرہ عوام الناس میں بالعموم اور مومنین میں بالخصوص ان لوگوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اور جوش پھیلا دے گا جنہوں نے ایسا ماحول پیدا کیا جو کربلا کے المناک خونی منظر پر منتج ہوا۔ چنانچہ اسی خطرہ کے پیشِ نظر علامہ ابن حجر مکی نے صواعقِ محرقہ میں واقعاتِ کربلا کے تذکرہ کو بند کرانے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے لکھا ہے :-

"یحرم علی الواعظ وغیرہ ذکر مقتل الحسنؑ والحسینؑ وحکایاتہ و

ماجری بین الصحابۃ من التشاجر والتخاصم فانہ یھیج علی بغض الصحابۃ"
(صواعق محرقہ طبع مصر۔ ص ۱۳۳)

(ترجمہ" واعظ و ذاکر پر شہادتِ حسینؑ کے واقعات و حکایات بیان کرنا اور اصحاب کے باہمی اختلاف و خصومت کا ذکر کرنا حرام ہے کیونکہ اس سے بغض صحابہ پیدا ہوتا ہے۔"

حقیقت شناس نگاہیں جب یہ دیکھتی ہیں کہ ذکرِ شہادتِ حسینؑ سے بغضِ صحابہ کیوں پیدا ہوتا ہے تو وہ اس نتیجہ تک پہنچ جاتی ہیں کہ اس خونِ ناحق سے شاید بعض صحابہ کے ہاتھ بھی رنگین ہوں گے ؎ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"۔

ہم آگے چل کر سانحۂ کربلا کے پسِ منظر اور اس کے صحیح اسباب و علل پر بحث کرتے وقت یہ ثابت کریں گے کہ قتلِ حسینؑ کی ذمہ داری سے بالواسطہ معاویہ، عمرو بن العاص، ابو موسیٰ اشعری، مغیرہ بن شعبہ اور مروان وغیرہ بری نہیں اور ان ہی کے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ حدیثیں وضع کی گئی ہیں کہ ماتم حرام ہے۔ میّت پر رونا بدعت ہے اور زندۂ جاوید کا ماتم کرنا ممنوع ہے۔

موضوعہ احادیث پر تنقید

بالعموم بخاری و مسلم سے مندرجہ ذیل تین احادیث پیش کرکے امامؑ کے ماتم کے امتناع پر استدلال کیا جاتا ہے۔ ہم ان احادیث کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیتے ہیں:۔

حدیث اوّل:۔ "انا بریء ممن حلق و صلق و خرق" (بخاری و مسلم)

(ترجمہ) جس نے مردہ کے ماتم میں سر منڈا دیا اور زور زور سے چیخا اور کپڑے پھاڑے میں اس سے بری ہوں۔"

اس حدیث کا حسینؑ کے ماتم پر اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ حسینؑ کے ماتم میں نہ کوئی سر منڈاتا ہے اور نہ زور زور سے بیہودہ چیخیں ماری جاتی ہیں اور نہ ہی کپڑے

پھاڑے جاتے ہیں بلکہ سیاہ ماتمی لباس پہنا جاتا ہے جس طرح سید الشہداء حضرت حمزہؑ کے ماتم پر جناب رسالتمآبؐ کی منشا کے مطابق بنی عبدالاشہل کی عورتیں ماتمی لباس پہن کر آئی تھیں اور گریہ و بکا کیا تھا اور نبی کریمؐ نے ان کے لئے دعائے خیر فرمائی تھی۔ (سیرۃ النبیؐ ابن ہشام۔ الجزء الثالث۔ ص ۵۰)

تاہم اس مفروضہ حدیث جس کو نہ قرآنی تائید حاصل ہے اور نہ عملِ رسولؐ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، کی تردید میں بائیبل کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

"خداوند رب الافواج نے اسی دن (عاشور محرم) رونے، ماتم کرنے، سر منڈانے اور ٹاٹ سے کمر باندھنے کا حکم دیا تھا۔" (یسعیاہ ۲۲: ۱۲)

اس آیۂ کریمہ پر بالتفصیل بحث اس باب میں گزر چکی ہے:۔

حدیث دوم:۔ "لَیْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الجیوب ودعیٰ بدعوی الجاھلیۃ۔" (بخاری و مسلم)

(ترجمہ) جو گلوں پر طمانچے مارتا ہے یا گریبان پھاڑتا ہے یا جاہلیت والوں کی طرح بَین کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں۔"

مخالفین کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہم حدیث یہی ہے جو ماتمِ حسینؑ کے ناجائز ہونے پر بطور دلیل پیش کی جاتی ہے ہمارے خیال میں یہ زمانہ مابعد کی پیداوار ہے جو محض واقعاتِ کربلا پر پردۂ اخفاء ڈالنے کے لئے وضع کی گئی ہے۔ حسینؑ کے ماتم میں نہ گریبان پھاڑے جاتے ہیں اور نہ جاہلیت والوں کی طرح بَین کئے جاتے ہیں البتہ واقعاتِ کربلا کو مجمع عام میں تقاریر، نوحہ خوانی اور مرثیہ گوئی کے رنگ میں ضرور پیش کیا جاتا ہے تاکہ ظالموں کی بدکرداری اور مظلوم کے صبر و استقامت کو پیش کر کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض کو پورا کیا جائے اور آلِ رسولؐ کے مجاہدۂ حق کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے اور ان کی سیرت و کردار کے وہ نقوش ابھارے جائیں جو ہمیں ایک نیا ولولۂ جہاد اور استقامت علی الحق

کا نیا درس دیتے ہیں۔

ظالموں کے ظلم وستم اور مکر و فریب کا پردہ چاک کرنا کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب امام فخرالدین رازی کی زبانی سنئے :۔ "اِنَّ الصبر علی القضاء اللّٰہ واجب واما الصبر علی الظالمین ومکر الماکرین فغیر واجب بل الواجب ازالۃ لا یسما فی الضرر العائد الی الغیر" (تفسیر کبیر جلد ۵ مطبوعہ مصر ص ۱۱۱ زیر آیۂ فصبر جمیل)

(ترجمہ" قضا و قدر الٰہی پر صبر کرنا واجب ہے مگر ظالموں کے ظلم وستم اور مکاروں کے مکر پر صبر کرنا غیر واجب ہے بلکہ اس صورت میں اس کا ازالہ واجب ہے خصوصاً جب کہ خاموشی میں ضرر و نقصان دوسروں تک پہنچتا ہو"۔ یوم عاشور کا ماتمی جلوس جس کو معترض ہنگامۂ ناسزا قرار دیتے ہیں درحقیقت ظالموں کے ظلم اور مکاروں کے مکر کے خلاف ایک کھلم کھلا احتجاج کا عملی مظاہرہ ہے اور افعالِ بد کی مذمت ہے تاکہ عوام پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ ؂

نماند ستمگار بد روزگار   بماند برو لعنتِ پائیدار (شیخ سعدیؒ)

ظالم کے ظلم کے خلاف کھلم کھلا احتجاج کرنے کا حکم خود قرآنِ حکیم میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ (النسا ۱۴۸)

(ترجمہ" کسی کی برائی ظاہر کرنا خدا کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے لیکن مظلومیت ظاہر کرنے کے لئے جائز ہے۔ اللہ یقیناً سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

البتہ اس حدیث کے الفاظ میں صرف ایک چیز ضرور موجود ہے جس پر معترض اپنے اعتراضات کی بنیاد استوار کر سکتا ہے۔ وہ "ضرب الخدود" یعنی گلوں پر طمانچے مارنا ہے۔ یہ حدیث مندرجہ ذیل حقائق کی بناء پر اموی حدیث ساز فیکٹری کی

تیار کردہ ہے۔ کیونکہ سر پیٹنا، سینہ زنی کرنا، زانو پر ہاتھ مارنا جناب رسولِ خداؐ اور ان کے اصحاب و اہلبیت کے عمل سے ثابت ہے:

۱۔ جناب رسولِ خداؐ کا زانو پیٹنا "ھو یقول ویضرب بیدہ علی فخذہ"
(صحیح نسائی باب الترغیب فی قیام اللیل، کتاب قیام اللیل مطبوعہ نظامیہ کانپور ص ۲۶۹)
(ترجمہ) "رسولِ خداؐ فرماتے تھے اور اپنا ہاتھ اپنے زانو پر مارتے جاتے تھے"۔

۲۔ یضرب فخذہ یدل علی جواز ضرب الفخذ عند التاسف" (فتح الباری شرح صحیح بخاری)
(ترجمہ) آنحضرتؐ اپنا زانو پیٹتے تھے۔ یہ فعلِ رسولؐ اس بات کی دلیل ہے کہ وقتِ تاسف ایسا کر سکتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہؐ نے ایک کنیز کو جس نے ایک صدمہ کی وجہ سے منہ پیٹ لیا تھا آزاد کرا دیا اور مومنہ کہا۔ (صحیح نسائی باب الکلام فی الصلواۃ ص ۱۹۷-۱۹۸)

۴۔ "فضرب القوم بایدیھم علی افخاذھم" اصحاب رسولؐ نے اپنے زانوؤں کو پیٹا۔
(صحیح نسائی باب الکلام فی الصلواۃ ص ۱۹۷-۱۹۸)

۵۔ حضرت ابوبکرؓ نے وفاتِ رسولؐ کے صدمہ سے اپنے آپ کو زمین پر دے مارا۔
(صحیح بخاری باب مرض النبیؐ ص ۶۴۳ جلد ۳)

۶۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کی زبانی یہ خبر سن کر کہ آج مسجد آنحضرتؐ سے بوجہ علالت خالی رہے گی اپنے آپ کو منہ کے بل زمین پر گرا دیا۔
(مدارج النبوۃ جلد دوم مطبوعہ نولکشور۔ ص ۵۴۴)

۷۔ نبی کریمؐ کی علالت اور مسجد میں نہ آنے کا پیغام سن کر حضرت بلالؓ سر پیٹتے ہوئے اور فریاد کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلے۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم ص ۵۴۴)

۸۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ و دیگر زنانِ صحابہ نے آنحضرتؐ کے انتقال پر سر و سینہ پیٹا۔ (مسند احمد حنبل جلد ۶ ص ۲۷۴۔ محمد اینڈ اسلام ولیم میور۔ ص ۲۳۲)

۹۔ جنگِ احد میں آنحضرتؐ کی شہادت کی غلط خبر پھیلنے پر زنانِ ہاشمیہ سخت متأثر ہوئیں اور جناب فاطمہ زہراؑ سر پیٹتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲۔ ذکر جنگ احد۔ ص ۱۶۳)

۱۰۔ حضرت عمرؓ کو نعمان بن مقرن کی موت کی خبر ملی تو خود سر پر ہاتھ رکھ کر اور چیخ کر روئے اور کہتے تھے۔ "ہائے نعمان!" (عقد الفرید جلد دوم مطبوعہ مصر ص ۴)

۱۱۔ نبی کریمؐ کی وفات کی خبر سن کر حضرت عمرؓ حواس باختہ ہو گئے اور ہاتھ میں شمشیر برہنہ لے کر اعلان کرنے لگے۔ جو یہ کہے گا کہ رسولِ خداؐ فوت ہو گئے ہیں میں اس کی گردن مار دوں گا۔ حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور انہوں نے آیۂ کریمہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْل ...... تلاوت کی تو حضرت عمرؓ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑے۔ (تفصیل گزر چکی ہے)

۱۲۔ خواتینِ اہلبیتؑ کا جب حسین شہیدؑ کی پامال لاش کے پاس سے گزر ہوا تو بیبیوں نے لاشوں کو دیکھ کر نوحہ و بکا شروع کر دیا اور اپنے رخساروں پر طمانچے مارنے لگیں (تاریخ کامل ابن اثیر)

۱۳۔ جنگِ احد کا تذکرہ سن کر جب خواجہ اویس قرنیؒ کو یہ معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کے دندان مبارک اس جنگ میں شکستہ ہو گئے اور آپؐ کے چہرۂ اقدس کو تکلیف پہنچی تو انہوں نے رسولِ خداؐ کی محبت میں اپنے دانت توڑ ڈالے اور اپنے آپ کو وہی تکلیف پہنچانے کی کوشش کی جو آنحضرتؐ کو پہنچی تھی۔ (سیرۃ حلبیہ جلد دوم ص ۲۶۵ مطبوعہ مصر)

غمِ حسینؑ میں زنجیروں سے سینہ کوبی کرنا اور اپنے آپ کو امام علیہ السلام کی محبت میں زخم پہنچانا محمود احمد عباسی کے ہمنوا حضرات کی نگاہ میں نادانوں کا فعل ہے۔ معلوم نہیں حُبِّ رسولؐ میں دانتوں کو توڑ دینا ان کے خیال میں معیوب تر ہے یا نہیں لیکن خواجہ اویس قرنیؒ کے مناقب اور دانت توڑنے کے مستحسن اقدام کی تعریف میں اسلامی کتب بھرپور ہیں۔ (سیرۃ حلبیہ جلد دوم مناقب اویس۔ مطبوعہ مصر ص ۲۶۵)

۱۴۔ ابن سعد اور ابو عبید نے غرائب اور حاکم نے عبداللہ بن عکرمہ سے روایت

گی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تعجب ہے لوگوں کے اس قول سے کہ حضرت عمرؓ نے رونے والی عورتوں کو خالد کی میت پر رونے سے منع کیا حالانکہ خالد پر مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی سات دن تک ماتم ہوا اور بنی مغیرہ کی عورتیں اس پر روئیں اور اس غم میں انہوں نے اپنے گریبان پھاڑے اور منہ پر طمانچے بھی مارے۔

۱۵۔ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا "حضرت ابراہیمؑ کی بیوی حضرت سارہؑ نے اپنے منہ پر ہاتھ مارا۔ اگر بقولِ معترض حضرت سارہؑ کا یہ فعل اظہارِ تعجب کے طور پر تھا اس لئے یہ معیوب نہیں تو اظہارِ افسوس پر ایسا کر لینا کیوں جرم ہے حالانکہ اظہارِ تعجب، اظہارِ افسوس اور اظہارِ خوشی کے موقع پر غیر ارادی طور پر کسی عضوِ بدن کا حرکت کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے اور فطری حرکات گناہ نہیں کیونکہ اسلام دینِ فطرت ہے۔

۱۶۔ جوازِ ماتم میں سب سے بڑی اور محکم دلیل جو پیش کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چھوٹے سے چھوٹے گناہ سے بچنے کے لئے قرآنِ حکیم کے اندر واضح ہدایات دے رکھی ہیں مثلاً چوری نہ کرو، چغلی نہ کھاؤ، جھوٹ مت بولو، کم مت تولو، شراب نہ پیو، جوا مت کھیلو، مالِ حرام مت کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر ماتم کرنا اور بالخصوص اجتماعی طور پر، اور پھر وہ بھی علانیہ، بر سرِ عام، سینہ زنی و سینہ کوبی کی صورت میں جرم ہوتا تو خدائے علیم و حکیم نے قرآنِ حکیم کے اندر کیوں واضح تنبیہہ سے اس کو ممنوع قرار نہ دیا کیونکہ علانیہ گناہ سے دوسروں میں بھی گناہ کی اشاعت ہوتی ہے حالانکہ خدائے قدیر عالم الغیب ہے اور قرآنِ حکیم کا دعویٰ ہے کہ ہر خشک و تر کا علم کتابِ مبین میں موجود ہے تو پھر قرآنِ مجید اس سلسلہ میں کیوں خاموش ہے؟ قرآن کی خاموشی خود اس امر کی دلیل ہے کہ ماتم کرنا ممنوع و حرام نہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

حدیثِ سوم:۔ الا تسمعون ان اللہ لا یعذب بدمع العین ولا بحزن القلب ولکن یعذب بھذا واشار الی لسانہ۔ (بخاری و مسلم)

(ترجمہ) کیا تم لوگ نہیں سنتے ہو کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسوؤں اور دل کی کلاہ پر سزا نہیں کرتا بلکہ اس کی سزا اس پر ہے (یہ فرماکر) آنحضرتؐ نے اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔

اگر اس حدیث کی صحت تسلیم کرلی جائے تو اس سے جوازِ گریہ ثابت ہوتا ہے نہ کہ اس کا ممنوع ہونا۔ زبان کی طرف اشارہ کرنے سے آنحضرتؐ کا مقصد یہ تھا کہ زبان سے وہ الفاظ نہ نکالے جائیں جو بقضاء رضا الٰہی کے منافی اور خدا کے خلاف گلہ و شکوہ کے مترادف ہوں مثلاً "ہائے اللہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ ۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ یہ تو بڑا ظلم ہوا۔ میری تقدیر پھوٹ گئی۔ ہائے میری قسمت میں خدا نے یہ عذاب اور مصیبت لکھ دی ہائے میں کیا کروں؟ اے خدا تیرے رحم و کرم کو کیا ہوا؟"

اس قسم کے فقرات صبر و رضا بقضا کے منافی ہیں۔ اپنے افعالِ بد کے بُرے نتائج کو خدا یا تقدیر کے سر تھوپ کر خدائے عزّوجل کو (العیاذ باللہ) ظالم قرار دینا شرعاً جرم ہے۔ رسولِ خداؐ کا مقصد اس برائی کو روکنا تھا۔ رہا واقعاتِ کربلا کے بیان کو زمانۂ جاہلیت کے بَین سے تشبیہہ دینا قرینِ انصاف نہیں بلکہ یہ بیجا موروثی تعصّب ہے۔ ویسے تو حضرت ابوبکرؓ کی موت پر حضرت عائشہؓ نے نوحہ خوانی کی۔ (تاریخ طبری)۔ حضرت عمرؓ کی موت پر حضرت حفصہؓ نے بَین کئے اور جناب رسالتمآبؐ کے انتقال پر مخدومۂ عالم سیّدۃ النساء جناب فاطمہ زہراؑ نے نوحہ خوانی کی۔ (صحیح بخاری جلد ۳۔ باب مرض النبی۔ ص ۶۰)

باب سیزدہم

حسینؑ ابنِ علیؑ کے قتل کا مطلب نہ ہم سمجھے
یہ ہم پر آج تک اسلام کا الزام باقی ہے (مولانا ظفر علی خانؒ)

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

اللہ باطل کو مٹاتا ہے اور اپنے کلمات کے
ذریعہ سے حق کو ثابت کرتا ہے۔ بیشک وہ
دلوں کی حالت سے آگاہ ہے

(الشوریٰ - ۲۴)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

تاریخی مغالطہ یا ایک فریب؟

عوام کو غلط فہمی میں بتلا رکھنے کے لئے بعض متعصب مورخین نے دیدہ و دانستہ شہادتِ عظمیٰ کی عظمت کو کم کرنے کی بے سود کوشش کی ہے اور تاریخی حقائق کو توڑ موڑ کر اس طرح پیش کیا ہے کہ عوام یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ امام حسینؑ نے سیاسی شعور کے فقدان کی بناء پر اموی طاقت کا غلط اندازہ لگایا اور بنو ہاشم کی قوت پر اعتماد کرتے ہوئے، عہد شکن کوفیوں کے عہد پیمان پر بھروسہ کر کے حکومتِ شام کے خلاف خروج کیا۔ مقامِ **زرود** پر پہنچ کر مسلم بن عقیلؑ کی شہادت اور کوفیوں کی بے وفائی کی خبر سن کر واپس پلٹنا چاہا لیکن اولادِ عقیلؑ نے واپسی سے انکار کیا اور مسلمؑ کے انتقام کا اصرار کیا لہٰذا آپ کو مجبوراً سفر جاری رکھنا پڑا۔ (ابن جریر)

کربلا پہنچ کر معلوم ہوا کہ حالات بالکل خلاف توقع پلٹ چکے ہیں تو آپ نے فوجِ یزید کے سامنے تین شرائط پیش کیں:-

۱- مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے آیا ہوں۔

۲- مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو۔

۳- مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو۔ وہاں کے لوگوں پر جو گزرتی ہے وہ مجھ پر گزرے گی۔ (داستانِ کربلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ص ۵۷)

دشمن نے یہ خیال کر کے کہ حسینؑ اب قبضہ میں آچکے ہیں۔ اگر اطاعت کے بغیر نکل گئے تو عجب نہیں کہ عزت و قوت حاصل کرلیں اور حکومت کے لئے دائمی خطرہ ثابت ہوں، انہیں غیر مشروط اطاعت پر مجبور کیا۔ حضرت امام حسینؑ نے غیر مشروط اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا، ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دی اور لڑ کر جان دے دی۔ امامؑ ملکی و سیاسی مفاد کے تقاضا کے بموجب قتل ہوئے اور یزید اس بغاوت

کو دبانے کے لئے غلطی پر نہ تھا بلکہ حق بجانب تھا۔ ہر حکومت ملکی نظام کو درہم برہم کرنے والے اور ملک میں انتشار و بغاوت پھیلانے والے شخص کے ساتھ یہی سلوک روا رکھتی ہے جیسا کہ یزید نے روا رکھا۔ بالفاظ دگر اِنَّ الْحُسَیْنَ قُتِلَ بِسَیْفِ جَدِّہٖ (قاضی ابوبکر بن العربی مالکی) حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے یعنی اسلامی شریعت نے بغاوت کی جو سزا مقرر کر رکھی تھی اسی کی تعمیل میں قتل کئے گئے اور یزید نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔

ممکن ہے کہ قارئین کرام اس نظریہ کو دیکھ کر خیال فرمائیں کہ ایسا کون مسلمان ہو سکتا ہے جو نواسۂ رسولؐ پر بغاوت کا الزام لگائے اور یزید کو قتلِ امامؑ میں حق بجانب سمجھے مگر اس حقیقت کے باوجود مسلمانوں کو کبھی یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ قاتلانِ امامؑ مسلمان ہی تھے جو قرآن گلے میں حمائل کئے کہہ رہے تھے کہ قتلِ حسینؑ سے جلد فراغت حاصل کرو تاکہ نمازِ جمعہ وقت پر ادا ہو سکے۔ وہ نواسۂ رسولؐ کو ذبح کر کے، اور خیمہ ہائے اہلبیتِ اطہارؑ کو نذرِ آتش کر کے نعرہ ہائے تکبیر بلند کر رہے تھے۔ آج دنیا میں اگرچہ ان کی صلبی اولاد بروئے آیۂ کریمہ "اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ" ناپید ہے مگر ان کے روحانی فرزند اور یزیدیت کے پرستار بکثرت موجود ہیں جو منہ پھٹ، زبان کی برچھیوں اور قلم کے نیزوں سے مظلومِ کربلا پر اب تک برابر وار کئے جا رہے ہیں اور اس عظیم الشان شہادت کو شہادت کے درجہ سے گرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں وہ امام عالیمقامؑ کو مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ کو یہ نہ کرنا چاہیئے تھا بلکہ یوں کرنا زیادہ مناسب تھا۔ ستاونؔ سال کے بزرگ امام علیہ السلام تیرہ سو برس کے بعد ان پیشہ ور مورخین کے مشوروں کے کس حد تک محتاج ہیں اس کا تصفیہ ہر خود دار ضمیر، ہر قلبِ سلیم اور ہر عقلِ کامل خود کر سکتی ہے۔

اگر اس مقام پر کوئی مستند تاریخی حوالہ پیش نہ کیا جائے تو یقیناً ادائیگی فرض میں ہماری کوتاہی متصوّر ہوگی۔ چنانچہ ہم اس سلسلہ میں چند مسلمان مؤرخین و ناقدین کے اقوال پیش کرتے ہیں۔ مرزا حیرت دہلوی اور اسی نوع کے دوسرے لوگوں کا تو کیا ذکر جو واقعہ کربلا کا سرے ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ خود اسلامی دنیا کے سب سے بڑے مورخ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں شہادت حسینؑ پر بحث کرتے ہوئے یہ نتائج نکالتے ہیں :-

"یزید فاسق و فاجر تھا۔ امام حسینؑ نے بنو ہاشم کی طاقت پر بھروسہ کرکے اس کے خلاف خروج کیا۔ امامؑ نے یزید پر خروج کرنے میں غلطی کی لیکن یزید ان کو قتل کرنے میں حق بجانب نہ تھا۔ صحابۂ رسول میں جابر بن عبداللہؓ، ابوسعید خدریؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، زید بن ارقمؓ یزید کے پاس تھے۔ انہوں نے امام حسینؑ کی مدد نہ کی اور وہ مدد نہ کرنے میں راستی پر تھے۔ یزید کے خلاف انہوں نے لڑنا جائز نہ سمجھا اور وہ اس امر میں حق پر تھے کیونکہ لڑنے میں خونریزی ہوتی ہے اور پھر غالباً یزید ہی کامیاب ہوتا۔ حضرت امام حسینؑ سے خروج کرنے میں غلطی ہوئی لیکن آپ کا قتل کیا جانا قرینِ صواب نہ تھا۔ آپ نے اجتہادی غلطی کی۔ آپ کے قتل کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شافعی یا مالکی کسی حنفی کو نبیذ (شراب) پینے پر سزا دے کیونکہ نبیذ تو حنفی کے اجتہاد سے جائز ہے اس پر سزا کیسی؟" (مقدمہ العلامہ ابن خلدون ص ۲۱۷، اردو ترجمہ مقدمہ حصہ دوم ص ۹۰-۹۱)

علامہ ممدوح آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"ابن زبیرؓ نے بھی خروج کرنے میں وہی غلطی کی جو امام حسینؑ کر چکے تھے اور انہوں نے بھی اپنے قبیلہ کی شوکت و طاقت کے اندازہ میں دھوکا کھایا کیونکہ بنی اسد کبھی بنو امیہ سے طاقت میں زیادہ نہ تھے۔ عبدالملک کی خلافت پر اجماع ہو چکا

تھا۔ وہ بڑا عادل تھا۔ ابن عباس رضؓ و ابن عمر رضؓ نے عبداللہ بن زبیر رضؓ کو چھوڑ کر عبدالملک سے بیعت کی۔ بہر صورت اپنے اپنے اجتہاد میں دونوں حق پر تھے۔ تعیین حق دونوں میں سے کسی ایک طرف نہیں کیا جا سکتا یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر؟ اور جو کچھ قتل و ہلاک ہوا وہ قاعدہ فقیہیہ کے مطابق ہوا۔"

(مقدمہ علامہ ابن خلدون ص ۲۱۷-۲۱۸ - اردو ترجمہ علامہ ابن خلدون حصہ دوم ص ۹۲ البلاغ المبین ص ۱۷۸۰)

غور کا مقام ہے کہ فقہائے اسلام کیوں ایسی مسخ شدہ فقہ اسلام مرتب کرنے پر مجبور ہو گئے کہ جو صحابہ یزید طاغی کے برخلاف امام عادل یعنی حسین مظلومؑ کی مدد نہیں کرتے وہ بھی حق پر ہیں کیونکہ مدد کرنے سے جنگ ہوتی ہے اور جنگ سے قتل و فساد ہوتا ہے۔ جو لوگ ایک امام عادل یعنی ابن زبیر رضؓ کے خلاف دوسرے امام عادل یعنی عبدالملک کی مدد کرتے ہیں اور قتل و فساد میں حصہ لیتے ہیں وہ بھی حق پر ہیں۔ یہ خلاف عقل بحث اور غیر معقول منطق بھی عجیب ہے بلکہ غیر مذاہب کے لئے ایک مضحکہ خیز صورت پیدا کر دی گئی ہے۔ دو خلفاء عبدالملک و ابن زبیر رضؓ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہزاروں کا کشت و خون ہو رہا ہے۔ بے پناہ سنگ باری سے دیوار کعبہ کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ آتش باری سے غلاف بیت اللہ جل رہا ہے۔ حرمت کعبہ توڑ کر ابن زبیر رضؓ کو بیدردی سے بیت اللہ کے اندر قتل کیا جا رہا ہے لیکن لوگوں کا منہ بند ہے۔ یہ نہ کہو کہ حق پر کون ہے اور کون ناحق پر۔ جس کا جدھر جی چاہے شامل ہو جائے۔ قتل ہو گا، فساد ہو گا۔ دونوں کو اس کا ثواب ملے گا۔ حق کی کیا مٹی پلید کی گئی ہے۔ اس مسخ شدہ فقہ اسلامی کا منہ بند ہے کہ وہ حق گوئی کی خاطر لب کشائی کرے۔ جنگ جمل میں کم و بیش دس بارہ ہزار مسلمان مقتول ہوئے لیکن نہ حضرت علیؑ غلطی پر تھے، نہ طلحہ رضؓ و زبیر رضؓ اور نہ ہی حضرت عائشہ رضؓ۔ خلیفۂ حق

حضرت علیؑ اور باغی امیرِ شام معاویہ کے مابین صفین کی کئی جنگیں ہوئیں جن میں ہزاروں آدمیوں کا خون ہوا۔ خواجہ اویس قرنیؓ و عمار بن یاسرؓ جیسے جلیل القدر لوگ حضرت علیؑ کی حمایت میں شہید ہو گئے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرکزی حکومت کے سربراہ، نائبِ رسولؐ، امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؑ غلطی پر تھے یا صوبائی حکومت کے خود سر، باغی گورنر امیرِ شام جنابِ معاویہ۔ (البلاغ المبین۔ ص ۱۷۸۱)

بہرکیف مذکورہ بالا اقتباس سے یہ امر عیاں ہے کہ علامہ ابن خلدون یہ تسلیم کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے بنو ہاشم کی طاقت پر بھروسہ کر کے یزید کے خلاف خروج کرنے میں غلطی کی لیکن یزید ان کے قتل میں حق بجانب نہ تھا۔ آخر یہ کیوں؟ اگر (العیاذ باللہ) جناب حسینؑ نے غلطی کی تو یزید نے بغاوت کو رفع کرنے اور ان کے قتل کرنے میں وہی کچھ کیا جو ہر وہ حاکم کرتا جس کے ہاتھ میں زمام امور ہوتی۔ اگر یزید نے امام حسینؑ کو قتل کرنے میں غلطی کی تو یزید یقیناً ظالم و مجرم تھا اور حضرت حسینؑ حق پر تھے۔ معلوم نہیں کہ مسلمان مورخین نے کیوں حق پوشی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ نہ صاف بات اِدھر کہیں گے نہ اُدھر۔ اجتہادی غلطی کے لئے نبیذ کی مثال بھی خوب تر ہے۔ اگر حنفی پی لے تو اس کے لئے کوئی سزا نہیں۔ اگر مالکی پی لے تو اس کے لئے حدِ شرع لازمی ہے۔ اسلام تو ایک شریعتِ کاملہ ہے اور اس کے قوانین میں تضاد کا امکان نہیں اور **نبیذ** بھی تو ایک ہی شے ہے۔ اگر حنفی پیتا ہے تو پی لے۔ کچھ مواخذہ نہیں چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ اگر شافعی یا مالکی پی لے تو مستوجبِ سزا۔ کوئی ان اسلامی فقہ مرتب کرنے والے بزرگوں سے پوچھے کہ کبھی حق بھی کوئی چیز ہے اگر نبیذ پینا حرام ہے تو سب مسلمانوں کے لئے حرام ہے اور اگر جائز ہے تو سب کے لئے جائز۔

علامہ ابنِ خلدون بہرحال پرانے زمانے کے مورخ تھے انہوں نے امام حسینؑ کے خروج کو غلطی سے تعبیر تو کیا لیکن امامؑ کو اجتہادی غلطی کی رعایت دے کر اتنا تو کیا کہ اُن کے قتل کو قرینِ صواب نہ سمجھا اور نہ یزید کا فعل حق بجانب تصوّر کیا۔ دورِ حاضرہ کے مورخین میں سے مسٹر خدا بخش بانکی پور کے بیرسٹر یزید کے حامیوں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب کے گیارہویں مقالہ میں ایک مضمون سپردِ قلم کیا جس میں یہ ثابت کیا کہ امام حسینؑ نے یزید پر خروج کیا۔ جوابی کاروائی میں یزید نے جو کچھ کیا وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھا مگر اس کے باوجود اسی کتاب کے پانچویں مقالہ میں انہیں اقرار کرنا پڑا کہ خلفائے بنی امیہ مخلص مسلمان نہ تھے۔

I confess to a strange prediction for the Omayyads. True tinged with paganism, Unorthodox, fond of pleasure, lovers of wine, women and sports of life and fun, they sought to live upto the gay old tradition of Arab Heathenism, untrammelled by religion, undeterred by threats of hell. All this and more if you please.

(Studies — Indian & Islamic — Page 41)

(ترجمہ) "میں اقبال کرتا ہوں کہ میرا میلان بنو امیہ کی طرف ہے۔ یہ بالکل درست ہے ان میں کفر تھا۔ سچے مسلمان نہ تھے۔ عیش و آرام کے طالب تھے۔ شراب،

عورتوں اور لہو و لعب سے عشق رکھتے تھے۔ زندگی و مذاق سے بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے زمانۂ جاہلیت کی کافرانہ زندگی گزارنے کی کوشش کی جس میں مذہب کی قیود اور دوزخ کا ڈر نہ تھا۔ یہ باتیں اور اس سے زیادہ بھی تھیں جو آپ گنوا سکتے ہیں اگر آپ چاہیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے اموی خلفاء کے کردار پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے لیکن دورِ جدید کے ایک نامور اہلِ قلم نے تاریخی واقعات کی تحقیق میں ایک نئے انداز سے قلم کی جولانی دکھائی ہے اور اپنے پیشرو حضرات علامہ ابن خلدون اور مسٹر خدابخش بیرسٹر کے برعکس ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو فنِ تاریخ میں جدّت کا سہرا کیسے ان کے سر بندھ سکتا تھا۔ وہ مؤرخ ہی کیا جو واقعات کو موڑ توڑ کر، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر نہ دکھا دے چنانچہ فاضل مولّف نے اس رنگ میں حیرت خیز کارنامہ جدّت سر انجام دیا ہے وہ یہ کہ جناب حسینؑ پر نہ صرف بغاوت کا الزام عائد کر کے ان کے قتل کو قرینِ صواب سمجھا ہے بلکہ خلفائے بنی امیہ کی پاکیزگی و طہارت اور تقویٰ و پارسائی کے ثبوت میں وہ زورِ قلم دکھایا کہ یزید و ولید کو مکارمِ اخلاق کا مجسّمہ بنا کر دکھا دیا۔ یہ کمالِ فن علامہ ابن خلدون اور مسٹر خدابخش کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔

مولف مذکور نے اپنے موروثی عقیدہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے تاریخی حقائق کو موڑ توڑ کر تاریخی کتاب کی بجائے مناظرہ کی اچھی ضخیم کتاب تیار کر دی ہے جسے لاہور کے ایک ثقافتی ادارے نے ۱۹۵۱ء میں طبع کرا کے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں فاضل محقق نے حضرت علیؑ اور اولادِ علی علیہم السلام کی تنقیصِ شان میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم اسی کتاب سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جو موضوع زیر بحث پر کافی روشنی ڈالتے ہیں موصوف ممدوح بنی امیہؓ کی تعریف و توصیف میں یوں رطب اللسان ہیں:

"یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دنیائے اسلام پر بنی امیہ کا بڑا احسان ہے کہ جو

ممالک ان کے قبضہ میں آئے ماسوائے ہسپانیہ، ایک طرف چین کی حدود سے اور دوسری طرف بحراوقیانوس سے ملتے ہیں ان میں ابھی خالص مسلم آبادی ہے، افغانستان، بلوچستان اور وادی سندھ میں اسلام کی اشاعت بنوامیہ نے کی۔ ان کے جانشین بنوہاشم ان کی فتوحات پر ایک انچ زمین کا اضافہ نہ کرسکے اور اشاعتِ اسلام کی طرف تو ان کی توجہ کبھی نہیں ہوئی۔" (خلافتِ اسلامیہ ص ۴۳)

"یہ الزام کہ اموی خلفاء فاسق و فاجر تھے ایک سیاسی ڈھونگ ہے جو بنوہاشم اور ان کے ہواخواہوں نے کھڑا کیا اور اس سیاسی منصوبہ میں وہ خاطر خواہ کامیاب ہوئے۔ یزید بن معاویہ پر یہ الزام شد و مد سے لگایا جاتا ہے حالانکہ اس وقت صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی اور نبوت کا ادب تازہ تھا۔ بات یہی ہے کہ بنوامیہ کے جانشین بنوعباس ہاشمی ہوئے اور انہوں نے دل کھول کر خلفائے بنوامیہ کی مخالفت کی۔

(خلافتِ اسلامیہ۔ ص ۷۶)

مذکورہ بالا دو اقتباسات سے واضح ہے کہ مولف مذکور اموی خلفاء کو نہ صرف محسنِ اسلام ہی سمجھتے ہیں بلکہ ان کو متقی و پارسا جانتے اور مانتے ہیں اور یہ کہ ان کو فاسق و فاجر کہہ کر بدنام کرنا بنوہاشم اور ان کے ہوا خواہوں کا **سیاسی ڈھونگ** ہے اس کے بعد مولف مذکور نے اپنے زورِ قلم سے ان الزامات کی تردید میں سعی لاحاصل کی ہے جو یزید و ولید پر عائد کئے جاتے ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ یزید کی ولیعہدی کے تقرر کو جائز ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے لیکن بخوفِ طوالت ہم نے تمام بحث کو قلم انداز کرتے ہوئے صرف ایک اقتباس ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

مولف ممدوح تقرر کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جب خلیفہ کو وصیت کا پورا اختیار ہے (اگرچہ جناب رسالتمآبؐ کو وصیت کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا کیونکہ حسبنا کتاب اللہ۔ مولف) تو معاویہ کس کے

حق میں وصیت کرتے۔ آئندہ واقعات نے بتا دیا کہ اُس وقت حسین ابن علیؑ اور عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ ہی ایسے لوگ تھے جو دعویدارِ خلافت ہو سکتے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ تو ایک زاہد اور عابد آدمی تھا اس نے کبھی خلافت کی خواہش نہ کی۔ دومۃ الجندل پر جب حکمین نے خلافت پیش کی تو انکار کر دیا باقی دونوں ہاشمی تھے اور دونوں نے بہت **ہاتھ پاؤں مارے**۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ میں دارالخلافت قائم کیا اور لڑے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ حسین بن علیؑ کو کوفیوں نے دعوت دی۔ عبداللہ بن عمرؓ و دیگر ہوا خواہوں نے مشورہ دیا کہ اوّل تو جماعت میں اختلاف و تفرقہ کا باعث نہ ہو دوسرے کوفی بے وفا ہیں۔ آپ کے باپ اور بھائی سے کیا سلوک کیا کہ ان سے وفا کی امید کی جائے......... امیر معاویہ سے پوچھا کہ آپ اپنے بیٹے کے حق میں کیوں وصیت کرتے ہیں تو کہا کہ اب **لونڈے** ہی رہ گئے ہیں۔ ان میں میرا بیٹا زیادہ تر لائق ہے معاویہ بہت دور اندیش سیاسی مدبّر تھا۔ وہ جانتا تھا جس طرح بنو ہاشم بنی امیہ کی خلافت تسلیم نہیں کرتے اسی طرح بنو امیہ بھی نہ کریں گے اور خانہ جنگی ناگزیر ہے۔ بنو امیہ کا پشت و پناہ تمام عرب تھا اور یہ خالص عربی حکومت تھی۔ صدیق اکبرؓ کی طرح امیر معاویہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر اپنے جانشین کا تقرر اپنی زندگی میں نہ کیا تو تمام دنیائے اسلام میں خانہ جنگی کا آغاز ہو جائے گا۔"

(خلافتِ اسلامیہ۔ ص ۷۹-۸۰)

بقول مولف ممدوح یزید کا تقرر معاویہ کی دور اندیشی و سیاسی تدبر کا نتیجہ تھا کیونکہ وہ حضرت ابوبکرؓ کی طرح اسلام کے سچے خیر خواہ تھے لہٰذا وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ ان کے بعد تمام دنیائے اسلام خانہ جنگی میں مبتلا ہو کر رہ جائے۔ پس انہوں نے اپنی زندگی میں یزید کی ولیعہدی پر لوگوں سے بیعت لے لی۔ کیا یہ درست ہے کہ یزید کے تخت نشین ہونے پر مسلمانوں میں خانہ جنگی نہ ہوئی۔ واقعہ ہائلہ کربلا مدینہ کی تاخت و تاراج، واقعہ حرّہ اور اسّی جلیل القدر صحابۂ رسولؐ کا قتل، سات سو حفاظِ قرآن مجید

کی شہادت، دس ہزار عوام الناس کا قتل، ایک ہزار حرامی بچوں کا تولد، مسجد نبوی کا بطور گھوڑوں کے اصطبل کے استعمال ہونا (جذب القلوب۔ محدث دہلوی) مکہ مکرمہ پر یزیدی افواج کی یورش، بیت اللہ پر سنگ باری اور بالخصوص آتش باری آخر کس چیز کا نتیجہ تھی؟ یہ تمام کچھ معاویہ کے اسی سیاسی تدبّر کا نتیجہ تھا جس پہ ہمارے دوست نازاں ہیں اور یہ اسی کے فرزندِ ارجمند یزید کے تقرر کے جوہر تھے جو نمایاں ہو رہے تھے۔

کیا حضرت ابوبکرؓ نے اپنے کسی نا اہل بیٹے کا بطور جانشین تقرر کیا؟ کیا یہی چیز اتمامِ حجت کے طور پر حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے معاویہ کے سامنے پیش نہ کی تھی جب وہ یزید کی ولیعہدی پر لوگوں سے بیعت لینے کی تگ و دو کر رہے تھے؟ ام المومنینؓ کے اس اعتراض پر معاویہ کو کوئی جواب نہ بن پڑا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ کیا مولف مذکور کے خیال کے مطابق یزید کو حضرت عمرؓ سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں، بلکہ یقیناً نہیں تو پھر معاویہ کا فعل کس طرح مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے جس نے فتنۂ وراثت کے تحت مسلمانوں کی دائمی خانہ جنگی اور ابدی تباہی کی راہیں کھول دیں۔ اسی فتنۂ وراثت کے پیدا کردہ تلخ اثرات سے خود اموی خلفاء ولید و سلیمان نے کیا کیا گُل کھلائے۔ محمد بن قاسم کا دردناک قتل، طارق بن زیاد کی ذلت، موسیٰ بن نصیر کی دربدر گداگری و رسوائی اور قتیبہ بن مسلم کا قتل، معاویہ کی اسی سنّت (فتنۂ وراثت) پر عمل کرنے کے نتائج تھے۔ مولف موصوف تقرر کے جواز میں لاکھ بودے دلائل پیش کریں لیکن کیا دنیا کی آنکھیں بند ہو سکتی ہیں؟ اسی فتنۂ وراثت کے متعلق قائدِ سوادِ اعظم، قائدِ ملّت نواب بہادر یار جنگ اپنے مقالہ "شہادتِ کبریٰ" میں رقمطراز ہیں:۔

"مجھ جیسے ہیچ میرز کو سزاوار نہیں کہ ایک صحابیٔ رسولؐ پر خردہ گیری کروں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی نظامِ حکومت

میں بنیادی و اصولی طور پر فتنہ کی بنیاد اس وقت پڑی جب کہ حضرت معاویہؓ نے خلافت کو ابوی و موروثی بنانا چاہا۔" (داستانِ کربلا ص ۲۱۳)

محمد عبدالرحمٰن سعید صدیقی یزید کی جانشینی کے مسئلہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کربلا کے حزنیہ کے معاً بعد حادثۂ حرّہ وقوع میں آیا جس میں ہزارہا صحابۂ کرام شہید ہوئے اور مدینہ لوٹا گیا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے مقابلہ کے لئے ایک لشکرِ جرّار مکہ معظمہ کو روانہ کیا جہاں اس لشکر نے اتنی آگ اور پتھر برسائے کہ حرم کعبہ کا غلاف تک جل گیا۔ ان واقعات سے یزید کے متشددانہ اور جابرانہ میلانات اور طرزِ عمل کی تصدیق ہوتی ہے۔ یزید کے شخصی خصائل کا دامن بھی بے داغ نہیں ہے۔ اس کے حرم میں کئی بیویاں موجود تھیں۔" (تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۷۶)

"ان امور سے قطع نظر اگر جمہور مسلمین نے یزید کو بہ طیب خاطر خلیفہ منتخب کر لیا ہوتا تو اس کی ذمہ داری بہت کچھ گھٹ جاتی لیکن افسوس ہے کہ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں اس اثر و نفوذ کو استعمال کر کے جو بحیثیت امیر انہیں حاصل تھا یزید کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ **یہ وہ پہلی بدعت تھی** جس سے اسلامی نظامِ حکومت اور حُریت کی روح مجروح ہوگئی اور اسلام کے سیاسی نصب العین کو یہ ایسا کاری زخم پہنچا جو آج تک مندمل نہ ہو سکا۔ کہا جاتا ہے کہ یزید کی جانشینی کے مسئلہ پر حضرت امیر معاویہؓ کے ہم عصر صحابہ سے شوریٰ کر کے رائیں حاصل کر لی تھیں لیکن تاریخی شواہد سے اس دعویٰ کی تردید ہوتی ہے۔" (داستانِ کربلا ص ۱۴۰)

مذکورہ بالا اقتباسات درج کرنے کے بعد ہم قارئین کرام کی خداداد ذہانت پر چھوڑتے ہیں کہ وہ محترم مولف موصوف اور سعید صدیقی کے بیانات و دلائل کا موازنہ کر کے خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ حق کس طرف ہے؟

فاضل محقق کی تاریخی معلومات کا یہ عالم ہے کہ آپ عبداللہ بن زبیرؓ کو ہاشمی سمجھتے

ہیں حالانکہ وہ بنی اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔" یاقی دونوں ہاشمی تھے اور دونوں نے بہت ہاتھ مارے" کا فقرہ خصوصی توجہ طلب ہے۔ ہم اس باب میں انشاء اللہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ امام حسین ؑ نے حصولِ حکومت کے لئے قطعاً کوئی ہاتھ پاؤں نہیں مارے البتہ مولف مذکور نادانستہ طور پر غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں یا دانستہ طور پر اخفائے حق سے اہلبیتِ نبوت کے خلاف موروثی عقیدت وکینہ پروری کا ثبوت دیا ہے جو ایک منصف مزاج مؤرخ کی شان کے شایان نہیں۔" لونڈے" کے لفظ کے اندر بھی ایک طنز موجود ہے جس کا اشارہ حضرت امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف ہے۔

فاضل مولف آگے چل کر لکھتے ہیں :۔ " شہادتِ امام حسینؑ کا واقعہ تمام مؤرخین نے لکھا ہے لیکن ابن خلدون نے جو ایک محقق مؤرخ ہے خاموش ہے۔ اس نے اس واقعہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ (معترض مولف کی دوسری غلط فہمی یا غلط بیانی) ہمارے زمانہ میں بعض محققین نے اس امر کا سرے سے انکار کر دیا ہے جو حضرات فلسفہ تاریخ سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ جس واقعہ کو غیر معمولی شہرت دی جائے اس کی تہ میں سیاسی اغراض ہوتی ہیں جو عوام سے پوشیدہ رکھی جاتی ہیں اور ایسا واقعہ یا تو سرے سے جھوٹ کا طومار ہوتا ہے یا اس میں " دو پیمانہ آب است ویک چمچہ دوغ "۔ لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ واقعہ رونما ہوا۔ یزید خاموشی سے حسینؑ کو خروج کرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر حسینؑ انکارِ بیعت پر اکتفاء کرتے تو معاویہ کی طرح یزید بھی طرح دیتا۔ ہمارے زمانہ میں جس لعنت وملامت کا نشانہ بنا ہوا ہے اس سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ خلافت سے دست بردار ہو جاتا۔ اس کے بیٹے نے یہی سیاسی غلطی کی اور دنیائے اسلام نے دیکھ لیا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ شہادتِ حسینؑ کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے اور شہادتِ عثمانؓ کو

نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اگر امام حسینؑ حضرت علیؑ کے بیٹے ہیں اور حضرت علیؑ آنحضرتؐ کے داماد ہیں تو کیا ذوالنورین کو یہ فخر حاصل نہیں۔ حضرت علیؑ آنحضرتؐ کے چچا کے بیٹے ہیں مگر اس قرابت کا لحاظ اگر وجہ انتخابِ خلافت ہوتی تو یہ ضرور کیا جاتا جو کبھی نہیں کیا گیا۔ بات اصل میں یہ ہے ؎

عروسِ ملک کسے درکنار گیرد چست　　کہ بوسہ بر لبِ شمشیر آبدار زند

اس بہادر سپاہی نے تجربہ کیا کامیاب نہ ہوا۔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔"

(خلافتِ اسلامیہ۔ ص ۸۱)

مولف مذکور کی غلط بیانی اور اخفائے حق کی ناکام کوشش کے متعلق مختصر سا اشارہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اب دوسری چیز ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کے نزدیک محقق کی تعریف یہ ہے کہ محقق دورِ جدید کا وہ پیشہ ور مورخ ہے جو واقعۂ کربلا کا سرے ہی سے انکار کر دے۔ کیونکہ واقعہ کربلا کے ذکر سے اموی بدکرداریاں اور بداعمالیاں منظرِ عام پر آتی ہیں۔ مولف موصوف یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی حق پرست، حق گو فرد ان اموی بزرگوں کی بدکاریوں کا علانیہ ذکر کرے۔ ان کا خیال ہے کہ واقعۂ کربلا سرے سے جھوٹ کا طومار ہے جس کو سیاسی اغراض کے تحت غیر معمولی شہرت دی گئی ہے۔ بفرضِ محال اگر اس میں کچھ حقیقت بھی ہے تو بہت تھوڑی، زیادہ جھوٹ ملا ہوا ہے۔

کیا اس سے بڑھ کر تاریخی حقائق کو جھٹلانے کی کوئی اور سعی ہو سکتی ہے؟ کیا یہ حق پوشی و غلط بیانی کی انتہا نہیں؟ اہلِ بیتِ رسالت سے غیر معمولی بغض و عداوت اور کینہ و عناد ان الفاظ کے معانی میں مضمر ہے۔ آلِ رسولؐ پر جور و جفا کی ابتدا کسی ایسی افسوسناک گھڑی سے ہوئی کہ ان بزرگوں کی موت بھی اس ایذا رسانی کو ختم نہ کر سکی۔ صدیاں گزر چکی ہیں کہ حضرت حسینؑ کو نیزہ و تلوار اور خنجر و سنان کے ذریعے زخم پہنچانے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے مگر زبان کی تلوار سے ابھی تک برابر گھاؤ لگائے جا رہے ہیں۔

اقتباس کا آخری فقرہ " مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا " کیا طنز نیش زنی نہیں جو نوکِ قلم سے پہنچائی گئی ہے۔ سانحۂ کربلا کو غیر معمولی شہرت دینے والے وہ قدرتی آثار تھے جن کا مفصل ذکر ہم گذشتہ باب میں کر چکے ہیں۔ مزید براں انبیائے کرامؑ اور جناب رسالتمآبؐ کی وہ بے شمار پیشین گوئیاں تھیں جو بتواتر ہم تک پہنچی ہیں اور جن پر گذشتہ ابواب میں تفصیلاً بحث کی جاچکی ہے۔ یہ انسانی کوشش کا نتیجہ نہ تھا انسانی کوششوں نے ذکرِ حسینؑ کو دبانے کے لئے اپنی حکومتوں کی پوری طاقت اور پورا زور صرف کردیا لیکن ذکرِ حسینؑ نے نہ دبنا تھا لہٰذا نہ دبا۔ مساجد کے منبروں پر چڑھ کر اور کوچہ و بازار میں حضرت علیؑ اور اولادِ علیؑ پر علانیہ تبرا کرنے اور کرانے کی بدعت جس کی ابتدا معاویہ نے کی تھی کم وبیش ستر سال تک پورے زور شور سے جاری رہی خواجہ حسن بصریؒ جیسے مقتدر شخص حضرت علیؑ کا نام لے کر کسی حدیث کو روایت کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے کیونکہ حکومت کے تشدد کی بناء پر قطعِ زبان لازم آتی تھی۔ اموی خلفاء کے جانشین عباسی خلفاء ہوئے جو اہلِ بیتِ رسولؐ پر غضب ڈھانے اور تشدد روا رکھنے میں اپنے پیشروؤں سے بھی بازی لے گئے تھے۔ ان حقائق کی موجودگی میں مولف مذکور کا قول کس قدر افترا پردازی پر مبنی ہے کہ سانحۂ کربلا جھوٹ کا طومار ہے جس کو سیاسی اغراض کے تحت غیر معمولی شہرت دی گئی ہے۔ کیا نبی کریمؐ کی تمام پیشینگوئیاں جن سے کتب احادیث و تفاسیر و تواریخ مملو ہیں (العیاذ باللہ) خرافات ہیں جو آئمہ احادیث و بزرگانِ دین نے سیاسی اغراض کے تحت وضع کی ہیں۔ حاشا ثم حاشا۔ ھٰذا بھتانٌ عظیم۔

اب ہم مولف موصوف کے بیان کے دوسرے حصہ پر بحث کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اگر امام حسینؑ محض انکارِ بیعت پر اکتفا کرتے تو یزید بھی معاویہ کی طرح درگزر سے کام لیتا مگر حضرت حسینؑ نے یزید کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر کے

یزید کے لئے صرف دو راستے باقی رکھے یا تو وہ تخت سے دستبردار ہوکر اسی سیاسی غلطی کا ارتکاب کرتا جو اس کے بیٹے معاویہ ثانی نے کی اور جو مسلمانوں کی خانہ جنگی و تباہی پر منتج ہوتی یا یہ کہ یزید بغاوت کو بزورِ شمشیر دبا دیتا۔ چونکہ یزید معاویہ ثانی کی نسبت زیادہ بہتر سیاسی شعور و تدبر رکھتا تھا اس لئے اس نے دوسری راہ اختیار کی اور حکومت سے دست بردار ہونے کی بجائے باغیانہ مزاحمت کو فوجی قوت سے توڑ دیا۔ بالفاظ دگر حضرت امام حسینؑ نے یزید کے خلاف خروج کیا تھا اور یزید کو مجبوراً جنگ کر کے انہیں قتل کرنا پڑا۔ لہٰذا یزید نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ ہی وہ اس لعنت ملامت کا مستحق ہے جس کا دورِ حاضرہ میں وہ نشانہ بنا ہوا ہے۔

محمود عباسی کا موقف

اس مقام پر محمود احمد عباسی مولف " خلافت معاویہ و یزید " کا موقف اور اس پر ملک غلام علی صاحب کی تنقید کسی ترمیم و تنسیخ کے بغیر نقل کر دیتے ہیں تاکہ انصاف پسند حضرات حق و باطل میں خود ہی تمیز فرمالیں۔ علامہ مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ اس پر ملک غلام علی صاحب نے " **اعتراضات کا تجزیہ** " نامی کتاب مرتب فرمائی جس میں ملک صاحب ممدوح تحریر فرماتے ہیں :-

" نیز یہ بھی ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کے بعد یہ بات ایک سنّتِ جاریہ اور عادتِ مستمرہ کی حیثیت اختیار کر گئی کہ خلیفہ اپنی زندگی ہی میں اپنے خاندان کے کسی فرد کو ولی عہد مقرر کر دے اور اس کی بیعت لے لے اس سے مسلمانوں میں انتخابی خلافت کا طریقہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اور اسکی جگہ بادشاہت یا آمریت نے لے لی۔ جہاں تک یزید کا تعلق ہے، بعض علمائے اہلِ سنت نے

اب تک اس کے دفاع میں جو کچھ کہا ہے وہ بس اس حد تک ہے کہ " اسے کافر کہنا اور اس پر لعنت کرنا جائز نہیں۔ وہ ایک مسلمان حکمران تھا۔ ولایتِ عہد کے وقت تک اس کا فسق و فجور اکثر کے علم میں نہ تھا اور امام حسینؓ کا قتل اس کے ایما پر نہیں ہوا۔ اگرچہ اس نے قاتلینِ حسینؓ سے باز پرس بھی ضروری نہیں سمجھی۔" اس سے آگے بڑھ کر علمائے اہل سنت میں سے کسی نے بھی کوئی بات یزید کے حق میں نہیں کہی ہے۔

اب اہل سنت کے اس محتاط مسلک اور ان پیش کردہ تصریحات کے بالکل برعکس اور عین ضد میں ایک نیا موقف ہے جسے محمود عباسی صاحب نے اختیار کیا ہے انہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کے انعقاد ہی کو سرے سے مشتبہ بنانے کی سعیٔ ناکام کی ہے تاکہ ان کا خلیفۂ راشد ہونا اور اپنے مخالفین کے مقابل میں برسرِ حق یا کم از کم اولیٰ بالحق ہونا ہی مشکوک ہو جائے۔ پھر جب نوبت یزید تک پہنچی ہے تو یہاں آکر عباسی صاحب کی دیدہ دلیری اور خیرہ چشمی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے ان کے نزدیک " امیرالمومنین یزیدؓ " کی خلافت پر جیسا اجماعِ امت ہوا ہے ایسا اجماعِ امت حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور ان کے بقول :۔

"صحابہ و تابعین ، ہاشمی و اموی اکابرین سب نے ہر دلعزیز ولی عہد کی بیعتِ خلافت خوش دلی کے ساتھ کی۔ البتہ مسند نشینی کی خبر سنتے ہی دونوں طالبانِ خلافت حضرت حسینؓ و ابن زبیرؓ کسی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق گورنر مدینہ کو جھکمہ دے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ موتِ معاویہؓ کا انتظار ہو رہا تھا۔" (تحقیق مزید۔ ص ۲۳۱)

ہٹ دھرمی کا کمال یہ ہے کہ امام حسینؓ کے سرفروشانہ اور مجاہدانہ اقدام کو عباسی صاحب نے " امیر یزید" کی خلافت کے خلاف باغیانہ خروج قرار دیا ہے اور ابن خلدون نے یزید اور اس کی ولایتِ عہد کے متعلق ہر ممکن صفائی پیش کرنے کے باوجود چونکہ

یزید کے فسق و فجور کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ابن العربی کے اس قول کو غلط قرار دیا ہے کہ امام حسینؓ کا قتل شرعاً جائز تھا کیونکہ وہ یزید کے بالمقابل مدعیٔ خلافت تھے۔ اس لئے عباسی صاحب کہتے ہیں :-

"ابن خلدون نے حضرت حسینؓ کے اقدامِ خروج پر جہاں گفتگو کی ہے وہاں ان کی پوزیشن کو صاف کرنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انہوں نے ولی عہدی کی بیعت کے سلسلہ میں تو بہت اچھی بحث کی ہے جسے کتاب "خلافت معاویہؓ و یزید" میں نقل کرتے ہوئے تحسین بھی کی گئی لیکن اقدامِ خروج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے میں شاید عقیدتِ حسینؓ ان کے مانع آئی۔ عقیدت کی بات اور ہے اور وقائع تاریخی کی بے لاگ ریسرچ شئے دیگر است۔" (تحقیق مزید۔ ص ۲۳۲)

اس "ریسرچ شئے دیگر است" کے نادر نمونے عباسی صاحب کی تحریروں میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ صرف دو طالبانِ خلافت کے ماسوا پوری امتِ مسلمہ نے ہر دلعزیز ولی عہد کی بیعت جس بیقراری کے ساتھ کی، اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے عباسی صاحب نے "تحقیق مزید" میں ایک باب "صحابۂ رسولؐ اور یزیدؒ کی بیعتِ ولیعہدی و خلافت" کے نام سے رقم کیا ہے اور سو سے زائد صفحات میں ان تمام صحابہ کرام اور امہات المومنین کے اسماء و تراجم بیان کر دیئے ہیں جو یزید کی ولیعہدی کے وقت زندہ تھے اور جن کے حالات مولف کو مل سکے ہیں۔ گویا ان اصحاب کا بقیدِ حیات ہونا اور بیعتِ یزید کے وقت دنیا سے اٹھ نہ جانا بجائے خود اس امر کا زندہ ثبوت ہے کہ انہوں نے پوری خوشدلی اور آمادگی کے ساتھ لپک کر یزید کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی تھی۔ عباسی صاحب نے فقط ان حضرات کے نام گنوانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ احادیثِ صحیحہ کا مفہوم مسخ کرنے اور واقعاتِ ثابتہ کا حلیہ بگاڑنے میں کوتاہی نہیں کی۔" (خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ ص ۵۲۷-۵۲۹)

محمود عباسی کے ہمنوا حضرات کے موقف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ کیا امام حسینؑ نے یزید کے خلاف باغیانہ خروج کیا؟ ہم حضرت امامؑ کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے ایسے چودہ نکات پیش کریں گے جن سے انشاء اللہ یہ بآسانی ثابت ہو سکے گا کہ نواسۂ رسولؐ نے حکومتِ شام کے خلاف مطلقاً کوئی بغاوت نہیں کی بلکہ عالی منزلت امامؑ نے ایسے حالات میں بھی جب کہ حکومتِ یزید کے خلاف کامیاب بغاوت کے مواقع موجود تھے، اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر امن پسندی و رواداری کو لائحہ عمل بنایا۔ اگر فی الحقیقت آپ بغاوت کرتے تو اس صورت میں آپ کا رویّہ موجودہ طرزِ عمل سے بالکل متضاد ہوتا اور ہونا چاہئے تھا۔

۱۔ امام حسنؑ کی خلع خلافت سے وفاتِ معاویہ تک امام حسینؑ کی بیس سالہ خاموشی :-

تمام موافق و مخالف کتبِ تواریخ کا مطالعہ اس امر واقعہ کی پُر زور تائید کرتا ہے کہ امامؑ نے بیسؔ سالہ زندگی کا طویل عرصہ خاموشی اور گوشہ نشینی میں گزار دیا۔ کسی بیرونی جماعت سے نہ خط و کتابت تھی اور نہ ہی حکومت کے خلاف کسی سیاسی منصوبہ کو بروئے کار لانے کی کبھی سعی کی۔ جو شخص کسی منظم و مستحکم حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے وہ پہلے طویل عرصہ تک اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے تیاری کرتا رہتا ہے۔ ہم خیال لوگوں کی جماعت پیدا کرتا ہے۔ مادی وسائل جمع کرتا ہے اور درپردہ وہ تمام ذرائع فراہم کرتا ہے جو اس کے خیال کے بموجب حکومت کا تختہ الٹ دینے کے لئے کافی و وافی ہوتے ہیں۔ جب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب ٹکر لینے کے لئے کافی طاقت فراہم ہو چکی ہے تو وہ یک لخت اٹھ کر ملک میں ایک خونی انقلاب بپا کر دیتا ہے۔ امام حسینؑ کا طرزِ عمل صاف بتا رہا ہے کہ آپ کو حکومت کے ساتھ مادی ٹکر لینے کا کبھی

خیال بھی پیدا نہیں ہوا برعکس اس کے امیر معاویہ کی خلافت اس بیس سال کے عرصہ میں کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اگر امامؑ کا مقصد ملک کے اندر مادی انقلاب بپا کرنا ہوتا تو آپ بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرتے جو ابراہیم و سفاح عباسی نے ابومسلم خراسانی کے گٹھ جوڑ سے کیا۔ دمشق کے دارالخلافہ سے دور، خراسان کو اپنی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنایا اور سلطنت کے طول و عرض میں اپنے خفیہ داعیوں کا جال پھیلایا جنہوں نے اموی حکمرانوں کے ظلم و ستم کی داستانیں عوام کو سنا کر اتنا منظم پراپیگنڈہ کیا کہ ہر شہر اور ہر قریہ میں عباسیوں کے ہواخواہوں کی کثرت ہوگئی۔ آخر جب مرو میں سیاہ جھنڈا کھولا گیا تو لاکھوں آدمی امویوں کی بیخ کنی کے لئے اس جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے اور بچانوے سال مضبوط اموی حکومت کو اس طرح تباہ و برباد کرکے رکھ دیا کہ دائمی طور پر امیہ کا نام و نشان مٹ گیا اور آئندہ عباسیوں کی راہ سے اموی بغاوت کا کانٹا ہمیشہ کے لئے دور ہوگیا۔ امام حسینؑ کی خاندانی وجاہت اور ذاتی اثر و رسوخ ابراہیم و سفاح عباسی سے یقیناً زیادہ تھا۔ اگر آپ عبداللہ بن عباسؓ کے مشورے کے مطابق مرکزِ حکومت سے دور، یمن کی دشوار گزار پہاڑیوں میں جاکر قیام کرتے، قلعہ بند ہوکر بیٹھ جاتے اور قاصدوں کے ذریعہ اپنی دعوت پھیلاتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ عباسیوں کی طرح حکومتِ شام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ نہ پھینکتے لیکن جیسا کہ بیشتر بیان ہوچکا ہے کہ امامؑ یزید سے تخت و تاج چھیننے کے متمنّی نہ تھے۔

عبداللہ بن عباسؓ کے مشورہ کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

جب روانگی کی گھڑی بالکل قریب آگئی تو ابن عباسؓ پھر دوڑے آئے اور امامؑ کو ارادہ سے باز رکھنے کے لئے کہنے لگے :۔

"اگر آپ حجاز سے جانا ہی چاہتے ہیں تو یمن چلے جائیے وہاں قلعے اور دشوار گزار پہاڑ ہیں۔ ملک کشادہ ہے۔ آبادی عموماً آپ کے والد کی خیر خواہ ہے۔ وہاں آپ

ان لوگوں کی دسترس سے باہر ہونگے۔ خطوں اور قاصدوں کے ذریعہ اپنی دعوت پھیلائیے گا مجھے یقین ہے اس طرح آپ کامیاب ہوجائیں گے لیکن حضرت امام حسینؑ نے جواب دیا۔" اے ابن عم! میں جانتا ہوں تم میرے خیر خواہ ہو لیکن میں اب عزم کر چکا ہوں۔" (داستان کربلا ابوالکلام آزاد۔ ص ۳۶۔۳۷)

حضرت حسینؑ نے اس موقع پر ابن عباسؓ کی رائے کی تردید نہ فرمائی اور یہ نہ فرمایا کہ آپ غلط کہتے ہیں بلکہ اپنے عزم کو اس مشورہ کا سدِّراہ سمجھا۔ امام مادی انقلاب بپا کرنے کی بجائے اپنی عظیم الشان قربانی سے خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کا عزمِ صمیم کئے ہوئے تھے اور اسی غیر متزلزل عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یمن کی طرف قدم بڑھانے کی بجائے، خطرات کی تلاطم خیز موجوں سے لپٹ جانے کے لئے، سرورِ دو عالمؐ کی پیشینگوئی کے مطابق ارضِ بابل، زمین طف اور ریگزارِ کرب و بلا کی تلاش میں نکلے۔ اس حقیقت پر غور کرنے کے بعد کوئی یزیدی حواری اور دشمنِ رسولؐ ہی امام حسینؑ کے طرزِ عمل کو بغاوت سے تعبیر کرے گا۔

۲۔ یزید کی غیر آئینی و غیر اسلامی ولیعہدی کے باوجود امامؑ کی خاموشی :۔

امام حسنؑ کی خلع خلافت کے وقت امیر معاویہ نے حضرت امام حسنؑ سے جو معاہدہ کر رکھا تھا اس میں دیگر شرائط کے علاوہ ایک یہ شرط بھی تھی کہ امیر معاویہ اپنے بعد کسی کو ولی عہد و جانشین مقرر نہیں کرے گا بلکہ خلافت امام حسنؑ کی جانب لوٹ آئے گی۔ (البدایہ والنہایہ، ابن کثیر شامی) امیر معاویہ نے امام حسنؑ کو زہر دے کر بزعم خود معاہدہ کی اس شرط سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔ امیر معاویہ کی اس مذموم سازش کا تذکرہ تاریخ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ (مروج الذہب للمسعودی الجزء الثانی ص ۳۰۳ تاریخ ابوالفدا۔ الجزء الاول ص ۱۸۲۔ تاریخ حبیب السیر۔ جلد دوم جزء اول۔ ص ۱۸)

پس بروئے معاہدہ خلافت حضرت امام حسنؑ کا حق تھا اور آپ کی شہادت کے بعد آپ کے ورثا اس کے حقدار تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ امام حسنؑ چونکہ معاویہ کی زندگی میں انتقال فرما گئے تھے اس لئے حکومت وہیں رہے گی جہاں پہلے تھی۔ معاویہ بلاشک وشبہ بالواسطہ حضرت امام حسنؑ کے قاتل تھے جنہوں نے آپ کی زوجہ جعدہ بنتِ اشعث کو ایک لاکھ درہم دے کر خود زہر بھیج کر امامؑ کو قتل کرادیا تھا۔ شرع محمدی کی رُو سے کوئی قاتل مقتول کی موت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر قاتل مقتول کا وارث ہے تو بوجہ قتل ورثہ سے محروم ہو جائے گا۔ پس اس اصولِ شریعت کی رُو سے بھی حکومت امامِ حسنؑ کے وارثِ اکبر جناب امام حسینؑ کو پہنچتی تھی۔ یزید تو کسی طرح اس کا حقدار نہ تھا۔ امیر معاویہ خود بھی باغی و غاصب تھے۔ یزید کا تقرر بھی غاصبانہ و مجرمانہ تھا۔ جب سوادِ اعظم کے عقیدہ کے بموجب خود نبی کریم صلعم کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ آنحضرتؐ اپنا وصی و جانشین نامزد کریں اور نہ ہی یہ جناب شیخینؓ کی سنّت تھی تو پھر امیر معاویہ کو کیا حق حاصل تھا کہ وہ اپنے بدکردار و نااہل بیٹے کے ہاتھ میں مسلمانوں کی زمامِ امور سونپ دیں، لہٰذا اس غیر آئینی و غیر اسلامی تقرر کے موقع پر حضرت امام حسینؑ ہر طرح سے مجاز تھے کہ آپ بلادِ اسلامی میں خطوط و وفود بھیج کر احتجاجی جلسے برپا کراتے، اس فتنۂ وراثت کے قلع قمع کے لئے ایک زوردار و ہمہ گیر تحریک شروع کر دیتے اور یزید کے تمام مخالفین عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ کا اشتراکِ عمل حاصل کر لیتے۔ کیونکہ دشمن کا دشمن بھی ایسے موقعوں پر دوست کا کام دے سکتا ہے۔ گذشتہ جنگِ عالمگیر میں ہٹلر کے خلاف چرچل و سٹالن کا اتحادِ عمل اسی نوعیت کا تھا۔ یقیناً امام کا اس طرح اشتراکِ عمل منظم و مؤثر بغاوت کی صورت میں رونما ہوتا۔ جب آپ دیکھ رہے تھے کہ اموی اقتدار کی بدولت حکومت بنی ہاشم کے پنجہ میں نہیں آسکتی تو آپ عبداللہ بن زبیرؓ کے ہی معاون بن جاتے اور حصولِ حکومت میں ان کی امداد کرتے کیونکہ تمام دنیادار مادہ پرستوں کا یہی شیوہ

ہے کہ جب یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مطلوبہ چیز اپنے ہاتھ میں نہیں آسکتی تو کوشش کرتے ہیں کہ غیر کے پاس چلی جائے لیکن دشمن کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اگر اسی اصول پر اس تحریک کو تھوڑا عرصہ پہلے ام المومنین حضرت عائشہ رض کی زندگی میں شروع کردیا جاتا تو کامیابی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ حضرت عائشہ رض اپنے بھانجے ابنِ زبیر رض کی ضرور خاطر خواہ امداد کرتیں۔ نتیجتہً امیرِ شام کی راہ میں مشکلات کی دلدل حائل ہوجاتی جس کا بآسانی مسمار کرنا محال تھا۔ امیر معاویہ بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے۔ حضرت عائشہ رض کی دھمکی پر انہوں نے یزید کی ولیعہدی کا مسئلہ معرضِ التوا میں ڈال دیا تھا اور جناب ام المومنین رض کے وجودِ گرامی کو راستے سے صاف کرنے کے بعد بار دگر اس مسئلہ کو طے کرنے کی ابتدا کی تھی۔

امام نے ابنِ زبیر رض کی کوئی امداد نہ کی بلکہ ہر ایسے طرزِ عمل سے علیحدگی اختیار کرکے بتا دیا کہ وہ حکومت کے کام میں روڑا نہیں اٹکانا چاہتے۔ آپ نے اپنی حق تلفی کو انتہائی صبر و سکون سے برداشت کیا۔ کیا وہ شخص جو کسی حکومت کے خلاف بغاوت کی سکیمیں سوچ رہا ہو ایسے موقعوں پر خاموش رہ سکتا ہے؟ امام حسین ؑ نے اس موقع پر نہ صرف عملاً کوئی اقدام کیا بلکہ کوئی احتجاجی مراسلہ تک بھی امیر معاویہ کے نام نہ بھیجا۔ یہ خیال کرنا کہ امیر معاویہ کے جاہ و حشم سے مرعوب ہوکر امام ؑ احتجاج نہ کرسکے، پرلے درجہ کی حماقت اور تاریخی شعور کا فقدان ہوگا۔ امام ؑ کی بہادری و شجاعت نے میدانِ کربلا میں اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ ایسا مردِ شجاع امیر معاویہ سے کیسے مرعوب ہوسکتا تھا۔ مزید براں امام ؑ حجر کندی اور عمرو بن الحمق الخزاعی کے ظالمانہ قتل پر معاویہ کو احتجاجی خط لکھ چکے تھے جس میں معاویہ کی بدکرداریوں و بداعمالیوں کو اس طرح بے نقاب کیا تھا کہ امیر معاویہ تلملا اٹھے اور غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگے۔

پس حضرت امام حسین ؑ موزوں وقت پر خروج کے لئے نہ اٹھے تو غیر موزوں وقت پر کیوں اٹھتے۔ لہٰذا ابنِ رسول ؐ پر خروج کا الزام دورِ حاضرہ کے پیشہ ور مخدعین

اور جدت پسند حضرات کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو تیرہ صدیوں کے بعد باطل کو حق کا لباس پہنا کر نئی تھیوری دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ بغاوت کا موزوں ترین وقت اور امامؑ کی امن پسندی

بغاوت کا علم بلند کرنے کے لئے موزوں ترین وقت وہ تھا جب امیر معاویہ کی اچانک موت واقع ہو چکی تھی اور یزید پر مستی و مدہوشی کا عالم طاری تھا۔ ایک مطلق العنان جابر حاکم کے خلاف عوام کے دلوں میں قدرتاً ایک جذبۂ نفرت ہوتا ہے جو اس کی موت پر ایک ہمہ گیر اضطرابی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ نظامِ حکومت میں انتہائی کمزوری آجاتی ہے۔ ولید حاکمِ مدینہ کے پاس اس وقت کوئی خاص فوج بھی موجود نہ تھی امامؑ ہاشمیوں کی طاقت کو بروئے کار لاکر مروان اور ولید کو قتل کر دیتے اور پھر آسانی کے ساتھ مدینہ پر مسلط ہو جاتے۔ اطراف و جوانب میں خطوط لکھ کر، قاصد بھیج کر اور اپنے داعی پھیلا کر ایک لشکرِ عظیم فراہم کر سکتے تھے۔ آپ کے معاونین اکنافِ سلطنت میں پھیل جاتے، لوگوں کو یزید کے خلاف اکساتے اور اس کے غیر آئینی وغیر اسلامی تقرر کے خلاف منظم پروپیگنڈا کر کے عوام کو ہمخیال بناتے۔ چونکہ لوگ یزید کی بدکرداریوں و بداعمالیوں کی وجہ سے پہلے ہی اس سے متنفر تھے اور صالح قیادت کے طلب گار تھے فوراً نواسۂ رسولؐ کی حمایت میں جمع ہو جاتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ امامؑ ایک طویل سلسلہ حرب و ضرب کا آغاز کر سکتے تھے۔ اگر جناب حسینؑ کے لئے نتیجہ مشکوک ہوتا تاہم یزیدی افواج بھی بآسانی غالب نہ آسکتی تھیں۔ کربلا کے میدان میں بہتر ۷۲ اشخاص کی محدود تعداد نے بھوک اور پیاس کے عالم میں تیس ہزار فوج کا جس بے جگری اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا ہے ثابت کرتا ہے کہ اگر جناب امام حسینؑ کی فوج کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تو حکومتِ شام ان کو آسانی سے دبا نہ سکتی تھی

آخر عبداللہ بن زبیرؓ کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ نو سال تک حکومتِ شام کا مقابلہ کرتے رہے۔ امیر مختارؒ نے صرف نواحِ کوفہ پر قابض ہو کر بیک وقت دو مخالف منظّم حکومتوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور ہزاروں قاتلانِ حسینؑ کو جہنم واصل کر دیا اس میں شک نہیں کہ امیر مختارؒ بالآخر شہید ہو گئے لیکن انہیں دو مخالف طاقتوں حکومتِ شام اور حکومتِ ابن زبیر کے درمیان پھنس کر بیک وقت دونوں محاذوں پر لڑنا پڑتا تھا۔ مزید براں قاتلانِ حسینؑ کے قتلِ عام سے خود کوفہ کے اندر بھی انتہائی خلفشار موجود تھا۔ پھر بھی اگر ان کا جرنیل ابراہیم بن مالک اشترؒ بروقت ان کی امداد پر پہنچ جاتا تو مختارؒ نہ شامیوں سے شکست کھا سکتے تھے اور نہ اہلِ بصرہ ان پر غالب آ سکتے تھے۔ بلا خوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امیر معاویہ کی موت خروج کے لئے موزون ترین موقع تھا۔ جناب امام حسینؑ تو ایسے موزوں موقع پر انتہائی خاموشی اور صبر و سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یزیدی حکومت کے خلاف خروج نہیں کرتے۔ آخر وہ کون سا طلسماتی بٹن آپ کے ہاتھ آجاتا ہے کہ آپ نہایت ہی غیر موزوں موقع پر، بغیر کسی سابقہ تیاری اور سامانِ حرب و ضرب کی فراہمی کے محدود وسائل و ذرائع کے ساتھ، ایک منظّم حکومت کے خلاف، صرف چند نفوس لے کر جن میں بوڑھے بچے اور عورتیں بھی شامل ہیں خروج کرنے اٹھتے ہیں۔ امامؑ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ جمل و صفین کی جنگوں میں شریک رہ چکے تھے۔ فوجی زندگی اور لڑائی کا ذاتی تجربہ رکھتے تھے اموی مکر و فریب سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ کیا ساوَن سالہ امام حسینؑ (العیاذ باللہ) اتنا بھی نہ سوچ سکتے تھے جتنا کہ ایک معمولی فہم کا انسان سوچ بچار کر سکتا ہے۔ آپ یقیناً بہتر سوچ سکتے تھے اور آپ نے وہی سوچا جو ایک امامِ ہدیٰ اور روحانی پیشوا کو سوچنا چاہیئے تھا وہ یہ کہ حکومتِ شام کے خلاف کوئی مادی جارحانہ جنگ نہ لڑی جائے لیکن حمایتِ باطل سے علیحدہ رہ کر امن سوزی و خونریزی کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر عائد نہ کی جائے۔ اگر

امن پسندی و رواداری کے باوجود، باطل کی طاغوتی طاقتیں مجتمع ہوکر اس سر کو جو صرف معبودِ حقیقی کے آگے جھکنا جانتا ہے اور جس کی نگاہ میں دنیوی جاہ و جلال ایک پرِ کاہ کی حیثیت نہیں رکھتا یزیدِ پلید کے ناپاک قدموں میں جھکانا چاہیں تو نمرودِ مردود کے سامنے نہ جھکنے والا ابراہیمی سر کسی فرعون و یزید کے سامنے بھی نہ جھکے گا۔ نہ جھکنے والے مقدس سر نے اپنی عزم کر رکھا تھا کہ اگر تن سے سلسلہ ارتباط کٹ بھی جائے تو کسی ملعون کے آگے خم ہونے کی بجائے نوکِ سناں پر سوار ہوکر بلند سے بلند تر ہو جائے گا۔

ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

یہ تھے راہِ حق کے سالک حسینِ شہید جن کو حامیانِ یزیدیت بغاوت کا مجرم قرار دیتے ہیں۔

امامؑ کا تجربۂ سابقہ

اس مقام پر امام حسینؑ کے سابقہ تجربہ کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ کیا وہ ایسا تھا کہ آپ یزید سے حکومت چھین لینے کی امید کر سکتے تھے؟ انسان کے مستقبل کے ارادے، ماضی کے تجربات و حال کے امکانات کی بناء پر تشکیل پذیر ہوتے ہیں ہر اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے سابقہ تجربہ کی بناء پر مدتوں کی تیاری اور غیر معمولی محنت و کوشش درکار ہوتی ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ہٹلر نے رات کو سوچا ہو کہ جرمنی کو تمام یورپ پر چھا جانا چاہیے اور صبح اٹھتے ہی بغیر کسی سابقہ تیاری کے حملہ کر دیا ہو۔ انقلاب فرانس سرمایہ داری اور مفلسی کے درمیان سالہا سال کی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ خود نبی کریمؐ نے ایک ہی دن میں تمام عرب کو فتح نہ کر لیا تھا۔ پھر عقلِ سلیم یہ کب تسلیم کرتی ہے کہ امام حسینؑ جو گذشتہ بیس سال سے خاموشی و عزلت نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے یک لخت بغیر کسی سابقہ تیاری کے ایک منظم و مستحکم سلطنت کو تہ و بالا

کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیا امام حسینؑ اس بات سے غافل تھے کہ ان کے والدِ محترم ملک و لشکر کے باوجود امیر معاویہ سے ملکِ شام نہ چھین سکے اور ان کے برادرِ معظم سامان حرب و ضرب کے باوجود مجبور ہو گئے کہ حکومت امیر معاویہ کے سپرد کر دیں۔ کیا ان دونوں حضرات میں سے کسی نے لڑائی میں غلطی کی تھی جو امام عالیمقامؑ سمجھتے تھے کہ میں اس غلطی کا اعادہ نہ کروں گا۔ کیا امام حسینؑ کو یاد نہ تھا کہ حضرت علی مرتضیٰؑ نے بہت کوشش کی کہ لوگ امیر معاویہ کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں لیکن کسی نے اجابت نہ کی اور اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ امیر معاویہ نے اس عرصہ کے دوران اپنے ارکانِ سیاست، رشوت و زہر، مکر و فریب، دغا اور جھوٹ سے کام لے کر حضرت علیؑ کے نظامِ حکومت کو درہم برہم کر دیا تھا۔

امیر معاویہ کے کارنامے

اس مقام پر پہنچ کر اپنے ذاتی عقائد و نظریات سے قطع نظر، مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں پر زیادہ تر انحصار کرتے ہوئے حضرت امیر معاویہ کے کردار کے متعلق چند اقتباسات جن کو مستند تاریخی کتابوں کی تائید حاصل ہے نقل کرتے ہیں اور فیصلہ قارئین کرام کی ذہنی صلاحیت پر چھوڑتے ہیں کہ وہ خود اندازہ فرمالیں کہ ان حالات کے تحت حضرت امام حسینؑ کا اختیار کردہ لائحہ عمل درست تھا یا غلط۔ بمصداق مشتے از خروارے۔ امیر معاویہ کے چند کارنامے ملاحظہ فرمائیے:-

۱۔ حضرت علیؑ کے مشہور جرنیل مالک اشترؒ مصر کی طرف جا رہے تھے تاکہ فوجیں فراہم کر کے دمشق پر دونوں جانب سے حملہ کیا جائے۔ امیر معاویہ نے جب یہ سنا تو گھبرا گئے اور ایک زمیندار کو رقم کثیر رشوت میں دے کر اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اثنائے راہ میں مالک اشترؒ کی مہمانی کرے اور زہر آلود غذا کھلا کر انہیں قتل کر دے۔ اس طرح

سے امیر معاویہ کی یہ حیلہ سازی و مکاری کامیاب ہوئی اور مالک اشتر کا انتقال ہوگیا۔
(تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے حبیب السیر۔ جزو چہارم۔ جلد اوّل۔ ص ۷۲)
جب مالک اشتر سمندر تک جا پہنچے تو ایک شخص نے ان کو زہر کھلا دیا اور وہ مرگئے
امیر معاویہ کو خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ شہد میں بھی خدا کا لشکر ہے۔ (تاریخ ابوالفدا)
۲۔ حضرت علیؑ کے عامل مصر محمد بن ابوبکرؓ امیر معاویہ کے حکم سے قتل کئے گئے اور
ان کی لاش کو گدھے کی کھال میں بند کر کے جلا دیا۔ جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ
کو اپنے بھائی محمد بن ابوبکر کی شہادت کی خبر ملی تو وہ قنوت میں ہر نماز کے بعد معاویہ بن
ابی سفیان اور عمرو بن العاص کو کوستی تھیں۔ حضرت علیؑ کو محمد بن ابوبکرؓ کی شہادت کی خبر
ملی تو آپ بہت روئے اور فرمایا کہ اس کا حساب خدا کے یہاں ہوگا۔ (تاریخ ابوالفدا)
۴۔ بعد شہادت حسنؑ ۵۸ھ میں امیر معاویہ مطمئن ہو کر منبر رسولؐ پر بیٹھے اور لوگوں
کو یزید کی بیعت پر ابھارنے لگے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے پکار کر ڈانٹا اور معاویہ
سے پوچھا۔ کیا ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنے بیٹوں کے لئے بیعت لی تھی؟ پھر تم کس کی
پیروی کر رہے ہو؟ امیر معاویہ خاموش ہو گئے اور دل میں عداوت بیٹھ گئی۔ جب
تک حضرت عائشہؓ زندہ رہیں یزید کے معاملہ میں کامیابی نہ ہو سکی۔ (تاریخ ابوالفدا۔ جلد اول
مطبوعہ قسطنطنیہ ص ۱۸۸)

حضرت امیر معاویہ کے چند کارنامے عالی مرتبت جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
صاحب کی زبانی سنئے:۔

۴۔ **توریث مسلم من الکافر:۔** "امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ اور
چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے
نہ مسلمان کافر کا۔ حضرت معاویہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث
قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آ کر
اس بدعت کو موقوف کیا مگر ہشام بن عبدالملک نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر

بحال کر دیا۔" (خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۷۳۔ بحوالہ البدایہ والنہایہ ج ۸۔ ص ۱۳۹
ج ۹ ص ۲۳۲)۔

۵۔ **مسئلہ دیت** :۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دیت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی مگر حضرت معاویہ نے اس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی۔ ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں :۔ " **وکان معاویۃ اول من قصرھا الی النصف واخذ النصف لنفسہ** " (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۳-۱۷۴۔ بحوالہ البدایہ والنہایہ ج ۸۔ ص ۱۳۹)

۶۔ **تقسیم غنائم کا مسئلہ** :۔ " مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رو سے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم کئے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی۔ لیکن حضرت معاویہ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔" (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۴ بحوالہ طبقات ابن سعد۔ الطبری۔ الاستیعاب۔ ابن الاثیر۔ البدایہ والنہایہ)

۷۔ **حضرت علیؑ پر سبّ و شتم** :۔ ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؑ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؑ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے

آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبۂ جمعہ میں سب علیؑ کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی :۔ " اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ٥ (النحل ۹۰) (خلافت وملوکیت ص ۱۷۴، بحوالہ الطبری۔ ابن الاثیر۔ البدایہ)

۸۔ استلحاقِ زیاد :۔ زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ کے ان افعال میں سے ہے جس میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیّہ کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت معاویہ کے والد جناب ابو سفیان نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی سے وہ حاملہ ہوئی تھی۔ حضرت ابو سفیان نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد ان ہی کے نطفہ سے ہے۔ جوان ہو کر یہ شخص اعلیٰ درجہ کا مدبّر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا۔ حضرت علیؑ کے زمانۂ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں ان کے بعد حضرت معاویہ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد ان ہی کا ولدالحرام ہے پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلعم کا صاف حکم موجود ہے کہ " بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں"۔ ام المومنین حضرت امّ حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان سے پردہ فرمایا۔" (خلافت وملوکیت ص ۱۷۵، بحوالہ الاستیعاب۔ ابن الاثیر البدایہ والنہایہ۔ ابن خلدون

اب حضرت معاویہ کا یہی کارنامہ جناب مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنئے:-

"کیا زیاد بن سمیّہ کا استحقاق اور اس کے لئے مجلس شہادت منعقد کرنی ایک اولین بدعت نہ تھی۔ حالانکہ یہی زیاد تھا کہ جب اس نے حضرت فاروقؓ کے زمانے میں بشارتِ فتح پر خطبۂ فصیح دیا تو ابوسفیان اور حضرت امیرؑ منبر کے قریب بیٹھے تھے۔ ابوسفیان نے کہا" انّہٗ ابن عمک " یعنی یہ تو میرا بیٹا ہے۔ اس پر حضرت علیؑ نے کہا کہ پھر اس کو ظاہر کیوں نہیں کرتے۔ ابوسفیان نے حضرت فاروقؓ کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ شخص جو منبر پر بیٹھا ہے ڈرتا ہوں کہ اس ادعائے خلافِ شریعت پر برہم ہوگا۔

یہ ایک مشہور اور تفصیل طلب واقعہ ہے۔ عام ناظرین کی واقفیت کے لئے اس قدر لکھ دیتا ہوں کہ سُمیّہ جاہلیت کی ایک زانیہ و فاحشہ عورت تھی۔ ابوسفیان اس کے پاس رہا کرتا تھا اور اسی سے زیاد پیدا ہوا۔ لیکن اغراض سیاسیہ سے پھر اس کا استحقاق پیدا کیا اور اس کو اپنا بھائی قرار دیا۔ اس کے لئے ایک خاص مجلسِ شہادت بھی منعقد ہوئی تھی جس میں گواہوں کے اظہار لئے گئے تھے۔ ازاں جملہ ایک گواہ ابومریم الخمار تھا جس نے ابوسفیان کے لئے سمیّہ کو مہیا کیا تھا۔ ایسی شہادتوں سے بالآخر زیاد بھی شرما گیا۔

پھر کیا آپ اس سے انکار کریں گے کہ یہ ایک بدعت نہ تھی۔ خیر یہ تو ایک خاص واقعہ تھا اور اس زمانہ میں لوگوں نے اسکی تاویلیں بھی کیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا خلافت علیٰ منہاج النبوت کو حکومت میں بدل دینا بھی بدعت نہ تھی۔ کیا مسلمانوں پر جنگ میں پانی روک دینا بدعت نہ تھا۔ کیا خفیہ وسائس سے مسئلہ حکمین کا فیصلہ کرنا، اپنے اغراض سیاسیہ کے لئے لوگوں کو خفیہ و علانیہ بیت المال سے روپیہ دینا، مخفی طور پر بزور و جبر اپنے لڑکے کو ولی عہد بنانا، عجمی شان و شکوہ اور علو و رفعت سے دربار آرائی کی اساس

اولیں قائم کرنا، مسجد میں اپنے لئے عام مسلمانوں سے الگ مقصورہ بنا کر نماز پڑھنا اور شمشیر برہنہ نگہبانوں کی حصار کے اندر سجدہ کرنا اور اسی طرح کی دوسری محدثات کو بھی کیا بدعت تسلیم نہ کیا جائیگا اور پھر یہ تو خود امیر معاویہ کے زمانے کے حالات ہیں آگے چل کر جو کچھ ہوا اس پر نظر ڈالئے۔" (مکالمات ابوالکلام۔ ص ۱۴۹۔۱۵۰)

گورنروں کی زیادتیاں

۱۔ **عبداللہ بن عمرو بن غیلان :۔** "حضرت معاویہ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کاروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دوران خطبہ اس کو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا حالانکہ شرعی قانون کی رو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔" (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۵۔۱۷۶ بحوالہ ابن الاثیر، البدایہ)

۲۔ **زیاد بن سمیہ :۔** زیاد کو جب معاویہ نے بصرے کے ساتھ کوفہ کا بھی گورنر مقرر کیا اور وہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لئے کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اس پر کنکر پھینکے۔ اس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کرا دیئے اور کنکر پھینکنے والے تمام لوگوں کو جن کی تعداد تیس سے اسی تک بیان کی جاتی ہے گرفتار کرا کے اسی وقت ان کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ کوئی مقدمہ ان پر نہ چلایا گیا۔ کسی عدالت میں وہ نہ پیش کئے گئے۔ کوئی باقاعدہ قانونی شہادت ان کے خلاف پیش نہ ہوئی۔ گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطع ید کی سزا دے ڈالی جس کے لئے قطعاً

کوئی شرعی جواز نہ تھا مگر دربارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔
(خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۷۶۔ بحوالہ الطبری۔ ابن الاثیر)

۲۔ **بُسر بن ارطاۃ**:۔ اس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بُسر بن ارطاۃ نے کئے جسے حضرت معاویہ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؑ کے قبضہ سے نکالنے کے لئے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ اس شخص نے یمن میں حضرت علیؑ کے گورنر عبیداللہ بن عباس کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس صدمہ سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی چیخ اٹھی کہ "مردوں کو تو تم نے قتل کر دیا اب ان بچوں کو کس لئے قتل کر رہے ہو؟ اے ابنِ ارطاۃ! جو حکومت بچوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کُشی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی ہو اس سے بُری کوئی حکومت نہیں۔" اس کے بعد اسی ظالم شخص کو حضرت معاویہ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا جو اس وقت حضرت علیؑ کے قبضہ میں تھا۔ وہاں اس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلمِ عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں انہیں لونڈیاں بنالیا۔ حالانکہ شریعت میں اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ یہ ساری کاروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں۔"
(خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۷۶-۱۷۷ بحوالہ الاستیعاب، الطبری، ابن الاثیر، البدایہ)

حضرت حجرؓ بن عدی کا قتل

حضرت حجرؓ بن عدی ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے امت میں ایک اونچے مرتبے کے مالک تھے۔ معاویہ کے زمانے میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؑ پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دل ہر جگہ ہی اس سے زخمی ہو رہے تھے مگر لوگ خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتے تھے۔ کوفہ میں حضرت حجرؓ بن عدی سے

صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب میں حضرت علیؑ کی تعریف اور امیر معاویہ کی مذمت شروع کردی اس پر زیاد گورنر کوفہ و بصرہ اور ان کے درمیان کشمکش برپا ہوگئی۔ وہ خطبہ میں حضرت علیؑ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے۔ اس پر انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر کے ان پر یہ فرد جرم عائد کی گئی کہ "یہ ابوتراب (حضرت علیؑ) کی حمایت کرتے ہیں ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہار برأت کرتے ہیں۔"

چنانچہ مولانا مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"اس طرح یہ ملزم حضرت معاویہ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ قتل سے پہلے جلادوں نے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علیؓ سے برأت کا اظہار کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔" ان لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور حجرؓ نے کہا۔ "میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو رب کو ناراض کرے۔" آخر کار وہ اور ان کے ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب عبدالرحمٰن بن حسّان کو حضرت معاویہ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور اس کو لکھا کہ وہ انہیں بدترین طریقہ سے قتل کرے۔ چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرادیا۔" (خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۶۵۔ بحوالہ الطبری ابن عبدالبر، الاستیعاب ، ابن خلدون ، ابن الاثیر)

یزید کی ولیعہدی

سب سے بڑا ظلم جو امیر معاویہ کے ہاتھوں امتِ مسلمہ پر ہوا اور جس سے اسلام کے سیاسی نصب العین کو ایسا کاری زخم پہنچا جو آج تک مندمل نہ ہو سکا وہ یزید کی ولی عہدی و جانشینی کا مسئلہ تھا۔ معاویہ نے اپنے نا اہل بیٹے کو تخت نشین کرنے اور بزعم خود امیرالمومنین اور خلیفۃ الرسول نامزد کرنے کے لئے ہر اوچھے سے اوچھا

اور ہر کمینے سے کمینہ ہتھیار استعمال کیا، ہر جائز و ناجائز حربہ برتا، اختلاف کی ہر آواز کو ملوکیت و استبداد کے زور سے بے اثر کر دیا اور رستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو رشوت و زہر، مکروفریب اور تلوار و خنجر سے دور ہٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی حتیٰ کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسن المجتبیٰؑ کو جور و ستم کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا۔

انتقامی رنگ میں مقتول کا سر کاٹ کر مشتہر کرنا

"سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی، جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا، اسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔ سب سے پہلا سر جو زمانۂ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمارؓ بن یاسر کا سر تھا۔ امام احمد حنبل نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور ابن سعد نے بھی طبقات میں اسے نقل کیا ہے کہ جنگِ صفین میں حضرت عمارؓ کا سر کاٹ کر حضرت معاویہ کے پاس لایا گیا۔" (خلافت و ملوکیت ص ۱۷۷)

دوسرا سر عمرو بن الحمق کا تھا جسے برسرِعام گشت کرایا گیا۔ ایسا ہی وحشیانہ سلوک مصر میں محمد بن ابوبکرؓ کے ساتھ کیا گیا۔ ان کی لاش ایک مردہ گدھے کی کھال میں رکھ کر جلائی گئی۔ امیر معاویہ کی اس رائج کردہ سنت پر عمل پیرا ہو کر شہدائے کربلا کے سر کاٹ کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک لے جائے گئے۔ اور ان کی لاشوں پر گھوڑے دوڑا کر انہیں روندا گیا۔ اسی طرح مصعب بن زبیر کا سر کوفہ اور مصر میں پھرایا گیا۔ پھر دمشق لے جا کر اسے منظرِ عام پر لٹکا دیا گیا۔ بعد میں اموی خاندان کے ہاتھوں یہی سلوک عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء عبداللہ بن صفوان اور عُمارہ بن حزم کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ان کے سر کاٹ کر مکہ سے مدینہ، اور مدینہ سے دمشق لے جائے گئے۔ جگہ جگہ ان کی نمائش کی

گئی اور مکہ میں ان کی لاشیں کئی روز تک سولی پر لٹکتی رہیں یہاں تک کہ وہ سڑ گئیں۔

(ابن خلدون، الطبری، البدایہ)

"قطع نظر اس سے کہ جن لوگوں کے مرنے کے بعد یہ سلوک ان کی لاشوں کے ساتھ کیا گیا وہ کس پائے کے لوگ تھے، سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے کسی کافر کے ساتھ بھی یہ برتاؤ جائز رکھا؟ (خلافت و ملوکیت۔ص ۱۷۹)

حسن بصریؒ کی حق گوئی

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ "حضرت معاویہ۔ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک، ان کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کرلیا۔ درانحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے، ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا۔ ریشم پہنتا، طنبورے بجاتا تھا تیسرے، ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا۔ حالانکہ نبی صلعم کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں۔ چوتھے، ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کردینا۔"

(خلافت و ملوکیت۔ص ۱۶۵۔۱۶۶۔ بحوالہ ابن الاثیر، البدایہ)

یہ تھے حضرت امیر معاویہ "رضی اللہ عنہ" اور یہ تھے ان کے کارنامے۔ یہ تھے خلفائے بنی امیہ کے اسلام پر احسانات۔ جن کا محمود عباسی اور ان کے ہم خیال حضرات ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ کسی یہودی و عیسائی نے بھی یہ قبیح حرکت کسی غیر قوم کے کمسن بچوں کے ساتھ روا نہ رکھی جو سلوک مسلمانوں کے امیر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہو یا علیہ السلام کہو کے حکم سے عبیداللہ بن عباس کے معصوم

دکمسن بچوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ بچوں کو ماں کی گود میں ذبح کیا گیا۔ وہ روتی رہی، پھڑکتی رہی اور جب تک زندہ رہی اپنے بچوں کا نوحہ کرتی رہی۔ حضرت علیؑ پر تبرا نہ کرنے کے جرم میں حضرت حجرؓ بن عدی کو مع سات ساتھیوں کے بیدردی سے قتل کر دینا اور عبدالرحمٰن کو زندہ قبر میں گاڑ دینا، خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے محمد کی لاش کو مردہ گدھے کی کھال میں بند کر کے جلا دینا۔ رشوت دے کر نواسۂ رسول حضرت حسنؑ کو زہر کے ذریعہ شہید کرا دینا۔ کیا وہ افسوسناک تاریخی حقائق نہیں جن کو آج ساڑھے تیرہ سو سال کی دوری پر محض پڑھ کر ایک منصف مزاج اور باضمیر شخص کی روح کانپ اٹھتی ہے، دل لرز جاتا ہے اور انسان آنکھوں سے مسلسل خونِ جگر بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس پر عالمِ وجد میں کہتے ہیں۔ "سبحان اللہ! کیا اسلام پھیلا ہے"۔ یہ تھا اس اسلام کا نمونہ جو بنی امیہ کی کوششوں سے رائج ہوا۔ اور یہ تھا بنوامیہ کا احسان عالمِ اسلام پر۔ مسلمان آبادی میں قتل و غارت، فحش کاری و عیاشی کی گرم بازاری، تلوار کے زور سے بیعت لے کر یزید جیسے شرابی و بدکار آمر کو امت کے سر پر مسلط کر دینا۔ کیا خدا و رسولؐ کا یہی منشا تھا کہ خلیفۃ اللہ و نائب رسولؐ اس قسم کی بربریت، درندگی، بیحیائی اور فحش کاری کو دنیا میں رائج کرے اور بے جرم و بے خطا بندگانِ خدا کا خون بہاتا رہے۔

بہرکیف یہ تھا وہ ماحول جس میں حضرت حسینؑ جیسے حساس و دور اندیش چھپن ۵۶ سالہ امامؑ زندگی کے دن گزار رہے تھے اور بنی امیہ کے ان روح فرسا و ہوش ربا مظالم کو بنفسِ نفیس اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ وہ معاویہ کے بیس سالہ دورِ اقتدار میں اموی عروج کو بچشم خود دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی حالات کس نہج پر جا رہے ہیں اور ان کو ان ناموافق حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے

کون سالائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ چونکہ آپ ان تمام حقائق کا علم الیقین تو درکنار عین الیقین سے مشاہدہ کر چکے تھے بلکہ آپ کی بصیرت حق الیقین تک پہنچی ہوئی تھی اسلئے بحیثیت حجتِ خدا و امامِ ہدیٰ آپ نے اسلام کو حیاتِ جاوید بخشنے کے لئے عظیم قربانی پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا اور آخرِ دم تک اس فیصلہ سے ایک انچ بھی انحراف نہ کیا۔

بہرکیف ہم امیر معاویہ کے کردار و کارناموں پر مختصر سی روشنی ڈالنے کے بعد نفسِ مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مولوی سعید احمد۔ ایم اے اپنی کتاب **مسلمانوں کا عروج اور زوال** کے صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں :- "عراق کے جو لوگ حضرت علیؑ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی سچے دل سے حضرت علیؑ کے ساتھی اور ان کے مددگار نہ تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں اپنی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "میں جب تم سے موسم سرما میں کہتا ہوں کہ شام والوں سے جنگ کرو تو تم کہتے ہو کہ یہ تو بڑا سخت موسم ہے کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ مگر جب موسم گرما میں کہتا ہوں کہ اچھا اب ان لوگوں سے لڑو تو تم کہنے لگتے ہو کہ آج کل تو بڑی ہی سخت گرمی ہو رہی ہے۔ گرم ہواؤں کی آندھیاں چل رہی ہیں۔"

مولوی سعید احمد صاحب کو تیرہ صدیوں کے فاصلہ پر معلوم ہوگیا کہ عراق کے لوگ دل سے حضرت علیؑ کے دوست نہ تھے لیکن حضرت امام حسینؑ کو اس زمانہ میں ہوتے ہوئے ان لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے کیا یہ نہ معلوم ہوا کہ کوفی کیسے ہیں ؟

حضرت حسنؑ نے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے خیال سے حکومت کی الجھنوں سے کنارہ نہ کیا تھا بلکہ حالات ہی کچھ ایسے ہو چکے تھے کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ آپ نے ساباط کے مقام پر اپنے لشکر کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا تھا:-

"دیکھو! مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں ہے۔ میں تمہارا بھی اتنا ہی بہی خواہ ہوں

جتنا خود اپنی ذات کی نسبت مجھے ہونا چاہیئے۔ میں تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کی رائے قائم کر رہا ہوں امید ہے کہ تم میری رائے سے انحراف نہ کرو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر کی ہمت جہاد سے پست ہو گئی ہے اور میں کسی طرح یہ صحیح نہیں سمجھتا کہ تمہیں بادلِ ناخواستہ کسی مہم پر مجبور کروں۔" آپ کا یہ مختصر سا خطبہ حقیقتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے بہترین ذریعہ تھا جو لشکریوں کی ذہنیت اور امامؑ کے بلند پایہ نظریہ کی ترجمانی کر رہا تھا لیکن ہوا کیا؟ آپ کی تقریر کا ختم ہونا تھا کہ ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ وہ لوگ جو خوارج کے ہم خیال تھے کہنے لگے۔ "حسنؑ بھی اپنے باپ کی طرح کافر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ کر دیا اور آپ کا مصلےٰ قدموں کے نیچے سے کھینچ لیا۔ خیمہ لوٹ لیا یہاں تک کہ چادر آپ کے دوشِ مبارک سے اتار لی۔ ربیعہ و ہمدان جاں نثار قبائل نے آپ کی نصرت کر کے جان بچائی۔ آپ گھوڑے پر سوار ہو کر مدائن کی طرف روانہ ہوئے کہ کمین گاہ میں چھپے ہوئے ایک سپاہی نے آپ پر وار کیا جس سے ران مبارک زخمی ہو گئی۔ بالفرض حضرت امام حسینؑ اس موقع پر موجود نہ تھے تو کیا امامؑ نے کوفی لشکر کی بغاوت نہ سنی ہو گی۔ اور برادرِ معظم کی زخمی ران نہ دیکھی ہو گی؟ خدا معلوم! اس المناک صدمہ کا ان کے حساس دل پر کتنا اثر ہوا ہو گا؟ امام حسینؑ نے ان تمام واقعات پر کبھی ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ ان کو اپنی سرگذشت سمجھتے تھے اور صحیح اندازہ رکھتے تھے کہ ہمیں ان حالات میں مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے انہوں نے دشمنوں سے مقابلہ کے لئے ساتھیوں کی کثرت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال یک قلم دل سے نکال دیا تھا۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار اور برادرِ معظم کے ساتھ ان بے وفا ساتھیوں کا افسوس ناک طرزِ عمل بارہا دیکھ چکے تھے۔ ان سابقہ تجربات کی موجودگی میں امام عالیمقامؑ کس طرح یقین کر سکتے تھے کہ کوفی لا یُوفی الفائے عہد کریں گے کہ آپ ان کے حکم میں آ گئے تھے اور بغیر کسی سابقہ تیاری کے ایک مضبوط و منظم سلطنت۔

کے خلاف اپنے اہل و عیال کو لے کر خروج کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان تلخ تجربات کی موجودگی میں اس امر کا کوئی امکان نہ تھا کہ آپ آزمائی ہوئی بے وفا قوم کے بھروسے پر محض مادی شان و شوکت حاصل کرنے کی غرض سے، بے سوچے سمجھے، اپنے تمام خاندان کو تباہ کرا دیتے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ابتدا ہی سے کچھ اس قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت آنحضرتؐ کے انتقال فرماتے ہی حضرت علیؑ اور اولادِ علیؑ کی علانیہ دشمن ہو گئی سینکڑوں کفار و مشرکین عہدِ نبوی میں ذوالفقارِ حیدری کے جوہر دار کے باعث فی النار ہوئے تھے۔ ان کے وارثانِ بازگشت دل ہی دل میں بغض و حسد کے مارے پیچ و تاب کھا رہے تھے اور موقع کے انتظار میں تھے۔ جناب رسالتمآبؐ کی وفات اور خلافتِ راشدہ کو ملوکیت میں تبدیل کرنے والے ناگزیر حالات نے جن کا ذکر اسی باب میں موجود ہے وہ مواقع پیدا کر دیئے کہ لوگوں نے اپنے دلوں کے کینے نکالے، حسرتیں پوری کیں اور گن گن کر اولادِ رسولؐ سے جنگِ بدر کے بدلے لئے۔

اپنے بزرگ پیشوا کی آخری وصیت، اسلام کی حقیقی خیر خواہی، امتِ مسلمہ کا اتحاد ایسی چیزیں تھیں کہ اہلِ بیتِ رسالتؐ نے حق تلفی برداشت کی لیکن حکومتِ وقت کے خلاف تیغ خون آشام بے نیام نہ کی۔ اسی اصول پر بعد میں اموی و عباسی دور میں آنے والے ہر امامؑ عمل پیرا رہے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر کے اسلام کی دینی خدمات سرانجام دیتے رہے مگر حکومتِ وقت کے کام میں کوئی مداخلت نہ کی اور اس کے خلاف کسی سازش میں شریک نہ ہوئے۔ امام حسینؑ نے اپنے جدِ عالیمقدارؐ، والدِ بزرگ اور برادرِ معظم سے یہی سبق سیکھا تھا اس لئے اسی پر عمل پیرا رہے۔ اس امن و سکون کی زندگی کے یہ معنی نہیں کہ معاذاللہ آئمۃ الطاہرینؑ میں سیاسی شعور و قابلیت نہ تھی۔ یقیناً تھی۔ وہ دشمن کی چالبازیوں و فریب کاریوں کو خوب

سمجھتے تھے لیکن بنی امیہ کے برعکس ان کی سیاست رشوت و زہر، مکروفریب، دغا اور جھوٹ کے اجزا سے مرکب نہ تھی کیونکہ وہ ہادیِ مطلق کے وصی و حقیقی جانشین تھے وہ کوئی ایسا فعل نہ کر سکتے تھے جو خدا و رسولؐ کی مرضی کے منافی ہو۔ رہا حضرت معاویہ اور ان کے خاندان کا سوال۔ ان کو خدا و رسولؐ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں ہر لمحہ اپنے سیاسی اقتدار کا استحکام پیش نظر تھا۔ ملتِ اسلامیہ کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ شام کے زرخیز ملک کا استمراری پٹہ اولادِ ابوسفیان کے نام لکھ دیا گیا۔ حضرت معاویہ کے پاس دولت کے انبار تھے۔ لاکھوں درہم و دینار عطا کر کے بڑے سے بڑے مسلمان کو فوراً خرید سکتے تھے۔ خود امام حسنؑ کی شہادت ایک لاکھ درہم کی قربانی سے وقوع پذیر ہوئی لیکن حسبِ وعدہ قاتلہ کے ساتھ یزید کی شادی نہ کر کے امیر معاویہ نے اپنی سابقہ ہزارہا بدعہدیوں میں ایک اور عہد شکنی کا اضافہ کر دیا۔ اس سلسلہ میں تاریخی شہادت ملاحظہ فرمائیے:-

"امام حسنؑ کی زوجہ جعدہ بنتِ اشعث بن قیس نے امام حسنؑ کو معاویہ کے حکم سے زہر دیا کیونکہ معاویہ نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو امام حسنؑ کو اس حیلہ سے قتل کر دیگی تو میں تجھ کو ایک لاکھ درہم دے دوں گا۔ جب یہ عہد و پیمان ہو گیا تو معاویہ نے جعدہ کے پاس زہر بھیجا اور جب امام حسنؑ کی رحلت ہو گئی تو معاویہ نے مال کی شرط تو پوری کر دی اور یہ کہلا بھیجا کہ ہمیں یزید کی حیات پیاری ہے ورنہ ہم تیرا نکاح اس سے کر دیتے۔"

۱۔ تاریخ ابوالفدا الجزء الاوّل۔ ص ۱۸۳۔
۲۔ مروج الذہب للمسعودی۔ الجزء الثانی۔ ص ۳۰۳۔
۳۔ الاستیعاب ابن عبدالبر ترجمہ حسن بن علی۔ الجزء الاول۔ ص ۱۴۴۔
۴۔ البدایہ والنہایہ فی التاریخ ابن کثیر دمشقی۔ الجزء الثامن۔ ص ۴۳۔

۵۔ تاریخ حبیب السیر جلد دوم۔ جزو اول۔ ص ۱۸۔
۶۔ شواہد النبوۃ مولانا عبدالرحمٰن جامی۔ رکن سادس۔ ص ۱۷۳۔
۷۔ تذکرۃ خواص الامت سبط ابن الجوزی۔ الباب الثامن فی ذکر الحسینؑ۔ ص ۱۲۱۔

پہل کس نے کی ؟

اس مقام پر دیکھنا یہ ہے کہ پہل کس نے کی۔ امام حسینؑ نے یا یزید نے ؟ کیونکہ اگر امام علیہ السلام نے پہل کی تو ان کا طرزِ عمل خروج کہلائے گا اور اگر یزید نے پہل کی تو امامؑ کا طرزِ عمل دفاعی صورت رکھے گا۔

اہلِ بیتِ رسالت سے بدظن رہنا، ان کی تحقیر روا رکھنا اور انہیں عوام کی نظروں میں گرانا اموی دورِ حکومت کے رائج کردہ چند ایسے معین سیاسی اصول تھے جو بعد میں آنے والی حکومتوں کے ہمیشہ پیشِ نظر رہے۔ امیر معاویہ و یزید نے بذاتِ خود ان اصولوں پر سختی سے عمل کیا۔ حضرت امام حسنؑ اور حضرت عائشہؓ کے قتل کے بعد امیر معاویہ امام حسینؑ کو موت کے گھاٹ اتارنے کی فکر میں تھے لیکن بدنامی سے بچنے کے لئے وہ یزید کی طرح جاہلانہ طریقِ کار استعمال کرنے سے اجتناب کر رہے تھے۔ وہ مناسب وقت کے منتظر تھے تاکہ زہر کے کارآمد و مجرب نسخہ کو انتہائی پردہ داری کے ساتھ سبطِ اکبرؑ کے بعد سبطِ اصغرؑ پر آزما کر ان کو موت کی میٹھی نیند سلادیں۔ اس مقصد کو سرانجام دینے کے لئے سونے اور چاندی کے سکے بکھیر کر کوئی جعدہ بنتِ اشعث خرید کرنے کی تگ و دو شروع تھی بصورت ناکامی ایسے حالات پیدا کرنے کا اہتمام کیا جارہا تھا کہ امام حسینؑ جوش میں آکر بغاوت کر دیں اور حکومت کو ان کے جوازِ قتل کا بہانہ مل جائے۔ دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی بات کبھی نوکِ زبان پر آہی جاتی ہے اور بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ جذبات کی رو میں بہ کر عقل مند سے عقل مند آدمی بھی، نہ کہنے والی باتیں غیر ارادی طور پر کہہ دیتا ہے۔

ایک ایسا موقع امیر معاویہ کو بھی پیش آگیا اور وہ جذباتِ تفاخر کے تحت اپنے مافی الضمیر کو مخفی نہ رکھ سکے اور تحقیرِ حسینؑ کی غرض سے اپنے ناپاک ارادہ کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ اسی سلسلہ میں ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ فرمائیے :۔

"جب اہلِ عراق اور اہلِ شام یزید کی بیعت کر چکے تو امیر معاویہ ایک ہزار سوار لے کر حجاز کی طرف روانہ ہوئے ۔ جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو راستہ میں سب سے پہلے امام حسین بن علیؑ ملے ۔ معاویہ نے ان کو دیکھتے ہی کہا کہ میں ایسے شتر قربانی کو مرحبا اور خوش آمدید نہ کہوں گا جس کا خون بہنے والا ہو اور خدا ہی اسے بہا دے گا ۔ انہوں نے کہا کہ سنبھل کے بولو ! قسم بخدا ، ایسی باتیں میری شان کے خلاف ہیں ۔ امیر معاویہ نے کہا کہ ہاں ضرور ہو بلکہ اس سے بھی بدتر کے لائق ہو ۔"

(اردو ترجمہ تاریخ کامل ابن اثیر ۔ خلافت بنوامیہ حصہ اول ۔ ص ۱۰۵)

امیر معاویہ اگرچہ اپنی زندگی میں قتلِ حسینؑ میں کامیاب نہ ہو سکے مگر مذکورہ بالا اقتباس سے اس کی نیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔ نواسۂ رسولؐ جیسا کہ پیشتر ازیں ثابت کیا جا چکا ہے بروئے معاہدہ حکومت کے حقدار تھے اس لئے دشمن کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہے تھے چنانچہ مرض الموت کے وقت معاویہ نے یزید کی رہنمائی کے لئے جو تحریری وصیت چھوڑی تھی ۔ اس میں چار مخالف افراد سے چوکنا رہنے کی ہدایت کی گئی تھی جن میں حضرت امام حسینؑ بن علیؑ کا نام گرامی سرفہرست تھا اور جن کا کچل دینا ان کی آبائی و موروثی سیاست کا جزوِ اعظم تھا ۔ یزید کی نا اہلیت کی وجہ سے معاویہ کو یہ شبہ تھا کہ کہیں عبداللہ بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ آگے چل کر یزید کے لئے خطرہ نہ بن جائیں ۔ اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر حفظِ ماتقدم کے طور پر ان پر بھی نگاہ رکھنا ضروری تھا ورنہ یہ کوئی حقیقی خطرہ نہ تھے ۔ یہ دونوں حضرات تو وہی ہیں جو امیر معاویہ کے معاون بن کر صفین کی جنگوں میں حضرت علیؑ کے خلاف لڑتے رہے تھے اور عبداللہ بن عمرؓ

نے نو معاویہ کی طرح حضرت علیؑ کی بیعت سے بھی تخلف کیا تھا۔ یہ عبداللہ بن زبیرؓ یہ وہ حضرت تھے جنہوں نے جنگِ جمل کھڑی کر کے نازک مرحلہ پر امیر معاویہ کی اس طرح مدد کی کہ حضرت علیؑ کی وہ فوجی قوت وعسکری طاقت جو معاویہ کے خلاف کام آسکتی تھی جنگِ جمل میں ضائع ہوگئی۔ کئی مخلص ساتھی شہید ہوگئے اور معاویہ کو اس عرصہ میں قوت مجتمع کرنے اور سامان حرب وضرب کی فراہمی کا سنہری موقع مل گیا جس سے اس نے پورا پورا استفادہ کیا۔ پس حقیقی خطرہ امام حسینؑ کی طرف سے تھا۔ چنانچہ معاویہ نے مرتے وقت بیٹے کو (بزعم خود) اس خطرہ سے نمٹنے کے لئے ضروری ہدایات یقیناً دی ہونگی۔ یہ ضروری نہیں کہ باپ بیٹے کے درمیان جو راز کی باتیں ہوئی ہوں وہ تمام کی تمام تاریخ کے صفحات پر آجائیں۔ پس جنگِ کربلا کی ابتدا خود امیر معاویہ نے اپنے عہدِ حکومت کے آخری دور میں شروع کردی تھی۔

تختِ حکومت پر متمکن ہونے کے فوراً بعد یزید نے ولید بن عتبہ حاکمِ مدینہ کو حکمنامہ بھیجا کہ حسین ابن علیؑ سے بیعت لی جائے۔ انکار پر ان کا سر قلم کرکے میرے پاس بھیج دو۔ ولید نے مضمونِ خط سے امامؑ کو آگاہ کیا اور مطالبۂ بیعت پیش کیا حضرت امام حسینؑ نے جواب میں فرمایا "میرے نزدیک یہ مناسب نہیں کہ مجھ جیسا شخص خفیہ طور سے بیعت کرے۔ سب لوگوں کو بلاؤ۔ میں بھی موجود ہوں گا اور سب سے پہلے میں ہی جواب دینے والا ہوں گا"۔ ولید نے صلح جویانہ رنگ میں کہا "بہت بہتر! آپ تشریف لے جائیے"۔ مروان نے مزاحمت کی اور ولید کو قتل کے لئے اکسایا۔ امامؑ نے ملعون کو ڈانٹ کر کہا "تو یا وہ مجھے قتل کریگا؟ واللہ تو جھوٹا ہے" مروان سن کر سہم گیا اور آپ لوٹ کر اپنے مکان پر تشریف لے آئے"۔

(تاریخ ابن کثیر شامی۔ الجزء الثانی۔ ص ۱۴۷۔ تاریخ طبری۔ الجزء السادس۔ ص ۱۸۹)

مطالبۂ بیعت کے سلسلے میں ولید کے مسلسل اصرار سے تنگ آکر امامؑ رات کے

وقت غمگین و حزیں تربتِ رسول پر تشریف لے گئے۔ چند رکعت نماز ادا کر کے بارگاہِ بے نیاز میں یوں ملتجی ہوئے "اے خدا! یہ تیرے پیغمبر کی خاک ہے اور میں ان کا نواسہ ہوں۔ مجھے کچھ ایسا معاملہ درپیش ہے جس سے تو ہی آگاہ ہے اور میرے حالات اور دلی کیفیتوں سے بخوبی واقف ہے کہ میں نیکی کو عزیز رکھتا ہوں اور برائی سے بیزار ہوں۔ اے ذوالجلال والاکرام! اس خاک کے طفیل اور اس شخص کے واسطے جو اس تربت میں مدفون ہے مجھے اپنی اور اپنے رسول کی رضامندی کرامت فرما"۔ اس کے بعد آپ بہت روئے اور قبرِ مطہر پر سر رکھ کر سو رہے۔ خواب میں اپنے نانا محمد مصطفےٰ کو دیکھا کہ بہت سے فرشتوں کے ساتھ جو آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے موجود ہیں تشریف لائے۔ امام حسین کو اپنے سینہ سے لگالیا، پھر پیشانی پر بوسہ دے کر فرمایا کہ تو عنقریب ایسے شخصوں کے ہاتھ سے جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہونگے، زمینِ کربلا میں شہید ہوگا۔ اس وقت تو پیاسا ہوگا اور وہ تجھے ایک قطرہ پانی نہ دینگے...... امام حسین نیند سے بیدار ہوئے، بہت پریشان خاطر ہوئے، اپنے اہلِ بیت سے یہ خواب بیان کیا اور اس قدر غمگین تھے کہ اس دن آپکے اہلِ بیت میں کوئی اور اتنا غمناک نہ تھا۔ پھر آپ نے مکہ جانے کا قصد کیا۔ (اردو ترجمہ تاریخ اعثم کوفی ص ۲۵۰۔۲۵۱)

خواب کی حقیقت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابراہیم خواب ہی میں اشارہ پاکر اپنے بیٹے اسمٰعیل کو ذبح کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ حضرت یوسف کا خواب اور اس کی تعبیر و اثرات کا مفصل ذکر قرآن میں موجود ہے۔ امام عالیمقام کو اپنے جدِ بزرگوار کی حقانیت پر مکمل ایمان تھا خواب میں اپنی دردناک شہادت کا مظلومانہ منظر دیکھ کر اور زبانِ رسول سے تشنہ دہانی کی حالت میں اپنا مذبوح ہونا سن کر امام کا حزن و ملال ایک فطری امر تھا۔ اس طرح غمگین و حزیں رہنا اور اپنی موت کا اظہار کرتے رہنا اس شخص کا طرزِ عمل نہیں ہوسکتا جو ایک مستحکم اور قوی سلطنت کو تہ و بالا کرنے کے ارادہ سے اٹھا ہو اس کا دل تو امیدوں اور آرزوؤں سے پُر ہوتا ہے۔ وہ تو دوسروں کو اپنی کامیابی کا یقین دلا کر اپنا معاون و ہمخیال بناتا ہے اور بڑی بڑی خوش آئند توقعات پر ایک شاندار مستقبل کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔

اندازہ فرمائیے کہ حسین مظلومؑ کی مذکورہ بالا دعا میں کتنا درد بھرا ہوا ہے، خدا و رسولؐ پر کس قدر مضبوط ایمان ہے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے دل میں کتنی تڑپ موجود ہے۔ اے میرے عالی منزلت امامؑ! روحی لک الفدا۔ آپ کے ہر عمل کے اندر قلب سلیم کے لئے کتنی بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔

اس طرح نواسۂ رسولؐ حزین و ملول اپنے گھر سے نکالے گئے۔ ظالم و جابر حکومت کے تشدد اور جور و جفا کے باعث وطن اور جوارِ روضۂ رسولؐ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ کن کن کو اپنے ساتھ لے گئے؟ صرف اُن رشتہ داروں کو جنہوں نے انتہائی محبت کی وجہ سے آپ کی جدائی گوارا نہ کی۔ آپ کے بھائی محمد بن حنفیہؓ اور چچیرے عبداللہ بن جعفر طیارؓ اور دوسرے رشتہ دار مدینہ میں ہی رہ گئے۔ مقامِ تعجب ہے کہ نہ ان سے کسی نے مطالبۂ بیعت کیا اور نہ انہوں نے خود بخود یزید کی بیعت کی۔ محمد بن حنفیہؓ حضرت علیؑ کے نامور بیٹے تھے انہیں مدینہ میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ بیعت کے سلسلہ میں ان پر کوئی تشدد نہ کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام جور و جفا اور یہ سارا ظلم و ستم محض اس ذاتِ مقدس کے لئے مخصوص تھا جس کی رگوں میں پیغمبر اسلامؐ کا خون دوڑ رہا تھا۔ پس صاف عیاں ہے کہ یزید ملعون اپنے باپ کی وصیت کے مطابق صرف امام ذیشانؑ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ بہرکیف یزید نے پہل کر کے خود ظالم کی جگہ لے لی اور حسینؑ بحیثیتِ مظلوم دفاعی صورت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور جائے پناہ کی تلاش میں وطن چھوڑ کر نکل آئے۔"

کیا دنیا کا کوئی مذہب، کیا دنیا کا کوئی بین الاقوامی قانون اور اخلاق کا کوئی ضابطہ دفاعی حیثیت اختیار کرنے والے مظلوم کو باغی قرار دے سکتا ہے؟ کیا دنیا کی کوئی مہذب سوسائٹی اس مہاجر کو جو حکومت کے جور و جفا سے تنگ آ کر اہل و عیال کی معیت میں، گھر سے نکلا ہو بغاوت کا ملزم قرار دیتی ہے؟ کیا ہندوستان سے بھاگ کر آنے والے مسلم مہاجرین کو پنڈت نہرو کی سیکولر سٹیٹ نے بغاوت کا مجرم تصور کیا؟ یقیناً نہیں۔ تو پھر نواسۂ رسولؐ کو ان کی مظلومانہ موت کے بعد بغاوت کا مجرم قرار دینا بذاتِ خود ایک ظلمِ عظیم ہے۔ کیا مظلوم سے نفرت اور ظالم سے محبت کرنا خود ظالم ہونے کی دلیل نہیں؟ لہٰذا حسینؑ مظلوم کی مظلومیت و اندوہناک شہادت کو خروج سے تعبیر کرنے والے خود ظالم ہیں اور عند اللہ و رسولؐ کی نگاہ میں آیہ والی علا۔ "وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کا

عملاً کفر کرتے ہوئے کہیں خود تو اسلام کے باغی نہیں؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

کامیاب بغاوت کیلئے تیسرا موقع اور امامؑ کی خاموشی

قیام مکہ کامیاب بغاوت کے لئے تیسرا موزوں موقع تھا لیکن امامؑ نے اس سے بھی کوئی استفادہ نہ کیا اور حسب معمول خاموشی دامن پسندی اختیار کی۔ عبداللہ بن زبیرؓ امام سے قبل مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ پہنچتے ہی اپنی حکومت کے قیام کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور بیعت کی سلسلہ جنبانی کرکے معاونین کی جماعت جمع کر رہے تھے۔ امامؑ کے پہنچتے ہی عوام کا رخ عبداللہ بن زبیرؓ سے ہٹ کر آپ کی طرف ہوگیا اور آپ کی اطاعت پر مستعد نظر آنے لگے۔ اگر آپ یہ چاہتے تو بیعت کا سلسلہ شروع کرکے اپنے گرد و پیش ایک بڑی جماعت جمع کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس طرف مطلقاً کوئی توجہ نہ دی اور زہد و عبادت کی طرف متوجہ رہ کر امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ صاحب حبیب السیر لکھتے ہیں:-

"اما حقیقۃً ابنِ زبیرؓ بر بودن امام زمن در مکہ راضی نبود زیرا کہ داعیہ خروج و طلب خلافت داشت و مے دانست کہ تا آنحضرت در حریم حرم باشد کسی متابعت نخواہد نمود۔"

(حبیب السیر جلد دوم جزو اول ص ۲۳)

فی الحقیقت ابن زبیر امام زمن کے قیامِ مکہ پر ناخوش تھے کیونکہ وہ خروج کے داعی اور خلافت کے طالب تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک امامؑ حرم میں مقیم رہیں گے کوئی بھی ان کی متابعت نہیں کرے گا۔

امام چھ ماہ تک صبر و سکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔ نہ کسی فرد کو بیعت کے زمرہ میں شامل کیا اور نہ کسی بیرونی سیاسی جماعت سے خط و کتابت کا آغاز کیا مگر عبداللہ بن زبیرؓ اس عرصہ میں اپنی مجوزہ سکیم کو عمل میں لانے کے لئے ہمہ وقت مصروف رہے وہ محسوس کرتے تھے کہ مکہ میں امامؑ کی موجودگی ان کے مقصدِ حصولِ خلافت کی تکمیل میں ایک قسم کی رکاوٹ ہے۔ شہادت ملاحظہ فرمائیے۔

امامؑ تمام مخلوق سے زیادہ عبداللہ بن زبیرؓ پر گراں تھے کیونکہ عبداللہؓ جانتے تھے کہ جب تک حسین بن علیؑ یہاں مکّہ میں موجود ہیں اہلِ حجاز کبھی میرے ہاتھ پر بیعت نہیں کرینگے اور بیشک حسینؑ کی عظمت اہلِ حجاز کی نگاہوں اور دلوں میں عبداللہ بن زبیرؓ سے زیادہ تھی اور یہ لوگ ان کی اطاعت کے لئے زیادہ مستعد تھے۔ (تاریخ ابن جریر طبری) (مروج الذہب للمسعودی الجزء الثالث ص ۵۔ تاریخ ابن کثیر شامی الجزء الثامن ص ۱۵۱)

ایک طرف تو عبداللہ بن زبیرؓ کو امامؑ کا مکہ میں قیام پذیر ہونا ناگوار تھا اور دوسری طرف حاجیوں کے لباس میں یزیدی ایجنٹ مکّہ میں پہنچ چکے تھے جنہوں نے آپ کے لئے خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی تھی اور آپ کی زندگی اجیرن بنا دی تھی۔ قافلۂ حجاج کے ساتھ شیاطین بنی امیّہ کے تیس افراد اس کام کے لئے مامور ہو کر آئے تھے کہ وہ امامؑ کو جس حال میں پائیں قتل کر دیں۔ (ینابیع المودۃ۔ شیخ سلیمان مفتیٔ اعظم)

آپ ان تمام واقعات کا بنظرِ غائر جائزہ لے رہے تھے اور لوگوں کے منع کرنے کے باوجود عراق کی جانب روانگی پر تیار ہو گئے کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے قتل سے بیت اللہ کی حرمت توڑی جائے۔

اس مقام پر یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ کوفیوں کے خطوط اس وقت آنے شروع ہوئے جب آپ مدینہ منورہ چھوڑ کر مکّہ معظمہ میں قیام پذیر ہو چکے تھے لہٰذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوفیوں کے خطوط مفروضہ خروج کے محرک تھے۔ اگر کوفیوں کے خطوط اس امر کے محرک ہوتے تو آپ کو مدینہ منورہ سے جنوب کی طرف رخ کر کے مکّہ میں تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی بلکہ آپ کا رخ شمال کو ہوتا اور آپ براہِ راست کوفہ پہنچ جاتے کیونکہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جنوب کی طرف اور کوفہ شمال کی جانب واقع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مکّہ میں اس لئے تشریف لائے تھے کہ معاونین کی ایک جماعت پیدا کی جائے اور اس طرح ایک لشکرِ کثیر لے کر کوفہ کی طرف بڑھیں تو آپ نے اپنے طرزِ عمل سے یہ واضح کر دیا کہ ایسا کرنا بھی ہرگز ہرگز آپ کا مقصود نہ تھا ورنہ جیسا اوپر بیان کیا جا چکا

ہے۔جمعیت کی فراہمی کے مواقع موجود تھے۔لوگ آپ کی موجودگی میں ابنِ زبیر کی طرف ملتفت ہونے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ آپ کی بیعت پر پوری طرح مستعد تھے۔رہا قیصرانی حکومت کا رعب ــ دمشق کے پایۂ تخت میں یزید کی حیثیت خواہ کچھ بھی تھی اہلِ اسلام کی نظر میں فرزندِ رسولؐ امام حسینؑ کی سیادت اپنا مقام رکھتی تھی۔ان گئے گزرے حالات کے باوجود لوگوں کی نگاہوں میں اولادِ رسولؐ کا احترام باقی تھا۔اقتضائے حالات کے تحت حج نے بہترین موقع فراہم کردیا تھا۔اطراف واکناف سے لوگ مرکزِ ایمانی میں جمع ہورہے تھے۔تجدیدِ عہد اور فریضۂ حج کی بجاآوری کے لئے لوگ جوق درجوق آرہے تھے۔انکے سامنے حالات کے رُوئے زِشت سے نقاب کشائی کے بعد رائے عامہ کو ہموار کیا جاسکتا تھا۔نعرے لگوائے جاسکتے تھے۔جمعیت کو جوڑا جاسکتا تھا۔لوگوں میں اپنے ارادے کی اشاعت و تبلیغ کی جاسکتی تھی۔کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آپ کی آبائی اعجاز بیانی سے متاثر ہوکر ہزاروں لوگ آپکی آواز پر لبیک نہ کہتے۔عبداللہ ابن زبیرؓ نے بھی تو اسی مکہّ میں رہ کر اموی حکومت کا نو سال تک زبردست مقابلہ کیا اور آخر اپنے بھائی،بیٹوں اور احباب کی بیوفائی کی وجہ سے قتل ہوئے۔جو خوف وطمع کی بناء پر دشمن کے ساتھ مل گئے تھے۔امام حسینؑ تو قرابتِ رسولؐ کی بناء پر ابنِ زبیرؓ کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ خاندانی وجاہت،ذاتی اثر ورسوخ اور بلند پایہ کردار کے مالک تھے۔آپ کے لواحقین وانصار نے واقعۂ کربلا میں ثابت کردیا کہ وہ وفاشعاری کے مجسّمے اور ایثار کے پیکر تھے۔وہ ابنِ زبیرؓ کے اقرباء وانصار کی طرح نہ تھے کہ اپنے آقا اور اپنے سردار کو مصائب میں محصور چھوڑ کر طمع یا خوف کی بناء پر فوجِ مخالف کے ساتھ جا ملتے۔

بایں ہمہ اگر آپ مکہّ ترک کرنے پر مجبور تھے تو ابنِ عباسؓ کے مشورہ کے مطابق یمن کا رخ کرلیتے اور کوفیوں کو لکھ دیتے کہ کیا تم نے اپنے امیر کو بے دست وپا کر دیا ہے اور ملک پر قبضہ کرلیا کہ مجھے دعوت دے رہے ہو۔جب تم اپنے امیر کو نکال دو گے تو ہم آئیں گے۔اس طرح اگر کوفی آپ کے کہنے پر عمل کرتے تو یزیدی حکومت کے خلاف بغاوت پھیل جاتی اور اگر

س پر عمل نہ کرتے تو ان کا امتحان بھی ہو جاتا اور امامؑ خطرہ سے محفوظ رہتے۔ آپ بذاتِ خود ابنِ عباسؓ کے مشورہ کے مطابق یمن کے دشوار گزار پہاڑی علاقہ میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاتے اور ملک کے طول و عرض میں اپنے قاصد و داعی پھیلا کر منظم بغاوت کرتے۔ اس وقت حکومتِ شام کو بیک وقت تین بغاوتوں کا مقابلہ درپیش ہوتا۔ کوفیوں کی بغاوت، ابنِ زبیرؓ کی بغاوت اور خود امامؑ کی بغاوت۔ کوفہ شام کے زیادہ قریب تھا۔ یزیدی فوج کی پہلی ٹکر کوفیوں سے ہوتی اور پھر ابنِ زبیرؓ سے تصادم ہوتا کیونکہ مکہ، یمن و شام کے درمیان میں واقع ہے۔ جناب حسینؑ سے مقابلہ کی باری بعد میں آتی۔ اس وقت یزیدی فوج کا معتد بہ حصہ تباہ ہو چکا ہوتا اور واقعات کا رُخ کچھ اور ہی ہوتا اور رسول خداؐ کا تمام خاندان اس بیدردی سے بھوک اور پیاس کے عالم میں اس طرح ذبح نہ ہوتا جس طرح کہ کربلا میں ہوا۔ لیکن یہ تمام کچھ جب ہوتا جب حسینؑ، امام حسینؑ نہ ہوتے بلکہ وہ دیندار کی بجائے دنیادار ہوتے۔ روحانیت کے علمبردار ہونے کی بجائے مادی جاہ و اقتدار کے پرستار ہوتے اور رسولِ عربیؐ کے حق پرست جانشین ہونے کی بجائے قیصر و کسریٰ کے نقشِ قدم پر چلنے والے استعمار پسند سرغنہ ہوتے۔ حسینؑ نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو انہیں نواسۂ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے کرنا چاہیے تھا۔ جنابِ معصومہؑ سیدۂ عالم صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہا نے انہیں اپنے دامانِ عاطفت میں محض اسی دن کیلئے پالا تھا کہ جب نانا کے بابا کی کمائی، خدا کا دین، اور اسلام کی حرمت اموی غارت گروں کے ہاتھوں لٹ رہی ہو تو حسینؑ بے تحاشا آگے بڑھیں اور تنِ اسلام پر ضربات لگانے والے ہر نیزے کے سامنے اکبرؑ سے کڑیل جوان کا سینہ، ہر تیرِ جفا کے آگے اصغرؑ سے گلفام کا حلقوم، ہر تلوار کے سامنے عباسؑ سے جری کے بازو اور ہر خنجر کے آگے اپنی مقدس گردن رکھ دیں۔

رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم　　زآتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
(اقبال)

سفارت مسلم بن عقیل اور کوفہ کا رُخ

اس موقع پر ہم وہ تاریخی حقائق منظرِ عام پر لانے کی کوشش کریں گے کہ کیوں امام عالیمقامؑ

عرب کے کسی دوسرے گوشہ کی طرف جانے کی بجائے کوفہ کا رُخ اختیار کرنے پر مجبور تھے اور مسلم بن عقیلؓ کی سفارت کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ خروج کو بروئے کار لانے کی سعی تھی یا حکمِ خدا کی تعمیل اور سنّتِ رسولؐ کا اتباع تھا؟

حضور سرورِ دوعالمؐ نے حضرت امام حسینؑ کے بے شمار فضائل و محاسن بیان فرمائے اور وحیٔ خدا کے ذریعہ پیش آنے والے واقعات کی خبر پاکر مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اہلبیتِ رسالت کی پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھیں اور مصائب میں ان کی نُصرت کرکے سعادتِ دارین حاصل کریں چنانچہ متعدد احادیث اس سلسلہ میں صحاح ستّہ میں مروی ہیں۔ ہم یقیناً یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آئمۂ احادیث بخاری و مسلم و دیگر بزرگانِ دین نے امام حسینؑ کی والہانہ محبت اور خاندانِ امیّہ کی بلاوجہ دشمنی کی بناء پر یہ ساری کی ساری حدیثیں وضع کی ہیں کیونکہ ایسا ہونا بعید از عقل ہے اور نہ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسینؑ ان فضائل و محامد کے حامل نہ تھے اور رسولِ خداؐ نے محض شفقتِ پدری کی وجہ سے مجبور ہوکر ہوا و ہوس کی بناء پر حسنینؑ علیہما السلام کو جوانانِ جنّت کا سردار کہہ دیا تھا کیونکہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۳-۴) کی رُو سے خدا کے برگزیدہ رسولؐ ہوا و ہوس کی بناء پر تکلّم نہ فرماتے تھے بلکہ وہ تو وہی کچھ بیان فرماتے تھے جو کچھ خدا کی طرف سے وحی ہوتا تھا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ امامؑ کے مستقبل کے متعلق بیان فرمایا ہے وہ درست ہی ہونا چاہئے اور فی الحقیقت درست ہی ثابت ہوا۔ اس طرح ایک یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ جس طرح ثقلین میں سے ایک ثقل یعنی قرآنِ مجید اعجازِ رسولؐ ہے اسی طرح دوسرا ثقل یعنی عترتِ رسولؐ بھی حضرت رسالتمآبؐ کا ایک معجزہ ہے۔

امامؑ نے اسلام کو محض عقیدے کے طور پر قبول نہیں کیا ہوا تھا بلکہ ان کی روزمرہ زندگی کے ہر طرزِ عمل کو مقرر کرنے والا یہی مذہب تھا۔ حامیانِ امیّہ مانیں یا نہ مانیں مگر حضرت حسینؑ کو قوی یقین تھا کہ اپنے نانا کے اب صحیح جانشین وہ ہی ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی بھی دے کر اسلام کو زندہ رکھنا ان ہی کا فرض ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی محبت آپ کے دل میں عشق کے آخری درجہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ امام حسینؑ نے مدینہ کی سکونت کیوں ترک

کی؟ محض اس لئے کہ امامؑ ایک فاسق و فاجر، خودسر بادشاہ کو نائبِ رسولؐ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور "وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کی آیت کریمہ کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ امامِ عامل بالکتاب کس طرح گوارا کر سکتے تھے کہ حکمِ خدا سے انحراف کر کے ایک دشمنِ ایماں کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں۔ یوم الحساب کی بازپرس آپ کی دور بین نگاہوں سے اوجھل نہ تھی اور آپ اس حکمِ خدا سے بخوبی آگاہ تھے کہ "اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۙ (النساء ۹۷) ملائکہ جب ظلم علی النفس کرنے والوں کی روح قبض کرتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ تم کس مذہب پر تھے؟ (النَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ) تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو زمین میں مغلوب تھے مگر ان کا یہ عذر قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا اور ملائکہ ان پر جرح کرتے ہیں "کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر کے کہیں چلے جاتے؟" کیا اس آیۂ کریمہ کا منطوق یہی نہیں کہ جب کسی مقام پر دینی آزادی حاصل نہ ہو اور بیدینی کی تائید پر مجبور کیا جائے تو اس وقت ہجرت کرنا لازمی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو حالات مدینہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر رہے تھے کیا وہی حالات مکّہ میں تو درپیش نہ تھے؟

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ امامؑ نے یزید کی بیعت اب تک نہ کی تھی اور آئندہ بھی کرنے پر تیار نہ تھے۔ یزید کے اس تہدیدی حکم کے بعد کہ بیعت کریں ورنہ قتل کر دیئے جائیں، مدینہ میں قیام ناممکن ہو چکا تھا مکّہ معظمہ میں قیام وقتی لحاظ سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تابکے؟ یزید کی نگاہوں میں کوئی چیز متبرک نہ تھی، نہ حرمِ کعبہ، نہ روضۂ رسولؐ۔ بعد میں مسلم بن عقبہ کی چڑھائی نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ شیاطینِ بنی امیہ کے تیس افراد حاجیوں کے لباس میں قتلِ حسینؑ کے ارادہ سے مکّہ پہنچ چکے تھے اور یزید کے بعض لامذہب مشیرانِ کار علانیہ کہہ رہے تھے کہ اگر ان کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہوا تو وہ

کی دیواریں تک بھی ڈھادیں گے۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیرؓ پر حملہ کے وقت بے پناہ سنگ باری سے بیت اللہ کی عمارت کا یہی حشر ہوا تھا۔ علاوہ ازیں مکہ امامؑ کے لئے اس لحاظ سے بھی ایک ناسازگار مقام نہ تھا کیونکہ ابن زبیرؓ نمائشی ہمدردی کے باوجود یہ نہ چاہتے تھے کہ حسینؑ مکہ میں طولانی قیام اختیار کر کے ان کی قیادت کی راہ میں رکاوٹ بنے رہیں۔ پھر جب مکہ میں قیام خطرہ سے خالی نہ تھا تو امامؑ مکہ میں رہ کر کیوں بیت اللہ پر فوج کشی کرانے کا موجب اور خونریزی کا سبب بنتے؟ طواف کے دوران کوئی ملعون آپکی پشتِ مبارک میں چھرا یا خنجر گھونپ دیتا مفت میں آپکی جان جاتی اور بیت اللہ کی حرمت بھی برباد ہوتی حکومتِ شام زیادہ سے زیادہ یہ کرتی کہ اپنے معائب پر پردہ ڈالنے کے لئے کسی بیگناہ بدو کو مجرم قرار دیکر موت کے گھاٹ اتار دیتی۔ کوئی عجب نہ تھا کہ ابن زبیرؓ کو سازشِ قتل کا مجرم قرار دے کر قصاص میں قتل کر دیتی اور اس طرح یک بہ دو کاج کا سلسلہ بن جاتا اور ابن زبیرؓ کی خلش بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتی۔ اس طریق کار سے قتلِ حسینؑ کا اصلی مجرم یزید پردۂ اخفا میں رہتا اور اس کی بدکرداریوں پر مسلسل نقاب پڑا رہتا جس طرح امام حسنؑ کے بالواسطہ قاتل اسی یزید پلید کا باپ امیر معاویہ آج تک پسِ پردہ ہے اور امامؑ کا قطعی قاتل ہونے کے باوجود "رضی اللہ عنہ" کے خطاب کا وارث بنا ہوا ہے حسینؑ اتنی عظیم الشان قربانی اس طرح کیوں ضائع کرتے کہ نہ تو دشمنانِ دین کے چہرے بے نقاب ہوتے اور نہ عوام میں وہ بیداری پیدا ہوتی جس کو عالمِ وجود میں لانے کے لئے امامؑ انکارِ بیعت پر چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔

ان حالات میں جب نواسۂ رسولؐ ہجرت پر مجبور تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کہاں کا قصد کرتے؟ امامؑ کی مدینے سے مہاجرت مشہور ہو چکی تھی مگر طائف ہو یا یمن، بصرہ ہو یا یمامہ، کہیں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لئے حاضر ہیں اور آپ کی حفاظت کے لئے آمادہ ہیں اس موقع پر عرب کے آباد ترین خطہ ملک عراق اور اس کے بھی اہم مرکز کوفہ سے، یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ ہمارے یہاں آئیے۔ ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لئے ہر طرح تیار ہیں۔

سینکڑوں عرضداشتیں آتی ہیں، متعدد خطوط پہنچتے ہیں اور خطوط ارسال کرنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی محبت و وفاداری پر امامؑ کو کامل بھروسہ بھی ہے مثلاً حبیب ابن مظاہرؓ، سلیمان بن صرد خزاعیؓ، رفاعہ بن شدادؓ وغیرہ۔ اس صورت میں یہ نہ دیکھو کہ بعد میں کیا ہوا؟ کیونکہ وہ تو بعد کے وقتی و ہنگامی اسباب کا نتیجہ تھا بلکہ اس امر سے خالی الذہن ہو کر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ آئندہ کے واقعات پردۂ غیب میں ہیں یہ غور کرنا ہے کہ ان حالات میں امامؑ کو کیا کرنا چاہئے تھا۔ اگر ان حالات میں ہم الجھے ہوئے ہوتے تو ہم کیا کرتے یا کم از کم ہم کو کیا کرنا چاہئے تھا۔

اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں آپ نے کوفیوں کے سینکڑوں خطوط کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور کسی کا جواب نہ دیا۔ ایک نہیں، دو نہیں، دس نہیں، چنانچہ ان چھ سو خطوں کے بعد بھی جو صرف دو دن میں آئے تھے خطوط کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ دو خرجیاں خطوں سے بھر گئیں (الاخبار الطوال۔ ص ۲۳۲) لیکن جب کوفیوں کا آخری خط پہنچا تو اسے دیکھ کر آپ تڑپ گئے، رونگٹے کھڑے ہو گئے، جسم پر کپکپی طاری ہو گئی اور آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں ہوا کیونکہ خط میں تحریر تھا "اے حسینؑ! ہم آپکو اپنی ہدایت کے لئے بلاتے ہیں اور آپ نہیں آتے۔ آپ خدا کے روبرو روزِ حشر کیا جواب دیں گے؟ اور ہم آپ کے نانا کے حضور فریاد کریں گے تو آپ کیا عذر پیش کرینگے؟ اے حسینؑ! اپنا وہ عذر ابھی تیار کر رکھئے جو اس دربارِ حق و عدل میں آپ پیش کرینگے۔" کوفیوں کا یہ خط پڑھ کر آپ نہ رک سکتے تھے اور آپکو نہ رکنا چاہئے تھا کیونکہ آپ امامِ ہدیٰ تھے اور رسولِ برحقؐ کے جانشینِ برحق۔ عوام کی رہنمائی اور تبلیغِ اسلام آپ کا فرض تھا۔ اگرچہ امامؑ نے بوجہ کمسنی رسولِ خداؐ کے طرزِ عمل کو بچشمِ خود نہ دیکھا تاہم صحابہ کرامؓ کے ماحول میں پرورش پا کر یہ سنا اور سمجھا تو تھا کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی قبیلہ نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ ہماری بستی کی ہدایت اور تبلیغِ اسلام کے لئے اپنا معتبر آدمی جو علمِ دین سے واقف ہو بھیج دیں اور آنحضرتؐ بھیج دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا تھا کہ لوگ مکر و فریب سے ان معلمین کو بے جا قتل کر دیتے تھے لیکن رسولِ خداؐ ان المناک تجربوں کے باوجود تبلیغِ اسلام کے لئے معلمین کو ضرور بھیجتے رہے اور ان ناموافق حالات کا سامنا کرتے رہے۔ معلمین کی شہادت کے خوف سے تبلیغی سلسلہ منقطع تو نہ کر دیا تھا۔

تو پھر حضرت امام حسینؑ رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کی موجودگی میں کوفیوں کی اس درخواست کو کس طرح مسترد کر سکتے تھے جس میں انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر آپ ہماری ہدایت و امامت کا اہتمام نہ کریں گے تو بروزِ قیامت جوابدہی کے لئے تیار رہیں۔ امام حسینؑ نے اپنے نانا کے اسی اصول پر عمل پیرا ہو کر مسلم بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر ہدایت کے کام پر مامور کر کے بھیجدیا اور صرف اتنا اعلان کر دیا کہ اگر تم مسلمؓ سے حسن سلوک سے پیش آؤ گے تو ہم بھی آجائیں گے۔ مسلمؓ کو تنہا بھیجا گیا۔ کوئی لاؤ لشکر ساتھ نہ کیا گیا۔ کوئی سامانِ جنگ فراہم نہ کیا گیا۔ کیا کسی منظم و مستحکم حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے یہی طریق کار استعمال کیا جاتا ہے؟ کیا بغاوت پھیلانے کا دستور یہی ہے؟ معاذاللہ! امام عالیمقامؑ عقل و فراست سے اتنے معرا تو نہ تھے کہ انہوں نے ہزار خطوط کو ہزار آدمی سمجھ لیا اور سابقہ تجربات کے برعکس فوری طور پر یقین کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے کوفی اپنے عہد پر قائم رہیں گے اور یہ کہ اموی تشدد کے باوجود آخری وقت تک ثابت قدم رہیں گے کیا یہ امکان نہ تھا کہ محدود افراد کی ایک ہی جماعت بار بار امامؑ کو خط لکھ رہی ہو۔ لیکن دیکھنا تو یہ چاہئے کہ حالاتِ وقت کا تقاضا کیا تھا؟ امام کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہئے تھا؟ کیا امام ہدیٰ کے لئے یہ جائز تھا کہ محض کوفیوں کو غدار اور کذاب سمجھ کر انکی دعوت کو ٹھکرا دیتے اور بزدل و کم ہمت سیاستدان کی طرح محض اپنی جان کے بچاؤ کے لئے ان فرائض کو سرانجام دینے میں کوتاہی کرتے جو بحیثیت جانشینِ رسولؐ آپ پر خدا اور رسولؐ کی طرف سے عائد ہوتے تھے۔

کوفیوں کے چند محاسن

جہاں کوفیوں کے بیسیوں معائب ہیں وہاں کچھ محاسن بھی ہیں جن کو یک قلم نظر انداز کر دینا بھی قرینِ انصاف نہیں۔

کوفہ کا مردم خیز خطہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فتح ہوا تھا اور بہت جلد اسلامی رنگ میں رنگین ہو گیا تھا۔ دینی مسائل پر تنقید کرنا ان کے خمیر میں داخل تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دربار میں عاملِ حکومت کے خلاف جو غضب سے پہلی شکایت پیش ہوئی تھی وہ اسی کوفہ کی طرف سے تھی اور وہ یہ تھی کہ سعدؓ بن ابی وقاص کو نماز پڑھانا نہیں آتی ہے۔ اس کے بعد بھی ہر گورنر کے اعمال و افعال پر انکی برابر انتقادی نگاہ

رہتی تھی۔ آخر کیا وجہ تھی کہ تمام عالمِ اسلام میں صرف کوفیوں ہی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یزید فاسق و فاجر ہے اور مستحقِ خلافت نہیں۔ اس لئے امام حسینؑ کو دعوت دی جائے اور ان سے بیعت کی جائے۔ یہی خیال اہلِ مکہ یا اہلِ مدینہ کو کیوں پیدا نہ ہوا؟ کیا اہلِ بصرہ و اہلِ یمن کی نگاہ میں یزید کے معائب مخفی تھے کہ کسی میں جرأتِ اظہار پیدا نہ ہوئی؟ امامؑ کے پاس کوفیوں کے سینکڑوں خطوط آئے۔ کوفیوں نے اٹھارہ ہزار کی تعداد میں بیعت کی۔ یہ تمام چیزیں مکہ میں پہنچتی رہیں۔ بایں ہمہ کسی مکی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ حضرت سے بیعت کرنے پر مصر ہوتا۔ ہاں مشورہ دینے کے لئے پوری دنیا تھی۔ امام حسینؑ خود بخود اہلِ مکہ میں یہ تحریک پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے کہ ان کو زمرۂ بیعت میں داخل کر کے حکومتِ شام کے خلاف کوئی محاذ کھڑا کریں۔ اس غرض و غایت کی تکمیل کے لئے عبداللہ بن زبیرؓ پوری طرح سرگرمی کے ساتھ معروفِ عمل تھے۔

یہ کہنا تو سراسر تاریخی حقائق کو عمداً جھٹلانا ہے کہ کوفیوں نے کسی سازش کے تحت یا قصداً فریب دینے کے لئے دعوت دی تھی۔ ہاں یہ درست ہے کہ انہوں نے دعوت دینے سے پیشتر اپنی قوت و ثباتِ قدم کا اندازہ نہیں کر لیا تھا اور نہ غور کیا تھا کہ ہم کہاں تک ساتھ دے سکیں گے۔ جان کا ہدیہ پیش کرنے کی ہم میں ہمت ہے یا نہیں۔ چونکہ ان کی عقل غبارِ عناد سے پاک تھی، وہ سمجھے ہوئے تھے کہ اسلام کی مرکزیت کس سے وابستہ ہو سکتی ہے لہٰذا انہوں نے دعوت نامے بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ ان میں حبیب ابن مظاہرؓ جیسے چند افراد بھی تھے جو قول پر جان دینا جانتے تھے مگر دنیا میں ایسے جان دینے والے کتنے ہوتے ہیں؟ ہم اس سلسلہ میں حضرت موسیٰؑ کے اصحاب، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں اور حضرت رسالتمآبؐ کے صحابہ کرامؓ کے کردار پر مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔

بہرحال سوال یہ تھا کہ کیا امامؑ کے لئے یہ روا تھا کہ کوفیوں کو بیوفا سمجھ کر انکی دعوت کو مسترد کر دیتے اور بن بلائے مہمان کی طرح کسی دوسری طرف رخ کر لیتے۔ بلانے والے جب یہ برتاؤ کرتے ہیں تو نامعلوم، جہاں امامؑ بن بلائے مہمان کی حیثیت سے جا پہنچتے وہاں کیا سلوک ہوتا۔ رہا مکہ کا قیام، اگر آپ وہاں کی ٹھیرے رہتے تو ابنِ زبیرؓ کی طرح آپ پر فوج کشی ہوتی

اور آپ محصور ہو کر شہید ہو جاتے تو پھر دورِ حاضرہ کے یہی پیشہ ور مورخین امامؑ پر اعتراض کرتے کہ امامؑ کوفہ میں کیوں نہ چلے گئے؟ کونسی عقلمندی تھی کہ اتنے بڑے خطہ کی دعوت و وعدۂ نصرت کو مسترد کر دیا جہاں کے لوگ آپ کے والد کی نصرت کر چکے تھے اور آپ کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ جان و دل سے حمایت کا وعدہ کر رہے تھے اور سینکڑوں عرضداشتیں بھیج کر آپ کی تشریف آوری کی خواہش کر رہے تھے۔ آپ نے ایسا نادر موقع ہاتھ سے کھو دیا اور مکہ کی بے آب و گیاہ زمین میں ٹھیرنا پسند کیا جہاں کے رہنے والے پست حوصلہ و بے ننگ اور جہاں کی فضا بے مہر و محبت۔ مکہ میں رہ کر مفت میں اپنی جان بھی کھو دی اور بیت اللہ کی حرمت برباد کرنے کا باعث بھی ہوئے ان حالات کی صورت میں ناقدین حضرات امام حسینؑ کے رویّہ پر یہی تنقید کرتے اور کہتے کہ امامؑ کو یہ نہ کرنا چاہئے تھا بلکہ یوں کرنا زیادہ مناسب تھا۔ یقیناً حالات کی بناء پر ایسا کہنا حق بجانب ہوتا۔ پس ان حقائق کی موجودگی میں عقل کا اقتضاء بھی یہی تھا کہ بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے اور ان کے نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے۔ اگر وہ اپنے قول میں صادق نہ ہوں تو بھی ان پر اتمامِ حجت کیا جائے۔

اگر معاذ اللہ حسینؑ امامِ وقت نہ ہوتے اور یزید کے خلاف مادی جنگ لڑنا چاہتے تو بنی امیّہ کی طرح اسلام کی تمام قیود سے آزاد ہو کر جب رشوت و زہر، مکر و فریب کا استعمال روا ہوتا، کسی جگہ بھی قیام کر کے، مدینہ ہو یا مکہ، یمن ہو یا کوفہ نہایت کامیابی کے ساتھ جنگ لڑ سکتے تھے اور یزیدی فوج کا بآسانی قلع و قمع کر سکتے تھے لیکن بحیثیت امامِ ہدیٰ، نواسۂ رسولؐ اور وصیٔ مصطفےٰؐ جو فرائض آپ کے ذمہ عائد ہوتے تھے ان کو سرانجام دینے کے لئے اور اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے پار کرنے کی خاطر وہی لائحۂ عمل درست تھا جو فرزندِ رسولؐ نے اختیار کر کے دکھا دیا۔ آپ مکہ سے اہلِ کوفہ کے مہمان بن کر نکلے۔ اس میں شک نہیں کہ اہلِ کوفہ کی کثرت امداد کو نہ پہنچی یا نہ پہنچ سکی پھر بھی کم و بیش چالیس افراد کوفی ہی تھے جو کربلا میں آپ کی نصرت میں شہید ہو گئے۔ انسانی فطرت اور عربی خاصیت کا یہ اثر ضرور ہونا چاہئے تھا اور ہو کر رہا کہ قتلِ حسینؑ کے بعد کوفی محسوس کرنے لگے کہ حسینؑ ہمارے بلائے ہوئے مہمان تھے۔ ہم نے ان کی وقت پر کوئی امداد نہ کی اور وہ ہمارے تغافل و

تساہل کی بنا پر نہایت بیدردی سے قتل کر دیئے گئے۔ چنانچہ اسی احساس نے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا اور اسی کوفہ سے سلیمان بن صرد خزاعی کے تحت **توابین** کی جماعت اٹھی۔ ہزاروں شامیوں کو فی النار کر کے خود بھی ہزاروں کی تعداد میں کوفی شہید ہو گئے۔ اسی کوفہ سے مختار ثقفیؒ اٹھے جنہوں نے قاتلانِ حسینؑ کو چن چن کر تہ تیغ بیدریغ کیا۔ زید شہیدؒ نے اسی کوفہ سے حکومتِ امیہ کے خلاف حریت کا علم بلند کیا۔ اموی خاندان کی بیخ کنی کے موقع پر یہی کوفہ عباسی دعوت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور اسی کوفہ میں **سفّاح عباسی** کی خلافت کا اعلان ہوا۔ پس یہی کوفہ تھا جو بنی امیہ کے خلاف ہر اٹھنے والی تحریک کا مرکز رہا۔ یہ وہ راز تھا جس سے امامؑ کی دور رس نگاہیں آشنا تھیں اور یہ تھا بلائے ہوئے مہمان کا حسبِ وعدہ امداد نہ کرنے کا اثر۔

امام حسینؑ ملکِ عرب میں جہاں بھی جاتے غالباً شہید ہو جاتے لیکن یہ بات نہ ہوتی جو کوفہ کی طرف رخ کرنے سے پیدا ہوئی۔ ان حقائق کی موجودگی میں جو لائحہ عمل امامؑ نے اختیار کیا اس کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرنا نہ صرف خلافِ عقل تھا بلکہ اصولِ اسلام کے منافی بھی تھا۔ لہٰذا جب مدینہ سے مکّہ کی طرف ہجرت کرنا بغاوت نہیں تو مکّہ سے بحالتِ مجبوری کوفہ کی طرف مہاجرت کیوں بغاوت پر محمول کی جاتی ہے؟ کیا امامؑ نے حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا؟ کیا یزیدی سلطنت پر حملہ یا یورش کرنے کے لئے لوگوں کو اپنی طرف بلایا؟ اگر نہیں تو پھر ایک شخص اِدھر سے اُدھر جا رہا ہے اسکی آمد و رفت پر پابندی کیوں؟ کیا امام عالیمقامؑ کی ہجرت کو خروج سے تعبیر کرنا پرلے درجہ کی احسان فراموشی، کوتاہ اندیشی، ہرزہ سرائی اور ضمیر فروشی نہیں ہے جو حامیانِ یزیدیت کو آباء و اجداد سے بطورِ ورثہ ملی ہے؟

مفروضہ خروج کے لئے ساز و سامان

اس مقام پر دیکھنا یہ ہے کہ امام عالیمقامؑ مفروضہ خروج کے لئے کس ساز و سامان کے ساتھ مکّہ سے نکلے؟ اگر لشکر تیار کر کے نکلے تو خروج تھا۔ اگر عورتوں اور بچوں کو ساتھ

ے کر نکلے تو تلاشِ امن و قیام کی کوشش تھی اور لوگوں کی ہدایت اس کا منشاء تھا۔ ہر زمانہ کی ملکی سیاست سے یہ امر عیاں ہے کہ جو شخص کسی منظم و مستحکم سلطنت کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے اٹھتا ہے وہ بہت عرصہ پہلے تیاری کرتا ہے اور اپنی خفیہ ریشہ دوانیوں کا جال پھیلا کر در پردہ سامانِ جنگ کی فراہمی اور لشکر کی تیاری میں مصروفِ عمل ہوتا ہے اور اس کے داعی و معاون تنظیمی مراکز قائم کرتے ہیں اور اپنی خفیہ تحریک کی عوام میں خوب نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ جب اس شخص کو یقین ہو جاتا ہے کہ حکومت سے ٹکر لینے کے لئے کافی طاقت فراہم ہو چکی ہے تو یک لخت اٹھتا ہے، حکومت کے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے۔ تمام ملک میں ہنگامۂ کارزار کا عالم ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے خونی انقلاب آتا ہے اور مطلق العنان اور خود سر حکام کے سر لڑھکتے نظر آتے ہیں۔ انقلابِ فرانس کو دیکھئے۔ روسی انقلاب کے سلسلہ میں زارِ روس کی تباہی اور لینن کے پروگرام کو ملاحظہ کیجئے۔ چینی انقلاب کے سلسلہ میں ماؤزے تنگ کی تنظیم پر نگاہ ڈالئے اور مغربی سامراج کے بل بوتے پر پروان چڑھنے والے چیانگ کائی شیک کے سرمایہ دارانہ نظام کا حشر دیکھئے۔ خود اموی سلطنت کی تباہی اور ابراہیم عباسی و ابو مسلم خراسانی کی کوششوں کا جائزہ لیجئے۔ تاریخی شواہد و حقائق اور خود عقلِ سلیم ہر حال میں مذکورہ بالا نظریہ کی تائید کرے گی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ امام حسینؑ اپنے وقت کی عظیم ترین و مستحکم ترین سلطنت، حکومتِ یزید کا تختہ الٹنے کے لئے مکہ سے نکلے کس ساز و سامان کے ساتھ؟ صرف اپنی عورتوں، بچوں اور نہایت ہی قریبی رشتہ داروں کے ساتھ، جن کی زیادہ سے زیادہ مجموعی تعداد بقولِ علامہ ابنِ خلدون نوّے افراد پر مشتمل تھی۔ (اردو ترجمہ ابن خلدون۔ ج ۵۔ ص ۹۲)

امام حسینؑ نے بہت سے قریبی رشتہ داروں کو بھی چھوڑ دیا جنہوں نے خود ہمراہ چلنے کا ارادہ نہ کیا مثلاً عبداللہ بن جعفر طیارؓ، محمد بن حنفیہؓ، عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ۔ صرف ان افراد کو اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دی جنہوں نے کسی حال میں امامؑ کو چھوڑنا نہ چاہا۔ چنانچہ علامہ طبری لکھتے ہیں:-

"امام حسینؑ مکہ سے عراق کی طرف صرف اہل و عیال کو لے کر نکلے" (تاریخ طبری جزء

ایک دوسرے مقام پر علامہ ممدوح رقمطراز ہیں :۔

"امام حسینؑ مکہ سے عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر نکلے۔" (تاریخ طبری الجزء السادس۔ ص ۲۲۴)

کیا گنتی کے چند افراد لے کر جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں کسی مستقل و مضبوط حکومت کے خلاف بغاوت ہو سکتی ہے ؟ یا کبھی کسی نے کی ہے ؟ ہرگز نہیں۔ علامہ اقبالؒ کی شہادت ملاحظہ فرمائیے :۔

مدعائش سلطنت بودے اگر
خود نکردے با چنیں سامان سفر
دشمناں چو ریگِ صحرا لا تعد
دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد
عزمِ او چوں کوہساراں استوار
پایدار و تند سیر و کام گار
تیغ بہر عزتِ دیں است و بس
مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

اقوالِ امامؑ بوقتِ خروجِ مفروضہ

امامؑ کے وہ اقوال جو آپ نے مکہ سے روانگی کے وقت ارشاد فرمائے تھے گزشتہ باب میں "حق گوئی و صاف بیانی" کے تحت درج ہو چکے ہیں۔ ناظرین کرام ورق الٹ کر ملاحظہ فرما لیں۔ یہ ارشادات اس شہید مظلوم، غریب نینوی، مذبوح من القفاء کے ہیں جو یہ جانتے تھے کہ میں مقتل کی طرف جا رہا ہوں جہاں وحشی درندے میرے جوڑ و بند قطع کر دیں گے اور میرے قتل سے اپنی حسرتیں نکالیں گے۔ کیا درد بھرے فقرات، موت کا یقین لئے ہوئے الفاظ اس شخص کے منہ سے نکل سکتے ہیں جو بزعم خود ایک مستقل و مستحکم سلطنت کو تہ و بالا کرنے کیلئے اٹھا ہو۔

شہادت کی پیشن گوئیاں

امام حسینؑ اپنے جدِ امجد حضرت محمد مصطفےٰؐ کو واقعی نبی برحق جانتے اور مانتے تھے اور

اس امر کا قوی یقین رکھتے تھے کہ نانا کی پیشین گوئی کے مطابق میری شہادت ارضِ کربلا میں وقوع پذیر ہوگی جہاں وحشی درندے میرے جسم کو پارہ پارہ کر دیں گے اور مجھے تشنہ دہن ذبح کریں گے۔ حضرت علی مرتضےٰؑ نے بارہا ان پیشین گوئیوں کو مختلف موقعوں پر دہرا کر جناب حسینؑ کو صابر و شاکر رہنے کی تلقین کی تھی۔ کیا وہ شخص جس کو اس امر کا یقین ہو کہ وہ اپنے اہل و عیال کی معیت میں بھوکا اور پیاسا ریگزارِ کربلا میں ذبح کیا جائیگا یہ امید کر سکتا ہے کہ وہ ایک وسیع و مضبوط سلطنت کے خلاف بغاوت کر کے اس کے تاج و تخت کو اپنے قبضہ میں لے سکے گا اور جاہ و حشم اور شان و شوکت کے ساتھ ایک وسیع و عریض سلطنت پر حکومت کر سکے گا؟

۱۱۔ دورانِ سفر امامؑ کا طرزِ عمل

مکہ سے روانگی کے بعد بدوؤں کی ایک جماعت آپ کے ساتھ اس خیال سے شامل ہوگئی تھی کہ کوفہ پہنچ کر خوب آرام و راحت سے دوچار ہونگے لیکن امامؑ انہیں تاریکی میں نہ رکھنا چاہتے تھے اور مناسب موقع کے انتظار میں تھے چنانچہ مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی اطلاع پا کر زبالہ یا زرود کی منزل پر امامؑ نے اپنا مشہور خطبہ ارشاد فرما کر ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا اور لوگوں کو ترکِ رفاقت کی اجازت دے دی تھی جس پر بھیڑ دائیں بائیں کٹنا شروع ہوگئی تھی۔ کیا وہ شخص جو کسی حکومت کیخلاف خروج کرنے کے لئے اٹھا ہو اپنے ساتھیوں کو اس طرح مایوسی کے ساتھ اپنے آپ سے الگ کر دیتا ہے یا طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اور خوش آئند توقعات کا تصور دلا کر ان پر اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا جاتا ہے؟

مقامِ ذوحسم پر حُر کے رسالے کو جو پیاس کے مارے جاں بلب ہو رہا تھا اور بیاباں میں کوسوں پانی کا نام و نشاں نہ تھا، پانی سے سیراب کیا کہ امامؑ نے انسانی ہمدردی اور دشمن سے بے پایاں فیاضی کا ثبوت نہیں دیا تھا؟ کیا وہ شخص جو بغاوت کی غرض سے اٹھتا ہے دشمن کی فوج کو اس طرح پانی سے سیراب کرتا ہے یا انکی کمزوری و مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کا کام تمام کرنے کی فکر میں ہوتا ہے؟ امامؑ کے بلند پایہ مقاصد پر روشنی ڈالنے والی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:۔

زرود کی منزل پر امامؑ کی زہیر بن القین سے ملاقات ہوئی جنہیں اس سے پیشتر خاندانِ رسولؐ سے کوئی عقیدت نہ تھی بلکہ اہلِ شام کے ہم عقیدہ سمجھے جاتے تھے جو اس زمانہ میں **عثمانی مسلک** کہلاتا تھا حضرت امام حسینؑ کی باطنی فطرت فراست نے اپنے معاملہ کو اس عمدگی کے ساتھ ان کے سامنے پیش کیا کہ وہ عثمانی مسلک سے منحرف ہو کر امامؑ کے جاں نثار و فداکار بن گئے۔ اپنا خیمہ اکھاڑ کر اصحابِ حسینؑ کے خیموں کے پاس گاڑ دیا اور بیوی کو طلاق دے کر کہا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ میکے چلی جائے۔ ساتھیوں سے کہا کہ میں نے امام حسینؑ کے ساتھ مرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا ہے جو شخص تم میں سے ہمارے ساتھ شہید ہونا چاہے وہ قیام کرے اور جو نہ چاہے وہ یہیں سے واپس پلٹ جائے چنانچہ ساتھ والے واپس چلے گئے۔ (الاخبار الطوال۔ ص ۲۵۶)

اس واقعہ سے صاف عیاں ہے کہ امام عالیمقامؑ نے زہیر بن القین سے جو گفتگو فرمائی تھی وہ خوش آئند توقعات وامید افزا تصورات پر مبنی نہ تھی بلکہ صفائی و راست گفتاری کے ساتھ اس آخری المناک مگر حیرت انگیز انجام کار کا انکشاف تھا جس پر ابھی تک سطحی نگاہوں میں توقعات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ امام عالیمقامؑ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر منزلِ عمل کی طرف ہر لحظہ بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی احمق یہ سمجھے کہ حسینؑ کوفہ پر حملہ کرنے کی غرض سے مسافت قطع کر رہے تھے تو اہل کوفہ کی بیوفائی اور مسلمؑ و ہانیؓ کی شہادت کی المناک خبر نے مادی کامیابی کی ٹمٹماتی ہوئی شمع امید کو گل کر دیا تھا لہٰذا منزلِ زبالہ سے واپس لوٹ آنا چاہیے تھا لیکن امامؑ اسی راہِ عمل پر بدستور گامزن رہے جس پر چل کر مسلمؑ نے جان دی تھی۔ بعض حضرات کا یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں کہ حضرت حسینؑ مقام زرود یا زبالہ پر پہنچ کر مسلم بن عقیل کی المناک موت کی خبر سن کر واپسی پر غور کرنے لگے لیکن اولادِ عقیلؑ کے اصرار کی بناء پر کہ "ہم مسلم کا انتقام لئے بغیر نہ ٹلیں گے" سفر جاری رکھنے پر مجبور ہو گئے اور واپس نہ لوٹ سکے۔

اسدی نوجوانوں کی زبانی یہ وحشت ناک خبر سن کر مسلم بن عقیلؑ و ہانی بن عروہؓ نہایت بیدردی سے قتل کئے جا چکے ہیں اور ان کی لاشوں کو پاؤں میں رسی باندھ کر بازاروں میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ آپ کے

ساتھیوں پر مایوسی کا چھا جانا اور ان میں اضطرابی کیفیت پیدا ہونا ایک فطری امر تھا کیونکہ ایک تو مسلم کی المناک شہادت کچھ کم اندوہناک نہ تھی اور دوسرے مستقبل کے متعلق تمام ظاہری امیدوں پر پانی پھر چکا تھا تمام رفقاء کی نظریں اپنے سردار پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس نازک موقع پر بھی اچانک یہ دردناک خبر سن کر امامؑ مضطرب نہ ہوئے اور چند بار "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَیْهِمَا" فرما کر کہنے لگے "عِنْدَ اللّٰهِ نَحْتَسِبُ اَنْفُسَنَا" ہم اللہ کے یہاں اپنی جانوں کا حساب کرتے ہیں یعنی اسکی راہ میں اپنی جانیں نثار کرتے ہیں اور وہی معاوضہ دینے والا ہے۔ (اخبار الطوال ص:۲۴۶)

یہ مختصر سا فقرہ حسینی مسلک کا کتنا بہترین آئینہ دار ہے۔ امامؑ اسی جادۂ حق پر چلنے کا ارادہ کئے ہوئے تھے جس پر چل کر حضرت امیر مسلمؓ نے اپنی جانِ عزیز جان آفرین کے سپرد کی تھی۔ آپ کے بعض ساتھی کہنے لگے "خدا کا واسطہ! اپنی اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالئے یہیں سے واپس ہو جائیے کیونکہ کوفہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہے نہ دوست، بلکہ ہمیں خوف ہے کہ پورا کوفہ آپ کے خلاف ہو چکا ہوگا۔"

اس میں شک نہیں کہ حضرت مسلمؓ کی شہادت کے بعد جو احباب آپ کو واپسی کا مشورہ دے رہے تھے یقیناً نیک نیت اور اپنے نقطۂ خیال سے حق بجانب تھے مگر انہیں حسینی مقصد کا اندازہ نہ تھا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور وقتی تأثر کے جذبہ سے جو ہمدردی کا مشورہ دیا جائے اس کے جواب میں سنجیدہ دلائل کارآمد نہیں ہو سکتے۔ وقتی جذبات کے مقابل عقلی دلائل بہت کم کامیاب ہوا کرتے ہیں۔ امامؑ نے اسی فطری اصول کے پیش نظر اس ہنگامی جذبہ سے پیدا شدہ مشورہ کا جواب بالکل متضاد فطری جذبہ کے احساس سے دینا چاہا اور اس کے لئے ایک نظر اولادِ عقیلؓ پر ڈالی اور فرمایا "تمہاری کیا رائے ہے مسلمؓ تو شہید ہو گئے؟" امام کے اس سوال نے برادرانِ مسلمؓ کے جذبات پر وہی کام کیا جو کسی مشتعل مادے سے آگ کا چھو جانا کرتا ہے تمام عقیلی جوان شوقِ شہادت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "خدا کی قسم! ہم تو واپس نہ ہونگے جب تک مسلمؓ کے خون کا بدلہ نہ لے لیں یا وہی موت کا ساغر ہم بھی نہ چکھ لیں جو مسلم نے چکھا۔" یہ سننا تھا کہ امامؑ مشورہ دینے والے دونوں اسدیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے "جب یہ لوگ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔" امامؑ کے الفاظ نے واضح کر دیا کہ آپ کا مقصد خونِ مسلمؓ کا انتقام نہ تھا بلکہ امامؑ کہہ رہے تھے

کہ مسلمؓ کی شہادت کے بعد ہم زندہ رہے تو اس زندگی کا کیا لطف ہے؟ کیونکہ امامؑ کے عندیہ کے مطابق ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بھی فی نفسہٖ ایک جرم تھا۔ البتہ آپ نے اولادِ عقیلؓ کو ترکِ رفاقت کے لئے اجازت دے دی تھی تاکہ ان کے دل میں یہ خیال نہ رہے کہ امامؑ نے اسدی جوانوں کے قول کے بموجب گھر بھر کی جان کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ امامؑ قربانی کے عظیم الشان مقصد کے تکمیل کے لئے کسی دباؤ یا ذاتی اثر سے کام نہ لینا چاہتے تھے بلکہ اپنے ہر ساتھی کے دل میں قربانی کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اس کے فعل کا خود اس کی اپنی ذات کو ذمہ دار بنانا چاہتے تھے۔ اسی احساس کا یہ نتیجہ تھا کہ امامؑ کے رفقائے کار میدانِ جہاد میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر جاتے تھے۔ اور کسی ایک کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ یہ وہ حیرت انگیز کارنامہ ہے اور یہ وہ جذبۂ قربانی ہے کہ جس کو تاریخِ عالم میں صرف حسینؑ ہی اپنے ساتھیوں کے اندر پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اگر بقولِ معترض امامؑ کا مقصد خونِ مسلم کا انتقام ہوتا یا حکومتِ شام کے خلاف باغیانہ خروج ہوتا تو آپ بدوؤں کی اس جماعت کو جو مکہ سے روانگی کے بعد مالِ غنیمت کی ہوس میں آپ کے ساتھ شامل ہو گئی تھی حقیقتِ حال سے آگاہ کر کے اپنے آپ سے علیحدہ نہ کرتے بلکہ ان کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر اور خوش آئند توقعات کی امید دلا کر اپنی گرفت میں رکھنے کی کوشش کرتے۔ اگر عراق کی روانگی کا ارادہ فی الحقیقت خوشگوار توقعات پر مبنی تھا تو بیشک اب اس ارادہ کو بدل جانا چاہئے تھا کیونکہ وہ توقعات اب مایوسی سے بدل چکے تھے لیکن جب امام عالیمقامؑ کے سامنے امیدوں کا سبز باغ نہ تھا بلکہ اہلِ کوفہ کے حد سے بڑھے ہوئے اصرار کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب و دعوت کی قبولیت تھی جو اتمامِ حجت کے لئے ضروری تھی تو اس ارادے کو اتنے پر کہ حضرت مسلمؑ جاں بحق ہو چکے ہیں، متزلزل نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ ہاشمی استقلال، نبوی ثباتِ قدم، حیدری شجاعت، وعدہ کی سچائی، بات کی پابندی اور آہنی عزم کا تقاضا یہ تھا کہ کوفیوں کو دکھلا دیں کہ دیکھو ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں اور تمہارے بلائے ہوئے آئے ہیں اور اپنے اس عزم راسخ پر آخری دم تک قائم رہیں گے۔

امامؑ کے پاس بظاہر حضرت مسلمؑ کی شہادت کی تفصیلات بھی تو نہ پہنچی تھیں اس لئے اس امر کا امکان تھا کہ حضرت مسلمؓ بڑی خوں ریز لڑائی کے بعد شہید ہوئے ہوں جس میں اہلِ کوفہ نے پورے طور پر دادِ شجاعت دی ہو لیکن حکومت کی تربیت یافتہ منظم و مسلح فوج کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہ ہوئے ہوں۔ ممکن ہے کہ ان

کے دل میں یہ ارمان ہوں اور بعد میں یہ کہنے کا موقع ملے کہ اگر امام حسینؑ آجاتے تو انہیں تازہ قوت حاصل ہو جاتی اور حالات کا نقشہ بدل جاتا۔ اس صورت میں آپ کا اس مقام سے پلٹ جانا جب کہ کوفہ کے لوگ آپ ہی کی خاطر ایک مصیبت اور کشمکش میں مبتلا ہو چکے ہوتے بڑی کمزوری اور پرلے درجہ کی کم ہمتی کا نمونہ سمجھا جاتا اور حیدری شجاعت و ہاشمی وقار کو بٹہ لگتا اور نبوی تربیت پر حرف آتا۔ لہٰذا امامؑ کو اتمامِ حجت اور تکمیلِ مقصد کے لئے آگے بڑھنا ضروری تھا اور آپ غیر متزلزل استقامت کے ساتھ آگے بڑھے لیکن بدوؤں کی بھیڑ کو الگ کر کے آپ نے یہ بھی دکھا دیا کہ آپ کا مقصد حکومتِ شام کے خلاف بغاوت کرنا نہ تھا بلکہ ایک منظم قربانی کو تدریج کے ساتھ پیش کر کے اسلام کا تحفظ اور عوام کی ذہنی بیداری مقصود تھی۔

۱۲۔ امامؑ کا طرزِ عمل کربلا میں

امامؑ عالیمقام نے کربلائے معلیٰ پہنچ کر حر بن یزید کے اصرار کی بناء پر دریائے فرات کا کنارہ چھوڑ دیا اور تپتی ریت پر خیمے برپا کر لئے۔ اگر آپ دریا کا کنارہ نہ چھوڑتے تو آپ کے لشکر کو بعد میں نہ پیاس کی ناقابلِ برداشت صعوبتیں اٹھانا پڑتیں اور نہ ہی پشت کی جانب سے یزیدی افواج حملہ آور ہو سکتیں کیونکہ پشت کی جانب دریا کی موجودگی قدرتی حصار کا کام دیتی لیکن امامؑ نے احباب کے مشورہ کے خلاف عمل کر کے دکھا دیا کہ وہ اپنے آپ کو خطرات میں ڈال کر بھی امن پسندی و رواداری کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور اپنی طرف سے جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے مبادا دشمن کو آپ پر الزام عائد کرنے کا موقع مل جائے

امامؑ کی دور رس نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ لوگ آپ کی موت کے بعد آپ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے اور امامؑ کی نیت و ارادے کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کر کے شہادت کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا امامؑ نے امور کی صحیح واقفیت کو محض اپنے الفاظ پر مبنی نہ رکھا۔ کیا خبر امامؑ کے بیان کردہ الفاظ بجنسہٖ آنے والی نسلوں تک پہنچیں یا نہ پہنچیں۔ اگر پہنچیں تو کوئی یقین کرے یا نہ کرے۔ لہٰذا آپ نے اپنے بلند مقصد کی صداقت میں محض واقعات کو شہادت کے طور پر پیش کرنا مناسب سمجھا۔ لوگ جھوٹ بولیں، سچائی کو باطل کے لباس میں پیش کریں، دوست تعریف میں مبالغہ کریں اور

منقبت میں غلو سے کام لیں۔ دشمن عداوت میں زیادتی کریں اور منقصتِ شان میں پورا زور صرف کردیں لیکن واقعات تو جھوٹ نہیں بول سکتے۔ واقعات تو مبالغہ نہیں کر سکتے۔ حسینؑ مدینہ منورہ و مکہ معظمہ سے اہل وعیال اور قریبی رشتہ داروں کو ساتھ لے کر نکلے۔ کیا اسی ساز وسامان سے ایک مستقل و مستحکم حکومت کے خلاف خروج کیا جا سکتا ہے؟ راستے میں جو دوست و مددگار آگئے ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر کے اپنے آپ سے علیحدہ کر دیا۔ کیا یہ روش اس مادہ پرست باغی کی ہو سکتی ہے جو کسی حکومت کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے اٹھا ہو؟ امامؑ نے دریا کا کنارہ جو امن و عافیت کا سہارا تھا چھوڑ کر تپتی ریت پر خیمے برپا کر لئے۔ کیا یہ اس شخص کا لائحۂ عمل ہو سکتا ہے جو فوجِ مخالف کو موت کے گھاٹ اتارنے کی فکر میں ہو اور ایک مستحکم سلطنت کا تختہ الٹنے پر کمربستہ ہو؟ امامؑ نے شش ماہے بچے کو فوجِ اشقیاء کے سامنے لاکر پانی مانگا حالانکہ آپ جانتے تھے کہ شقی القلب قوم پانی کی بجائے

حلقومِ اصغر پر تیر برسائے گی۔ آپ نے

اپنے اس طرزِ عمل سے ساری دنیا کو دکھا دیا کہ "اَنَا قَتِیلُ العطشان" اگر میرے خیام میں پانی ہوتا تو میں ان اشقیاء سے پانی مانگنے کی ذلت کیوں اٹھاتا؟ ان واقعات کے باوجود دشمن تو دشمن ہی تھے۔ ان سے حق و انصاف کی کیا توقع ہو سکتی تھی یا اب ہو سکتی ہے۔ دوستوں میں بھی بعض ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو یہ شبہ کرنے لگ گئے ہیں کہ خیامِ امامؑ میں یومِ عاشور تک پانی موجود تھا۔

یومِ عاشور عالی منزلت امامؑ نے زرہ بکتر و خود کو زیبِ تن کرنے کی بجائے خز کا کرتہ پہنا اور حضرت رسالتمآب کے عمامہ مبارک کو زیبِ سرِ اطہر کر کے گھوڑے کی بجائے اونٹ کی سواری اختیار کی اور فوجِ اشقیاء کے سامنے تشریف لاکر اپنا مشہور تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اپنی ذاتِ مقدس کا تعارف کرانے کے بعد اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کی۔ لوگوں کو خونِ ناحق کے جرمِ عظیم سے باز رکھنے کی سعی کی اور آخری دم تک اس کوشش میں مصروفِ عمل رہے کہ کسی طرح اس حقیقت ناشناس قوم کی آنکھوں سے غفلت و جہالت کی پٹی اتر جائے اور ان میں حق و باطل کے امتیاز کا شعور پیدا ہو جائے تاکہ یہ ضلالت و عصیاں کی گرفت سے آزاد ہو کر نارِ جہنم کا ایندھن نہ بنے۔ یہ خوش نصیبی و بیدار بختی صرف حُر اور چند دیگر گنتی کے

افراد کے مقدر میں تھی کہ وہ باطل کی اعانت سے کنارہ کش ہو کر حمایتِ حق پر کمربستہ ہو گئے۔ بہرکیف کیا یہ طرزِ عمل اس شخص کا ہو سکتا ہے جو کسی مضبوط حکومت پر حملہ کرنے کی فکر میں ہو؟ کیا وہ میدانِ جنگ میں زرہ بکتر و خَود پہنتا ہے یا خُز کے باریک کپڑے کا کرتہ زیب تن کرتا ہے؟ کیا میدانِ جنگ میں گھوڑے کی سواری استعمال ہوتی ہے یا اونٹ کی؟

امرِ واقعہ یہ ہے کہ امامؑ نے ہر وہ طریقِ کار اختیار کر کے دکھا دیا کہ آپ صلح جو ہی، امن پسندی اور رواداری کے حامی ہیں۔ آپ نے واقعات کو گواہی میں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ آنے والی نسلوں کو جب یزیدی ایجنٹ اپنے ابلیسانہ مکر و فریب سے غلط فہمی میں ڈالنا چاہیں تو امامؑ کا طرزِ عمل رہ نوردانِ حق کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہو اور واقعات آپ کی مظلومیت و عظیم الشان قربانی کی شہادت میں پیش ہو کر یزیدیوں کے دامِ تزویر کو تار تار کر کے رکھ دیں۔ دورِ حاضرہ کے پیشہ ور مورخین ایک طرف تو حضرت امام حسینؑ پر بغاوت کا الزام لگاتے ہیں اور جب امن پسندی و رواداری کی ان مثالوں کو دیکھ کر سچائی کو چھپانے میں ناکام ہوتے ہیں تو دوسری طرف اس صلح جُویانہ طرزِ عمل کو (العیاذ باللہ) امامؑ کی کمزوری پر محمول کرتے ہیں۔ چنانچہ قربانی کی عظمت کو کم کرنے اور حسینی طرزِ عمل کو خروج قرار دینے کے لئے دشمنوں کی مذموم ترین حرکت وہ دروغ بافی و افترا پردازی ہے جس کے تحت امامؑ کی مفروضہ تین شرائط کو عالمِ وجود میں لایا گیا ہے جو بقولِ معاندین یومِ عاشورہ فوجِ اشقیاء کے سامنے پیش ہوئیں۔ امامؑ نے فرمایا: "(معاذ اللہ) میری تین باتوں میں سے ایک بات مان لی جائے۔"

۱۔ مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے آیا ہوں۔

۲۔ مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو۔

۳۔ مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو۔ وہاں کے لوگوں پر جو گزرتی ہے وہ مجھ پر گزرے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ امام عالیمقامؑ کی شہادت سے بہت پہلے معاویہ کے محکمہ وضع و نشر نے جھوٹی حدیثوں کا انبار لگا دیا تھا۔ خاندانِ رسالت کی منقصتِ شان اور اموی سلسلہ کی مدح و ثنا ملک کے چپے چپے میں پھیلائی گئی مگر جب وقت آیا تو معلوم ہوا کہ شاہی نشر و تبلیغ کی اس کوشش کو خاطر خواہ

کامیابی نہ ہوئی۔ اہلبیتِ رسالتؐ کے خلاف جو کچھ پھیلایا گیا ان کے پاکیزہ عمل سے خود بخود اس کی تردید ہوگئی اور بنی امیّہ کی بدکرداریاں و بداعمالیاں طشت از بام ہوکر رہ گئیں۔ سانحۂ کربلا سے کچھ عرصہ پہلے حدیث سازی کی یہ رفتار تیز تر کردی گئی تھی اور خود کربلا میں تاریخ کا رُخ بدلنے کے لئے اموی نامہ نگاروں اور خبر رسانوں نے جھوٹے پراپیگنڈے میں اپنی ساری دماغی قوتیں اور ذہنی کاوشیں صرف کردی تھیں۔ کربلا میں جب امام حسینؑ نے عمر بن سعد کو نصیحت کے لئے بلایا تو امامؑ اور ابن سعد کے درمیان تنہائی میں گفتگو ہوئی۔ اموی افواج میں اس گفتگو کو بہت سے معنی پہنائے گئے۔ باطل کی اس ملمع سازی کو ابن اثیر کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:۔

"وتحدث الناس ان الحسین قال لعمر بن سعد اخرج معی الی یزید بن معاویۃ وندع العسکرین۔ فقال عمر اخشی ان تہدم داری۔ قال ابنیہا لک خیرا منہا من مالی بالحجاز فکرہ ذالک عمر وتحدث الناس بذالک ولم یسمعوہ وقیل بل قال اختاروا منی واحدۃ من ثلاث اما ان یرجع الی المکان الذی اقبلت منہ واما ان اضع یدی فی یزید بن معاویۃ فیری فیما بینی وبینہ رایۃ واما ان تسیروا بی الی ثغر من ثغور المسلمین شئتم فاکون رجلاً من اھلہ لی ما لھم وعلی ما علیھم"۔ (تاریخ کامل ابن اثیر ۴: ۲۸)

(ترجمہ) کچھ لوگوں نے کہا کہ امام حسینؑ نے عمر بن سعد سے فرمایا کہ ہم دونوں اپنی اپنی فوج کو چھوڑ کر یزید کے پاس چلیں۔ ابن سعد نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ میرا گھر گرا دیا جائے گا۔ امامؑ نے فرمایا۔ میں اپنی حجاز کی جائیداد سے تمہارے لئے اس سے بہتر مکان بنوا دوں گا۔ عمر سعد نے اسے ناپسند کیا لوگوں میں یہ چرچا رہا حالانکہ کسی نے خود نہیں سنا تھا۔ کچھ یہ کہتے تھے کہ امامؑ نے فرمایا۔ "تین باتوں میں سے کوئی ایک بات میری مان لو یا تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں یا یزید کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دوں۔ وہ جو فیصلہ چاہے میرے متعلق کرے یا جس کسی اسلامی سرحد پر چاہو مجھے بھیج دو۔ میں وہاں کے ایک باشندہ کی طرح زندگی بسر کروں گا اور ان کے حالات کا پابند رہوں گا۔"

افتراء پردازی کا یہ پلندہ جس قدر مکر و فریب اور دروغ بیانی پر مشتمل ہے اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ شہادت کی عظمت کا دارومدار محض "انکارِ بیعت" پر ہے۔ انکار کی اہمیت کو گھٹانے

اور دلوں میں حسینی عظمت کو کم کرنے کے لئے یہ سب سے زیادہ خطرناک حربہ تھا جو معاندین نے امامؑ عالیمقامؑ کے خلاف استعمال کیا اور اس کو ایک ایسے نازک وقت کے ساتھ منسوب کیا گیا جب کہ ہر نا مکمل انسان ایسے خطرناک ماحول کے اندر، زندگی کو خطرات سے بچانے کے لئے ہر طرح کی بزدلانہ، منافقانہ اور کمینہ روش اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر امام حسینؑ کی بجائے کوئی دوسری شخصیت ہوتی تو اس کے متعلق یہ افترا پردازی موافق و مخالف سب پر یکساں اثر انداز ہوتی اور ہر سننے والا اس جھوٹ کے پلندے کو صداقت کا مجسمہ سمجھ کر اس کی حقانیت پر یقین کر لیتا مگر حسینؑ کے اصولِ زندگی اس قدر اعلیٰ و ارفع تھے اور آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ سلسلۂ واقعات کو اس طرح ترتیب دے رکھا تھا کہ موافقین کا تو کیا ذکر، مخالفین میں بھی یہ پروپیگنڈہ سراسر ناکام رہا اور کسی نے اس کو صحیح نہ سمجھا۔ قصرِ باطل کی بنیادیں اسی موضوعہ روایت پر رکھی گئیں جس کو ہم ابنِ اثیر کی زبانی اصل عربی عبارت میں اوپر نقل کر چکے ہیں۔ اگر عقل کی کسوٹی پر اس کو پرکھا جائے تو دلائل کی روشنی میں اس کا پول فوراً کھل جائے گا۔

مفروضہ شرائط کا جائزہ

۱۔ خیامِ اہلبیتِ اطہارؑ کے باہر کے تمام واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں ان کا راوی یزیدی پرچہ نویس حمید بن مسلم تھا جو فوجِ اشقیاء میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ دشمن کے ذریعہ حسینی عظمت و شجاعت کے صحیح حالات کا ہم تک پہنچنا ناممکن ہے۔ حکومت کے تنخواہ دار ملازمین تحریر و تقریر کے ذریعہ وہی باتیں بیان کریں گے جن سے حکومت کی شان و شوکت، عروج و اقبال اور فتح و ظفر کی تشہیر ہو۔ بھلا وہ باتیں کب لکھ سکتے ہیں جو حکومت کے مزاج کے مخالف ہوں اور جن سے حسینی عظمت و شجاعت کا اظہار ہوتا ہو؟

۲۔ تمام کی تمام مذکورہ بالا گفتگو رات کے پردہ میں تخلیہ میں ہوئی۔ حضرت امام حسینؑ و عمر بن سعد کے بغیر کوئی تیسرا فرد موجود نہ تھا۔ بقولِ راوی جب گفتگو بالکل خفیہ و صیغۂ راز میں رہی تو پھر عوام کو گفتگو کے مفہوم سے کس طرح آگاہی ہو سکتی تھی؟

۳۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ دشمن نے اپنی طاقت و اکثریت کے بل بوتے پر یہ گمان کر لیا ہوگا کہ

امامِ حسینؑ نے قلتِ انصار و فقدانِ قوتِ مزاحمت کی بنا پر مجبور ہو کر اس قسم کی باتیں کی ہونگی جن کے اظہار پر ایسے حالات میں ایک عام آدمی مجبور ہو جاتا ہے، چونکہ مخالفین کے ذہنی قوائے وعقلی قوتیں مختل ہو چکی تھیں اس لئے وہ امامؑ کے بلند پایہ کردار و اعلیٰ نصب العین کے سمجھنے کے شعور و ادراک سے عاری و محروم تھے بلکہ وہ نواسۂ رسولؐ کو ایک معمولی انسان کی حیثیت دینے کے لئے تیار نہ تھے بھلا ایسے لوگوں کی قیاس آرائی کبھی صحیح نتائج اخذ کر سکتی ہے؟ اگر قومِ اشقیاء میں عقل و شعور کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو فرزندِ رسولؐ کو ایک فاسق و فاجر اور خود سر حکمران کی خوشنودی کے لئے اس طرح بیدردی سے نہ شہید کیا جاتا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ عوام کا یہ گمان محض قیاس آرائی پر مبنی تھا۔ اس میں قطعاً کوئی صداقت نہ تھی۔

۴۔ روایت کے اپنے الفاظ (تحدث الناس بذالک ولم یسمعوہ) اس امر کی دلالت کر رہے ہیں کہ لوگوں کے اندر یہ چرچا تھا حالانکہ کسی نے خود نہیں سنا تھا۔ پس ایسی گواہی کا چشم دید و عینی ہونا تو درکنار اس کو تو سماعی شہادت (HEAR-SAY EVIDENCE) کا درجہ بھی حاصل نہیں۔ محض عوام کی قیاس آرائی پر عقلاً، شرعاً اور قانوناً کوئی فتویٰ صادر نہیں ہو سکتا۔ "عوام کالانعام" اپنے آپ کو فاتح اور حسینی سپاہ کو مفتوح؛ اپنے آپ کو غالب اور نواسۂ رسولؐ کو مغلوب سمجھ رہے تھے۔ اپنی غالب اکثریت کی بناء پر اگر نخوت و غرور کے پتلے اس قسم کی قیاس آرائی کر بھی بیٹھیں تو یہ خلافِ عقل نہیں۔

۵۔ **لفظ "قِیْلَ"** کے اندر جو اضطراب مخفی ہے خود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ روایت جھوٹ کا طومار ہے۔

بیعتِ یزید پر (مفروضہ) اظہار آمادگی

کسی روایت میں بھی یہ قول موجود نہیں کہ عمر بن سعد نے اپنی فوج میں واپس آکر عوام کو یہ بتایا کہ امامِ حسینؑ سے میری گفتگو اس موضوع پر ہوئی یا انہوں نے چند شرائط پیش کی ہیں جن میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ یزید کی بیعت کرنے پر تیار ہیں۔ اگر یہ شرط عوام کے سامنے پیش ہوتی تو پھر عوام کہتے کہ جب وہ ہمارا مطالبہ (بیعتِ یزید) تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں تو پھر جنگ کا مطلب کیا ہے؟

۲۔ یومِ عاشور اپنے خطبہ کے دوران جب امامؑ نے کوفی سرداروں کے نام لے کر اتمامِ حجت کے طور پر پکارنا شروع کیا تو قیس بن الاشعث نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اپنے آپ کو اپنے عم زادوں کے حوالے کر دیں۔ وہ وہی برتاؤ کریں گے جو آپ کو پسند ہے اور آپکو ان سے کوئی گزند نہ پہنچے گا۔" آپ نے جواب دیا۔ "تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ اے شخص! کیا تو چاہتا ہے کہ بنی ہاشم تجھ سے مسلم بن عقیلؓ کے سوا ایک اور خون کا بھی مطالبہ کریں؟ نہیں، واللہ میں ذلّت کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔" (داستانِ کربلا۔ ابوالکلام آزاد۔ ص ۴۳۔ بحوالہ ابن جریر)

اگر حضرت امام حسینؑ کی مفروضہ شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہوتی کہ مجھے خود یزید سے معاملہ طے کر لینے دو یا میں یزید کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دینے کے لئے تیار ہوں تو نہ قیس آپ پر مذکورہ سوال کرتا اور نہ ہی آپ یہ جواب دیتے۔ "نہیں، واللہ، میں ذلت کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔" اس صورت میں یہ سوال و جواب بے معنی تھے لہٰذا ثابت ہوا کہ ایسی کوئی شرط پیش نہ ہوئی تھی۔

۳۔ اگر مذکورہ شرائط میں بیعتِ یزید اختیار کر لینے کی شرط موجود ہوتی تو پھر ابنِ زیاد کا تہدیدی خط جو شمر کی معرفت، عمر بن سعد کو پہنچا اس کا یہ مضمون نہ ہوتا۔ "اگر حسینؑ مع اپنے ساتھیوں کے اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کر دیں تو لڑائی نہ لڑی جائے اور انہیں صحیح و سالم میرے پاس بھیج دیا جائے۔"

(داستانِ کربلا۔ ص ۵۸)

اگر حسینؑ بیعتِ یزید پر تیار ہوتے یا یزید کے پاس جاکر براہِ راست گفتگو سے اپنا معاملہ طے کرنے پر رضامندی ظاہر کرتے تو پھر نہ ابنِ زیاد کے خط کا یہ مضمون ہو سکتا تھا جو اوپر درج ہے اور نہ معرکۂ کربلا ظہور میں آتا۔ جنگ کی وجہ جنابِ حسینؑ کا انکارِ بیعت پر آخری وقت تک چٹان کی طرح ڈٹے رہنا ہی تھا۔

۴۔ فوجِ اشقیاء نے آخری وقت تک امامؑ کو اس غرض و غایت سے مہلت دی کہ شاید آپ یزید کی بیعت کرلیں اور اس طرح وہ نواسۂ رسولؐ کے خلاف جنگ لڑنے کی آزمائش سے بچ جائیں۔ اگر [illegible] پیش [illegible] تو عمر سعد نے کربلا پہنچتے ہی تیسری محرم کو آغازِ جنگ کیوں

نہ کر دیا اور لڑائی دسویں محرم تک کیوں معرضِ التوا میں رہی ؟

۵ ۔ شبِ عاشور کی مہلت سے بعض مخالفین کا خیال تھا کہ شاید صبح تک حضرت حسینؑ بیعتِ یزید پر رضامند ہو جائیں گے ۔ شبِ عاشور کی مہلت سے امامؑ کی غرض و غایت تو کچھ اور تھی جس کو ہم گزشتہ باب میں مفصل بیان کر آئے ہیں ۔ لیکن دشمن تو امامؑ کو مزید مہلت محض اس خیال سے دے رہا تھا کہ شاید بیعتِ یزید پر تیار ہو جائیں اور اس طرح جنگ کی نوبت نہ آئے ۔ اب اسی شرط کی دوسری شکل پر غور کیجئے ۔

مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو

یزید سے براہِ راست گفتگو کر کے معاملہ نمٹا لینے کی شرط عقلاً درست نہیں ہو سکتی ۔ حضرت امام حسینؑ جانتے تھے کہ یزید کا فیصلہ صاف و صریح ہے کہ حسینؑ بیعت کریں ورنہ قتل کر دیئے جائیں ۔ انکارِ بیعت ہی کی وجہ سے مدینہ چھوڑا ، مکّہ سے ہجرت کی ۔ اگر بیعت کرنا تھی تو عبداللہ ابن عمرؓ کی طرح پہلے ہی کر لیتے ۔ اب یزید کے پاس جا کر معاملہ کو نمٹا لینے کی کون سی صورت باقی رہ گئی تھی ؟ انسانی عقل پر زور دینے سے صرف تین صورتیں ممکن نظر آتی ہیں ۔ اوّلاً بیعت کرلیں ۔ ثانیاً انکارِ بیعت ثالثاً انکارِ بیعت پر قائم رہتے ہوئے صلح کی درمیانی راہ اختیار کی جائے ۔ امرِ اوّل کے تحت یعنی بیعت کر لینے کی صورت میں نہ مدینہ چھوڑنے کی ضرورت تھی اور نہ مکّہ سے ہجرت لازمی تھی اور پھر کربلا میں بیعت کر لینے سے جھگڑا فی الفور ختم ہو سکتا تھا ۔ پس ثابت ہوا کہ یزید کے پاس پہنچ کر بھی بیعت کرنا مقصود نہیں ہو سکتا ۔ رہا امرِ دوم یعنی کھلم کھلا انکارِ بیعت ۔ اس صورت میں یزید کے پاس جانے کی ضرورت ہی کیا تھی بلکہ وہاں جا کر اپنے آپ کو اس کے اقتدار کے پنجے میں پھنسا دینا تھا ۔ رہا امرِ سوم یعنی انکارِ بیعت پر قائم رہتے ہوئے صلح کی درمیانی راہ ۔ یہ اس صورت میں ممکن تھی کہ فریقین میں یہ عہد و پیمان ہو جائے کہ یزید بیعت کا اصرار نہ کرے اور امامؑ حکومتِ شام کے خلاف کوئی تخریبی کارروائی نہ کریں ۔ حضرت امام حسینؑ پہلے کب حکومت کے خلاف تخریبی کارروائی کر رہے تھے جس کے ترک کرنے کا اب عہد کرتے ۔ آپ معاویہ کے بیس سالہ دورِ حکومت میں امن پسندی

و رواداری کی زندگی بسر کر رہے تھے اور یزید کی تخت نشینی پر آپ نے حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے کسی تخریبی کاروائی کی ابتدا نہ کی۔ یہ خود حکومت کے پے در پے تشدد اور مظالم کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مدینہ کی سکونت ترک کی اور مکہ مکرمہ کی جائے امن میں پناہ پکڑی۔ پھر شیاطینِ بنی امیہ وہاں بھی در پئے آزار ہوئے تو مکہ بھی مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ اگر امام حسینؑ نے فی الحقیقت حکومتِ یزید کے خلاف کوئی تخریبی کاروائی کی ہوتی اور اب دمشق جاکر (معاذ اللہ) غلط بیانی سے کام لے کر یزید کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاتے جس طرح عام مادہ پرست، وقار پسند سیاسی آدمی کیا کرتے ہیں تو کیا یزید یقین کر لیتا اور اموی مکر و فریب امامؑ کو زندگی بسر کرنے کی مزید مہلت دیتا؟ کیا سبطِ اکبر حضرت امام حسنؑ کے ساتھ اموی عہد و پیمان کا حشر جناب امام حسینؑ نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا؟ کیا امام حسنؑ کی امن پسند زندگی اور دردناک موت کا منظر آپ کی آنکھوں سے اوجھل تھا؟ کیا دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں موجود نہیں ہیں کہ خود غرض، جابر بادشاہوں نے ہر اس آدمی کو موت کے گھاٹ اتار کے چھوڑا جو حکومت کے زعم میں ملک کے اندر تخریبی کاروائی سے حکومت کا تختہ الٹنے پر کمربستہ سمجھا گیا؟ لہٰذا عقلِ سلیم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ستاون سالہ امامؑ اپنے باپ اور بھائیؑ کے ساتھ اموی سلوک کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ توقع کر سکتے تھے کہ یزید کی بیعت کے بغیر صلح کی صورت ممکن ہے۔ پس مفروضہ شرط کہ "مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو" ایک فریب ہے جو محض حسینی عظمت کو کم کرنے کے لئے عالمِ وجود میں لایا گیا ہے۔ یقیناً یہ کذبِ صریح و بہتانِ عظیم دشمنانِ اہل بیتؑ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

دشمن کی اس پر فریب کوشش پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے اتنا ہی شرط کی لغویت و افترا کے متعلق یقین قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ کیا امامؑ کو یاد نہ تھا کہ معاویہ نے اپنی زندگی میں آپ کو شہید کرا دینے کی دھمکی دی تھی؟ اور اپنے اس ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مناسب موقع و محل کا منتظر رہا اور مرتے وقت یزید کو وصیت کی کہ فلاں فلاں چہار کس تیری خلافت کے راستے میں کانٹے ہیں ان میں امامؑ عالی منزلت کا نام نامی سرِ فہرست درج تھا۔ چنانچہ یزید اب باپ کی اسی وصیت پر عمل پیرا ہو کر محض امامؑ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ابنِ زبیرؓ سے تو مطالبۂ بیعت اسی شدت کے ساتھ نہیں ہو رہا تھا۔ کیا

ان تمام واقعات و حقائق کا بچشم خود ملاحظہ کرتے ہوئے امامؑ یہ یقین کر سکتے تھے کہ وہ یزید کی بیعت نہ کریں اور محض اسے یہ کہہ دیں کہ میں تمہاری حکومت کے خلاف کوئی سازش نہ کروں گا تو یزید آپ کو شہید کئے بغیر چھوڑ دے گا؟ امام حسینؑ نے اپنے متیقن انجام کو مکہ سے روانگی کے وقت ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"قسم بخدا اگر میں سوراخِ مور میں چلا جاؤں گا تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے نکال کر اپنی خواہش قتل پوری کریں گے۔ قسم بخدا میرے معاملہ میں یہ لوگ اسی طرح حدود خداوند تعالیٰ سے باہر ہو جائیں گے جس طرح یہودی سبت کے معاملہ میں ہوئے تھے۔" (تاریخ طبری الجزء السادس۔ ص ۲۱۷، ۲۳۳)

کیا یہود کی طرح نقضِ عہد کرنے والی قوم پر حضرت امام حسینؑ اعتبار کر سکتے تھے؟ اگر یزیدی وقتی طور پر عہد و پیمان کر کے امان دے بھی دیں تو کب تک اس امان نامہ کو ملحوظِ خاطر رکھیں گے؟ امیر معاویہ نے حجر کندی و عمرو بن الحمق الخزاعی جیسے متقی، عبادت گزار صحابہ کو امان دینے کے بعد قتل کرا دیا تھا۔ لہٰذا ان حقائق کی موجودگی میں یزید کے پاس جا کر براہِ راست معاملہ طے کرنے کی کوئی صورت سوائے اس کے ممکن نہ تھی کہ امامؑ یزید کی بیعت کر لیں۔ چونکہ آپ نے بیعت نہ کرنے کا ایک اٹل عزم کیا ہوا تھا لہٰذا تصادم ناگزیر تھا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ شرائط یزید کے حواریوں نے حکومت کی مدح و ستائش کے لئے وضع کی تھیں تاکہ حکومت کے جاہ و جبروت کی شہرت اور امام مظلومؑ کی تنقیصِ شان ہو۔ اب ہم دوسری شرط کا جائزہ لیتے ہیں۔

مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو

معاملہ نمٹانے کے لئے یزید کے پاس چلے جانے یا جہاں سے آئے ہیں وہاں واپس لوٹ جانے کچھ معنی ہو سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی سرحدوں پر نکل جانے کے کوئی معنی نہیں۔ اگر اس شرط سے مقصد غیر ممالک میں چلا جانا تھا تو امامؑ صاف طور پر ارشاد فرما دیتے کہ اگر یزید کو اپنی وسیع و عریض سلطنت کے اندر میری موجودگی سے خطرہ ہے تو میں بخوشی خود جلا وطنی اختیار کر کے کسی دوسری مملکت میں چلے جانے پر آمادہ ہوں۔ اگر اسلامی ملک کے اندر رہ کر سرحد کے قریب رہنا مطلوب تھا تو یہ حکومت کے مفاد کے خلاف تھا کیونکہ جس آدمی سے بغاوت کا خدشہ ہو اس کو اپنی دسترس کے اندر رکھنا چاہئے۔ نہ کہ اس کو مرکزِ حکومت سے دور

رکھا جائے جہاں وہ بغاوت کے سامان آسانی سے فراہم کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جو شرط حکومت کے مفاد کے خلاف ہو ایسے موقع پر پیش نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ بعض لوگوں کے ناخنِ تدبیر نے اس عقدہ کی گرہ کشائی کے لئے بہت زور مارا اور اس کی اس طرح توجیہہ کی ہے کہ زیرِ بحث شرط سے امامؑ کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی سرحد پر جا کر غیر مسلم اقوام کے خلاف جہاد جاری رکھنا چاہتے تھے۔ اگر اس شرط کو یہ معنی پہنائے جائیں تو یہ اور بھی لغو و مضحکہ خیز ہوں گے۔

ہر ذی شعور کے لئے محلِ فکر یہ ہے کہ کیوں حضرت علیؑ نے خلفائے ثلاثہ کے دورِ حکومت میں کسی لڑائی میں شرکت نہ کی۔ امیر خیبر گیرؑ نہ مسلسل پچیس[۲۵] سال بیمار رہے کہ ان سے جہاد کی شرط ساقط ہو جاتی اور نہ ان پر اس قدر ضعیف العمری طاری ہو چکی تھی کہ جہاد بالسیف کے فرض کو سرانجام دینے کے لئے ان میں جسمانی قوت و بدنی شجاعت ناپید ہو چکی تھی۔ بعد میں جمل، صفّین اور نہروان کی جنگوں نے ثابت کر دیا کہ حیدرِ کرّارؑ کے جسمِ مقدّس میں وہی توانائی، وہی شجاعت بدستور موجود تھی جس نے دورِ نبوی میں درِ خیبر اکھاڑ پھینکا تھا اور نامور شجاعانِ عرب کی اکڑی ہوئی گردنیں خم کر دی تھیں۔ جب باپ نے خلفائے راشدین کے عہد میں کفّار کے خلاف جنگیں نہ کیں تو بیٹے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ یزید جیسے فاسق و فاجر کی توسیعِ سلطنت کی خاطر بلاوجہ غیر مسلم اقوام پر جارحانہ حملہ کر کے ان کے امن و امان کو برباد کرتے پھرتے حالانکہ کسی ملک پر جارحانہ حملہ کرنا حکمِ خدا کی صریح خلاف ورزی ہے۔ امامؑ عامل بالکتاب کی مقدس نگاہوں سے لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ کا قرآنی حکم اوجھل نہ تھا۔ پھر غیر ملک کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے فوج و اسلحہ کی ضرورت ہے۔ جس سے امامؑ محروم ہیں۔ یزیدی حکومت فوج اور اسلحہ امام حسینؑ کی تحویل میں دے کر کیوں یہ خطرہ مول لے کہ امامؑ اسی فوج اور اسلحہ سے کفّار کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے یزید کے خلاف چڑھائی کر دیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امامؑ اس ظالم حاکم کی خاطر، جس کو وہ بدکار سمجھ کر اس کی بیعت نہیں کرتے اور اسے خلافت کا اہل نہیں سمجھتے، غیر اقوام کے ساتھ کیوں نبرد آزما ہوتے؟ پس ثابت ہوا کہ یہ شرط بھی نہایت لغو اور مہمل ہے جسے خواہ مخواہ یزیدی ہوا خواہوں نے خود وضع کر کے چند در چند وجوہ کی بناء پر امامؑ کے سر تھوپ دیا ہے۔ اب تیسری شرط کا جائزہ لیجئے۔

مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے آیا ہوں

اس شرط پر غور کرتے وقت یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ امامؑ اہلِ کوفہ کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ جب آپ کربلا میں پہنچے تو آپ نے کوفیوں ہی کی اکثریت کو اپنے خلاف صف آراء دیکھا۔ اتمامِ حجّت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ سرداروں کے نام پکار کر کہتے۔ "اے شیث بن ربعی، اے حجاب بن ابجر، اے قیس بن الاشعث، اے یزید بن الحارث! کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ پھل پک گئے، زمین سرسبز ہوگئی، نہریں اُبل پڑیں، آپ اگر آئیں گے تو اپنی فوجِ جرّار کے پاس آئیں گے۔ جلد آیئے۔" (داستانِ کربلا۔ ابوالکلام آزاد۔ صـ۴۲) چنانچہ میں تمہاری دعوت قبول کر کے آگیا ہوں لیکن تم خود ہی مجھے بلا کر آج ننگی تلواروں، کھچی ہوئی کمانوں اور تُلے ہوئے نیزوں سے استقبال پر آمادہ ہو اگر تمہیں میری امامت سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں اور تم میری آمد سے ناخوش ہو تو میں واپس وہیں جانے کے لئے تیار ہوں جہاں سے آیا ہوں۔ یہی چیز آپ نے حُر بن یزید کی سب سے پہلی ملاقات کے موقع پر اثنائے راہ بیان فرمائی تھی۔ اسی چیز کا یومِ عاشور میدانِ کربلا میں فوجِ اشقیاء کے سامنے تکرار کیا اور جب عمر سعد نے امامؑ کی آمد کی وجہ پوچھی تو یہی چیز آپ نے اس کے سامنے بیان کی۔ یہی حقیقتِ حال تھی جس سے حکومت کے نمائندہ کو آگاہ کیا گیا۔ یہ شرط بھی حکومت کے سامنے پیش نہ ہوئی تھی بلکہ ان کوفیوں کے سامنے بطورِ اتمامِ حجّت رکھی گئی تھی جو امامؑ کو دعوت دے کر آج تلواریں ان کے خلاف استعمال کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ حقیقت تو اتنی ہی تھی جس کو یزیدی ہواخواہوں نے اس قدر ہوا دی کہ اس مکروہ پروپیگنڈے کے زہریلے اثرات سے دوست دشمن کے کانوں کو مسموم کر دیا اور قربانی کی عظمت کو مٹانے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

میدانِ کربلا سے محمد بن حنفیہ کے نام خط

سید اولاد حیدر فوق بلگرامی نے اپنی کتاب ذبحِ عظیم کے صفحہ ۱۸۷ پر حضرت امام حسینؑ کے خط کی عربی عبارت نقل کی ہے جو امامؑ نے دوسری محرم کو اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام لکھا

خط کے مضمون کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :۔

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کی طرف سے محمد بن علیؑ اور ان کے نام جو فرزندانِ بنی ہاشم میں سے ان کے پاس ہیں اور ان کی حفاظت و حمایت میں سپرد گئے گئے ہیں۔ امابعد واضح ہو کہ میں نے ترکِ زندگانی کی اور اب منتظرِ شہادت ہوں۔ دنیا کو ایسا جانتا ہوں گویا تھی ہی نہیں اور آخرت کو ہمیشہ رہنے والی جانتا ہوں اور میں نے بمقابلہ دنیا کے آخرت اختیار کی ہے۔ والسلام۔"

کیا اس خط کے مضمون سے یہ ظاہر نہیں کہ امامؑ کو اپنی شہادت کا قطعی یقین تھا اور آپ داعیٔ اجل کو لبیک کہنے پر تلے ہوئے تھے پھر یہ کیونکر درست تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ معاذ اللہ آپ نے جان بچانے کی غرض سے فوجِ اشقیاء کی اکثریت کو دیکھ کر مفروضہ شرائط پیش کر دی تھیں۔ اسی سلسلہ میں ایک مزید برہانِ قاطع ملاحظہ فرمائیے :۔

ارضِ کربلا کی ساٹھ ہزار درہم میں خرید

علامہ ممدوح اپنی اسی کتاب میں بحر المصائب کی عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں کہ امامؑ نے دوسری محرم باشندگانِ نینوی کو بلا کر ارضِ کربلا جس کی مساحت چار میل تھی۔ ساٹھ ہزار درہم میں خرید لی اور دو شرائط پر پھر ان ہی لوگوں پر وقف کر دی۔ اوّلاً اس خرید کردہ زمین پر کھیتی نہ کیجائے ثانیاً اہلِ نینوی زائرین کی قبورِ شہداء تک رہنمائی کیا کریں اور تین روز تک ان کو اپنے ہاں مہمان رکھا کریں۔ چنانچہ اہلِ نینوی ان شرائط پر رضامند ہو گئے اور قیمت لے کر اپنے گھروں کو پلٹ آئے۔ (ذبح عظیم۔ طبع جدید۔ ص ۱۸۸)

ظاہر ہے کہ اگر امامؑ قومِ اشقیاء کے سامنے مفروضہ شرائط پیش کر کے رضاکارانہ طور پر قربانی پیش کرنے سے ہچکچاتے جیسا کہ ان شرائط سے نتیجہ ہوتا ہے تو آپ اس ریگزارِ کربلا کو ساٹھ ہزار درہم کی کثیر رقم دے کر کیوں خریدتے اور پھر دو شرطوں کے تحت اہلِ نینوی پر کیوں وقف کر دیتے؟ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کو اپنے جدِّ عالیمقدارؐ کی بیان کردہ پیشین گوئیوں پر ایمانِ کامل تھا اور آپ نے اسی یقینِ محکم کے ساتھ رقمِ کثیر جمع کر رکھی تھی

جس سے ارضِ کربلا خریدی گئی۔ آپ کو یقینِ کامل تھا کہ ارضِ کربلا آپ کی شہادت گاہ ہے۔ جہاں آپ کی معہ دیگر انصار کی قبریں بنیں گی جن کی زیارت کے لئے زائرین آتے رہیں گے۔ غیور امامؑ نے یہ بھی مناسب نہ سمجھا کہ آپ کی قبر کسی ایسی زمین میں بنے جو کسی غیر کی ملکیت ہو، مہمان نواز امامؑ نے زائرین کے قیام کا قبل از وقت اہتمام کر کے دکھا دیا کہ امام مبینؑ کی نگاہِ دور بین نے سینکڑوں برس بعد آنے والے واقعات کا احاطہ کر رکھا تھا۔ یہ سب کچھ اسی یقینِ محکم کا نتیجہ تھا جو عالی منزلت امامؑ کو پروردگارِ عالم کی ربوبیت اور محمد مصطفٰےؐ کی نبوت سے متعلق تھا۔ چنانچہ آج تیرہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ کی وصیت پر عملدرآمد ہو رہا ہے اور اہالیانِ سرزمینِ نینوٰی زائرین کی خاطر مدارات کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ امامؑ نے اپنے طرزِ عمل سے ہر اس اعتراض کی قبل از وقت تردید کر دی جو فردائے قیامت تک دشمنانِ اہلِ بیتؑ پیش کرنے کی سعی کریں گے یہ وہ مخصوص کمال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب شہیدِ اعظم کو عطا فرمایا ہے۔

مفروضہ شرائط کی عقبہ بن سمعان کی زبانی تردید

تمام مستند مورخین نے عقبہ بن سمعان کی زبانی ایک روایت نقل کر کے شرائط زیرِ بحث کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے چنانچہ علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں :-

عن عقبہ بن سمعان قال صحبتُ حسینا فخرجت معہٗ من المدینۃ الی المکۃ ولا فی الطریق ولا فی العسکر الی یوم مقتلہ الّا وقد سمعتا الّا واللّٰہ ما اعطاھم ما یتذکر الناس وما یزعمون من ان یضع یدہ فی ید یزید ابن معاویۃ ولا ان یسیرہ الی ثغر من ثغور المسلمین ولکنہ قال دعونی لا ذھب فی ھٰذہ الارض العریضۃ حتّٰی ینظر الی ما یصیر امر الناس (طبری جزء السادس ص ۲۳۵)

یہی مضمون تاریخ الکامل ابن الاثیر (ص ۲۸۴) پر درج ہے۔

(ترجمہ) عقبہ بن سمعان کا بیان ہے کہ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق تک امام حسینؑ کے

ہمراہ رہا اور ان کی شہادت کے وقت تک ان سے جدا نہ ہوا۔ میں نے ان کی تمام وہ تقاریر سنیں جو انہوں نے اپنی شہادت کے دن تک لوگوں کے سامنے کیں۔ خدا کی قسم، انہوں نے کبھی لوگوں سے یہ نہ کہا کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دوں گا یا یہ کہ تم مجھے مسلمانوں کی سرحد کی طرف لے چلو بلکہ انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ یا تو مجھے وہیں جانے دو جہاں سے آیا ہوں یا نہیں تو مجھے اس وسیع وعریض دنیا میں کہیں چلا جانے دو تا آنکہ ہم دیکھیں کہ لوگوں کے اس امر کا آخری انجام کیا ہوتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے نہیں مانا۔"

(اردو ترجمہ تاریخ الکامل حصہ اول ص ۱۷۸، البدایہ والنہایہ فی التاریخ الجزء الثامن ص ۱۷۵)

عقبہ بن سمعان کی معتبر شہادت سے جو اوّل سے آخر تک امامؑ کی معیت میں رہا یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ امامؑ نے کبھی نہیں کہا کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں یا مجھے ثغور مسلمین کی طرف جانے دو۔ رہا آپ کا یہ کہنا کہ مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے میں آیا ہوں، کوفیوں کی دعوت کے جواب میں اتمامِ حجّت تھا حالانکہ آپ جانتے تھے کہ مجھے کوئی واپس نہیں جانے دے گا اور نہ وہ اس خیال سے تشریف لائے تھے کہ آپ دشمن کی بے پناہ فوج دیکھ کر واپسی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آپ موت کے لئے آئے تھے حتیٰ کہ آپ کے ساتھی بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کی غرض سے کربلا میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ زہیر بن القین نے منزلِ زرود میں اپنی بیوی کو طلاق دے کر ساتھیوں کو علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ میں امام حسینؑ کے ساتھ مرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ جو موت چاہتا ہے ہمارے ساتھ آئے اور جس کو زندگی کی تمنا ہو وہ ہم سے کنارہ کش ہو جائے۔ چنانچہ زہیر کے ساتھی اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ الغرض اگر عقبہ بن سمعان امامؑ کی خلوت و جلوت میں موجود بھی نہ ہوتے اور یزیدی افواہوں کے خلاف اظہارِ حقیقت بھی نہ کرتے جب بھی کوئی دیوانہ یا بدحواس ہی دشمن کے پراپگنڈے سے متأثر ہوتا۔ امام مظلومؑ کی غیرت و حمیّت، کردار و اخلاق، ہر قسم کے مخالفانہ پروپگنڈہ

کے اثرات سے بالاتر تھا۔ آپ کی شرافت وغیرت بھرے جذبات کا تذکرہ سن کر مصعب بن زبیرؓ عبدالملک کے خلاف جرأت مندانہ طریقہ سے نبرد آزما ہوا۔ بنو مہلب اور نجدہ بن عامر آپ کی حمیّت وغیرت کا کلمہ پڑھتے تھے، حالانکہ آپ کے مخلصین میں سے نہ تھے۔

مفروضہ شرائط کے تباہ کن اثرات اور ان کی تردید کی ضرورت

ان مفروضہ شرائط کی تردید میں جس قدر دلائل پیش کئے جائیں کم ہیں کیونکہ وہ شرائط یہی ہیں جن کو مخالفین سنگِ بنیاد قرار دے کر، امامؑ کے مفروضہ خروج کے محل کی دیواریں تعمیر کرتے ہیں۔ یہی وہ شرائط ہیں جو نواسۂ رسولؐ کی عظیم الشان شہادت کو رضاکارانہ قربانی کے مرتبے سے گرا کر، مجبوری کی موت کے پست ترین درجے تک لے آتی ہیں۔ اغیار کا تو کیا شکوہ، تعجب خیز امر یہ ہے کہ خود حضرت امام حسینؑ کے بعض نام لیوا بھی مجالسِ عزاداری میں عوام کو امامؑ کی انتہائی مظلومیت وبیکسی سے متاثر کرنے کے لئے ان مفروضہ وبے بنیاد شرائط کی رٹ لگاتے رہتے ہیں تاکہ عوام کے دل ودماغ پر یہ نقش کر دیا جائے کہ امامؑ آخری مرحلہ پر پہنچ کر اس قدر بے بس ومجبور ہو گئے تھے کہ دشمن کی بعض ناجائز باتیں بھی مان لینے کے لئے تیار ہو گئے تھے لیکن پھر بھی قوم اتنی سنگدل، قسی القلب اور ظالم ہو چکی تھی کہ فرزندِ رسولؐ کی کوئی شنوائی نہ ہوئی بعض ذاکرین حضرات جنہیں فلسفۂ تاریخ پر کماحقہٗ عبور حاصل نہیں یہ سوچنے کی زحمت کب گوارا کرتے ہیں کہ جہاں ہم عوام کے جذبات کو اپیل کر کے انہیں غمِ حسینؑ میں گریہ وزاری پر آمادہ کرتے ہیں وہاں ان بے سروپا باتوں اور لغو شرائط کے تذکرے سے امامؑ کی بلند پایہ قربانی کو قربانی کے درجہ سے گرا دینے کا موجب بنتے ہیں اور امامؑ کی عظمت کو جو محض انکارِ بیعت پر مبنی ہے نقصانِ عظیم پہنچانے کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ صرف ذاکرین تک ہی محدود نہیں بلکہ بعض خود شیعہ مصنّفین ومورخین اس غلطی کے ارتکاب سے بری نہیں۔

اس کی وجہ عیاں ہے اوّلاً تو شیعہ مورخین ہی کم ہیں کیونکہ شیعہ تاریخ تو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔ اگر کوئی شیعہ واقعہ نگاری کا حق ادا کرتا تو اس کی تاریخ کو کون قبول کرتا

کربلا پہنچ کر مخالف حالات میں الجھ کر رہ گئے۔ اور وہاں سے بچ نکلنے کے لئے مفروضہ شرائط پیش کر دیں۔ یہ خطبات امامؑ کے بلند مقاصد و اعلیٰ نصب العین کی ایسی واضح تصویر پیش کر رہے ہیں کہ کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ حدودِ الٰہی معطّل ہو چکی تھیں۔ خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا جا رہا تھا۔ اس سرکشی و باطل پرستی کو حق و عدل سے بدل دینے کی سب سے بڑی ذمہ داری اس ذاتِ گرامی سے وابستہ تھی جو نواسۂ رسولؐ، امامِ برحقؑ اور وصیِ مصطفےٰؐ تھے۔ اگر امامؑ اس آڑے وقت میں جب اسلام کی کشتی منجدھار میں پھنس چکی تھی، ناخدا بن کر اسلام کے کام نہ آتے تو کس کا زہرہ تھا کہ اس سیلابِ بلا کے مقابل سینہ سپر ہوتا۔ امامؑ نے اپنے نصب العین کو واشگاف الفاظ میں بیان فرما دیا کہ میں شہادت ہی کی موت چاہتا ہوں کیونکہ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ پس امامؑ کے مقدس منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کے مقابل جن کی تائید میں امامؑ کا عمل موجود ہے۔ یزیدی ایجنٹوں کی ان مفروضہ شرائط و بے بنیاد افواہوں کی کیا حقیقت ہے جن کو "قِیْلَ" کے عربی لفظ سے شروع کیا ہے جو عربی گرامر کی رُو سے اضطرابی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مقام پر یاد رہے کہ قِیْلَ کا لفظ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس روایت کا راوی کون ہے اور قائل نے یہ قول کس موقع اور محل پر بیان کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر قِیْلَ کی اضطرابی کیفیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ ایک بے بنیاد افواہ تھی جس کو عوام ہوا دے رہے تھے۔

۱۳۔ بیعت کا مفہوم

منتہی الارب میں بیعت کے معنی عہد و پیمان لکھے ہیں۔ دراصل یہ لفظ "بَاعَ" کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں "فروخت کر دیا"۔ اس کا مادہ "ب ی ع" ہے۔ چونکہ فروخت کرنے میں فریقین کا عہد و پیمان ہوتا ہے لہٰذا بیعت کے اصطلاحی معنی "عہد و پیمان" قرار دیئے گئے۔ عہد و پیمان کی حقیقت یہ ہے کہ دونوں فریق اپنی اپنی طرف سے اقرار کرتے ہیں اور ایک کا اقرار دوسرے کی شرط ہوتا ہے۔ گویا عہد و پیمان کی حیثیت

امامؑ نے دوستوں اور دشمنوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے۔ چنانچہ مقام بیضہ پر لوگوں سے خطاب کیا:۔

"اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے جو ظلم کرتا ہے اور خدا کی قائم کردہ حدیں توڑتا ہے، عہدِ الٰہی شکست کرتا ہے، سنّتِ نبوی کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا کے بندوں پر گناہ و سرکشی سے حکومت کرتا ہے اور دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے فعل سے اس کی مخالفت کرتا ہے نہ اپنے قول سے، سو خدا ایسے آدمی کو اچھا ٹھکانہ نہیں بخشے گا۔ دیکھو یہ لوگ شیطان کے پیرو بن گئے، رحمان سے سرکش ہو گئے ہیں، فساد ظاہر ہے، حدودِ الٰہی معطّل ہیں، مالِ غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرایا جا رہا ہے میں ان کی سرکشی کو حق و عدل سے بدل دینے کا **سب سے زیادہ حقدار** ہوں۔" (ابنِ جریر، تاریخ کامل)

صَدَقْتَ یَابْنَ رَسُوْلِ اللہ! رُوحِی لَکَ الْفِدَا۔ فی الحقیقت اموی سرکشی کو حق و عدل سے بدل دینے کے سب سے زیادہ حقدار آپ ہی تھے۔ آپ نے اپنا مقدس خون پیش کر کے اس حق کو کما حقہٗ ادا کر دیا اور جو کچھ زبانِ مبارک سے فرمایا تھا عملاً کر دکھایا۔ اور اسلام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد پر لا کھڑا کیا۔ ایک دوسری جگہ نواسۂ رسولؐ نے یوں تقریر فرمائی:۔

"معاملہ کی جو صورت ہو گئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو۔ دنیا نے اپنا رنگ بدل دیا، منہ پھیر لیا، نیکی سے خالی ہو گئی، ذرا سی تلچھٹ باقی ہے، حقیر سی زندگی رہ گئی ہے، ہولناکی نے احاطہ کر لیا ہے افسوس! دیکھتے نہیں کہ حق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ باطل پر علانیہ عمل کیا جا رہا ہے کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے۔ وقت آگیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقاء الٰہی کی خواہش کرے لیکن میں **شہادت ہی کی موت** چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے۔" (داستانِ کربلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ص ۴۷)

ان خطبوں کی موجودگی میں کوئی ناقص العقل ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ امامؑ نادانستہ طور پر

کربلا پہنچ کر مخالف حالات میں الجھ کر رہ گئے اور وہاں سے بچ نکلنے کے لئے مفروضہ شرائط پیش کر دیں۔ یہ خطبات امامؑ کے بلند مقاصد و اعلیٰ نصب العین کی ایسی واضح تصویر پیش کر رہے ہیں کہ کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ حدودِ الٰہی معطل ہو چکی تھیں، خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا جا رہا تھا۔ اس سرکشی و باطل پرستی کو حق و عدل سے بدل دینے کی سب سے بڑی ذمہ داری اس ذات گرامی سے وابستہ تھی جو نواسۂ رسولؐ، امامِ برحقؑ اور وصیٔ مصطفیٰؐ تھے۔ اگر امامؑ اس آڑے وقت میں جب اسلام کی کشتی منجدھار میں پھنس چکی تھی، ناخدا بن کر اسلام کے کام نہ آتے تو کس کا زہرہ تھا کہ اس سیلابِ بلا کے مقابل سینہ سپر ہوتا۔ امامؑ نے اپنے نصب العین کو واشگاف الفاظ میں بیان فرما دیا کہ میں شہادت ہی کی موت چاہتا ہوں کیونکہ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ پس امامؑ کے مقدس منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کے مقابل جن کی تائید میں امامؑ کا عمل موجود ہے۔ یزیدی ایجنٹوں کی ان مفروضہ شرائط و بے بنیاد افواہوں کی کیا حقیقت ہے جن کو "قِیْلَ" کے عربی لفظ سے شروع کیا ہے جو عربی گرامر کی رُو سے اضطرابی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مقام پر یاد رہے کہ قِیْلَ کا لفظ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس روایت کا راوی کون ہے اور قائل نے یہ قول کس موقع اور محل پر بیان کیا ہے۔ بالفاظ دیگر قِیْلَ کی اضطرابی کیفیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ ایک بے بنیاد افواہ تھی جس کو عوام ہوا دے رہے تھے۔

۱۳۔ بیعت کا مفہوم

منتہی الارب میں بیعت کے معنی عہد و پیمان لکھے ہیں۔ دراصل یہ لفظ "بَاعَ" کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں "فروخت کر دیا"۔ اس کا مادہ "ب ی ع" ہے۔ چونکہ فروخت کرنے میں فریقین کا عہد و پیمان ہوتا ہے لہٰذا بیعت کے اصطلاحی معنی "عہد و پیمان" قرار دیئے گئے۔ عہد و پیمان کی حقیقت یہ ہے کہ دونوں فریق اپنی اپنی طرف سے اقرار کرتے ہیں اور ایک کا اقرار دوسرے کی شرط ہوتا ہے۔ گویا عہد و پیمان کی حیثیت

شرط و مشروط کی ہوتی ہے۔ ایک فریق کے نقضِ عہد سے دوسرے فریق کا عہد خود بخود ساقط ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب شرط نہ رہی تو مشروط کا وجود خود بخود ہی کالعدم ہونا لازمی ہے۔ اسلام میں سب سے پہلی بیعت بیعتِ عقبہ تھی جب کہ اوّلین انصار نے حضرت رسالتمآبؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے وقت یہ عہد کیا تھا کہ وہ احکامِ خدا و رسولؐ کی متابعت کریں گے اور رسولِ خداؐ کی طرف سے یہ عہد تھا کہ آنحضرتؐ حکمِ خدا کے تحت ان کی صراطِ مستقیم پر رہنمائی کریں گے۔ چونکہ بیعت مذہب سے شروع ہوئی تھی اس لئے ہمیشہ اس کی مذہبی نوعیت قائم رہی۔ اسلام میں مذہب و حکومت جُدا نہ تھے، لہٰذا حکومت میں بیعت کا استعمال ہونا شروع ہوگیا۔ علامہ جرجی زیدان کی تحقیق کے بموجب کتاب و سنّت کے احکام کے مطابق خلیفہ اور اس کی رعایا کے مابین باہمی عہد و پیمان کا نام بیعت تھا۔ (اردو ترجمہ تمدّنِ اسلام حصہ اوّل۔ ص ۱۲۶)

چونکہ بیعت فریقین کے درمیان ایک عہد و پیمان تھا اس لئے فقہائے اسلام نے اس بات پر زور دیا کہ بیعت کرنے والے کی آزاد رائے ہونا چاہئے، جس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہ ہو۔ امام مالک نے اکراھی قسم کو بیعت سے ساقط کرنے کا حکم دیا ہے۔ (اردو ترجمہ ابن خلدون حصہ دوم ص ۹۷)

لہٰذا ثابت ہوا کہ بیعت محض عہد و پیمان تھا جس میں فریقین کی آزاد رائے اور رضامندی کی ضرورت تھی۔ اسلام میں ہر بیعت کرنے والا شخص خدا کی وحدانیت، رسولِ خداؐ کی رسالت، اور اخلاقِ حسنہ کی متابعت کا اقرار کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی پیرانِ طریقت اپنے مریدوں سے اسی قسم کی بیعت لیتے ہیں۔ حضرتِ امیر مسلمؑ نے حکمِ امامؑ کے تحت کوفیوں سے جو بیعت لی تھی وہ اسی مذہبی نوعیت کی تھی کہ کوئی فسق و فجور کا ارتکاب نہ کریں گے۔ ان کے اقوال و افعال کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کے مطابق ہوا کریں گے۔ امام حسینؑ ہدایت کا فریضہ سرانجام دیں گے اور کوئی حکم خلافِ قرآن و سنّت نافذ نہیں کریں گے۔ مزید برآں بیعت کے باہمی عہد و پیمان کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ کفّار رعایا سے بیعت نہ لی جاتی تھی۔ پس بیعت کی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ حاکم اس امر کا عہد کرے کہ وہ کتاب و سنّت کے مطابق حکم

کرے گا اور رعایا یہ عہد کرے کہ وہ ہر اس حکم کی تعمیل کرے گی جو کتاب و سنّت کے مطابق ہوگا۔ جب صورت یہ ہے تو وہ حاکم بیعت لینے کا مجاز ہی نہیں جو پہلے خود حکمِ خدا اور سنّتِ رسولؐ کے مطابق عمل کرنے کا عہد نہیں کرتا۔ چونکہ یزید نے کبھی یہ وعدہ نہ کیا تھا اس لئے وہ کسی مسلمان سے بیعت طلب کرنے کا مجاز نہ تھا۔ چہ جائیکہ وہ نواسۂ رسولؐ سے بیعت بالجبر کا مطالبہ کرے۔ جس حاکم کے اعمال و اقوال علانیہ شریعتِ اسلامیہ کے مخالف ہوں نہ وہ بیعت طلب کر سکتا ہے اور نہ ہی لوگوں کے لئے جائز ہے کہ اس کی بیعت کریں جب تک گناہوں سے تائب ہو کر اپنے طرزِ عمل کو خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق نہ بنا دے۔ یزید نے اپنے افعالِ بد سے کبھی توبہ نہیں کی بلکہ احکامِ شریعت کا مضحکہ اڑاتا تھا اور وحیِ خدا کو ہاشمی فریب کاری سے تعبیر کرتا تھا۔

مزید برآں اگر دورانِ حکومت حاکم سے خلافِ شرع و سنّت عمداً احکام و افعال صادر ہوں تو بیعت خود بخود فسخ ہو جاتی ہے کیونکہ جب حاکم کی طرف سے بیعت کی شرط ساقط ہو گئی تو مشروط خود بخود کالعدم ہو گیا اور معاہدہ باقی نہ رہا۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو ہر مسلمان کا حق ہی نہیں بلکہ شرعی فرض ہے کہ ایسے فاسق و فاجر بادشاہ کی حکومت کو منقطع کرے۔ چنانچہ یزید کی علانیہ بدکاریوں اور بداعمالیوں کے بعد ملّتِ اسلامیہ کا فرض تھا کہ اس کی حکومت کا قلع قمع کرے۔ حضرت امام حسینؑ نے مقام بیضہ پر جو خطبہ دوستوں اور دشمنوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا اس میں مسلمانوں کی توجہ اس حکمِ رسولؐ کی منعطف کر کے فرضِ امامت پورا کر دیا تھا۔ بیعت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے یہ امر کچھ کم توجہ طلب نہیں کہ محض انکارِ بیعت کرنا بغاوت کا مترادف نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ سے کئی آدمیوں نے بیعت نہ کی مگر ان کو باغی نہ سمجھا گیا۔ حضرت علیؑ کے زمانۂ ظاہری خلافت میں سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور کئی ایسے آدمی تھے جنہوں نے آپ کی بیعت سے کنارہ کشی کی مگر وہ باغی متصوّر نہ ہوئے اور نہ ان کے خلاف کوئی سیاسی کارروائی کی گئی۔ بیعت نہ کرنے سے

کوئی شخص سیاسی حیثیت رعایا کے زمرے میں سے خارج نہ ہوجاتا تھا۔ اسلامی سلطنت میں بسنے والے غیر مسلم ذمی بیعت نہ کرتے تھے مگر ان کو رعایا سمجھ کر ان کی حفاظت کی جاتی تھی۔ ان کو کبھی باغی سمجھ کر واجب القتل اور گردن زدنی قرار نہیں دیا جاتا تھا۔

فی الحقیقت اسلام نے دنیا میں حکومت کا بہترین تخیل پیش کیا تھا جس کی بناء پر جبر و تشدد کی بجائے باہمی عہد و پیمان پر تھی۔ حاکم یہ عہد کرے کہ میں تم پر شرع و سنت رسول کے مطابق حکومت کروں گا اور رعایا یہ اقرار کرے کہ اگر تم نے احکام خدا و رسول کے مطابق حکومت کی تو ہم تمہارے حکم کی اطاعت کریں گے۔ گویا یہ اطاعت، بادشاہ کے اسلامی طرز عمل سے مشروط تھی۔ اسلام میں یہ **حکومت الٰہیہ** کی بنیاد تھی۔ لیکن افسوس! مسلمانوں نے چند در چند وجوہات کی بناء پر اس حکومت کو دنیا میں رائج نہ ہونے دیا اور اسی رو میں بہ گئے جس میں قدیم الایام سے اہل دنیا بہتے چلے آتے تھے اور اسی دقیانوسی اصول "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کو اپنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں بھی خلافت الٰہیہ محدود عرصہ کے لئے قائم ہوئی اور پھر یہ نعمت چھن گئی اور ان میں بھی شہنشاہیت کی بنیاد ظلم و جبر اور جور و تشدد پر قائم ہوئی۔ جن خرابیوں کو مٹانے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا وہی خرابیاں خود اسلام کے اندر پیدا ہوگئیں ؎

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے اس دین میں خود تفرقہ اب آن پڑا ہے (حالیؔ)

سب سے بڑی نعمت مسلمانوں کے لئے جو اسلام نے مقرر کی تھی وہ ان معصوم حکام کا سلسلہ تھا جو دنیا میں عدل کامل رائج کرتے۔ عدل کامل صرف وہی معصوم کرسکتا ہے جو راسخ فی العلم ہو اور قرآن حکیم کی صحیح تاویل کو سمجھتا ہو۔

یہ شان صرف آئمہ معصومینؑ کی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں بیعت لینا محض معصوم کے لئے مختص ہے لیکن ملت اسلامیہ کی بدبختی ملاحظہ کیجئے۔ یہاں یہ معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ایک فاسق و فاجر، اسلام کا کھلم کھلا دشمن، استعمار پسند ڈکٹیٹر، مسند خلافت پر بیٹھا ہوا،

جانشینی رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعی بن کر ایک معصوم کو بیعتِ بالجبر پہ مجبور کر رہا تھا ؎ ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بکجا

امامؑ نے بیعت یزید سے کیوں انکار کیا؟

جب ہم نے بیعت کی نوعیت، اسلامی حکومت کی ماہیت اور یزید کی اخلاقی کیفیت و استحقاق کا صحیح اندازہ کرلیا تو یہ معلوم کرنا بہت آسان ہوگیا کہ امام حسینؑ نے بیعتِ یزید سے کیوں انکار کیا؟ اسلام میں وہ شخص حاکم اور رسولِ عربیؐ کا جانشین نہیں ہوسکتا جو شرعِ اسلامیہ کی علانیہ ہتک کرتا ہو، جن میں نہ تو کسی تاویل کا موقع ہو اور نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش موجود ہو۔ یزید نے اپنی طرف سے نہ تو قولاً کوئی عہد و پیمان کیا تھا کہ وہ کتاب و سنّت کے مطابق حکومت کرے گا اور نہ عملاً احکامِ خدا و رسولؐ کی متابعت کی تھی۔ اس صورت میں نہ تو یزید طلبِ بیعت کا مجاز تھا اور نہ عوام کو شریعت نے یہ حق دے رکھا تھا کہ وہ غیر متشرع حاکم کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیں۔ یزید نے اپنے عقائد و خیالات کو اس قدر عریاں کر رکھا تھا کہ حسینؑ دربارِ خداوندی اور بارگاہِ رسالت میں اپنے نفس کے لئے یزیدی اعمال کی کوئی تاویل پیش نہ کر سکتے تھے لہٰذا حسینؑ اور سب کچھ کر سکتے تھے، بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے تھے لیکن ایک بداطوار و بدکردار کو نائبِ رسولؐ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یزید کی ان علانیہ بدکرداریوں کا نتیجہ تھا کہ امام عالیمقامؑ کے خیرخواہوں میں سے کسی عزیز یا دوست نے کبھی یہ مشورہ نہ دیا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے حالانکہ مختلف اوقات میں آپ کو کئی مشورے دیئے گئے۔ کسی نے کہا کہ مدینہ میں قیام کیجئے۔ کوئی کہنے لگا کہ مکّہ کو مستقر بنائیے۔ بعض نے مشورہ دیا کہ طائف یا یمن کی طرف چلے جائیے۔ کچھ کہنے لگے کہ کوہ اجا میں چل کر پناہ لیجئے۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ بیعتِ یزید کی رائے دینے والا شخص کوئی

پیدا نہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ عوام کی نگاہوں میں یزید کا کردار اتنا ذلیل، رسواکن اور منافی اسلام تھا کہ کوئی انسانی دماغ یہ سوچ تک نہ سکتا تھا کہ امامؑ کے لئے یزید جیسے ستمگر بدکار شخص کی بیعت کرنے کا کوئی جوازی پہلو موجود ہے۔

اگر یزید صرف دنیوی سلطنت پر اکتفا کرتا تو شاید حضرت امام حسینؑ سے اس شدت کے ساتھ بیعت حاصل کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی لیکن یزید کا نظریہ مادی سلطنت تک محدود نہ تھا وہ عوام سے اپنی مذہبی قیادت و روحانی پیشوائی کا سکہ منوا کر خدائی اختیارات پر چھا جانا چاہتا تھا اور قرآنِ حکیم کے قوانین کو مسخ کرکے اسلام کو اپنے تابع رکھنا چاہتا تھا۔ اسے اسلام کی محکومی پسند نہ تھی بلکہ اسلام کا حاکم بننے کی تمنا تھی۔ البتہ حصولِ مقصد کی راہ میں مشکل یہ تھی کہ مذہب کی سچی پیشوائی پر مہرِ تصدیق کون ثبت کرے؟ کیا یہ فرض شامی، عراقی، مکّی یا مدنی سرانجام دے سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر ضرورت اس امر کی تھی کہ خاندانِ رسالت کی بزرگ ترین ہستی سے جس کو عوام رسولؐ کی دینی وراثت کا حامل سمجھتے تھے اپنے خدائی اختیارات پر مہرِ تصدیق ثبت کرائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اہلبیتِؑ رسالت میں ممتاز ترین ہستی فرزندِ رسولؐ جناب امام حسینؑ کی تھی۔ پس یزید کے ارادوں کی تکمیل محض حضرت امام حسینؑ سے وابستہ تھی۔ یزید کا مقصد یہ نہ تھا کہ حضرت امام حسینؑ بحیثیتِ حسینؑ اس کی اطاعت قبول کرلیں۔ بلکہ امام حسینؑ بحیثیت مذہبی پیشوا اس کے مطیع اور فرمانبردار ہو جائیں اور اس کے ہر منافی اسلام و مضحکہ خیز فعل کے جواز کی سند بن جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ خاندانِ رسالت سے حکومت نکالی جا چکی تھی مگر پھر بھی یگانے و بیگانے سب اس بات کے قائل تھے کہ آنحضرتؐ کے دینی علوم کے وارث یہی لوگ ہیں جن کو آنحضرتؐ نے بارہا اپنا وارث و وصی بیان فرمایا تھا۔ اگر امامؑ

یزید کی بیعت کر لیتے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کا جوا اپنی گردن میں ڈال لیتے تو پھر فوراً کفر اسلام کی جگہ لے لیتا۔ یزید امتِ محمدیہ کو پھر صنم خانوں کی طرف لے جاتا اور ان ہی منہیات و لغویات کو اسلام میں رائج کر دیتا جو اس کو آباء و اجداد سے ورثہ میں ملی تھیں اور جن میں کفر کی جان اور اسلام کی موت تھی۔ یہ وقت امام حسینؑ کے لئے انتہائی آزمائش کا تھا۔ حسینؑ کے ایک لفظ "ہاں" میں دنیا بھر کی عیش و عشرت اور آرام و راحت پوشیدہ تھی۔ نہ لختِ جگر شہید ہوتے نہ تپتی ریت پر عزیز و اقارب کا خون بہتا، نہ احباب قتل ہوتے، نہ پیاسے حلقومِ اصغرؑ میں تیر جفا پیوست ہوتا، نہ عفتِ مآب بیبیوں کی تشہیر ہوتی اور نہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے لاشیں پامال ہوتیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا اور حسینؑ بچ جاتے مگر اسلام کی موت ہوتی اور پیغمبرِ اسلامؐ کی عمر بھر کی محنت برباد ہو جاتی۔ حضرت ابو عبیدہ بن الحارثؓ، حضرت امیر حمزہؓ اور حضرت جعفر طیارؑ جیسے گرامی قدر ہاشمیوں کی قربانیاں رائیگاں جاتیں جنہوں نے اپنے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی تھی۔

حضرت امام حسینؑ سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت برادرِ مکرم حضرت حسن المجتبیٰؑ زندہ ہوتے تو یہ مطالبۂ بیعت ان کے سامنے پیش ہوتا اور مجھ سے بیعت کی خواہش نہ کی جاتی۔ اگر پدرِ بزرگوار حضرت علی مرتضیٰؑ ہوتے تو یہ مطالبہ پھر ان سے ہوتا، مجھ سے نہ ہوتا۔ اگر میرے جدِّ عالیمقدار جنابِ رسولِ خداؐ بقیدِ حیات ہوتے تو حکومت کے جواز کی سند ان سے طلب کی جاتی، مجھ سے کچھ نہ کہا جاتا۔ لیکن اب نہ نانا محمد مصطفیٰؐ ہیں۔ نہ بابا علی مرتضیٰؑ ہیں اور نہ بھائی حسن المجتبیٰؑ ہیں۔ اب تو صرف میں ہی ہوں اور مجھ ہی سے بیعت طلب کی جا رہی ہے نہ میرے بھائی محمد حنفیہؓ سے، نہ عباس بن علی سے اور نہ عبداللہ بن جعفر طیارؑ سے۔ اس صورت میں اگر میں نے بیعت کر لی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر میرے بھائی حسنؑ ہوتے تو ایک کفرِ مجسّم کو اپنا پیشوا مان لیتے

بابا علیؑ ہوتے تو باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتے تو فسق و فجور کی حکومت کو جائز تسلیم کر لیتے۔ حسینؑ نے جب یہ سوچا تو احساسِ ذمہ داری کے جذبہ نے تمام مصائب و مشکلات کو برداشت کر لینے پر آمادہ کر دیا۔ حسینؑ نے بظاہر ایک آسان سی بات نہ کی یعنی مطالبۂ بیعت کے جواب میں ہاں نہ کہی اور "نہ" کا لفظ کہہ کر دنیا بھر کے مصائب کو اپنی ذاتِ قدسی صفات پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے دی۔ حسینؑ کی ساری عظمت کا دارومدار اس "نہ" میں چھپا ہوا ہے اور اس "نہ" میں اسلام کی دائمی زندگی اور کفر کی ابدی موت مضمر ہے۔

درس گاہِ کربلا

امامِ ذی شانؑ نے بیعتِ یزید سے انکار کیا کیا؟ میدانِ کربلا کو ملّتِ اسلامیہ کے لئے ایک عظیم الشان ایک لاثانی عملی درس گاہ بنا دیا، جس میں عملی درس دینے والے حبیب ابن مظاہرؓ ایسے اسّی سالہ سن رسیدہ صحابیِ رسولؐ، حضرت علی اکبرؑ ایسے کڑیل نوجوانِ اہلبیتؑ اور اصغرؑ گلفام ایسے ششماہے کم سن مجاہدینِ اسلام شامل تھے جنہوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق لاجواب سبق دئیے۔ حق کو کسی قیمت پر نہ بیچنا، باطل کو کسی کی خاطر نہ خریدنا، عزت کی موت کو زندگی پر ترجیح دینا، باطل کی مادّی جاہ و جبروت اور عسکری شان و شوکت دیکھ کر نہ دبنا، حق کے لئے جان دیتے ہوئے صبر کی تلقین کرنا، موت کی ہولناکیوں کو کھیل سمجھنا، تیروں کی بوچھاڑوں میں سجدہ ریز ہونا، امیرِ جماعت کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا، دنیوی وجاہت اور مادی آرام و آسائش کو ہیچ سمجھنا، اسلام کے لئے جینا اور اسلام کے لئے مرنا، خدا کی رضا مندی کو اپنی محبت و نفرت کا معیار قرار دینا۔ یہ وہ چند سبق ہیں۔ ان سبقوں میں سے جو امام عالی مقامؑ یومِ عاشورہ کے چند گھنٹوں میں ملّتِ اسلامیہ کو سکھا گئے۔ کاش! ملّتِ اسلامیہ اگر ان اسباق پر عمل پیرا ہوتی تو اسلام پرستی و انحطاط کا وہ دور دورہ نہ ہوتا جس کا آج اسلام کو سامنا ہے۔

یزید کا محض حسین علیہ السّلام کے پیچھے پڑنا

جب یہ اچھی طرح سے سمجھ میں آگیا کہ امام عالیمقامؑ نے بیعتِ یزید سے کیوں انکار کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یزید کو حضرت حسینؑ سے بیعت لینے کی اس قدر کدّو کاوش کی کیا ضرورت تھی؟ جمہوری نقطۂ خیال سے جب اکثریت کسی حکومت کو تسلیم کرلیتی ہے تو آئینی طور پر اس کے مسلّم ہونے کے لئے یہی کچھ کافی ہے۔ اقلیت کی مخالفانہ رائے بالکل بے وزن ہوکر رہ جاتی ہے۔ دنیا کے کسی جمہوری ملک میں اقلیّت کو اپنی رائے بدلنے پر نہ پہلے کبھی مجبور کیا گیا ہے اور نہ اب کیا جاتا ہے۔ خود خلافتِ اسلامیہ کے ہر دور میں کچھ لوگ ضرور ایسے موجود رہے جنہوں نے خلیفۂ وقت کی بیعت نہ کی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے کئی لوگوں نے تخلّف کیا تھا۔ سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور کئی ایسے آدمی تھے جنہوں نے حضرت علیؑ کی بیعت سے کنارہ کشی کی تھی مگر کبھی صرف بیعت نہ کرنا قابلِ مؤاخذہ جرم نہ سمجھا گیا۔ اسلامی حکومت میں غیر مسلم اقلیّت سے کبھی بیعت طلب نہ کی گئی اور نہ انہیں باغی سمجھا گیا بلکہ ان کو رعایا کے زمرہ میں تصوّر کرتے ہوئے ان کی حفاظت کی جاتی رہی۔ خود امیر معاویہ نے مکّہ و مدینہ میں یزید کی بیعت کے لئے خواہ کتنی بڑی کانفرنس یا مجلس منعقد کی ہو یقیناً سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ایسے آدمی گھروں میں بیٹھے ہوئے رہ گئے ہونگے جنہوں نے یزید کی بیعت نہ کی ہوگی۔ خود خاندانِ رسولؐ میں محمد بن حنفیہؓ عبداللہ بن جعفر طیارؓ، حضرت عباس بن علیؑ اور ان کے بھائی ایسے افراد موجود تھے جن سے بیعت طلب نہ کی گئی۔ عبداللہ بن زبیرؓ پر بھی جو بیعتِ یزید کے علانیہ مخالف تھے اتنی سختی نہ کی گئی جتنا تشدّد نواسۂ رسولؐ کے لئے روا رکھا گیا۔ جب ایک وسیع و عریض اسلامی سلطنت میں ہزاروں لوگ ایسے موجود تھے جنہوں نے یزید کی بیعت نہ کی مگر کسی سے بیعت کا اصرار نہ کیا گیا اور نہ حکومت کو ان سے کوئی پرخاش ہوئی تو پھر حسینِ مظلومؑ میں کون سی بات ایسی تھی کہ آپ سے بیعت حاصل کرنے کے لئے سلطنتِ شام کی پوری مشینری حرکت

میں آگئی اور شاہی جاہ و جبروت کی تمام طاقتیں صرف کر دی گئیں۔ اس کے جواب میں مخالفین کا یہ کہنا کہ واقعۂ کربلا بنوہاشم و بنوامیہؓ کی باہمی رقابت کا مظاہرہ تھا، درست نہیں ہے۔ یہ محض شہادت کی عظمت کو کم کرنے کے لئے اور حق پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ **بنوعباس** کو کافی وقعت حاصل تھی اور ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ عبداللہ بن عباسؓ اور ان کے بھائیوں نے **امیر** معاویہ کے زمانہ میں ہی یزید کی ولی عہدی پر بیعت کر لی تھی۔ خود واقعۂ کربلا میں "**اٹھارہ بنی ہاشم**" جو مقتول ہوئے سب کے سب "**اولادِ ابوطالبؒ**" میں سے تھے جن میں سے آٹھ افراد اولاد فاطمہؑ زہرا ہونے کے باعث نسلِ رسولؐ تھے۔ بنوعباس کا ایک فرد بھی ان میں شامل نہ تھا جب بنوعباس یزید کے طرفدار بن گئے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ سانحۂ کربلا بنی ہاشم و بنوامیہؓ کی باہمی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ اگر یزید اور اس کے باپ امیر معاویہ مسلمان تھے تو اسلام لانے کے بعد خاندانی بغض و عناد ختم ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ جناب رسالتمآبؐ کی تمام جنگیں مذہبی جہاد کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کی کامیابی سے تنگدلی محسوس کرنا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں۔ اگر یزید دل سے کافر تھا تب بھی دیرینہ بغض و عناد اس وقت ختم ہو جانا چاہئے تھا جب امیر معاویہ نے بنوہاشم کی پیدا کردہ سلطنت پر قبضہ جما لیا کیونکہ کینہ اور دیرینہ عداوت تو مغلوب اور کمزور دل انسانوں کا خاصہ ہے۔ جب فتح و غلبہ حاصل کر لیا اور پرانی کدورتوں اور رنجشوں کا بدلہ لے لیا تو اب کیا رہ گیا تھا کہ جس کا انتقام لیا جاتا اگر بنی ہاشم نے بنی امیہؓ کے معصوم بچوں کو کبھی بھوکا اور پیاسا قتل کیا ہوتا تو پھر یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ اس مخصوص واقعہ کا بدلہ تھا لیکن ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں بلکہ قتلِ عثمانؓ کے موقع پر حسنینؑ ان کے مددگاروں میں سے تھے اور پانی کی مشکیں خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر محصور خلیفہ تک پہنچاتے رہے۔ خود امیر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کے نصرت طلب کرنے کے باوجود ان کی کوئی امداد نہ کی جب کہ اس آگ کے شعلے عمرو بن العاص نے

بھڑکائے تھے جو بعد میں معاویہ کے سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت سے حضرت علیؑ کے خلاف صفین کی جنگیں لڑتے رہے۔ جنگِ بدر کا انتقام دُرِ دندانِ پیغمبرؐ شہید کر کے اور عمِ رسولؐ حضرت حمزہؓ کا جگر چبا کر جنگِ اُحد میں لیا گیا۔ بنی ہاشم کی سابقہ فتح اور گذشتہ کامیابیوں کا بدلہ تو مکمل طور پر اس وقت لے لیا گیا جب امیر معاویہ نے ہاشمی فتوحات سے حاصل کی ہوئی سلطنت پر کسی نہ کسی طرح قبضہ جما لیا۔ لہٰذا سابقہ بغض و عناد کے حساب میں کوئی کھاتہ ایسا نہ تھا جس کا انتقام لینا باقی رہ گیا تھا۔ پس یہ کہنا کہ واقعہ ہائلہ کربلا بنو ہاشم و بنو امیہ کی پرانی خاندانی رقابتوں کا نتیجہ تھا۔ حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ اخفائے حق کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس کی وجہ دیرینہ خاندانی کشمکش نہ تھی تو پھر یزید کیوں جناب امام حسینؑ کے پیچھے پڑ گیا اور ان کو ایذا پہنچانا شروع کر دی۔ اس کی ایک وجہ تو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یزید اپنے خدائی اختیارات کے استعمال کا جواز پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اب دوسری وجہ سنئے :-

یزید جس حکومتِ اسلامیہ کا وارث بنا ہوا تھا وہ حسینؑ کے نانا بزرگوار کی پیدا کردہ اور حسینؑ کے والد حضرت علیؑ کے جہاد بالسیف کا نتیجہ تھی۔ یزید اچھی طرح جانتا تھا کہ خاندانِ رسالت اس حکومت کا حقدار بھی ہے اور بہت عرصہ تک دعویدار بھی رہا ہے۔ خدا ان بزرگواروں کا بھلا کرے جنہوں نے بڑی پیچیدہ حکمتِ عملی سے اس حکومت کو خاندانِ رسالت سے نکال کر شام کی زرخیز سلطنت کا استمراری پٹہ ہمارے خاندان کے نام اس لئے لکھ دیا تھا کہ ہم کسی قیمت پر یہ سلطنت خاندانِ رسالت میں لوٹ کر نہ جانے دیں۔ میرے والدِ بزرگوار امیر معاویہ نے کن کن سیاسی تدابیر کو بروئے کار لا کر، لاکھوں روپوں کے مصرف سے بڑے بڑے نامور مسلمانوں کو خریدا تھا اور حضرت امام حسنؑ کو کس حکمتِ عملی سے زہر دے کر خلافت کی دشوار گزار راہ کو ہموار کیا تھا۔ ابھی تک خاندانِ رسالتؐ کا ایک دعویدار باقی ہے۔ اگر اس وقت کچھ نہ کیا گیا تو پھر حکومت خاندانِ رسالت میں واپس

چلی جائیگی۔ اس طرح تو نہ صرف خاندانِ امیہ کے سیاسی دنگل کا کیا کرایا خاک میں مل جائیگا اور میرے جدِّ امجد حضرت ابو سفیان کی پر مغز سیاسی کوششیں ضائع ہو جائیں گی بلکہ میرے والد کی عمر بھر کی سیاسی چالیں بیکار ہو کر رہ جائیں گی لہٰذا **دارالندوہ** کی پُر پیچ حکمتِ عملی میں ابلیس کے ایماء پر جس امر کی طرف ایک صریح اشارہ کیا گیا تھا۔ اب اس کی تکمیل کا وقت آپہنچا ہے۔ اس وقت تو صرف صراحت سے فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ قبائلِ قریش کا نمائندہ گروہ جو بہادر و تنومند نوجوانوں پر مشتمل ہو ہاشمی نبوت کے روز افزوں اقتدار کا خاتمہ کر دے اور مدعیٔ نبوت کو قتل کر دے لیکن افسوس، جن لوگوں کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا یا تو وہ ایسے جرأت والے نہ تھے یا ماہرِ فن نہ تھے یا ممکن ہے کہ حالات نے اس وقت ان کی مساعدت نہ کی ہو اور مجوزہ سکیم زیرِ عمل نہ آسکی ہو۔ اگر اس وقت (معاذاللہ) حضرت محمدؐ کا سر کاٹ دیا جاتا تو میرے دادا ابو سفیان کو نہ معرکۂ بدر و حنین درپیش ہوتا اور نہ خندق و اُحد کی لڑائیاں لڑنا پڑتیں اور نہ ہی میرے والد امیر معاویہ کو صفین کی معرکہ آرائی پیش آتی۔ یزید نے سوچا کہ اب موقع ہے کیوں نہ اس تجویز کو زیرِ عمل لاؤں جس کے بارے میں پہلے کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ خاندانِ رسالت کا دعویدار باقی ہے۔ اگر سلطنت کے اس کانٹے کو اب نہ نکالا گیا تو یہ خلش ہمیشہ باقی رہے گی۔ بالغرض حسینؑ خاموش رہے۔ میں نے ان کو چھوڑ دیا اور وہ مجھ سے پہلے انتقال بھی کر گئے تو میری موت تک ان کا بیٹا جوان ہو کر میرے بیٹے کو ستائے گا۔ موقع سے استفادہ نہ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اسی غرض کے لئے نہ اس خاندان کو کوئی بڑا عہدہ و منصب دیا گیا تھا اور نہ ان کے ماتحت کبھی کوئی فوج کی گئی تھی مبادا طاقت پکڑ لیں۔ اب یہ بالکل بے طاقت و نہتے ہیں لہٰذا زور آزمائی کا موزوں ترین وقت ہے۔ رہا یہ سوال کہ قتلِ حسینؑ گناہ ہے۔ گناہ و ثواب تو محض خیال ہی خیال ہے اور یہ آسمانی وحی کا تصور تو

بنی ہاشم کا سیاسی ڈھونگ ہے جو حکومت پر چھا جانے کے لئے رچایا گیا ہے۔ مذہب کی حقیقت تو اتنی ہی ہے جتنی ہمارے سیاسی پیشوا اور بزرگ آباد اجداد بتا گئے ہیں جو امر واقع ہو گیا، سمجھو کہ خدا اس کا فاعل ہے۔ مجھے خلافت مل گئی گویا خدا نے دی حسینؑ کو خلافت نہ ملی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا چاہتا ہے کہ حسینؑ کو خلافت نہ ملے۔ خدا چاہتا ہے کہ حسینؑ قتل ہوں، اسی لئے تو مجھے غلبہ دے رکھا ہے۔ میں خدا کے ارادے کی تکمیل میں حسینؑ کو قتل کر رہا ہوں۔ کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ آمنّا بالقدر خیرہٖ وشرّہٖ من اللّٰہ تعالیٰ۔

قارئین کرام یہ نہ سمجھیں کہ یزید کا یہ منطق خلافِ عقل ہے اور یہ مؤلف کی ذاتی اختراع کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنے بیان کی تائید میں ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے حسینؑ کی اجتہادی غلطی کے تحت یزید کی تقریر نقل کی ہے جو امیر شام نے شاہی دربار میں تفاخر بھرے جذبات کی رو میں بہہ کر سرِ اقدس کے پیش ہونے پر کی تھی۔

بقول یزید امام حسینؑ کی اجتہادی غلطی

اس کے بعد یزید نے حاضرینِ مجلس سے کہا۔ "تم جانتے ہو یہ سب کس بات کا نتیجہ ہے؟ یہ حسینؑ کی اجتہادی غلطی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے سوچا۔ میرے باپ یزید کے باپ سے افضل ہیں، میرے نانا یزید کے نانا سے افضل ہیں اور میں خود بھی یزید سے افضل ہوں اس لئے حکومت کا بھی یزید سے زیادہ مستحق ہوں۔ حالانکہ یہ سمجھنا کہ ان کے والد میرے والد سے افضل تھے صحیح نہیں۔ علیؑ اور معاویہ نے جھگڑا کیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ کس کے حق میں فیصلہ ہوا...... حسینؑ کے اجتہاد نے غلطی کی۔ وہ یہ آیت بھول گئے۔" اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ

شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ" (داستانِ کربلا۔ ص ۱۰۶۔۱۰۷) (آلِ عمران - ۲۶)

قرآنِ حکیم کی اس آیہ کریمہ کے بے محل استدلال سے یزید نے حاضرینِ دربار کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ خدا نے مجھے اہل سمجھا اور خلافت دے دی۔ اور حسینؑ کو نا اہل سمجھ کر اس سے محروم رکھا۔ خدا نے مجھے عزت دی اور (معاذ اللہ) حسینؑ کو ذلت دی۔ کیا مذکورہ بالا اقتباس سے یزید کا وہی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

یزید کے ہاتھ میں استعماری تلوار کس نے دی؟

اس مقام پر آنکھوں سے تعصّب کی پٹی اتار کر، تاریخی حقائق کا جراٰت مندانہ طور پر تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا بقول قاضی ابوبکر بن العربی مالکی و محمود عباسی امام حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے یا اس حادثۂ عظمیٰ کو بقولِ آغا سلطان مرزا واقعاتِ سقیفہ کا براہ راست قدرتی نتیجہ سمجھا جائے، یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نقطۂ نظر سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے خاتمہ پر ملوکیت کے استعماری واستحصالی نظام کو ملزم قرار دیں جس نے تیس سالہ خلافتِ راشدہ کو ختم کر کے ملتِ اسلامیہ کو زوال وانحطاط کے دروازے پر لاکھڑا کیا اور قومی و نسلی عصبیتوں کو جنم دے دیا، یا اس کی ذمہ داری مسئلہ تقدیر کی تعبیر اور مصنوعی فقہ کے سر تھوپیں جو چند در چند وجوہات کی بناء پر معاویہ کے ابتدائی دورِ حکومت میں شروع ہوئی کہ جو کچھ ہوتا ہے منجانب اللہ ہوتا ہے جیسا کہ یزید کا استدلال امام حسینؑ کی (مفروضہ) اجتہادی غلطی کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک میری ذاتی تحقیقات اور تاریخی ریسرچ کا تعلق ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پانچ افراد امیر معاویہ، مروان بن الحکم، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ اور ابوموسیٰ اشعری قتلِ حسینؑ کی ذمہ داری سے بری نہیں اور بالواسطہ طور پر ان کے ہاتھ بھی اس خونِ ناحق سے رنگین ہیں۔ یہی پانچ اشخاص ہیں جنہوں

نے یزید کے ہاتھ میں استعماری تلوار دی جس سے فرزندِ رسولؐ کی مقدس گردن کٹ گئی۔

اب اس سلسلہ میں جناب مودودی صاحب قبلہ کے پیش کردہ چند تاریخی حقائق پر غور کرتے ہیں:

حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جو دورِ حاضرہ کے بلند پایہ مورخ، نامور محقق، شہرۂ آفاق مصنف، مولف، ادیب، ذی فہم مدبّر اور مخلص قومی رہنما ہیں۔ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف **"خلافت و ملوکیت"** میں ملّتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب پر بےلاگ محققانہ تبصرہ کیا ہے اور ان مختلف دشوار گزار مراحل کا جائزہ لیا ہے جن سے گزر کر خلافتِ راشدہ ملوکیت تک پہنچی۔ اس تغیّرِ عظیم نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر دور رس و عبرت خیز اثرات ڈالے۔ ملّتِ اسلامیہ کی بدقسمتی تھی کہ ملوکیّت اپنے جلو میں وہ تمام برائیاں لے کر آئی جن کے مٹانے کے لئے دنیا میں اسلام آیا تھا۔ ملوکیت کا پہلا وار انتخابی خلافت کے خاتمہ پر منتج ہوا اور اس سے موروثی بادشاہت کا ایک مستقل سلسلہ چل پڑا۔ بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کی بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔ چنانچہ جناب مودودی صاحب رقمطراز ہیں:۔

"اس طرح جس تغیّر کی ابتدا ہوئی تھی یزید کی ولیعہدی کے بعد سے ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفےٰ کمال کے الغائے خلافت تک ایک دن کے لئے اس میں تزلزل واقع نہ ہوا۔ اس سے جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔ اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنے کا کوئی موقع نصیب نہ ہو سکا۔" (خلافت و ملوکیّت۔ ص: ۱۵۹)

اسی سلسلہ میں جناب عزیز ملک ارشاد فرماتے ہیں:۔

"وقت گزر چکا تھا اور فتح مکّہ کے دن حالات ایکا ایکی بدل گئے تھے۔ اب ابوسفیان اور اس کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بظاہر دوسرے اہلِ مکّہ کے ساتھ ایمان لانے والوں میں شریک تھے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہندہ کی آغوش میں ایک ایسی نسل تیار ہوئی

اپنے قبیلے اور خاندان کے کسی شخص کو سرے سے کسی منصب پر مامور نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دس سال کے عہد میں بنی عدی کے صرف ایک شخص کو ایک چھوٹے سے عہدہ پر مقرر کیا اور اس سے بھی ان کو بہت جلدی سبکدوش کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں قبائلی عصبیتوں کو سر اٹھانے کا کوئی موقع نہ ملا۔ حضرت عمرؓ کو خوف تھا کہ یہ پالیسی اگر بدل دی گئی تو سخت فتنہ کی موجب ہو گی۔ اسی لئے انہوں نے اپنے تینوں متوقع جانشینوں: حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو الگ الگ بلا کر ان کو وصیت کی تھی کہ اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو مسلمانوں کی گردن پر مسلط نہ کر دینا۔ (بحوالہ طبری، طبقات ابن سعد)

"لیکن ان کے بعد حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ انہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدف اعتراض بن کر رہیں (مثال کے طور پر انہوں نے افریقہ کے مالِ غنیمت کا پورا خمس "پانچ لاکھ دینار" مروان کو بخش دیا) حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو معزول کر کے انہوں نے کوفہ کی گورنری پر اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی مُعَیط کو مقرر فرمایا اور اس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعید بن عاص کو دیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو ان کی جگہ مامور فرمایا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سَرح کو مقرر کیا۔ حضرت معاویہ سیدنا عمر فاروق کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی گورنری میں دمشق، حمص، فلسطین، اردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے چچا زاد بھائی مروان بن الحکم کو انہوں نے اپنا سیکرٹری بنا لیا جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے دروبست پر اس کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا۔ اس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ

میں سارے اختیارات جمع ہو گئے۔" (خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۰۵-۱۰۸)

جناب مولانا مودودی صاحب حضرت عثمانؓ کے دورِ حکومت میں عوامی بے چینی کے اسباب گنواتے ہوئے آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں :۔

" مگر اس کے علاوہ چند اسباب اور بھی تھے جن کی وجہ سے اس صورتِ حال نے اور زیادہ بے چینی پیدا کر دی :۔

اوّل :۔ یہ کہ اس خاندان کے جو لوگ دورِ عثمانی میں آگے بڑھائے گئے وہ سب طلقاء میں سے تھے۔ "**طلقاء**" سے مراد مکہ کے وہ خاندان ہیں جو آخر وقت تک نبی صلعم اور دعوتِ اسلامی کے مخالف رہے۔ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ان کو معافی دے دی اور وہ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت معاویہ، ولید بن عقبہ، مروان بن الحکم ان ہی معافی یافتہ خاندانوں کے افراد تھے اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو چکے تھے۔ رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے موقع پر جن لوگوں کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ وہ اگر خانۂ کعبہ کے پردوں سے بھی لپٹے ہوئے ہوں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ یہ ان میں سے ایک تھے۔ حضرت عثمانؓ انہیں لے کر اچانک حضورؐ کے سامنے پہنچ گئے اور آپؐ نے محض ان کے پاسِ خاطر سے ان کو معاف فرما دیا تھا۔ فطری طور پر یہ بات کسی کو پسند نہ آسکتی تھی کہ سابقین اوّلین جنہوں نے اسلام کو سربلند کرنے کے لئے جانیں لڑائی تھیں اور جن کی قربانیوں ہی سے دین کو فروغ نصیب ہوا تھا پیچھے ہٹا دئیے جائیں اور ان کی جگہ یہ لوگ امّت کے سرخیل ہو جائیں۔

دوسرے :۔ یہ کہ اسلامی تحریک کی سربراہی کے لئے یہ لوگ موزوں بھی نہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہ ایمان تو ضرور لے آئے تھے مگر نبیؐ کی صحبت و تربیت سے ان کو فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ان کے ذہن اور سیرت و کردار کی پوری قلب ماہیت ہو جاتی۔ وہ بہترین منتظم اور اعلیٰ درجہ کے فاتح ہو سکتے تھے، اور فی الواقع وہ ایسے ہی ثابت بھی

ہوئے، لیکن اسلام محض ملک گیری و ملک داری کے لئے تو نہیں آیا تھا۔ وہ تو اولاً اور بالذّات ایک دعوتِ خیر و صلاح تھا جس کی سربراہی کے لئے انتظامی اور جنگی قابلیتوں سے بڑھ کر ذہنی و اخلاقی تربیّت کی ضرورت تھی اور اس اعتبار سے یہ لوگ صحابہ و تابعین کی اگلی صفوں میں نہیں بلکہ پچھلی صفوں میں آتے تھے۔ اس معاملہ میں مثال کے طور پر مروان بن حکم کی پوزیشن دیکھئے۔ اس کا باپ حکم بن ابی العاص جو حضرت عثمانؓ کا چچا تھا، فتح مکّہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا اور مدینہ میں آکر رہ گیا تھا مگر اس کی بعض حرکات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے مدینہ سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ رسول اللہؐ کی نقلیں اتارا کرتا تھا حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے خود اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ بہرحال کوئی سخت قصور ہی ایسا ہو سکتا تھا جس کی بناء پر حضورؐ نے مدینہ سے اس کے اخراج کا حکم صادر فرمایا تھا۔ مروان اس وقت سات آٹھ برس کا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ طائف میں رہا۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو ان سے عرض کیا گیا کہ اسے واپسی کی اجازت دے دیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسے واپس بلا لیا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لئے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہؐ کے اسی معتوب شخص کا بیٹا اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے۔ خصوصاً جب کہ اس کا وہ معتوب باپ زندہ موجود ہو اور اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثرانداز ہو سکتا تھا۔" (خلافت و ملوکیّت۔ ص ۱۰۹-۱۱۱)

ازاں بعد عوامی بے اطمینانی کی وجوہات پر بحث کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ تھے وہ وجوہ جن کی بناء پر حضرت عثمانؓ کی یہ پالیسی لوگوں کے لئے اور بھی زیادہ بے اطمینانی کی موجب بن گئی تھی۔ خلیفۂ وقت کا اپنے خاندان کے آدمیوں کو پے

در پے مملکت کے اہم ترین مناصب پر مامور کرنا بجائے خود کافی وجہِ اعتراض تھا۔ اس پر جب یہ لوگ دیکھتے تھے کہ آگے لائے بھی جا رہے ہیں تو اس طرح کے اشخاص، تو فطری طور پر ان کی بےچینی میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں ایسی تھیں جو بڑے دور رس اور خطرناک نتائج کی حامل ثابت ہوئیں۔

۱۔ ایک یہ کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت معاویہ کو مسلسل بڑی طویل مدت تک ایک ہی صوبے کی گورنری پر مامور کئے رکھا۔ وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں چار سال سے دمشق کی ولایت پر مامور چلے آ رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے **ایلہ** سے **سرحدِ روم** تک اور **الجزیرہ** سے **ساحلِ بحرِ ابیض** تک کا پورا علاقہ ان کی ولایت میں جمع کر کے اپنے پورے زمانۂ خلافت **(۱۲ سال)** میں ان کو اسی صوبے پر برقرار رکھا۔ یہی چیز ہے جس کا خمیازہ آخر کار حضرت علیؓ کو بھگتنا پڑا۔ شام کا یہ صوبہ اس وقت کی اسلامی سلطنت میں بڑی اہم جنگی حیثیت کا مالک تھا۔ اس کے ایک طرف تمام مشرقی صوبے تھے اور دوسری طرف تمام مغربی صوبے۔ بیچ میں وہ اس طرح حائل تھا کہ اگر اس کا گورنر مرکز سے منحرف ہو جائے تو وہ مشرقی صوبوں کو مغربی صوبوں سے بالکل کاٹ سکتا تھا۔ حضرت معاویہ اس صوبے کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھے گئے کہ انہوں نے اپنی جڑیں پوری طرح جمالیں اور وہ مرکز کے قابو میں نہ رہے بلکہ مرکز ان کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا۔

۲۔ دوسری چیز جو اس سے زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی وہ خلیفہ کے سیکرٹری کی اہم پوزیشن پر مروان بن الحکم کی ماموریت تھی۔ ان صاحب نے حضرت عثمانؓ کی نرم مزاجی اور ان کے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر بہت سے کام ایسے کئے جن کی ذمہ داری لامحالہ حضرت عثمانؓ پر پڑتی تھی۔ حالانکہ ان کی اجازت اور علم کے بغیر ہی وہ کام کر ڈالے جاتے تھے۔ علاوہ بریں یہ صاحب حضرت عثمانؓ اور اکابر صحابہؓ کے باہمی خوشگوار تعلقات کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے تاکہ خلیفۂ برحق اپنے پرانے رفیقوں کی بجائے ان کو زیادہ

اپنا خیر خواہ اور حامی سمجھنے لگیں۔ یہی نہیں بلکہ متعدد مرتبہ انہوں نے صحابہ کے مجمع میں ایسی تہدید آمیز تقریریں کیں جنہیں طلقاء کی زبان سے سننا سابقین اوّلین کے لئے بمشکل ہی قابلِ برداشت ہو سکتا تھا۔ اسی بناء پر دوسرے لوگ تو درکنار، خود حضرت عثمانؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ بھی یہ رائے رکھتی تھیں کہ حضرت عثمانؓ کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری مروان پر عائد ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شوہرِ محترم سے صاف صاف کہا۔ "اگر آپ مروان کے کہے پر چلیں گے تو یہ آپ کو قتل کرا کے چھوڑے گا۔ اس شخص کے اندر نہ اللہ کی قدر ہے، نہ ہیبت نہ محبت۔" (بحوالہ طبری، البدایہ والنہایہ)

"حضرت عثمانؓ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ **غلط** تھا، اور غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔ اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ ہی دین کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔" (خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۱۴-۱۱۶)

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ باہر سے آنے والے شورش پسند، مدینہ کے مہاجرین و انصار تمام کے تمام پریشانی میں مبتلا تھے۔ قوم و ملک کا کوئی سربراہ نہ تھا۔ لوگوں کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر حضرت علیؓ خلافت کی قبولیت کے لئے تیار ہوئے اور فرمانے لگے :-

"میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریق سے نہیں ہو سکتی۔ عام مسلمانوں کی رضا کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں۔" پھر مسجدِ نبوی میں اجتماعِ عام ہوا اور تمام مہاجرین و انصار نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صحابہ میں سترہ یا بیس ایسے بزرگ تھے جنہوں نے بیعت نہیں کی۔" (تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے خلافت و ملوکیت۔ ص: ۱۲۲)

حضرت علیؓ نے خلافتِ راشدہ کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے کر کام شروع کیا ہی تھا کہ بقول جناب مودودی صاحب آپ کو تین رخنے درپیش ہوئے جن کی مزاحمت نے

حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پیدا شدہ خطرناک رخنہ جو نظامِ حکومت میں پیدا ہو چکا تھا بھرنے نہ دیا بلکہ امت کو ملوکیت کی طرف ایک مرحلہ اور دھکیل دیا۔ وہ تین رخنے یہ تھے:۔

۱۔ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے میں ان لوگوں کی شرکت جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے باہر آئے ہوئے تھے۔

۲۔ بعض اکابر صحابہؓ کا حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہنا۔

۳۔ حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اٹھ کھڑے ہوئے ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور دوسری طرف حضرت معاویہ"۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۲۳۔ ۱۲۴)

تاریخ کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ ان مطالبات کی بناء پر جنگِ جمل کی صورت میں مسلمان افواج کے درمیان پہلا تاریخی تصادم ہوا۔ جانبین کا کافی نقصان ہوا۔ حضرت زبیرؓ عمرو بن جرموز کے اور حضرت طلحہؓ مروان بن الحکم کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت علیؓ نے جنگِ جمل میں مخالفین کو عبرتناک شکست دی اور ان کی عظیم اکثریت میدانِ جنگ میں کام آئی اور ہزاروں آدمی مجروح ہوئے لیکن اس جنگ سے حضرت علیؓ کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس نقصانِ عظیم کی تفصیل مولانا مودودی صاحب کی زبانی سنئے:۔

"حضرت علیؓ کے مقابلے میں جو فوج لڑی تھی وہ زیادہ تر بصرہ و کوفہ سے ہی فراہم ہوئی تھی۔ جب حضرت علیؓ کے ہاتھوں اس کے پانچ ہزار آدمی شہید اور ہزاروں آدمی مجروح ہو گئے تو یہ امید کیسے کی جا سکتی تھی کہ اب عراق کے لوگ اس یکجہتی کے ساتھ ان کی حمایت کریں گے جس یکجہتی کے ساتھ شام کے لوگ حضرت معاویہ کی حمایت کر رہے تھے جنگِ صفین اور اس کے بعد کے مراحل میں حضرت معاویہ کے کیمپ کا اتحاد اور حضرت علیؓ کے کیمپ کا تفرقہ بنیادی طور پر اسی جنگِ جمل کا نتیجہ تھا۔ یہ اگر پیش نہ آئی ہوتی تو

پچھلی ساری خرابیوں کے باوجود ملوکیت کی آمد کو روکنا عین ممکن تھا حقیقت میں حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے تصادم کا یہی نتیجہ تھا۔ جس کے رونما ہونے کی توقع مروان بن الحکم رکھتا تھا۔ اس لئے وہ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ لگ کر پھرے گیا تھا۔ اور افسوس اس کی یہ توقع سو فیصدی پوری ہوگئی۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۴۰)

حضرت علیؓ بمشکل جنگِ جمل سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ صفین کا معرکہ درپیش تھا۔ امیر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کی خون آلودہ قمیص اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں منظرِ عام پر لٹکا دیں تاکہ اہلِ شام کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ امیر معاویہؓ نے جوابی قاصد کے ہاتھ کورا لفافہ دے کر حضرت علیؓ کو کہلا بھیجا تھا کہ دمشق میں ساٹھ ہزار آدمی خونِ عثمانؓ کا انتقام لینے کے لئے بیتاب ہیں۔ حضرت علیؓ کے استفسار پر قاصد کہنے لگا۔ "آپ کی گردن سے۔" (الطبری۔ ج ۳۔ ص ۴۶۴)

بقولِ جناب مودودی صاحب اس کے صاف معنی یہ تھے کہ شام کا گورنر صرف اطاعت ہی سے منحرف نہیں تھا بلکہ اپنے صوبہ کی پوری فوجی قوت مرکزی حکومت سے لڑنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا اور اس کے پیشِ نظر قاتلینِ عثمانؓ سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینا تھا۔ یہ سب کچھ اس چیز کا نتیجہ تھا کہ امیر معاویہ سولہ سترہ سال سے ایک ہی صوبے اور وہ بھی جنگی نقطۂ نظر سے انتہائی اہم صوبے کی گورنری پر رکھے گئے اسی وجہ سے شام خلافتِ اسلامیہ کے ایک صوبہ کی بہ نسبت ان کی ریاست زیادہ بن گیا تھا۔
(خلافت وملوکیت ص ۱۳۳)

ابتدا میں جب حضرت علیؓ نے شام پر چڑھائی کی تیاری کی تھی اس وقت ان کے لئے شام کو اطاعت پر مجبور کر دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا کیونکہ جزیرۃ العرب، عراق اور مصر ان کے تابع فرمان تھے۔ تنہا شام کا صوبہ ان کے مقابلہ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکتا تھا۔ علاوہ بریں دنیائے اسلام کی عام رائے بھی اس کو ہرگز پسند نہ کرتی کہ ایک صوبے کا گورنر خلیفہ کے مقابلے میں

تلوار لے کر کھڑا ہو جائے بلکہ اس صورت میں شام کے لوگوں کے لئے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سب متحد ہو کر خلیفہ کے مقابلہ میں حضرت معاویہ کا ساتھ دیتے لیکن عین وقت پر ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے اس اقدام نے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں حالات کا نقشہ یکسر بدل دیا تھا اور حضرت علیؑ کو شام کی طرف بڑھنے کی بجائے ربیع الثانی ۳۶ھ میں بصرے کا رخ کرنا پڑا۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے خلافت و ملوکیت ص ۱۲۴)

صفین کی جنگیں پوری ہولناکی سے جاری تھیں۔ حضرت عمار یاسرؓ اور خواجہ اویس قرنیؓ حضرت علیؑ کی حمایت میں لڑکر درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے اور امیر معاویہ کی فوج کا ایک کثیر حصہ ہلاک ہو چکا تھا اور ذوالفقار حیدری اپنے وہی جوہر دکھا رہی تھی جو جنگ احد و بدر میں دکھا چکی تھی۔ مالک اشترؓ دشمن کی فوجوں میں گھس کر کشتوں کے پشتے لگا رہے تھے۔ امیر معاویہ اپنی فتح مندی و ظفریابی کے سارے فسانے بھول چکے تھے ان پر یہ خوف و ہراس طاری تھا کہ ان کی قیصرانی شان و شوکت آخری ہچکی لینے والی تھی ہے۔ انہوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں عمرو بن العاص کو طلب کیا اور کہا کہ کوئی چارہ جوئی کیجئے۔ عمرو بن العاص کی جنگی حکمت عملی کی تفصیل مولانا مودودی کی زبانی سنئے:-

"حضرت عمارؓ کی شہادت کے دوسرے روز ۱۰ صفر کو سخت معرکہ برپا ہوا جس میں حضرت معاویہ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت حضرت عمرو بن العاص نے حضرت معاویہ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھائے اور کہے۔ "هٰذَا حَكَمٌ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے) اس کی مصلحت حضرت عمرو بن العاص نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؑ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائیگی۔ کچھ کہیں گے کہ یہ بات مان لی جائے اور کچھ کہیں گے نہ مانی جائے۔ ہم مجتمع رہیں گے اور ان کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائیگا۔ اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائیگی۔" (بحوالہ طبری، ابن سعد، ابن الاثیر)

اس کے صاف یہ معنیٰ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی۔ قرآن کو حکم بنانا مقصود ہی نہ تھا

اس مشورے کے مطابق قرآن نیزوں پر اٹھایا گیا اور اس کا وہی نتیجہ ہوا جس کی حضرت عمرو بن العاص کو امید تھی۔ حضرت علیؑ نے عراق کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ اس چال میں نہ آؤ اور جنگ کو آخری فیصلے تک پہنچ جانے دو۔ مگر ان میں پھوٹ پڑ کر رہی اور آخر کار حضرت علیؑ مجبور ہو گئے کہ جنگ بند کر کے حضرت معاویہ سے تحکیم کا معاہدہ کریں۔ پھر یہی پھوٹ حکم مقرر کرنے کے موقع پر بھی رنگ لائی۔ حضرت معاویہ نے اپنی طرف سے حضرت عمرو بن العاص کو حکم بنایا۔ حضرت علیؑ چاہتے تھے کہ اپنی طرف سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو مقرر کریں۔ مگر عراق کے لوگوں نے کہا۔ وہ تو آپ کے چچازاد بھائی ہیں۔ ہم غیر جانبدار آدمی چاہتے ہیں۔ آخر ان کے اصرار پر حضرت ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنانا پڑا حالانکہ حضرت علیؑ ان پر مطمئن نہ تھے۔"

(خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۳۹۔ ۱۴۰)

مولانا مودودی صاحب چھٹے مرحلے کے تحت رقمطراز ہیں :-

چھٹا مرحلہ :- اب خلافت کو ملوکیت کی طرف جانے سے بچانے کا آخری موقع باقی رہ گیا تھا کہ دونوں حکم ٹھیک ٹھیک اس معاہدے کے مطابق اپنا فیصلہ دیں جس فیصلے کی رُو سے ان کو فیصلے کا اختیار سونپا گیا تھا۔ معاہدے کی جو عبارت مورخین نے نقل کی ہے اس میں تحکیم کی بنیاد یہ تھی :-

" دونوں حکم جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں اس پر عمل کریں اور جو کچھ کتاب اللہ میں نہ پائیں اس کے بارے میں سنّتِ عادلہ جامعہ غیر مفرقہ پر عمل کریں (بحوالہ طبری، البدایہ)

لیکن دومۃ الجندل میں جب دونوں حکم مل کر بیٹھے تو سرے سے یہ امر زیرِ بحث ہی نہ آیا کہ قرآن و سنّت کی رُو سے اس قضیہ کا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔ قرآن میں صاف حکم موجود تھا کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کی صحیح صورت طائفہ باغیہ کو راہِ راست پر آنے کے لئے مجبور کرنا ہے۔

" فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ

"پھر اگر ان میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہو تو زیادتی کرنے والی جماعت سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے"

حضرت عمارؓ بن یاسر کی شہادت کے بعد نبی صلعم کی نص صریح نے متعین کر دیا تھا کہ اس فتنے میں طائفہ باغیہ کون سا ہے"۔ (خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۴۰ - ۱۴۱)

حضرت عمارؓ بن یاسر کی شہادت کے متعلق نبی کریمؐ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے:۔

ابن عبدالبر الاستیعاب میں لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ سے بتواتر آثار یہ بات منقول ہے کہ عمار بن یاسر کو باغی گروہ قتل کرے گا اور یہ صحیح ترین حدیث میں ہے۔

تہذیب التہذیب میں ابن حجر کہتے ہیں کہ: و تواترت الروایاۃ عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلّم اِنّہٗ قالَ لعمار تقتلک الفئۃ الباغیۃ۔ (ج ۷۔ ص ۴۱۰)

حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ حضرت عمارؓ بن یاسر کے قتل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اس سے نبی صلعم کی دی ہوئی اس خبر کا راز کھل گیا کہ حضرت عمارؓ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا اور اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حضرت علیؑ حق پر ہیں اور **حضرت معاویہ باغی ہیں**"۔ (بحوالہ البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۲۷۰۔ خلافت و ملوکیت ص ۱۳۸)

قرآنِ حکیم کی واضح ہدایات کے بموجب حضرت معاویہ باغی تھے لہٰذا واجب القتل تھے تحکیم کی معینہ شرائط کے مطابق بھی یہی ہونا چاہئے تھا لیکن ملّتِ اسلامیہ کی بدنصیبی دیکھئے کہ جس طرح عراقی عمرو بن العاص کی جنگی چال کے فریب میں آ گئے تھے اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری اپنی سادگی، نادانی، ضعفِ پیری و دماغی کمزوری کی بناء پر عمرو بن العاص کی شاطرانہ چالوں سے مات کھا گئے۔ جب ہی تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بولے "افسوس تمہارے حال پر اے ابوموسیٰ! تم عمرو کی چالوں کے مقابلے میں بڑے کمزور نکلے"۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے کہا۔ "ابوموسیٰ اس سے پہلے مر گئے ہوتے تو ان کے حق میں زیادہ اچھا تھا۔" حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا "دیکھو، اس امّت کا حال کہاں تک جا پہنچا ہے۔ اس کا

مستقبل دو ایسے آدمیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے جن میں سے ایک کو کچھ پرواہ نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے اور دوسرا ضعیف ہے۔" (الطبری، ابن سعد، ابن الاثیر)
(تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: خلافت و ملوکیت۔ ص: ۱۴۱-۱۴۲)

"معاہدہ تحکیم کا **بدترین نتیجہ** مزید انتشار کی صورت میں رُونما ہوا اور حضرت علیؑ کی فوج دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ مخالف گروہ خوارج کی صورت میں رونما ہوا جو جنگ نہروان کا داعی بنا جس میں کم و بیش پچیس ہزار خوارج ہلاک ہوئے۔ بالآخر حضرت علیؑ جو اس تاریک دور میں امامت و ہدایت کا روشن چراغ تھے، عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی کے ہاتھوں مسجد کوفہ میں زہر آلود تلوار سے زخمی ہوئے اور بعد ازاں درجۂ شہادت پر فائز ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔"

معاہدہ تحکیم کی حدود سے غیر آئینی تجاوز اور غلط مفروضہ کی بنا پر اختیارات کے غلط استعمال کا ذکر کرتے ہوئے اس المناک صورت حال کو مولانا مودودی یوں بیان فرماتے ہیں:-

"اس کے بعد حضرت علیؑ نے کوفہ واپس پہنچ کر شام پر چڑھائی کی پھر تیاریاں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں انہوں نے جو تقریریں کیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امت پر ملوکیت کے مسلط ہو جانے کا خطرہ کس شدت سے محسوس کر رہے تھے اور خلافتِ راشدہ کے نظام کو بچانے کے لئے کس طرح ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ایک تقریر میں وہ فرماتے ہیں:-

"خدا کی قسم، اگر یہ لوگ تمہارے حاکم بن گئے تو تمہارے درمیان کسریٰ و ہرقل کی طرح کام کریں گے۔" (الطبری، ابن الاثیر)

ایک دوسری تقریر میں انہوں نے فرمایا: "چلو ان لوگوں کے مقابلہ میں جو تم سے لڑ رہے ہیں کہ ملوک جبابرہ بن جائیں اور اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنالیں۔" (الطبری، ابن الاثیر)

مگر عراق کے لوگ ہار چکے تھے۔ خوارج کے فتنے نے حضرت علیؑ کے لئے مزید ایک دردسر پیدا کر دیا تھا۔ پھر حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص کی تدبیروں سے مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور دنیائے اسلام عملاً دو متحارب حکومتوں میں بٹ گئی

آخر کار حضرت علیؓ کی شہادت (رمضان سنہ ۴۰ھ) پھر حضرت حسنؓ کی مصالحت (سنہ ۴۱ھ) نے میدان حضرت معاویہ کے لئے پوری طرح خالی کر دیا۔ اس کے بعد جو حالات پیش آئے انہیں دیکھ کر بہت سے وہ لوگ بھی جو پہلے حضرت علیؓ اور ان کے مخالفین کی لڑائیوں کو محض فتنہ سمجھ کر غیر جانبدار رہے تھے، یہ اچھی طرح جان گئے تھے کہ حضرت علیؓ کس چیز کو قائم رکھنے اور امت کو کس انجام سے بچانے کے لئے اپنی جان کھپا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے آخری زمانے میں کہا تھا۔ "مجھے کسی چیز پر اتنا افسوس نہیں جتنا اس بات پر ہے کہ میں نے علیؓ کا ساتھ کیوں نہ دیا۔" (ابن سعد، ابن عبدالبر، الاستیعاب) ابراہیم النخعی کی روایت ہے کہ مسروق بن اجدع حضرت علیؓ کا ساتھ نہ دینے پر توبہ و استغفار کیا کرتے تھے (الاستیعاب) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو عمر بھر اس بات پر سخت ندامت رہی کہ وہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں حضرت معاویہ کے ساتھ کیوں شریک ہوئے۔

(الاستیعاب، خلافت و ملوکیت۔ ص ۱۴۲-۱۴۵)

تاریخی حقائق کی روشنی میں نتیجہ

عالی مرتبت جناب مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے پیش کردہ تاریخی حقائق قارئین کرام کی خدمت اقدس میں پیش کر کے ہم ان کی ذہنی صلاحیت پر چھوڑتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود فیصلہ کریں کہ کربلا کے دردانگیز المیہ کی ذمہ داری کن لوگوں کے سر ہے۔ ویسے جناب مودودی صاحب قبلہ کے بیان کردہ تاریخی حقائق کا مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مروان کی شرانگیزی و فریب کاری، شام کے زرخیز اور جنگی نقطہ منظر سے اہم صوبہ پر حضرت امیر معاویہ کا مسلسل طویل عرصہ تک متصرف رہنا اور فوجی قوت مجتمع کر کے مرکزی خلافت کو کمزور کرنا، بعض اکابر صحابہ کرامؓ کا غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ کر آڑے وقت میں مرکزی حکومت کی امداد نہ کرنا، عمرو بن العاص کی شاطرانہ چالوں کے تحت قرآن حکیم کا نیزوں پر بلند کرنا، شامی بغاوت کو کچلنے کے موقع پر مرکزی حکومت کی امداد کی بجائے حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ کا جنگ جمل کے دوران حضرت علیؑ کی عسکری قوت کو کمزور کرنا، معاہدۂ تحکیم کی معینہ شرائط کے متضاد مفروضہ پر حضرت

ابوموسیٰ اشعریؓ کا دانستہ یا سادگی کی بناء پر نادانستہ طور پر غلط فیصلہ دینا اور عمرو بن العاص کی شاطرانہ چالوں سے مات کھانا، اہلِ بصرہ و اہلِ کوفہ کی تلون مزاجی و بزدلی، خوارج کا قرآنِ حکیم کی غلط تاویل اور من گھڑت تشریح کی بناء پر فتنۂ عظیم برپا کرنا وہ افسوس ناک **عوامل** ہیں جنہوں نے تیس سالہ خلافتِ راشدہ کا خاتمہ کر کے ملوکیت کے استحصالی و استعماری نظام کی راہ ہموار کی اور فتح مکہ کے موقع پر بنی امیہ کا کھویا ہوا وقار بحال کر دیا اور امیر معاویہ کو قیصرانی گدی پر بٹھا دیا۔ مغیرہ بن شعبہ کی انگیخت پر امیر معاویہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں شاہانہ شان و شوکت اور عسکری قوت کے بل بوتے پر عوام کے اظہارِ رائے کی آزادی کو ختم کر کے اپنے نااہل بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد و جانشین نامزد کر دیا اور اپنی زندگی ہی میں شاہانہ جاہ و جبروت کو جو انہیں بطورِ امیر حاصل تھی بروئے کار لا کر عوام سے اس کی بیعت لینا شروع کر دی۔ اس طرح کنبہ پرور، غلط اندیش حکمران نے مرتے مرتے اپنے ناز و نعمت کے پروردہ بیٹے کو عوام کے سر پر مسلط کر دیا تاکہ اسلامی استقلال اور خلافتِ الٰہیہ کے خواب دیکھنے والے کبھی اپنی منزلِ مقصود کو نہ پا سکیں۔ دریں صورت یزید کے ناپاک ہاتھوں میں وہ استعماری تلوار آئی جس سے فرزندِ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کی مقدس گردن کٹی۔

آنریبل جسٹس سید امیر علی خلافتِ اسلامیہ کے زوال و انحطاط پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

The celebrated doctor (Imam) Hasan of Basra who lived towards the close of century declared that two men threw into confusion the affairs of Muslims: Amr the son of Alaas when he suggested to Muawiyah, the lifting of the Quran on the lances and it was so uplifted, and Mughira who advised Muawiah to take the covenant of allegiance to Yazid.

(ترجمہ) "مشہور عالم خواجہ حسن بصریؒ نے جو پہلی صدی ہجری کے اختتام پر بقیدِ حیات تھے۔ ارشاد فرمایا کہ دو شخصوں نے اسلامی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اولاً عمرو بن العاص جس نے قرآن کو نوکِ سناں پر بلند کرنے کے لئے معاویہ کو مشورہ دیا تھا اور جس پر عمل کیا گیا ثانیاً مغیرہ بن شعبہ جس نے معاویہ کو یزید کے لئے بیعت لینے کی رائے دی تھی"۔

باب چہار دہم

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

وقتِ عصر کی یا زمانہ کی قسم! انسان ضرور خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اعمال صالح بجالائے ایک دوسرے کو حق کی پیروی کی تاکید کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے

(العصر ۱-۳)

دعوت الی الحق

قسم کی حقیقت

عام طور کسی عزیز القدر اور مہتم بالشان چیز کی قسم کھائی جاتی ہے جس سے قسم کھانے والے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا بیان قابلِ اعتبار اور مبنی بر حقائق سمجھا جائے عدالتوں میں جو قسمیں کھائی جاتی ہیں وہ اسی نوعیت کی ہوتی ہیں تاکہ حکام عدالت کو شہادت کی سچائی پر یقین آجائے۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا کہ قسم سے مقسم بہ کی تعظیم و تکریم مطلوب ہوتی ہے اور بعض اوقات اظہار محبت مقصود ہوتا ہے۔ عاشق اپنے معشوق اور محب اپنے محبوب کی قسم کھا کر محبت ہی کا اظہار کرتا ہے کسی شاعر نے اس حقیقتِ حال کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

اے نازنین من تیرے آثار کی قسم — شہر و دیار و کوچہ و بازار کی قسم
پیاری مجھے ہر ایک تیری یادگار ہے — کھاتا ہوں میں تیرے در و دیوار کی قسم

عاشق کو معشوق سے نسبت رکھنے والی ہر چیز بھی محبوب ہوتی ہے اس لئے معشوق جس شہر و دیار میں بستا ہے عاشق اظہارِ محبت کے لئے اس کی بھی قسم کھاتا ہے۔ سورۂ التین میں خداوند تبارک وتعالیٰ اسی بنا پر "ھٰذا البلد الامین" (امن والے شہر مکہ) کی قسم کھاتا ہے۔ جب کوئی باپ اپنے بیٹے کی قسم کھاتا ہے تو یہی جذبۂ محبت کارفرما ہوتا ہے۔ فرزند کی بزرگی و عظمت کی وجہ سے نہیں بلکہ محبت اور صرف محبت ہی کی بنا پر یہ قسم کھائی جاتی ہے۔ اس مقام پر اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں مادیات و مجردات میں سے اکثر اشیاء کی قسمیں اس قدر کیوں کھائی گئی ہیں؟ کیا اس سے پیغمبر اسلامؐ کی دلجمعی مطلوب تھی یا قسم سے مقسم بہ کی بزرگی و برتری مقصود تھی یا پسِ پردہ جذبۂ محبت کارفرما تھا۔

قسم کھانے کا خدائی نظریہ

قرآنِ حکیم میں قسم کھانے کا خدائی نظریہ ہمارے نظریہ سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا کسی ایسی چیز کی قسم کھا رہا ہو جو ہماری نظر میں وقیع نہ ہو مثلاً کسی درخت کی قسم کھانا جیسے زیتون و انجیر وغیرہ۔ ہو سکتا ہے کہ خدائی نگاہوں میں وہ درخت قابلِ قدر و رفیع الشان ہو کیونکہ اس کو کسی ایسی چیز سے نسبت ہے جو خدا کے حضور مہتم بالشان بھی ہے اور محبوب بھی۔ قرآنِ حکیم میں بعض اوقات قسم کھانے سے کسی پیشین گوئی کا اظہار مقصود ہوتا ہے جس سے پیغمبر اسلامؐ کی صداقت کی تائید مطلوب ہوتی ہے۔ کبھی قسم کے ذریعہ عالم آب و گل کے مکینوں کی توجہ قوانینِ قدرت کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے مثلاً دن رات کا تغیر و تبدل وغیرہ تاکہ انسان اندازہ کر سکے کہ عالمِ روحانیت پر بھی اس نوع کے قوانین حاوی ہیں۔ بسا اوقات قرآنِ حکیم میں ایک دعویٰ پیش کیا جاتا ہے اور قسم اس دعویٰ کی دلیل میں لائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمایئے:۔

" وَالْعَصْرِ ۙ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۙ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (سورہ العصر ۱-۳)

(ترجمہ) " وقت اور زمانہ کی قسم۔ انسان ضرور خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجا لائے۔ ایک دوسرے کو حق کی پیروی کی تاکید کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے۔"

ان آیات کریمہ میں یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ تمام انسان نقصان و خسارے میں ہیں ماسوائے ان کے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔ زمانہ کو اس دعویٰ کی دلیل میں پیش کیا گیا ہے یہ کتنی واضح حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی مستقل و دائمی نیکی کے سرانجام دینے میں مصروف نہیں وہ فی الواقعہ اپنی زندگی کا ہر وہ منٹ

اور ہر وہ لمحہ جو گزر رہا ہے، کھو رہا ہے اس لئے وہ لازماً خسارے میں ہے۔ زمانہ تین صورتوں میں اس دعویٰ کی صداقت کی تائید کرتا ہے۔ اولاً صرف وہی لوگ جو اعمال صالحہ بجالانے میں سنہری موقع نہیں کھوتے فائدہ میں رہتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے لوگ سراسر گھاٹے میں ہیں۔ ثانیاً گذشتہ زمانے کے واقعات سے صاف عیاں ہے کہ صرف وہی لوگ اوجِ کمال اور برجِ عروج تک پہنچ پاتے رہے ہیں جنہوں نے اعمالِ صالح بجالائے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ بدکار اپنی بداعمالیوں کی بنا پر ہمیشہ تباہ و برباد ہوئے ثالثاً جناب رسالتمآبؐ کا زمانۂ نبوت (جو بعض مفسرین کے نزدیک العصر کا صحیح مقصود ترجمہ ہے) خود اس امر کا شاہد ہے کہ اعمالِ صالح بجالانے والے مومنین کامیاب و کامگار ہوئے اور آنحضرتؐ کے مخالفین معرضِ ہلاکت میں پڑ کر خسران و نقصان اور ذلت و رسوائی سے دوچار ہوئے۔

زمانہ نے اس حقیقت کو کتنی اچھی طرح ثابت کر دیا کہ رزم گاہِ کربلا میں تمام کے تمام انسان خسارے میں پڑ گئے ماسوائے حسین مظلومؑ اور آپ کے اعزہ و اقربا اور احباب و انصار کے جو مومنینِ کامل کی حیثیت سے اعمال صالح بجالائے اور تیروں کی بارش میں نماز ظہر ادا کی۔ تبلیغ حق کے لئے خود بھی صبر و ضبط نفس سے کام لیا اور دوسروں کو بھی مصائب میں صابر و ثابت قدم رہنے کی وصیت کرتے رہے تبلیغ حق فی نفسہٖ ایک ایسا فریضہ ہے جس کے سرانجام دینے کے لئے مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا اٹل و ناگزیر ہے۔ پس جب تک داعیٔ حق خود صابر نہ ہوگا، نہ تو خود اتباعِ حق کر سکے گا اور نہ دوسروں کو تبلیغ حق کی دعوت دے سکے گا۔ کیا اس سورہ سے یہ تاریخی حقیقت منظرِ عام پر نہیں آتی کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ حسین شہیدؑ تو توصیۂ حق و توصیۂ صبر کی بنا پر زندۂ جاوید ہو گئے اور دنیا میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسان

آپ کی غلامی کو سرمایۂ افتخار سمجھنے لگے۔ برعکس اس کے قوم یزید دائمی ہلاکت و ابدی خسران سے دوچار ہوئی اور رہتی دنیا تک اس پر جن وانس کی لعنت برستی رہے گی۔

تفسیر صافی میں ہے کہ "اَلْعَصْر" سے مراد وقتِ نمازِ عصر بھی ہے۔ چہ عجب! قرینِ قیاس ہے کہ اس کا اشارہ اس نمازِ عصر کی طرف ہو جو بروزِ عاشور مظلومِ کربلا نے زیرِ خنجر ادا کی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لیکر تا قیامِ قیامت بارگاہ خداوندی میں جبینِ نیاز سجدہ میں جھکتی رہی ہے اور جھکتی رہے گی مگر امامِ عالیمقام کا ایک سجدہ کونین کی نمازوں پر بھاری ہے ؎

کر گیا سجدہ کے قابل کربلا کی خاک کو ایک سجدہ کربلا میں زیرِ خنجر دیکھئے

پس حسینِ مذبوح من القفاؑ کے اس سجدہ کی قسم کہ قومِ اشقیاء سراسر نقصان میں رہے گی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ " وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ " کی موجودگی میں "اَلْعَصْر" صرف وہ مخصوص نمازِ عصر ہی ہو سکتی ہے جو تلوار کی دھار کے نیچے ذبیحِ نینویٰ، قتیلِ فرات، ذبیحِ موعود، فرزندِ رسولؐ نے ادا کی ہے ؎

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

امام حسینؑ نے اپنا گھر لٹا کر اور سر کٹا کر دعوت الی الحق کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ حسینؑ کے نام لیواؤں کا فرضِ منصبی بھی یہی ہے کہ وہ تعمیلِ حکمِ خدا اور اتباعِ امامؑ میں وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کے تحت حق پر ثابت قدم رہ کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض پورا کرتے رہیں۔ یہی دعوت الی الحق ہے اور اسی مقصد کے لئے حسینؑ نے جان دی ہے۔ اسی میں اسلام کی حیات و بقاء کا راز مضمر ہے اور اسی پر عمل کرنا ہر مسلمان کا ایمان اور ہر حسینی کا اخلاقی فرض ہے کیونکہ حسینؑ محض ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ حسینؑ نام ہے ایک تحریک کا جو دعوت الی الحق، ایمانِ محکم

عملِ پیہم، بے لوث قربانی، مسلسل جدوجہد، حق کی حمایت اور باطل سے تصادم کا درس دیتی ہے جو جور و جفا کی چکی میں پسنے والے، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے افراد کو آزادی، سربلندی اور استقامت علی الحق کی دولتِ بے پایاں سے مالا مال و نہال کر دیتی ہے۔

قسم خداوندی کی دوسری مثال

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے: "وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۫ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۭ (التین: ۱-۶)

(ترجمہ) "قسم ہے انجیر، زیتون، طورِ سینا اور اس امن والے شہر (مکّہ) کی، بیشک ہم نے انسان کو بہترین ترکیب میں پیدا کیا ہے۔ پھر ہم نے اس کو پست سے پست حالت کی طرف پھیر دیا۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیکیاں کرتے رہے۔ ان کے لئے بے انتہا ثواب ہے۔"

اس موقع پر یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ انسان کو بہترین ترکیب سے معرضِ وجود میں لایا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انجیر، زیتون، طورِ سینا اور امن والے شہر مکّہ کی قسم۔ اسی باب میں ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ انجیر کا تعلق طورِ سینا سے ہے جو موسوی شریعت کا خصوصی نشان "SYMBOL" ہے اور زیتون کا تعلق امن والے شہر مکہ سے ہے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ پس پروردگارِ عالم یہودیت اور اسلام کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین ترکیب سے عمل میں لائی گئی۔ موسوی شریعت اور دینِ محمدی کے اصول و قوانین اور ہر دو بانیانِ مذاہب حضرت موسیٰؑ اور آنحضرتؐ کے سوانح حیات و باہمی مماثلت پر غور کرنے سے یہ امر بالوضاحت ثابت ہے

کہ واقعی انسان کو بہترین دل و دماغ عطا کیا ہے۔ انسانی دل اپنی قدسیت کی وجہ سے مقامِ جلیلِ اکبر ہے اور یہ خاکی پتلا علمِ لاہوتی کی بناء پر مسجودِ ملائک ہے اور دماغی ارتقا کے لحاظ سے اپنی حیرت انگیز ایجادات و اختراعات کے طفیل سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا وارث ہے مگر وہی انسان جس میں ارتقائی منازل طے کرنے کی اس قدر صلاحیت موجود ہے اس وقت پست سے پست درجہ میں گر جاتا ہے جب وہ شجر و حجر کو اپنا معبودِ حقیقی سمجھ کر ان کے سامنے جھک جاتا ہے اور بت پرستی میں محو ہو جاتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس پستی کو اسفل سافلین کے درجہ سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ثابت ہوا کہ یہودیت و اسلام کی تدریجی ترقی اور مخالفین کی تدریجی ہلاکت اس امر کی دلیل ہے کہ انسان کو بہترین ترکیب سے پیدا کیا گیا ہے۔ نیک عمل کرنے والے لوگ مادی و روحانی لحاظ سے اوجِ کمال تک پہنچ گئے اور مخالفین اسفل سافلین کے چکر میں پڑ کر دائمی ہلاکت سے دوچار ہو گئے۔

کیا یزید ملعون کے سامنے گردنِ عبودیت جھکانے والے اسفل سافلین کے گڑھے میں نہیں گرے؟ کیا حسینِ شہیدؑ نے طاغوتی قوتوں کے سامنے گردن نہ جھکا کر اور سر کٹا کر اپنی قوتِ ایمان اور عملِ صالح سے یہ ثابت کر دیا کہ آپ ہی کی ذاتِ گرامی ان مخصوص انسانوں میں سے ہے جن کو بہترین ترکیب سے پیدا کیا گیا اور جن کے لئے اجرِ غیر ممنون اور ثوابِ عظیم ہے۔

قسم خداوندی اور سورۂ فجر

اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورہ الفجر کی ابتدائی آیات میں فجر، دس راتوں، شفع، وتر اور ایک مخصوص رات کی قسم کھا کر ایک حیرت انگیز تاریخی واقعہ کی طرف جو مستقبل کے پردوں میں نہاں تھا اشارہ کر کے شجرِ ملعونہ کی بیخ کنی کی پیشین گوئی کی ہے اور حضرت رسالتمآبؐ کی دلجمعی و تشفی فرمائی ہے بالعموم پیغمبرِ اسلامؐ واقعاتِ دشتِ کربلا

کا خیال فرماکر بمقتضائے بشریت مغموم ہوجایا کرتے تو اس عالم الغیب نے اپنے حبیبؐ کی دلجوئی کے لئے ارشاد فرمایا :۔

" وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۝ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ (الفجر : ۱-۱۴)

(ترجمہ) " قسم ہے فجر کی، دس راتوں کی، جفت کی، طاق کی اور ایک رات کی کہ دہ قریب ختم ہو، ضرور اس میں صاحب عقل کے لئے قسم ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ جو ستونوں والے ارم کے رہنے والے تھے کہ ویسا شہر شہروں میں بنایا ہی نہیں گیا اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے میدان میں چٹانوں کو تراشا تھا اور فرعون کے ساتھ جو میخیں رکھنے والا تھا کیسا معاملہ کیا۔ ان سب نے ملکوں میں سرکشی کی تھی پھر ان میں خرابی کو بہت بڑھا دیا تھا۔ پس تمہارے پروردگار نے بھی ان پر عذاب کا کوڑا لگایا۔ بیشک تمہارا پروردگار ضرور گھات میں ہے۔"

اگرچہ ان آیات میں دعویٰ پردۂ اخفا میں رکھا گیا ہے تاہم قوم عاد، قوم ثمود اور فرعون کی عبرتناک ہلاکت کے قرائن سے یہ واضح کر دیا ہے کہ دعویٰ کیا ہو سکتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (بیشک تمہارا پروردگار ضرور گھات میں ہے) کے الفاظ سے بھی یہی نمایاں ہے۔ اس دعویٰ کی دلیل میں فجر، دس راتوں، شفع، وتر اور ایک شب مخصوص کی قسم کھائی گئی ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ قسم ہے مجھے صبح عاشور کی، قسم ہے محرم کی دس راتوں کی، قسم ہے جفت یعنی حسنینؑ یا ان

کے والدین کی، قسم ہے طاق یعنی یکتائے زمانہ محمد مصطفٰےؐ یا علی مرتضٰیؑ یا شہیدِ کربلاؑ کی اور قسم ہے اس رات کی (جو اہلِ بیتِ رسالت کے لئے قیامت کی شام تھی) جس میں اسیرانِ کرب و بلا سفرِ شام محنت انجام پر مجبور کر دیئے گئے۔ اے میرے حبیبؐ! **میں ان ظالموں کو ضرور عذاب میں ڈالوں گا**۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ قوم عاد (اولادِ ارم) کو جو حضرت ہودؑ کی امت تھی جنہوں نے بڑی بڑی بلند عمارتیں بنائی تھیں اور جن کی مثل بلاد میں کوئی قوم قوی تر پیدا ہی نہیں کی گئی تھی تیرے پروردگار نے انہیں کس طرح برباد کر دیا اور کس طرح تباہ کر دیا۔ قوم ثمود، امتِ صالحؑ کو جنہوں نے بڑے بڑے مضبوط و سنگین مکانات بنا رکھے تھے اور کس طرح فرعونِ ذی الاوتاد کو بحرِ فنا میں غرق کر کے قعرِ جہنم میں پہنچا دیا، جس نے بیحد سرکشی کر رکھی تھی اور اپنے زیرِ حکومت شہروں میں قتلِ ناحق اور اموالِ غیر پر دستِ ظلم بڑھا رکھا تھا۔ پس تیرے پروردگار نے بھی ان پر عذاب کا کوڑا ایسا چلایا کہ ان کا نام و نشان تک مٹا دیا اور دارالبوار میں فی النار کر دیا۔ اے میرے حبیبؐ! تیرا پروردگار جبّار و قہّار اس بات پر قادر ہے کہ جس طرح قوم عاد کو برباد، قوم ثمود کو تباہ اور قوم فرعون کو غرقاب کیا تھا اسی طرح شجرِ ملعونہ کو بھی مٹا دے گا، اس کی جڑ کاٹ ڈالے گا اور اس کا تخم برباد کر دے گا۔ یقیناً تیرا پروردگار گھات میں ہے اور وہ موقع کی تلاش میں ہے کہ مجرموں پر اتمامِ حجت کر کے ان کو عذابِ شدید میں گرفتار کرے۔

مفسرین نے اس سورہ کی تفسیر لکھتے وقت بھی متضاد آراء کا اظہار کیا ہے بعض نے تو کہا ہے کہ اس سے ماہِ ذوالحجہ کا عشرۂ اول مراد ہے کیونکہ اس میں یومِ حج و بقرعید کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بعض نے بیان کیا کہ نہیں، اس سے ماہِ رمضان کا آخری عشرہ مراد ہے کیونکہ اس میں لیلۃ القدر موجود ہے۔ قیاسِ اوّل کے حامی شفع، وتر اور شبِ مخصوص کی تشریح میں کوئی معقول وجہ بیان نہ کر

سکے اور قیاس دوم کے حامی فجر، شفع اور وتر کی توضیح میں کوئی مدلل چیز پیش نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی معقول توجیہہ اس صورت میں واضح کر سکے جب رمضان کا مہینہ تیس[۳۰] کی بجائے انتیس[۲۹] دن کا شمار ہو۔ بلکہ ہر ایک نے تفسیر بالرائے سے کام لے کر اپنی اپنی جگہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مفسرین کے ایک تیسرے گروہ نے اس سورہ کا عشرۂ محرم پر اطلاق کیا ہے۔ تمام مفسرین سے بہتر مفسر، تمام عالموں سے بہتر عالم، جن کی شاگردی پر خود امام ابوحنیفہ کو فخر ہے اور جن کے سایۂ عاطفت میں تربیت پانے پر حضرت سفیان ثوری رح کو ناز ہے یعنی صادقِ آلِ محمدؑ ارشاد فرماتے ہیں جو کوئی اس سورہ کو فرائض و نوافل میں پڑھے وہ حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ محشور ہوگا کیونکہ یہ سورہ، سورۂ حسینؑ بن علیؑ ہے۔ پس قولِ معصومؑ سے صاف عیاں ہے کہ فجر سے مراد عاشورِ محرم کی صبح ہے جب قوم اشقیا چراغِ امامت کو گل کرنے کے لئے نیزہ و شمشیر اور تیر و کماں سے مسلح ہو کر میدانِ جنگ کی طرف بڑھ رہی تھی اور جاں نثارانِ حق توصیۂ حق و توصیۂ صبر پر عمل کر کے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے اپنی جانیں قربان کر رہے تھے اور اپنے ہر قول و فعل سے دعوت الی الحق دے رہے تھے تو آفتابِ اسلام جو کفر و باطل کی تاریکیوں میں مستور تھا اور مسلسل دس راتوں سے یہ تاریکیاں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ صبح عاشور چمکا اور امام حسینؑ کی عظیم الشان قربانی نے اسلام کے چہرے پر پڑے ہوئے تاریک پردوں کو چاک کر کے رکھ دیا اور حقیقی اسلام اپنا اصلی روپ میں جلوہ فگن ہوا جس کی ضیا پاشیوں سے تاریکیوں کے بادل چھٹ گئے اور مولانا محمد علی جوہر بے اختیار پکار اٹھے ؎

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

پس خدائے قدوس نے محرم کی دس تاریک راتوں اور یوم عاشور کی صبحِ روشن کی قسم کھا کر اپنے اس دعویٰ کی دلیل پیش کی ہے کہ ظالم کیفر کردار کو پہنچیں گے۔ اس کے بعد خدائے بزرگ و برتر نے مرج البحرین کے عظیم القدر جوڑے یا لؤلؤ والمرجان یعنی جنابِ حسنینؑ کی قسم کھائی کہ خونِ ناحق کا ردِ عمل قوم اشقیاء کو معرض ہلاکت میں ڈال کر چھوڑے گا۔ پھر اس سے بڑھ کر ایک عظیم الشان قسم کھائے زمانہ جناب سید الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ ؐ یا سید الاوصیاء حضرت علی المرتضیٰؑ یا سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی کھا کر زبانِ قدرت اپنے دعویٰ کی حقانیت کو اس طرح مدلل کرتی ہے کہ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (المجادلہ ۲۱)
پر غور کر کے دیکھو کہ جناب محمد مصطفےٰ ؐ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ کفر کو سرنگوں ہونا پڑے گا اور امامِ عالیمقامؑ پر ظلم کرنے والوں وہی انجام ہوگا جو حضرت ہودؑ پر تشدد کرنے والی قوم عاد کا ہوا۔ لَا فَتٰى اِلَّا عَلِي لَا سَيْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار کے آسمانی نعرہ کو گوشِ ہوش سے سنو اور سوچو کہ کفر مغلوب ہو کر رہے گا اور باطل پرست جو ہوا و ہوس کے گھوڑوں پر سوار ہیں بالآخر اسی ذلت و رسوائی سے گلوگیر ہونے والے ہیں جس سے ناقۂ صالحؑ کی کونچیں کاٹنے والی شقی ازلی قوم ثمود دوچار ہوئی۔ آیۂ مبارکہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کو بنظرِ غائر دیکھنے والو۔ یقین رکھو کہ شہیدِ کربلا حیاتِ جاودانی کے وارث ہوں گے اور قومِ یزید فرعونِ ملعون کی طرح ابدی لعنت و دائمی ذلت کی سزاوار ٹھہرے گی۔

ان تمام عظیم الشان قسموں کے بعد خدائے قدوس ایک عظیم القدر شبِ مخصوص کی قسم کھاتا ہے جس کو قرآنِ حکیم وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ سے موسوم کرتا ہے ہم اپنے سلسلۂ بیان میں اس کو شامِ غریباں سے تعبیر کرتے ہیں۔ شامِ غریباں کو کیا ہوا؟ قلم کو اس کا یارا نہیں کہ بیان کرے۔ بعدِ شہادتِ امامؑ اشقیائے امت

نے اہلِ بیتِ رسالتؐ پر وہ مظالم توڑے جن کے تصور سے جسم تھرا اٹھتا ہے، دل تڑپ جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

شامِ غریباں

لکھا ہے بعدِ قتلِ شہنشاہِ کربلا   میت کے لوٹنے کو بڑھی فوجِ اشقیاء
تلوار کسی نے، سپر کوئی لے گیا   ملبوس تن سے کھینچ لیا وا مصیبتا!
عریاں چھوڑا لاشِ شہِ مشرقین کو
مسلم بھی کافروں نے نہ سمجھا حسینؑ کو

اس پر بھی باز آئے نہ افسوس اہلِ کیں   ڈھائے وہ ظلم جس سے لرزنے لگی زمیں
گھوڑوں کی نعل بندیاں کرنے لگے لعیں   پامال کرنے کے لئے لاشِ امامِ دیں
ٹاپوں سے چُور چُور تنِ نازنیں کیا
اعدا نے کچھ نہ پاسِ امامِ مبیںؑ کیا

سی پارہ کر کے مصحفِ ایماں بخطر   اہلِ حرم کی لوٹ پہ باندھی گئی کمر
کانوں کو چیر چیر کے کھینچے گئے گہر   بھاگے سروں سے چادریں لے کے اہلِ شر
کرب و بلا موردِ رنج و بلا ہوئی
بے پردہ آہ عترتِ خیر الوریٰؐ ہوئی

کتنے جفا پسند تھے صد حیف اہلِ شام   آتش کی نذر کرنے لگے شاہ کے خیام
شعلوں میں تھا خیمۂ زنگاریٔ امامؑ   سردارِ دیں کا گھر جلے عبرت کا ہے مقام
کیا دل شکستوں کے لئے آفت کا وقت تھا
سیدانیوں پہ آہ قیامت کا وقت تھا

پروردگارِ عالم نے اس قدر عظیم قسمیں کھانے کے بعد شامِ غریبان کی کیوں قسم کھائی؟ محض اس لئے کہ اہلِ حرم نے یزیدی مظالم و شامی بربریت کا صبر و سکون

سے مقابلہ کرتے ہوئے حسینی مقصد کی تکمیل کی۔ حسینی مقصد کی تکمیل میں ہی اسلام کی زندگی کا راز پنہاں تھا اس لئے شامِ غریباں کی قسم درحقیقت زینب کبریٰ کے بلند پایہ کردار کی قسم ہے جو بعد شہادت قافلۂ اہل بیت کی سالار اور تکمیلِ مقصدِ حسینی کی روحِ رواں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ و انصارِ حسینؑ نے کربلا میں صبر و استقلال کا وہ یادگار نمونہ پیش کیا جس کی مثال ناممکن ہے۔ انہوں نے شجاعت و جرأت کا مجسمہ بن کر حق پرستی و ثباتِ قدم کے وہ جوہر دکھائے جن کی نظیر تاریخِ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس سے زیادہ ہیبت ناک و دہشت خیز مگر عظیم الشان وہ موقف تھا جہاں خاندانِ رسالت کی مخدرات کو ٹھیرنا پڑا وہ یزید و ابنِ زیاد کا دربار تھا ؎

اے فلک جس گھر تلک آتے نہیں تھے بے صدا
سایہ جن کا آفتابِ چرخ نے دیکھا نہ تھا
بعد قتلِ شاہ دیں در میدانِ کربلا
شامیاں بستند بازو زینبؑ و کلثومؑ را

اہلِ حرم کو ساتھ لینے کی وجوہات

اس میں شک نہیں کہ امام حسینؑ نے اہلِ حرم کو اپنے ساتھ لے کر ان تمام مظالم کا موقع خود پیدا کر دیا اور یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ کے عمل کا یہ ایک بڑا نازک گوشہ سمجھا گیا ہے اور واقعہ ہائلہ کربلا سے پہلے عبداللہ بن عباسؓ و دیگر ہواخواہوں نے بھی اس کے خلاف مشورہ دیا تھا۔ امامؑ نے ان تمام مشیرانِ کار کے خیر خواہانہ مشوروں کو کبھی یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ منظورِ الٰہی یہی ہے کہ یہ قید ہوں، کبھی یہ فرمایا کہ جو مقدر میں ہے وہی ہوگا۔ ان خیر خواہوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور نہ

آنا چاہئے تھا کہ امامؑ کس مقصد کے پیشِ نظر عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے کیونکہ ان کی نگاہ میں عورتوں اور بچوں کا ساتھ حفاظتی و مدافعتی پہلو کمزور کرنے والا تھا۔ دنیوی نقطۂ نظر سے یہ درست بھی ہے کہ میدانِ جنگ میں عیال و اطفال کی موجودگی انسانی توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہیں ہونے دیتی۔ عورتوں اور بچوں کے تحفظ کا خیال جنگی منصوبوں کی تکمیل میں رکاوٹ ڈال دیتا ہے اور دفاعی تدابیر پر بطریقِ احسن عمل کرنا محال ہو جاتا ہے۔ جب مشکلات میں الجھ کر انسان دماغی انتشار کا شکار ہو جائے تو تمام کی تمام سیاسی چالیں اور جنگی سکیمیں ادھوری رہ جاتی ہیں اور دشمن کمزوری سے فائدہ اٹھا کر قوی تر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعاتِ کربلا کو چند ھیائی نظروں سے دیکھنے والے، حقائق کی دنیا سے کوسوں دور بسنے والے، تعصب کی عینک سے حقیقتوں کا سطحی مطالعہ کرنے والے اور حق پوشی کی نقابوں کے پیچھے تانک جھانک کرنے والے آج بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اہلِ حرم کو اپنے ساتھ لے جانے میں غلطی کی جس کے نتیجہ میں عورتوں اور بچوں کو دردناک مصائب و آلام کا شکار ہونا پڑا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں نے حسینی تدبّر پہ نہ ہی تو غائرانہ نظر ڈالی ہے اور نہ ہی حسینی مقصد کو سمجھنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ اگر وہ واقعاتِ کربلا کا آبائی تعصب کی عینک اتار کر بنظرِ غائر مطالعہ کرتے اور اپنی بے لوث قوتِ فیصلہ سے کام لیتے تو انہیں یقیناً یہ معلوم ہو جاتا کہ حسینی مقصد کی تکمیل اہلِ حرم نے کی ہے۔ اگر مخدراتِ عصمت سانحۂ کربلا میں حسینؑ کا ساتھ نہ دیتیں تو امامؑ وہ کچھ نہ ہوتے جو آج سمجھے جاتے ہیں بلکہ پیکرِ حریت و مجسمۂ حقیقت حسینؑ ابنِ علیؑ (معاذ اللہ) مجرم، باغی اور مستحقِ قتل متصور ہوتے۔ برعکس اس کے یزید ملعون مجاہد و غازی کا لقب پاتا۔ بعد شہادتِ عظمیٰ ام المصائب نائب زہرا حضرت زینب کبریٰؑ کا یہ حیرت انگیز کارنامہ ہے کہ جس نے حسینؑ کی بلند پایہ قربانی کو عظیم الشان اور لازوال بنا دیا ہے۔ کوفہ و شام کے بازاروں

اور باطل پرست حکام کے درباروں میں ان کی باطل شکن تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ حسینِ مظلومؑ کی قربانی زندۂ جاوید ٹھیری اور اسلام اپنی اصلی شکل وصورت میں مسلمانانِ عالم کے سامنے جلوہ گر ہوا ورنہ اموی بادشاہوں کی بدکرداریاں سنّتِ الٰہیہ قرار پاتیں۔

ذیل میں ہم وہ چند وجوہات تحریر کرتے ہیں جن کی بناء پر حضرت حسینؑ نے تمام آنے والے خطرات سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کے باوجود اہلِ حرم کو اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھا مگر وقت سے پہلے یہ راز لوگوں کو سمجھانا قرینِ مصلحت نہ خیال کیا کیونکہ قوی اندیشہ تھا کہ بنی امیہ اس مصلحت سے باخبر ہوکر کوئی ایسی صورت اختیار کر لیتے جس سے حسینی نصب العین کو کامیابی کا موقع نہ مل سکتا۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ قبل از وقت اعلان کر دینے سے تکمیل پذیر نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے اقتضائے عقل یہی تھا کہ حسینؑ اپنی اس مجوزہ سکیم کو پردۂ اخفاء میں رکھتے۔ غالباً یہی بات ہے کہ جس کی طرف تاریخ ابنِ جریر طبری میں ایک اشارہ موجود ہے:۔

"جب امام حسینؑ نے سفرِ عراق کا قصد کیا اور اکثر اشخاص مانع ہوئے تو امامؑ نے فرمایا۔ "میں نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا ہے اور آنحضرتؐ نے ایک امر کے لئے مجھے مامور کیا ہے۔ میں اس کو انجام دینے والا ہوں"۔ یحییٰ بن سعید اور عبداللہ بن جعفرؓ نے پوچھا وہ کیا امر ہے جس کی بجاآوری کا آپ کو حکم دیا گیا ہے؟ امام حسینؑ نے فرمایا "اس امر کا ذکر نہ میں نے کسی سے کیا ہے نہ زندگی بھر کروں گا"۔ (تاریخ احمدی ص۔ ۲۹۰)

امرِ اوّل:۔ امام حسینؑ کو قوی اندیشہ تھا کہ آپ کے مدینہ سے تشریف لے جانے کے بعد اموی درندے اہلِ حرم کو پریشان کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ بالخصوص ان مستورات کو جن کے شوہر یا بچے امامؑ کی معیّت میں عازمِ سفر ہوں گے۔ امامؑ کی آنکھوں کے سامنے زندہ مثال موجود تھی کہ عبداللہ بن زبیرؓ کے چلے جانے کے بعد اس کے باقی رشتہ داروں کو کافی پریشان کیا گیا تھا۔ خود کربلا میں خواتینِ علیا کی گرفتاری اور شہر بہ شہر

کی تشہیر اس امر کی شاہد ہے کہ امامؑ کا یہ خیال بالکل درست تھا۔ جن وحشی خونخواروں اور سفاک بھیڑیوں نے انتہائی بے رحمی سے تمام خاندان کو قتل کرنے کے بعد بھی ان بے والی و وارث بیبیوں کو اسیر کرنے سے دریغ نہیں کیا وہ بھلا مدینہ میں ان کو قید و بند سے کب آزاد رکھ سکتے تھے؟ اس موقع پر معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اہلِ بیتِ نبوت کی جو مستورات مدینہ منورہ میں رہ گئی تھیں مثلاً ام سلمہؓ و ام البنینؑ وغیرہ، اس خوف سے امامؑ نے ان کو اپنے ساتھ کیوں نہ لیا؟ مزید برآں جب ان خواتینِ علیا پر بنی امیہ نے مظالم نہ توڑے تو کیونکر یقین کر لیا جائے کہ امامؑ کے ساتھ جانے والی عورتوں پر بھی ضرور ظلم و ستم روا رکھا جاتا، اگر امامؑ انکو بوقتِ روانگی مدینہ میں چھوڑ جاتے؟

امرِ اوّل کا جواب یہ ہے کہ امامؑ نے اپنی معیت میں صرف ان بیبیوں کو لیا تھا جن کے متعلق اپنے نانا سے پیشین گوئی سن چکے تھے یا اپنے والد بزرگوار سے بذریعہ وصیت حکم پا چکے تھے۔ باقی رہ جانے والی مخدرات میں حضرت ام سلمہؓ اور جناب ام البنین رضؓ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر نے بعد وفاتِ رسولؐ زندگی بھر گھر سے باہر قدم نہ رکھا حتیٰ کہ محلہ کے قریب قریب گھروں میں بھی کبھی تشریف نہ لے گئیں اور "قَرْنَ فِی بُیُوتِکُنَّ" کے قرآنی حکم پر پورا پورا عمل کر دکھایا۔ ایک تلخ تاریخی حقیقت مجبوراً اس موقع پر ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہے کہ جس زمانے میں ام المومنین حضرت عائشہ نے حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کی معاون بن کر حضرت علیؑ کے خلاف جنگِ جمل کی تیاریاں کر رہی تھیں تو انہوں نے مکہ سے ایک خط حضرت ام سلمہؓ کو لکھا کہ میں حضرت علیؑ کے خلاف جنگ لڑنے جا رہی ہوں آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ اس کے جواب میں حضرت ام سلمہؓ نے تحریر فرمایا۔" اے عائشہ خدا سے ڈرو اور اپنے ارادہ سے باز آ جاؤ۔ قرآنِ حکیم میں ازواجِ نبیؐ کے لئے "قَرْنَ فِیْ بُیُوتِکُنَّ" (اپنے گھروں میں ٹکی رہو) کا حکم موجود ہے۔ ایسی حالت میں مجھے تمہارا مدینہ سے مکہ پہنچنا ہی تعجب میں ڈال رہا ہے، چہ جائیکہ آپ حضرت علیؑ

کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے بصرہ جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ کیا آپ نے رسولِ خدا[ص] کی یہ حدیث نہیں سنی "یَا عَلِی حَرْبُکَ حَرْبِی" (اے علی تمہاری جنگ میری جنگ ہے) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو حضرت علیؑ سے جنگ لڑنے کی جرأت ہی کیسے ہو رہی ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کے اس جواب کی روشنی میں بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی صورت میں بھی گھر سے نکلنے پر رضامند نہ ہو سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ پیرانہ سالی کی بنا پر حد درجہ ضعیف و ناتواں تھیں۔ ان کی عمر اسی برس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ایسی حالت میں ان کا ساتھ لے جانا نہ قرینِ مصلحت تھا اور نہ عقلِ رسا کی نظر میں جائز تھا۔ مزید برآں امامؑ کو یقین تھا کہ ام المومنینؓ کی حیثیت کے پیشِ نظر بنی امیہ ان کی ایذا رسانی پر آسانی سے آمادہ نہ ہو سکیں گے، اگر ہوں گے بھی تو اہلِ مدینہ انکی سرکوبی ضرور کر دینگے۔

موخرالذکر حضرت ام البنینؓ کو بھی مدینہ میں چھوڑنا کئی وجوہات کی بناء پر ضروری معلوم ہوتا تھا۔ اولاً حضرت ام سلمہؓ کی خدمت و موانست کے لئے کسی فرد کی موجودگی ضروری تھی ورنہ وہ اس ضعیف العمری میں گھر میں اکیلے رہ کر گھبرا جاتیں۔ اگر خدانخواستہ کہیں بیمار پڑ جاتیں تو کوئی تیمار دار بھی نہ ہوتا اور اس صورت میں ان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ ثانیاً جناب ام البنینؓ بذاتِ خود بھی کافی سن رسیدہ تھیں۔ ان کی عمر پینسٹھ [۶۵] برس سے کم نہ تھی۔ ثالثاً وہ اس وقت علیل بھی تھیں۔ ایسی عورت کو گرفتار کرنے سے بنی امیہ کی کینہ پرور طبیعتوں کو نہ کوئی خاص خوشی حاصل ہوتی، نہ اس عمر کی عورتوں پر دل کھول کر مظالم روا رکھے جا سکتے تھے۔ ان کی حقائق کی موجودگی میں حضرت ام سلمہؓ و ام البنینؓ کا مدینہ میں چھوڑ جانا حسینی اصابت رائے کی دلیل ہے۔

امر دوم:- عربوں میں زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ وہ جنگی معرکوں میں عورتوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ اس سے دو فائدے ہوتے تھے۔ اولاً وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ ثانیاً ناموافق حالات کی صورت میں

اگر مردوں میں بزدلی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے تو عورتیں ان کے جوش کو ابھارتی تھیں جنگِ احد میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے مسلمانوں کے خلاف کافروں کو ابھارنے میں بڑا اہم کردار سرانجام دیا تھا۔ اور اس کا غلام شیرِ اسلام حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا ورنہ شکست خوردہ فوجِ کفّار کا حوصلہ پست ہو چکا تھا اور وہ پلٹ کر سرفروشانِ اسلام پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔

مذکورہ بالا ہر دو صورتیں کربلا میں پیش نہ آئیں۔ نہ عورتوں کو مرہم پٹی کا موقع ملا اور نہ کسی فرد پر بزدلی غالب آئی کہ وہ اس کی قوتِ ایمان کو جوش دیکر ابھارتیں انصارِ حسینؑ کی قوتِ ایمان، جوشِ شجاعت اور شوقِ شہادت اس سے بہت بلند و بالا تھا تاہم ایک ضرورت ایسی تھی کہ امامؑ کو اپنے ساتھ مستورات کا رکھنا ضروری تھا وہ یہ کہ آپ کو اپنے علمِ امامت کی بنا پر معلوم تھا کہ آپ کے ساتھ انصار میں کچھ ایسے لوگ بھی ہونگے جن کے ساتھ ان کی عورتیں اور بچے بھی ہونگے۔ پس ایسی عورتوں اور بچوں کی دلجوئی کے لئے امامؑ کے ساتھ عورتوں اور بچوں کا ہونا بھی ضروری تھا۔ انصار کی عورتوں نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے وارثوں کی ہمتوں کو ابھارا اور اپنی گود کے پالوں کو امامِ ذلیشانؑ پر نثار کر دیا۔ یہ سب حضرت زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ کی موجودگی کا اثر تھا کہ ان عورتوں کی ڈھارس بندھی رہی اور ان کے حوصلے بدستور بلند رہے۔ اگر حضرت زینبؑ و حضرت ام کلثومؑ کربلا میں موجود نہ ہوتیں تو عین ممکن تھا کہ یہ بیبیاں پست ہمت ہو جاتیں اور ان کی وجہ سے شاید چند آدمی ایسے بھی نکل آتے جو میدانِ جنگ میں جانے سے جی چرانے لگے۔

امرِ سوم:۔ دنیا پر امامؑ یہ واضح کر دینا چاہتے تھے کہ یزیدیوں کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیونکہ بعدِ شہادتِ حسینؑ اہلِ حرم پر جو مظالم توڑے گئے، مسلمانوں کا تو کیا ذکر، کوئی کافر بھی روا نہ رکھتا۔ ان مخدرات کی اسیری اور شہر بہ شہر

کی تشہیر نے مکر و فریب کے پردوں کو چاک کر کے رکھ دیا۔ اب صرف کوئی عقل کا کورا اور دشمنِ ایمان ہی قوم یزید کو مسلمان بلکہ انسان سمجھ سکتا ہے۔

امر چہارم:۔ امامؑ تیرہ صدیوں کے بعد پیدا ہونے والے متعصب و پیشہ ور مورخین کو یہ دکھا دینا چاہتے تھے کہ میری جنگ دنیوی جنگ نہیں بلکہ دینی جنگ تھی۔ اگر میرا ارادہ تسخیر مملکت ہوتا تو میں ہرگز اپنے ساتھ عورتوں اور بچوں کو لے کر نہ نکلتا بلکہ لشکر اور سامانِ حرب و ضرب فراہم کرتا۔ بہتر۷۲ آدمیوں کی فوج سے کسی منظم و مستحکم حکومت کا تختہ نہیں الٹا جا سکتا۔ امامؑ کا مکہ سے روانگی کے وقت ہر منزل پر یہ اعلان کرتے جانا کہ میں جینے کے لئے نہیں بلکہ مرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ خود اس امر کی دلیل ہے کہ کربلا کی جنگ دنیوی جنگ نہ تھی۔ امامؑ کو اپنی ظاہری شکست اور شہادت کا قطعی یقین تھا۔ اسی یقین کی موجودگی میں عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر نکلنا ہی خود معرکۂ کربلا کی دینی نوعیت پر روشن دلیل ہے۔

امر پنجم:۔ سب سے اہم ضرورت جس کے تحت امامؑ عیال و اطفال کو ساتھ لے کر مدینے سے نکلے وہ حسینی مقصد کی تکمیل تھی جو اہلِ حرم نے سرانجام دی۔

حسینی مقصد کی تکمیل

یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ کی رحلت کے ساتھ ہی اہلِ بیتِ رسالت پر لامتناہی مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ امامؑ نے پورے پچاس برس ان مظالم کی تدریجی ترقی دیکھی اور ساتھ ساتھ یہ تجربہ بھی ہو رہا تھا کہ ہم پر جو مظالم توڑے جاتے ہیں ان کو پردۂ اخفاء میں رکھنے کے لئے حکومت کی تمام مشینری حرکت میں لائی جاتی ہے اور حکومت کے کارندے اپنی آتش بیانی و چرب زبانی سے ان تمام مصائب پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اگر کسی واقعہ پر پوری طرح پردہ نہ پڑ سکے تو

"والقدر خیرہٖ و شرّہٖ من اللہ تعالیٰ" کی آڑ لے کر گناہ کے بارِ گراں کو اپنی گردن سے اتار کر درگاہِ قدس و جلال پر ڈال دیا جاتا ہے اور وکلائے حکومت سروں پر بڑے بڑے عمامے باندھے اور لمبے لمبے جُبّے زیبِ تن کئے فتوے صادر کر دیتے ہیں کہ " وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے"۔ بندہ مجبورِ محض ہے۔ خدا جو چاہتا ہے بندہ اس کی تکمیل پر مجبور ہے۔ پس اگر اہلبیتِ رسالت زبانِ شکوہ کھولتے تو حکومت کے ہواخواہوں کی طرف سے یہ جواب ملتا کہ صبر کیجئے جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اگر آپ کو شکوہ ہے تو حکومت سے نہیں بلکہ خدا سے کیجئے۔

امامؑ جانتے تھے کہ دکھیا ماں نے بعدِ وفاتِ رسولؐ بمشکل پچانوے دن رنج و الم میں گزارے اور وہ بھی زیادہ تر بیت الحزن میں جا کر گریہ و زاری میں۔ آخر اپنے والد بزرگوار کے غم میں گھل گھل کر راہیٔ ملکِ بقا ہوئیں۔ مسلمانوں نے بنتِ رسولؐ کی دلجوئی کرنے کی بجائے ایذا رسانی میں اضافہ کیا۔ بنتِ رسولؐ کی جان گئی مگر کسی نے اُف تک نہ کی اور امت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اہلبیتؑ کے صبر و سکوت اور ایذا رسانوں کے غلط پراپیگنڈے نے سببِ موت پر پردہ ڈال دیا۔ ماں کی موت کے بعد دوسرا تجربہ باپ کی شہادت پر ہوا۔ گو قاتل پکڑا گیا مگر سازشِ قتل عرصہ تک معمّہ بنی رہی۔ تیسرا ہولناک تجربہ اپنے بھائی حسن المجتبیٰؑ کی شہادت پر ہوا۔ قاتل اپنا کام کر کے چلتا ہوا مگر اس وقت تک یہ مسئلہ مشتبہ رکھنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں کہ ایسا کس نے کیا، کیوں کیا اور کس نے کرایا؟ بدلہ لینا تو درکنار کسی نے قاتلوں سے اظہارِ نفرت بھی نہ کیا بلکہ سبطِ پیغمبرؐ کی موت پر شاہی درباروں میں مسرت کا اظہار کیا گیا، خوشی کے قہقہے لگائے گئے اور نواسۂ رسولؐ کے جنازے پر تیر برسائے گئے۔ ان تمام سابقہ تجربات کی بنا پر امامؑ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ بنی امیہ کا غلط پروپیگنڈہ میرے مقصدِ شہادت پر پردہ ڈال دے گا لہٰذا امامؑ نے پورے تدبّر

اور غور و فکر سے کام لے کر یہ فیصلہ کیا کہ مقصدِ عظمٰی کی تکمیل کے لئے اہلِ حرم کو اپنے ساتھ لے جانا نہایت ہی ضروری ہے۔

ہم گذشتہ ابواب میں اچھی طرح روشنی ڈال چکے ہیں کہ امام برحق محض تبلیغ حق اور اتمام حجت کے طور پر سفرِ کوفہ پر روانہ ہوئے مگر امیر مسلمؑ کی شہادت کے بعد اس غلط پروپگنڈے کے حالات سے جو کتبِ تواریخ میں مذکور ہیں، پتہ چلتا ہے کہ ابن زیاد نے عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے اپنا ہم خیال بنانے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ حسینؑ کوفہ پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ وہ زمامِ امور یزید کے ہاتھوں سے چھین کر خود بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ ہم پوری طاقت سے ان کا مقابلہ کریں گے۔ ان کے باپ اور بھائی بھی ہمیشہ اموی حکومت کے مخالف رہے لیکن ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اب حسینؑ کو ملک گیری کا شوق پیدا ہوا ہے لہٰذا جو انجام ان کے باپ اور بھائی کا ہوا وہی ان کا ہوگا۔ اس پروپگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ کوفہ کی اکثریت امام حسینؑ سے متنفر ہو گئی اور بعض یہ سمجھنے لگے کہ امامؑ (معاذ اللہ) شر پسند اور امن و امان کے دشمن ہیں۔ وہ ہمارے شہر پر کیوں حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں؟ ان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ یزید کے ہاتھ سے عنانِ حکومت چھینیں؟ بعض کتبِ تاریخ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ امام کا نام بھی پردۂ اخفاء میں رکھا گیا اور عوام میں صرف یہ شہرت کیا گیا تھا کہ حجاز کے ایک خارجی نے امیر المومنین یزید سے حکومت کی باگ ڈور چھیننے کے لئے کوفہ پر چڑھائی کی ہے۔ اس جھوٹے پراپیگنڈے اور بے بنیاد افتراء کی قلعی کھولنا ضروری تھا ورنہ شہدائے کربلا کا خون رائیگاں جاتا اور کربلا کے بے آب و گیاہ بیابان میں جو بہتر ۷۲ آدمی قتل ہو جاتے، کوئی بتلانے والا کہاں ہوتا کہ انہوں نے کاہے پر جان دی؟ بس قاتل افراد کی زبانیں ہوتیں اور اپنی بے جرمی کی داستانیں۔ جب تردید کرنے والا کوئی موجود نہ ہوتا تو حسینی مسلک مشتبہ ہو کر رہ جاتا اور شہادت کی نوعیت بالکل بدل جاتی۔ اس صورت میں یہ قتل صرف بہتر ۷۲

کا قتل نہ ہوتا بلکہ امامؑ کی تحریکِ حریت، ان کے مقاصد علیا، ان کی ہر دلعزیزی، ان کی پاکدامنی اور اس کے ساتھ ساتھ دینِ حقہ اور شریعتِ مطہرہ کے قتل کے مترادف ہوتا۔ اس سے بڑھ کر امام حسینؑ کی شکست و حق کی خفت اور کیا ہو سکتی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قتلِ امامؑ کے بعد اس مقصد کی حفاظت کا کون سا ذریعہ ہو سکتا تھا؟ کس پر اعتماد کرتے کہ وہ ان کی شہادت کے فلسفہ، ان کی حقانیت و صداقت کی تبلیغ کماحقہٗ کرے گا؟ کیا وہ اپنے اعزہ و انصار پر بھروسہ کر سکتے تھے؟ وہ تو سب ان کے سامنے قتل ہو جانے والے تھے۔ کیا وہ اپنے بیمار فرزند زین العابدینؑ پر اعتماد کرتے؟ وہ تو خود طوق و سلاسل میں گرفتار اور شدائد مرض میں مبتلا تھے۔ ان کا قتل بھی سنگ دل دشمنوں کے لئے معمولی بات تھی۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق دربارِ عبید اللہ بن زیاد اور بعض کے مطابق دربارِ یزید میں ایسا موقع بھی آیا کہ اگر زینب کبریٰؑ ان کے ساتھ لپٹ کر قتل ہونے پر تیار نہ ہو جاتیں تو وہ کلمۂ حق کہنے کے جرم میں ضرور قتل کر دیئے جاتے پھر ایسا کون ہو سکتا تھا جو اس اہم فریضہ کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا تھا؟ یقیناً مردوں میں میں سے ایسا کوئی شخص نہ ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی جانباز کلمۂ حق کہنے کی جرأت کر بیٹھتا اور امامؑ کی حق پسندی اور حکومت کی جفا پروری کے متعلق ایک لفظ بھی زبان سے نکالتا تو فوراً اس کی زبان کاٹ دی جاتی اور وہ گردن زدنی قرار دیا جاتا۔ اگر کسی شخص کو ہمارے اس دعویٰ پر شبہ ہے تو عبداللہ بن عفیف ازدی کے واقعہ کو نگاہِ عبرت سے دیکھیے جس کا ہم تفصیل سے گذشتہ ابواب میں ذکر کر آئے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اموی پراپیگنڈے کے خلاف اگر امامؑ مردوں سے کام لیتے تو ان کا وہی انجام ہوتا جو مردِ حق گو عبداللہ بن عفیف ازدی علیہ الرحمہ کا ہوا۔ پھر ایسا کون ہوتا جو دنیا کے سامنے حقانیت و صداقت کو بے نقاب کر کے دشمنوں کی حکمتِ عملی اور حیلہ سازی کو مکمل شکست دیتا اور بھرے مجمعوں، بازاروں اور حکام کے درباروں میں اپنی پرزور و باطل شکن تقریروں سے ناواقف افراد کے سامنے

حقیقت کو واضح کرتا ؛ ایسے ہولناک مواقع پر جہاں بڑے بڑے بہادروں کے قدم ڈگمگا جاتے، حسینی مقصد کی تکمیل ان ہی بے والی و وارث عورتوں نے کی، جو قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرائی جا رہی تھیں، جن کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی، جن کی رگوں میں فاطمی خون جوش مار رہا تھا اور جن کی زبانوں پر نبوی بلاغت اور علوی فصاحت الفاظ کی صورت میں موجزن تھی۔ انہوں نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جو بڑے بڑے پر جگر مردوں سے نہ ہو سکتا تھا اور ایسے ہیبت ناک مواقع پر فریضۂ تبلیغ ادا کیا، جن میں بہادروں کے دل چھوٹ جاتے تھے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر یزیدی حکومت سے قتل کا ایسا ہی خوف مردوں سے متعلق تھا تو یہی خوف عورتوں کی نسبت کیوں نہ ہونا چاہئے تھا۔؟ یہ خیال اس وجہ سے درست نہیں کہ انتہائی جفا پروری، ظلم پسندی اور اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کے باوجود ابھی اتنی حمیت عرب میں باقی تھی کہ وہ عورتوں کا قتل اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ یزیدی حکمرانوں اور اموی درندوں سے تو ایسا کرنا بعید نہ تھا لیکن وہ محض اس خیال سے باز رہے کہ حمیت عوام اس کو برداشت نہ کر سکے گی اور جا بجا لوگ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ روزِ عاشور یزیدیوں کے ہاتھوں بعض عورتیں اور بچے بھی قتل ہوئے مگر معرکۂ جنگ کی خصوصیات دوسرے اوقات سے مختلف ہوتی ہیں۔ ابن زیاد اپنی تمام تر سرکشی، سفاکی اور سنگدلی کے باوجود اس پر قادر نہ تھا کہ وہ ایک غیر معرکہ جنگ میں ایک بیکس و بے بس عورت کا خون بہاتا جو اس کے سامنے ایک قیدی کی حیثیت سے کھڑے ہو کر اپنی باطل شکن تقریروں سے حکومت کے فسق و فجور کو خبث و شقاوت کو طشت از بام کر کے شاہی جاہ و جبروت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا رہی تھی۔ ابن زیاد یہ سن کر پیچ و تاب کھانے لگا اور زینب کبریٰؑ پر ہاتھ ڈالنا چاہا کہ ان کے جگر سوز کلمات کا انتقام لے مگر اسی کے لشکر کا بڑا سردار عمرو بن حریث سامنے آ گیا اور اس نے ابن زیاد کو یہ کہہ

کر روک دیا کہ عورت کو اس کی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کی سزا نہیں دی جاتی۔ ابن زیاد کو یکبکر ساکت ہو جانا پڑا کر تو نہیں دیکھتا کہ زینبؑ نے میرے ساتھ کتنی بڑی جسارت کی ہے۔ امامؑ کو عربی حمیت کا خوب اندازہ تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ ملکی قوانین کی شرم اور عوام کے جذبات کے خوف سے بنی امیہ کے لئے کسی عورت کا قتل کرنا تو درکنار، اس پر بظاہر ہاتھ اٹھا لینا بھی آسان نہیں ہے۔ لہٰذا امامؑ نے پورے تدبر سے کام لے کر اپنے مقصد کی تبلیغ و تکمیل کا کام مردوں کی بجائے عورتوں ہی سے لینا مناسب سمجھا۔ امامؑ کا یہ فعل ان کے سیاسی شعور، انتہائی تدبر اور بیمثال عاقبت اندیشی پر برہانِ قاطع ہے۔ کہاں ہیں وہ پیشہ ور مؤرخین جو یہ کہتے ہیں کہ امامؑ سیاسی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہاشمی و اموی طاقتوں کا صحیح اندازہ نہ کر سکے؟ وہ لوگ آئیں اور چشمِ بصیرت وا کر کے ان حقائق کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں ہو سکتا ہے کہ وہ راہِ ہدایت پر گامزن ہو جائیں اور دہکتی ہوئی نارِ جہنم کا ایندھن نہ بنیں۔

اب ہم صرف ایک مثال پیش کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان مقدس خواتین نے حسینی مشن کی تکمیل کس طرح کی اور مقصدِ شہادتِ عظمیٰ کو تباہ و برباد ہونے سے کس طرح بچایا؟

پیشتر ازیں بتایا جا چکا ہے کہ یزیدی نمک خواروں نے تمام کوفہ میں پروپیگنڈا کر رکھا تھا کہ حجاز کا ایک خارجی کوفہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کا قتل کرنا واجب ہے۔ عوام کو یہ نہ بتایا گیا تھا کہ کربلا میں جنگ کس سے ہوگی؟ جب کوفہ سے فوجیں بھیجی جا رہی تھیں تو سیاسی حالات سے بےخبر انسان تعجب سے دریافت کرتے تھے کہ کس کے خلاف یہ جنگی تیاریاں معرضِ وجود میں آ رہی ہیں؟ تو جواب ملتا کہ حجاز کا ایک باغی کوفہ پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے۔ چونکہ اپنے وطنِ مالوف پر مخالف کا حملہ آور ہونا کسی کو پسند نہیں آتا لہٰذا فطرتاً حملہ آور سے ہر کس و ناکس کا متنفر ہو جانا ضروری تھا،

عوام کالانعام کو حقیقتِ حال کی کیا خبر تھی ؟

چنانچہ اس کا بین ثبوت کتبِ تواریخ سے اس طرح ملتا ہے کہ جب اہلِ حرم کا لٹا ہوا قافلہ بازارِ کوفہ میں سے گزرا تو تماشائی عورتوں نے جو مکانوں کی چھتوں پر بیٹھی ہوئی تھیں ان کو تباہ حال، بھوکا اور پیاسا دیکھ کر صدقہ کے خرمے اور روٹیاں پھینکنا شروع کیں۔ اس پر جنابِ زینبؑ نے ان کو ڈانٹا اور فرمایا: "اے زنانِ کوفہ! کیا کر رہی ہو؟ ہم اہلبیتِ رسولؐ ہیں۔ ہم پر صدقہ حرام ہے" یہ سنتے ہی وہ چونک پڑیں اور پوچھنے لگیں۔ "تم کس قبیلہ سے ہو؟" اب حضرت زینبؑ کو موقع ملا اور آپ نے نہایت پر زور خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اہلِ کوفہ و بنی امیہ کے دہشیانہ مظالم اور امام شہیدؑ کی اسلام نوازی و دین پروری کو ایسے درد انگیز لہجے میں بیان کیا کہ وہ زار زار رونے لگیں اور ابن مرجانہ پر لعنت کرنے لگیں۔ چنانچہ حضرت زینبؑ، حضرت ام کلثومؑ اور امام زین العابدینؑ نے صرف کوفہ میں نو مقامات پر ایسی پر زور و باطل شکن تقریریں کیں کہ اہلِ کوفہ کے دل دہل گئے اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "ہم ان واقعات سے قطعاً ناواقف ہیں ہم کو تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ ایک خارجی نے حملہ کرنا چاہا تھا، اس کو کربلا میں قتل کیا گیا ہے اور اس کی عورتوں کو قید کر کے لایا جا رہا ہے"۔

اسی قسم کی ایک روایت زید بن ارقمؓ کی زبانی کتبِ تواریخ میں مذکور ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عام اہلِ کوفہ کو امام حسینؑ کے واقعۂ شہادت سے قطعاً بے خبر رکھا گیا تھا۔ یہ کوئی حیرت انگیز اور تعجب خیز امر نہیں۔ آج کل بھی ہر حکومت عوام کو اہم سیاسی امور سے اسی طرح بے خبر ہی رکھتی ہے۔ چنانچہ زیدؓ بیان کرتا ہے:۔

"جب میں طولانی سفر کے بعد کوفہ آیا تو میں نے دیکھا کہ بازار سجے ہوئے ہیں، شہر آراستہ ہے۔ ہر طرف غیر معمولی چہل پہل ہے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا اہلِ کوفہ یہ کوئی نئی عید منا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ جشنِ عید اس خوشی میں منایا جا رہا ہے کہ ایک

باغی نے امیر المومنین یزید پر خروج کیا تھا، اس کو قتل کر دیا گیا ہے اور آج اس کے اہل و عیال کو قید کر کے کوفہ میں لایا جا رہا ہے۔ اس خوشی میں یہ آئینہ بندی بھی ہے اور لوگوں کا ہر طرف مجمع بھی۔ زید کہتے ہیں، میں یہ سن کر اپنے گھر چلا گیا۔ قریب شام جب وہ قافلہ میرے مکان کے نیچے سے گزرنے والا تھا مجھے باجوں کی آواز سنائی دی۔ میں اپنے کوٹھے پر چڑھا۔ دیکھا، چند سر خون آلودہ، چہروں پر غبار جما ہوا، نیزوں پر نصب آگے آگے ہیں اور کچھ عورتیں کھلے سر، با حالِ پریشاں، بے عماری و کجاوہ اونٹوں پر سوار ہیں میں نے ایک بی بی کو گھور کر دیکھا۔ اس نے خشم آگیں لہجے میں مجھ سے کہا "یَا شَیخ غُضَّ بَصَرَکَ نَحنُ اساریٰ من بنات آلِ محمدؐ۔" اپنی آنکھیں بند کر لے! ہم قیدی آلِ رسولؐ ہیں۔" زید کہتے ہیں، یہ سنتے ہی میں بدحواس ہو گیا۔ دل میں کہنے لگا۔ "اولادِ رسولؐ کو قید سے کیا تعلق؟" میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ "اے بی بی مجھے معاف کرو۔ میں نے نگاہِ بد سے نہیں دیکھا بلکہ صرف یہ جاننے کے لئے کہ آپ کس قوم و قبیلہ سے ہیں۔" فاشارت اِلٰی علیؑ ابن الحسینؑ۔ انہوں نے بیمارِ کربلاؑ کے اونٹ کی طرف اشارہ کیا کہ جو پوچھنا ہو ان سے پوچھو۔ زید کہتے ہیں۔ میں منتظر رہا یہاں تک کہ جب وہ آخری اونٹ میرے قریب ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک جوان نہایت نحیف و نزار اس پر سوار ہے اور اس کے پیر بطنِ شتر سے بندھے ہیں۔ ضعف کا یہ عالم ہے کہ بار بار سر چوبِ پالان پر رکھ دیتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "تم کس قبیلہ سے ہو؟" اس نے کہا۔ "تم نے قرآن پڑھا ہے؟" میں نے کہا۔ "ہاں۔" پوچھا۔ "سورہ بنی اسرائیل میں یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ۔" میں نے کہا۔ "تم ہی وہ لوگ ہو جن کے حق ادا کرنے کا خدا نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا تھا؟" فرمایا۔ "ہاں۔ ہم وہی ہیں۔" میں یہ سن کر تڑپ گیا۔ پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟" کہا۔ "علیؑ بن حسینؑ" میں نے کہا۔ "میرے سردار، مولا، آقا ابو عبد اللہ الحسینؑ کہاں ہیں؟" انہوں نے ایک نیزہ

طویل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ میرے پدرِ بزرگوار کا سر نیزہ پر نصب ہے"۔

(رسالہ نور کراچی اکتوبر ۱۹۵۳ء، ص ۸)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام تو درکنار، خاص خاص لوگ بھی حقیقتِ حال سے بے خبر تھے۔ لہٰذا ان تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اگر مخدراتِ عصمت ساتھ نہ جاتیں تو مقصدِ شہادت اور بنی امیہ کے مظالم کون بیان کرتا اور لوگوں کو کیسے پتہ چلتا کہ ننگِ انسانیت مسلمانوں نے آلِ رسولؐ پر کیسے کیسے وحشیانہ ظلم کئے ہیں۔ جب تک یہ معلوم نہ ہوتا تو امام حسینؑ کی بے گناہی، حق پسندی، دین نوازی اور حریت پروری کیسے ثابت ہوتی؛ بنی امیہ تو اپنی تمام سیاسی تدابیر کو بروئے کار لانے میں ہمہ تن معروف تھے کہ خونِ ناحق رائیگاں جائے لیکن امام ذیشانؑ نے اپنے علم و بصیرت کی بناء پر نائبِ زہرا حضرت زینبؑ کو اسی لئے شریکِ کار کر رکھا تھا کہ خونِ ناحق کے دھبے قاتلوں کے دامن سے نہ چھوٹیں اور لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ یزید ملعون، رسول عربیؐ کا جانشین نہیں اور اس کی بیعت و اطاعت مسلمانوں پر حرام ہے۔ حسینؑ کے اسی لائحۂ عمل نے ہر ایک مسلمان کی غیرتِ ایمانی و قومی حمیت کو مشتعل کر کے یہ کہہ اٹھنے پر مجبور کر دیا کہ

جب کبھی غیرتِ انساں کا سوال آتا ہے
بنتِ زہراؑ تیرے پردے کا خیال آتا ہے

جب اہلِ حرم کو کوفہ سے دمشق کی طرف لے کر چلے تو راستے میں جس جس منزل پر فوجِ یزید نے قیام کیا، وہاں اہلبیتؑ کے خطبوں نے آگ لگا دی۔ لوگ فوجِ یزید سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کی رسد بند کر دی۔ اپنے شہروں میں سے انہیں گزرنے نہ دیا۔ بعض مقامات پر لڑائی کی نوبت آئی اور عیسائیوں نے مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر کئی یزیدی سپاہیوں کو فی النار کیا۔ یہی چیز تھی جس نے آناً فاناً شہادتِ حسینؑ کی خبر مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پہنچا دی۔ دمشق کے شہر میں، بلکہ خود یزید

کے دربار میں خواتین کی باطل شکن تقریروں نے تہلکہ مچا دیا تھا اور عیسائی ملکوں کے سفیر حسینی احتجاج میں شامل ہو گئے۔ یہ وہ خاص ضرورت تھی جس کی بنا پر امامؑ اپنے ساتھ مقدس خواتین کو لے گئے تھے۔ اگر خواتین نہ ہوتیں تو قتلِ حسینؑ، عبداللہ بن زبیرؓ اور ان کے بھائی مصعب کے قتل کی صورت اختیار کر لیتا۔ جس سے نہ کوئی مقصد حاصل ہوا اور نہ ہی اس کا بدلہ لیا گیا۔ مگر خونِ حسینؑ نے عالمِ اسلام میں آگ لگا دی تھی۔ ان محترم خواتین کا قید سے رہا ہو کر مدینہ پہنچنا تھا کہ اموی سلطنت میں انقلاب کی صورت رونما ہونے لگی۔ یزید و ابن زیاد کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور اموی سلطنت اس طرح نیست و نابود ہو گئی کہ قیامت تک کوئی اس کا نام لیوا پیدا نہ ہوگا۔

سورۂ فجر میں شبِ مخصوص کی قسم سے اس حقیقت پر استدلال کیا گیا ہے کہ بعد قتلِ حسینؑ مصائب و آلام کے بے پناہ طوفان اٹھیں گے جو اہلِ حرم کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے لیکن وہ ان تمام مرحلوں کو صبر و ثباتِ قدم کے ساتھ طے کر کے حسینی مقصد کی تکمیل اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیں گے کہ وہ شجرِ ملعونہ کی تباہی و بیخ کنی پر منتج ہو کر رہے گی۔ اسی دعوت الی الحق کے لئے حسینؑ شہید نے سر دیا اور اسی دعوت الی الحق کی خاطر حضرت زینب کبریٰؑ اور حضرت ام کلثومؑ علیا نے سفرِ شام کی صعوبتیں اٹھائیں اور قید خانۂ دمشق کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں دیکھیں۔ آج بھی حسینؑ گو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں مگر اپنے کٹے ہوئے حلقوم سے ہمیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں:۔

"اے مسلمانو! محبت، رواداری، صبر و استقامت اور قربانی و ایثار کی راہ پر چل کر صداقت و حق پرستی کا پرچم بلند رکھو دیکھو تمہارا نصب العین صرف یہ ہونا چاہئے کہ ہماری عبادت، ہماری زندگی اور ہماری موت محض اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہے جو جہانوں کا پروردگار ہے۔"

آیۂ نور و اصلاحِ عمل

اللہ تبارک و تعالیٰ نے آیۂ نور میں ایک عجیب تمثیل کے ذریعے اصلاحِ عمل و قبولیتِ حق کی دعوت دی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (النور ۳۵)

(ترجمہ)"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال اس طاق "PILLER" کی سی ہے جس میں ایک زبردست روشن چراغ ہو اور وہ چراغ شیشے کی ایک قندیل میں ہو اور وہ قندیل ایسی ہو جیسا ایک چمکتا ہوا ستارہ اور زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے روشن ہو جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ قریب ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے گو آگ اس کو نہ چھوئے **نور بالائے نور** ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی راہ بتلا دیتا ہے اور اللہ آدمیوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کا پورا پورا علم جاننے والا ہے"۔

اگرچہ مفسرین کے ہاں اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں بہت بڑا اختلاف ہے تاہم وہ سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ آیۂ زیرِ بحث میں خداوند عالم پر نور کا اطلاق بر سبیلِ مجاز ہے نہ کہ بر سبیلِ حقیقت۔ کیونکہ نور اشیاء حادث میں سے ہے جن میں تغیرات واقع ہوا کرتے ہیں اور خدا محلِ حوادث نہیں ہو سکتا۔ پروردگارِ عالم جسم و جسمانیات سے پاک و منزہ ہے۔ نہ اس میں عرض ہے نہ جوہر۔ پس اس موقع پر لفظِ نور کا استعمال کبھی حقیقی معنی میں نہیں ہو سکتا بلکہ نور بمعنی منور درست مقصود ہو گا یعنی خدا آسمانوں اور زمین کا روشن کرنے

والا ہے۔ زبانِ قدرت اس کلام پُراسرار و پُر رموز کی یوں تشریح فرماتی ہے کہ اس نور کی مثال بلند برج کی سی ہے جس پر ایک روشن چراغ رکھا ہوا ہے تاکہ اس کی ضیا پاشیوں سے دور دور کی چیزیں روشن و درخشاں ہو سکیں۔ بلند برج کو درحقیقت نورِ نبوتِ احمدی کا اس بنا پر مشبہ بہ قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح بلند ترین برج پر رکھی ہوئی تیز روشنی اکنافِ عالم تک پھیل سکتی ہے اسی طرح جنابِ ختم الرسلؐ کی رسالت عالمگیر بھی ہے اور ہمہ گیر بھی المصباح (چراغ) سے مراد سیدۂ عالم جناب فاطمہ زہراؑ ہیں جو فی نفسہٖ "الفاطمة بضعة منی" کی رُو سے نورِ نبوت کا ایک حصہ ہیں پس نورِ خداوندی کی مثال اس مشکوٰۃ (حضرت رسالتمآبؐ) کی سی ہے جس میں زمین و آسمان کو نورِ ہدایت سے منور کرنے والا چراغ (فاطمہ زہراؑ) ہے۔ چراغ کے گرداگرد زجاجہ یعنی ایک شیشے کی قندیل (علی مرتضٰیؑ) ہے جو اس کو تیز و تند ہواؤں کے جھونکوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ شیشہ بذاتِ خود اس قدر اُجلا و شفاف ہے گویا درخشندگی کے لحاظ سے کوکبِ دُری یعنی ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر چراغ کے گرداگرد چڑھا ہوا شیشہ مکدّر و غیر شفاف ہوگا تو روشنی کی شعاعیں اس کے ماحول کو اچھی طرح روشن نہ کر سکیں گی اور روشنی بذاتِ خود مدھم نظر آئیگی۔ روشنی کو تیز کرنے کے لئے صفائی و درخشندگی از بس ضروری ہے۔ پس اس مقدس شیشہ سے مراد جو چمک دمک کے لحاظ سے کوکبِ دُرّی ہے امیرالمومنین حضرت علی مرتضٰیؑ کی ذاتِ گرامی ہے جن کی ذوالفقارِ جوہر دار نے نہ صرف چراغِ اسلام کو کفر و باطل کی تیز و تند ہواؤں کے طوفانوں سے محفوظ رکھا۔ بدر، احد اور خندق و خیبر کے نازک مرحلوں پر اسلام کی پوری پوری محافظت کی بلکہ اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا کی رُو سے سَلُوْنِیْ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ کا نعرہ لگایا اور علمِ امامت کی ضیاپاشیوں سے ہدایت و معرفت کی راہ کو زیادہ روشن اور نمایاں کر دیا شجرِ اسلام کو اس موقع

پر تمثیلاً شجر مبارک (زیتون) بیان کیا گیا ہے جو نہ صرف مشرق تک محدود ہے اور نہ صرف مغرب کے لئے مخصوص، بلکہ اس کے روحانی ثمرات سے دنیا کی تمام قومیں تمام زمانوں کے لئے متمتع و مستفیض ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ رسالتِ محمدی مسیح ناصری کی نبوت کے برعکس جو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں تک محدود تھی، نہ صرف قبائلِ قریش اور صحرا نشین بدوؤں کی ہدایت کی ضامن ہے بلکہ آنحضرتؐ کا دائرۂ رسالت " وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ " کی رُو سے تمام جہانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور نزولِ رحمتِ خداوندی کا ذریعہ ہے۔ پس یہ چراغِ ہدایت شجرِ زیتون (اسلام) کے مبارک تیل سے روشن ہے جس میں نور تو ہے لیکن نار نہیں۔ نور کی ضیا پاشیاں تو ہیں مگر آگ کی سوزش و تپش موجود نہیں۔ اس مبارک چراغ نورٌ علیٰ نور (آئمۃ الطاہرینؑ) سے نور کے بعد نور اٹھ رہا ہے یعنی فاطمہ زہراؑ کے گھر سے ایک امامِ ہدیٰ کے بعد دوسرا امامِ ہدیٰ مامور ہو رہا ہے۔ حضرت حسن المجتبیٰؑ سے لے کر امام محمد مہدیؑ تک تمام آئمۃ الطاہرینؑ ہدایت و معرفت کے سرچشمہ ہیں جو اپنے مقدس خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کرتے رہے ہیں اور اپنے علمِ امامت سے نورِ نبوّت کو اقصائے عالم میں پھیلاتے رہے ہیں اور پھیلاتے رہیں گے۔ اللہ اس نور کی طرف جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور اللہ نے انسانوں کے سمجھانے کے لئے مثال بیان کر دی ہے تاکہ صاحبانِ شعور اس سے استفادہ کریں۔ مبارک ہیں وہ جو خدا کی بتائی ہوئی نشانیوں پر غور کرتے ہیں اور مقدس لوگوں کا دامن تھام کر صراطِ مستقیم پر چلنے کی سعی کرتے ہیں۔

قارئینِ کرام یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے تفسیر بالرائے سے کام لے کر نورٌ علیٰ نور سے مراد آئمۃ الطاہرینؑ لی ہے۔ جناب صادقِ آلِ محمدؐ نورٌ علیٰ نور سے یہی مراد لیتے ہیں اور ان ہی حضرات کو اس کا مصداق سمجھتے ہیں۔ خود جناب باقر العلومؑ نے مشکوٰۃ

سے مراد سینۂ نبیؐ اور زجاجہ (شیشہ) سے سینۂ علیؑ مراد لی ہے۔ امر واقعہ تو یہی ہے کہ نورٌ علیٰ نور سے کے مقصود بالذات حضرات آلِ محمدؐ ہیں جو اوصیائے نبیؐ اور خلفاء الرسولؐ ہونے کے علاوہ روئے زمین پر حجتِ خدا ہیں۔ یہ حقیقت بھی متفق علیہ ہے کہ دنیا کسی زمانہ میں بھی حجتِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتی۔ مشہور حدیثِ نبوی " مَنْ مَاتَ وَلَمْ یعرف امام زمانہ فقد مات میتۃ جاھلیۃ " بھی اس امر کی موید ہے یعنی جو شخص مر گیا اور اس نے اپنے زمانہ کے امامؑ کی معرفت حاصل نہ کی وہ جاہلیت کی موت مرا۔ مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور اسی آیۂ کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

The blessed olive from that light is lit stands here for a symbol of Islam, as the fig stands for a symbol of Judaism."
(Holy Quran-Footnote No.2766)

(ترجمہ) جس طرح انجیر یہودیت کے لئے ایک علامت ہے اسی طرح زیتون کا مبارک درخت جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اسلام کا نشان قرار دیا گیا ہے۔ مولانا موصوف اپنے بیان کی تائید میں آیہ کریمہ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انجیر کو شریعتِ موسوی اور زیتون کو دینِ محمدی کا مظہر قرار دینے میں ایک خاص مناسبت کارفرما ہے جو مابعد کی آیات (وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ) سے بصورت صنعتِ لف و نشر ظاہر ہے۔ موسوی آئین طورِ سینا پر بذریعہ الواح عطا ہوا اور اسلامی قوانین کا نفاذ بلد الامین یعنی مکّہ کے پُرامن شہر میں شروع ہوا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جناب رسولخدا صلعم حضرت موسیٰؑ کے مثیل تھے اور اس مماثلت کا بعثتِ نبوی کے ابتدائی دور میں ہی اعلان کر دیا گیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے سورۂ طور : ۱-۴ ، سورۂ مزمل : ۱۵۔ نیز یہ مماثلت توریتِ مقدس میں بھی مذکور ہے

ملاحظہ کیجئے :۔ "میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں (بنی اسمٰعیل) میں سے **تیری مانند** ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا (وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ......)
(استثنا ۱۸ : ۱۸-۱۹)

بہرکیف بائیبل کے تمام مفسرین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ انجیر یہودیت کی مظہر ہے ورنہ مسیحؑ کا انجیر کے درخت کو لعن وطعن کرنا اور اس کا مرجھا جانا ایک لغو واقعہ ہوتا جس کو تمثیلی حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوتا کیونکہ انجیل میں مذکور ہے کہ جب حضرت مسیحؑ صبح کے وقت عنسیاہ سے تشریف لا رہے تھے تو انہیں شدت سے بھوک محسوس ہوئی وہ انجیر کے درخت کے قریب آئے تاکہ کچھ انجیریں توڑ لیں مگر اس پر سوائے پتوں کے کچھ نہ پاکر اس پر لعنت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پودا فوراً خشک ہو گیا انجیل مقدس کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے :۔

"جب صبح کو پھر شہر جا رہا تھا اسے بھوک لگی اور راہ کے کنارے انجیر کا ایک درخت دیکھ کر اس کے پاس گیا اور پتوں کے سوا اس پر کچھ نہ پاکر اس سے کہا کہ آئندہ تجھ پر کبھی پھل نہ لگے اور انجیر کا درخت اسی دم سوکھ گیا۔ شاگردوں نے یہ دیکھ کر تعجب کیا اور کہا، یہ انجیر کا درخت کیونکر ایک دم سوکھ گیا؟" (متی ۲۱ : ۱۸-۲۰)

بائیبل کے عیسائی مفسرین کو چار و ناچار یہ تسلیم کرنا ہی پڑا کہ یسوع کو اپنے اس عمل سے یہودیت کی تردید و نفرین مقصود تھی۔ حضرت مسیحؑ کے اس فعل کا درحقیقت مقصد یہ تھا کہ شاگردوں پر یہ ظاہر کر دیں کہ یہود انجیر کے درخت کے مشابہ ہیں جس پر صرف پتے ہی پتے ہیں اور پھل نام کو نہیں۔ اب پتے بھی جو ان کی نمائشی پرہیزگاری کی دلیل تھے انکارِ مسیحؑ کی بنا پر مرجھا چکے ہیں۔ حضرت مسیحؑ ناصری نے یہودیت کی تردید کے لئے باغ کی تمثیل (متی ۲۱ : ۴۳) بالوضاحت بیان کی جس کے آخر میں یہ الفاظ موجود ہیں :۔

"خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائیگی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائیگی دے دی جائے گی" قرآنِ حکیم کی زبان میں یہ دوسری قوم ملتِ اسلامیہ ہے جو بنی اسرائیل کے نقضِ عہد پر عہدِ ابراہیمی کی وارث ٹھہری ہے۔ مزید برآں یرمیاہ نبی نے قومِ یہود کو انجیر کے دو ٹوکروں سے تشبیہہ دی ہے۔ صالحین کو اچھی انجیروں سے اور بدکاروں کو بُری انجیروں سے تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے یرمیاہ باب ۲۴۔

"مماثلت زیرِ بحث سے یہ امر نمایاں ہے کہ وہ آئین جو طورِ سینا پر دیا گیا تھا مسیح کی تمثیل کے مطابق انجیر کے درخت کی طرح بیکار و کالعدم ہو چکا تھا اور خدا کی بادشاہت یہود سے لے کر اس ذاتِ مقدس کے ہاتھ میں دی جانے والی تھی جو **مثیلِ موسیٰ** تھی۔ انجیر کی شانِ رفعت داستانِ پارینہ بن چکی تھی اور اب نئی روشنی زیتون کے مبارک درخت سے اکتساب کی جا رہی تھی جو کبھی اختتام پذیر نہ ہوگی۔ یہ روشنی نہ صرف مشرق سے وابستہ ہے اور نہ صرف مغرب سے متعلق بلکہ تمام بنی آدم اس سے مستفیض ہوں گے اور یہ ابدی طور پر عالم کون و فساد میں جاری و ساری رہے گی موسوی شریعت زمان و مکان کی قیود میں محدود تھی مگر دینِ رسولِ عربی عالمگیر بھی ہے اور وقت کی قیود سے آزاد بھی۔ زیتون کے مبارک درخت کے اندر جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی یہی اشارہ موجود ہے۔

بائیبل کی مقدس شہادت کے بعد اگر محمود عباسی کے ہمنوا حضرات کا یہ خیال ہو کہ ہم نے خواہ مخواہ کھینچ تان کر چہاردہ معصومینؑ کو آیۂ نور کا مصداق قرار دے دیا ہے تو اس کے جواب میں بلاخوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں نور کا لفظ محض ہدایت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور چہاردہ معصومینؑ ہادیانِ مطلق ہونے کی حیثیت سے نورِ مجسم ہیں جنہوں نے اپنے بلند پایہ کردار اور حسنِ عمل سے راہِ ہدایت کو نمایاں کر دیا ہے تاہم قارئین کرام کے اطمینانِ قلب کے لئے قرآنِ حکیم کی مزید شہادت پیش

کی جاتی ہے۔ آیۂ نور کے مابعد اگلی آیۂ کریمہ جو نفسِ مضمون کے لحاظ سے آیۂ نور سے ملحق و مربوط ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔ " فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ " (النور : ۳۶)

(ترجمہ) " (یہ چراغ) ایسے گھروں میں ہے جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی تعظیم کیجائے اور اس کا نام ان میں لیا جائے اور ان میں صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرتے رہیں "۔

حضرت رسالتمآبؐ سے استفسار کیا گیا کہ وہ کون سے گھر ہیں جن کے بلند رکھنے اور جن کی تعظیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے ؟ آنحضرتؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ وہ گھر انبیائے کرامؑ کے ہیں۔ سائل نے پھر پوچھا کہ کیا حضرت علیؑ و حضرت فاطمہؑ کا گھر بھی ان گھروں میں شامل ہے ؟ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کے مصداق نے ارشاد فرمایا " ہاں بلکہ فاطمہؑ کا گھر بدرجہ اولیٰ ان میں شامل ہے "۔ اسی مضمون کی ایک روایت علامہ جلال الدین سیوطی نقل کرتے ہیں :۔

جب جناب رسالتمآبؐ نے آیت فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ ...... تلاوت فرمائی تو ایک شخص نے عرض کیا " یا حضرت ! اس سے کون گھر مراد ہیں ؟ " آپؐ نے فرمایا " انبیاء کے گھر " یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؑ و حضرت فاطمہؑ کے گھر کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا " یا رسول اللہ ! کیا یہ گھر بھی ان گھروں میں سے ہے ؟ " آپ نے فرمایا " ہاں ! بلکہ ان میں یہی سب سے بہتر و افضل ہے " (تفسیر درِّ منثور جلد ۵ ص ۵۰ مطبوعہ مصر)

کافی میں قتادہ کے متعلق جو سوادِ اعظم کے عالی مرتبت مفسرین میں ایک جلیل القدر رتبے کے مالک ہیں منقول ہے کہ وہ ایک دن جناب باقر العلومؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے :۔ " میں بہت سے علماء کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیٹھا مگر کسی کے سامنے میرا قلب اس طرح

مضطرب نہ ہوا جس طرح حضورؐ کے سامنے ہوتا ہے۔" فرمایا: "تو جانتا ہے کہ تو کہاں ہے؟ تُو ان گھروں کے سامنے ہے جن کی تعظیم کئے جانے کا خود خدا نے حکم دیا ہے۔ پس تُو وہاں ہے اور ہم وہ ہیں۔" قتادہ نے عرض کیا: "قربان جاؤں، واللہ آپ نے سچ فرمایا۔ بیشک ان بیوت سے مراد مٹی اور پتھر کے مکان نہیں ہیں"۔

ان حقائق کے باوجود اگر کوئی تنگ نظر محض تعصب کی بناء پر اہلبیتؑ کے فضائل و مناقب سے انکار کر کے بادیۂ ضلالت میں سرگرداں رہنا چاہتا ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں ورنہ خدائے قدوس نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے تمثیل بیان کر کے راہِ ہدایت کو روشن کر دیا ہے۔ مگر شقی ازلی وہ شخص ہے جو اتنی کھلی کھلی شہادتوں کے باوجود اہلبیتِ رسالت کا دامن تھامنے کی بجائے اغیار کے دروازوں پر بھٹک رہا ہے اور دشمنانِ دین کا ہمنوا ہو کر دعوت الی الحق قبول کرنے سے انکاری ہے اور وہم و شک کے اندھیروں میں اور تذبذب و تعصب کی تاریکیوں میں مسلسل ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ حالانکہ امام عالیمقامؑ نے اپنا خون دے کر راہِ ہدایت کو منور کر دیا ہے تاکہ پیچھے آنے والے راہ نوردانِ حق اپنی منزل کا پتہ لگا سکیں۔

اپنی مختصر سی تالیف کے اختتام پر عرض کروں گا کہ آج اسلام کا سفینہ پھر اسی گرداب میں آپھنسا ہے۔ پھر مسلمانوں کے اجسام اور اجسام کے بعد عقول، عقول کے ساتھ قلوب پر غیر اسلامی روایات اثر انداز ہو رہی لیکن لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کی روشنی میں رحمتِ خداوندی سے مایوس ہونا انتہائی بے بصیرتی و کوتاہ اندیشی ہے۔ باطل کی تاریکیوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے حسینی شمع لے کر پھر کوئی اٹھے گا، ضرور اٹھے گا۔ جناب فاطمہؑ ہی کے گھرانے سے اٹھے گا۔ بیچین روحیں اجنبی دباؤ کے نیچے زیادہ دیر تک نہ پھڑپھڑائیں گی اور عقول جہالت کی تاریکیوں میں اپنے لئے نورِ معرفت تلاش نہ کریں گی۔ ناکامیوں اور مایوسیوں کے بادل چھٹ جائیں گے اور ملتِ اسلامیہ شہادتِ حسینؑ سے وہی حرارت حاصل کرنے کی کوشش کرے گی جس کے لئے خاندانِ رسالت نے دشتِ غربت میں قدم رکھ کر اپنی عزیز جانیں قربان کی تھیں۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ (الاحزاب ۴۱)۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
وابستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(اقبالؒ)

The End.

ٹی، ایس پرنٹرز گوالمنڈی
راولپنڈی